قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 24 ❖ شمارہ 08 ❖ جولائی 2014ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	راؤ محمد عبید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فرحان علی بخش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

رمضان کی آمد آمد ہے اور اشیائے صرف ذخیرہ اندوزوں کے گوداموں میں قید ہیں۔ تیل، گھی، بیسن، چنا، پھل اور دیگر ایسی چیزیں جن کا استعمال رمضان میں زیادہ ہوتا ہے، ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان کو گناہ کی ترغیب شیطان دیتا ہے مگر وہ تو اس مقدس مہینے میں مقید ہوجاتا ہے۔ پھر یہ کون لوگ ہیں جو صائم کی زندگی میں زہر گھولتے ہیں۔ جینا دوبھر کرانے میں کوشاں ہیں؟ ہم کفار سے برأت کا اظہار کرتے ہیں مگر وہ بھی اپنے تہواروں پر غربا کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ہمارا مذہب تو غریبوں کا خاص خیال رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ خیرات، زکوٰۃ، فطرانہ کے لیے تاکید کرتا ہے مگر ہم نے ادھر زکوٰۃ نکالی، ادھر اس رقم کو چار سے ضرب دینے کا عمل شروع کردیا، کیا ایسے میں ہماری عبادات قبول ہوں گی؟ یقیناً اللہ کو ناراض کرکے ہم عتاب سے بچ نہیں سکتے۔ یہ جو ہمیں قدم قدم پر ٹھوکریں لگ رہی ہیں۔ مصائب کے پہاڑ نظر آرہے ہیں، کہیں یہ ہمارے اعمال کی سزا تو نہیں ہے جو آج ہر طرف کشت وخوں کا بازار گرم ہے۔ بقول شاکر نظامی

شاکر نہیں تمیز جب رزق حلال کی
کیسے ہوں مستجاب دعاؤں کی خیر ہو

معراج رسول

شاعر جادو بیاں

سرگزشت

فیروز پور جھرکا کے نواب شمس الدین خان کے تعلقات فریزر ایجنٹ گورنر جنرل سے ٹھیک نہ تھے۔ رسا کشی چلتی رہتی تھی۔ یہ رسا کشی اس دن دشمنی میں بدل گئی جب سر ولیم فریزر نے ایک شریف گھرانے کی لڑکی پر ہاتھ ڈالا۔ فریزر انتہا درجے کا عیاش تھا۔ اسے ہر روز کسی نہ کسی سے ربط رکھنا ضروری تھا اور یہی بات نواب شمس الدین کو بری لگتی تھی جبکہ نواب کے دو برادر خورد نواب ضیاء الدین خان اور نواب امین الدین خان فریزر کو عزیز رکھتے تھے۔ کسی نے رات کے اندھیرے میں فریزر کو قتل کردیا اور یہ الزام نواب شمس الدین خان پر آیا اور بھائیوں کی ذلالت نے انہیں اکتوبر 1835 کو پھانسی کے تختے پر لٹکوادیا۔ عدالت نے تیزی اس لیے دکھائی تھی کہ معاملہ انگریزی اہلکار کا تھا اور اس وقت حکومت برطانیہ کا سورج ہند پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ نواب صاحب کو پھانسی ہوئی تو ان کا بیٹا 5 سال کا تھا۔ اس بیٹے کی پیدائش 12 ذی الحجہ 1346 بمطابق 25 مئی 1851 دن کے نو بجے چاندنی چوک دہلی میں ہوئی تھی۔ ماں اسے ساتھ لے کر لال قلعہ دہلی چلی آئی۔ بچے کی دیکھ ریکھ کے لیے عمدہ نامی ماما کا تقرر ہوا جو پوربی زبان بولتی تھی۔ جب زیادہ گرمی پڑتی تو وہ عمدہ کی منتیں کرتا کہ کچھ ایسا کرو کہ ہوا چلنے لگے۔ تب وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی "باوش باوش بابا کا بکی کا دلبوری کموڑی نذر کرے بادل اڑی جائے۔" عمدہ کا لہجہ پوربی تھا اس لیے بچے سمجھتے کہ وہ کوئی منتر پڑھ رہی ہے۔ کبھی کبھی ہوا چلنے بھی لگتی اور بچے اسے عمدہ کی جادوگری سمجھتے۔ وہ بچہ کچھ بڑا ہوا تو اسے ورزش کا شوق ہوا۔ خوب خوب مگدر پھراتا، گھڑ سواری کی مشقوں میں بھی دل لگاتا۔ تلوار چلانا، تیر اندازی، چوگنگ، بیتا کا تنا، بندوق چلانا، سپہ گری کے ہر فن میں طاق ہوتا چلا گیا کیونکہ اس کے سر پر ولی عہد ہند مرزا فخرو کا ہاتھ تھا۔ پھر اس وقت کے سب سے اعلیٰ ذوق شاعری میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ اپنا پہلا کلام اس نے مرزا فخرو سے صحیح کرایا پھر انہوں نے ہی مشورہ دیا کہ تم ذوق کی شاگردی اختیار کرو۔ اس سلسلے میں مرزا فخرو نے ہی حضرت بختیار الدین کاکی کے مزار پر ایک بڑی محفل منعقد کرائی جس میں شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر بھی شریک تھے۔ مرزا فخرو نے بچے کی طرف سے ذوق کی خدمت میں ایک دوشالہ اور اشرفیوں کی ایک تھیلی نذر کی۔ اسی دن سے ذوق نے اس کی شاعری پر اصلاح دینا شروع کردیا۔ ذوق بادشاہ اور ولی عہد کی غزلوں پر بھی اصلاح دیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ بادشاہ، ولی عہد اور اس کی غزلوں پر خود قلم چلاتے جبکہ باقی شاگردوں کی غزلیں کوئی ایک شاگرد سناتا اور وہ زبانی اصلاح کرتے جاتے۔ وہ دور ایسا تھا کہ دہلی کا لال قلعہ ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شعر و شاعری کا دور دورہ تھا۔ اس کی شاعری میں بھی نکھار پیدا ہوتا چلا گیا۔ صہبائی، آزردہ اور غالب جیسے باکمال بھی اس کی شاعری پر جھومنے لگے۔ حضرت ذوق سے اس نے 14 سال اصلاح لی۔ پہلا دیوان مکمل ہوا تو اس نے بعد ادب اپنے استاد کی خدمت میں پیش کیا کہ آپ ایک بار اور نظر ڈال لیں تاکہ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہے۔ حالانکہ اس نے اس کم عمری میں بھی بڑے بڑوں سے بڑھ کر شعر کہے مثلاً غالب کا ایک شعر اس وقت بہت پسند کیا جارہا تھا "نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بڑے بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے۔" اسی زمین پر اس کا بھی ایک شعر مشہور ہوا تھا" ہوئے مغرور جب کہ آہ میری بے اثر دیکھی۔ کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے۔" غالب ہی کا ایک شعر تھا" آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی، اب کسی بات پر نہیں آتی۔" اسی زمین پر اس کا شعر بھی داد حاصل کرنے لگا تھا" دلبروں پر طبیعت آتی ہے۔ اس طرح اس قدر نہیں آتی۔ دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور۔ یہ تجھے مفت پر نہیں آتی۔" شعر و شاعری میں وہ کمال دکھا ہی رہا تھا کہ اس پر ایک افتاد آپڑی۔ مرزا فتح الملک ولی عہد بہادر کا انتقال ہوگیا۔ اب دلی میں کیا رہ گیا تھا سو وہ رام پور کی جانب کوچ کرگیا۔ وہاں اسے اصطبل کا افسر مقرر کردیا گیا۔ یہاں اسے مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ بہت سے لوگ اس سے رقابت کرنے لگے تھے۔ ایک دن جب وہ اصطبل پہنچا تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس میں شعر لکھا تھا "شہر دہلی سے آیا اک مشکی، آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا۔" اس شعر میں اس کی کالی رنگت کو نشانہ بنایا گیا تھا مگر وہ بجڑ کا نہیں، اس نے شاعر کی خوب تعریف کی کہ رعایت لفظی سے بہت بہتر کام لیا گیا ہے۔ انہی دنوں نواب رام پور نے حج کا ارادہ کیا اور وہ بھی ان کے ساتھ ہوگیا۔ واپسی کے بعد وہ عازم کلکتہ ہوا اور راستے ہی میں عظیم آباد المعروف پٹنہ رک گیا۔ میر باقر نے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ خوب خوب مشاعرے ہوئے۔ بہت سے شعرا نے شاگردی اختیار کی اور پھر وہ عازم کلکتہ ہوا۔ وہاں بھی اپنا رنگ جمایا۔ کچھ دن قیام کیا۔ پھر وہاں سے حیدرآباد منتقل ہوگیا۔ جہاں بھی گیا شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا ادب پرستی کا یہ عالم تھا کہ 5 دیوان مکمل ہونے کے بعد بھی سیکڑوں غزلیں باقی رہ گئیں۔ مثنوی بھی کہی۔ انشائے پر بھی طبع آزمائی کی۔ فصیح اللغات کے نام سے ایک لغت ترتیب دے رہا تھا جسے قضا نے مکمل نہ کرنے دیا۔ اس معروف شاعر کا اصلی نام ابراہیم تھا مگر نواب مرزا کے نام سے ملقب تھا اور داغ دہلوی تخلص تھا۔

شہرِ خیال

☆ رانا محمد سجاد کا تبصرہ ''معراج رسول صاحب کے خیالات پڑھے۔ موجودہ واقعات پر صحیح تبصرہ تھا۔ پیر صاحب میں حضرت حسن نظامی کا تعارف ہوا۔ ایک صفحہ میں کسی شخصیت کا نقشہ کھینچ دینا اور حالاتِ زندگی بیان کر دینا یہ خاصہ صرف سرگزشت کو حاصل ہے۔ شاہد جہانگیر صفحۂ اول پر ہی جگمگا رہے تھے اور تبصرہ بھی شاندار تھا۔ میرا خیال ہے سب سے طویل خط تھا۔ اعجاز حسین سٹھار بڑے خوش نظر آئے، جناب آج کل کیا مصروفیت ہے؟ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے تشریف لائیں اور علم دشمنی پر ماتم کر رہی تھیں۔ حیرت ہے راولپنڈی جیسے شہر میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اسکولوں کے بارے میں آپ کے خیالات درست ہیں۔ یہ علم روشنی نہیں بزنس ہے اور زور و شور سے جاری ہے۔ ڈاکٹر قرۃ العین بھی اسی دکھ میں مبتلا تھیں۔ آپ نے دورِ حاضر کے مسلمان سائنس دانوں کا سلسلہ شروع کرنے کا کہا تو بہت انتظار رہے گا۔ انور عباس شاہ کی دریا خان سے تشریف آوری، بڑی گہری نظر رکھتے ہیں آپ الف لیلۂ پر، رانا شاہد صاحب کی زیرِ تعلیم اور وزیرِ تعلیم والے جملے نے بہت لطف دیا۔ جناب کہیں آپ کا اشارہ موجودہ حکومتی وزیر کی جانب تو نہیں؟ محی الدین صاحب کی سرگزشت والا رسالہ اب تلاش کریں گے دیکھتے ہیں کب تک ملے گا۔ احمد خان توحیدی، منشی محمد عزیز سے، عبدالغفور خان ساغر بھی حاضر تھے۔ اسلم عالم، سرگزشت کی سالانہ ڈاک سے فائدہ اٹھایئے۔ شبانہ حنیف صاحبہ! مجھے بھی سرگزشت کے چند ایک شمارے چاہئیں باقی تو میرے پاس ہیں۔ میں اپنا رابطہ نمبر دوں گا۔ ادارے سے پوچھنا تھا کہ کیا کوئی سلسلہ شروع نہیں کیا جا سکتا کہ پرانے شمارے قارئین کی فرمائش پر ادارہ دوبارہ شائع کرے۔ (پھر نئی تحقیق کا سلسلہ رک جائے گا) منشی محمد عزیز جامع تبصرے کے ساتھ آئے۔ رجنی کانت کا ذکر آیا تو آج کے اخبار میں تھا کہ ان کے سوشل میڈیا پر دس لاکھ افراد فین ہیں۔ بڑی حیرت ہوئی کہ اس عام سی شکل و صورت کے فنکار کی اتنی مقبولیت ہو سکتی ہے۔ بہر حال پسند اپنی اپنی۔ چراغِ ادب کافی یاد کرنے کی کوشش کی لیکن یاد نہ آسکا ان کے حوالے سے کوئی مضمون (پرانے ادبی پرچے دیکھ لیں، بہت کچھ مل جائے گا) ساجد صاحب کا شکریہ ان سے متعارف کرایا۔ جوش ملیح آبادی والے قصے نے تو کافی ہنسایا۔ اب پتا نہیں کہ حقیقت ہے کہ فسانہ۔ شمارے کی سب سے بہترین تحریر آزاد صاحب کی تھی۔ گویا عہدِ حاضر جو اس خمار میں مبتلا ہے کہ انسان کی ترقی کا یہی دور ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں میں غاروں کے اندر ایسی ایسی خوبصورت پینٹنگ ملتی ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ تتلیاں ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر ہونے والوں کی داستان۔ اللہ تعالیٰ ہر جابر اور قاہر کے سامنے ایسے ہی انسانوں کو پیدا کرتا ہے۔ رافیل ٹروجیلو جیسے زمینی جھوٹے خداؤں کی خدائی خاک میں ملا دیتے ہیں۔ ترکی کا سفرنامہ اپنے مخصوص رنگ میں جاری ہے۔ جرم وفا، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی ایک اداس کر دینے والی کتھا۔ یہ کیا جاہلانہ سوچ تھی ہٹلر کی، شیفر نے اتنی بڑی قربانی دے کر اپنا مشن مکمل کیا۔ بجائے اس کو سراہے جانے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انتہائی عجیب احمقانہ سوچ تھی۔ فلمی الف لیلۂ میں سلیم رضا کو یاد کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ انتہائی خوبصورت آواز کے مالک سلیم رضا بھی افسردہ حالت میں دنیا سے چل بسے۔ تنویر نقوی کا لکھا ہوا گیت واقعی جس خوبصورتی کے ساتھ انہوں نے گایا شاید ہی کوئی گا سکے۔ خوشونت سنگھ کا ذکر بھی خوب ہوا۔ واقعی اپنی طرز کے خوبصورت انسان تھے۔ ایک انسانیت نواز دوست۔ حدیقہ، عقیل احمد صاحب کا تذکرہ بھی رہا۔ جدن بائی کا تذکرہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے گزشتہ دنوں ان کی صاحبزادی کی فلم یعنی نرگس کی فلم دیکھی مدر انڈیا، واقعی بہت شاندار فلم تھی۔ مذہب کے حوالے سے بات آئی تو جدن بائی نے پہلے سلمان کیا پھر اس شخص سے شادی کی۔ الوداع میں حسن رزاقی صاحب کو کمپنی سے فارغ کرنے کے طریقے پر بہت ہنسی آئی۔ سراب میں کل کے دشمن اب ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ علمی آزمائش 101 کا جواب بھی دیا تھا لیکن چونکہ خط شاملِ اشاعت نہ ہوا اس لیے جواب نہ آسکا۔ اور اب کی بار کافی آسان سوال ہے۔ سچ بیانیوں میں حضرت اشرف المخلوق کا پستی میں گرنا ملاحظہ کیا۔ ان دیکھا سودا۔ اشرف کو عظمیٰ نے اچھا جواب دیا۔ دیکھے بغیر کوئی فیصلہ کرنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ ناقابلِ تلافی، ایک عجیب اور حیرت انگیز کہانی ہے۔ یقین نہیں آیا، ہم مجرم، ایک حساس انسان کی دعوتِ فکر دینے والی تحریر، موجودہ تہذیب یافتہ معاشرے پر ایک طمانچہ ہے۔ نہ خدا ملا ایک انتہائی بدبخت شخص کی کہانی تھی، سوچ کر بھی

لرزنا چاہیے۔ اعترافِ گناہ، ایک ایسی کہانی جو ہر اس انسان کے لیے عبرت کا سبق لیے ہوئے تھی جو اس قسم کی سوچ رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہمارے آس پاس موجود ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے اسے بروقت عقل آ گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے طرزِ عمل سے دور رکھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ (آمین)۔ انور اعجاز صاحب، روبینہ نفیس ثاقب، بشریٰ افضل صاحبہ غیر حاضر تھیں۔ جلد حاضر ہو جائیں۔ ایک اور درخواست مستریں، پر کوئی تحریر دیجیے۔''

☆ ظہیر احمد تبسم کراچی سے لکھتے ہیں ''میں نے دوبار شہرِ خیال میں قدم رکھنے کی کوشش کی ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ دونوں بار نہ تو میرا کوئی خط شائع ہوا نہ دیر سے ملنے والوں میں میرا نام آیا۔ آپ ہمیشہ صرف پرانے لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں اور ویسے بھی شہرِ خیال میں پرانے لوگوں کی بادشاہت قائم ہے (یہ بالکل غلط خیال ہے۔ کیا آپ کو لیٹ کر میں پرانے نام نظر نہیں آتے؟) اتنی مصروفیات ہونے کے باوجود میں آپ کا ڈائجسٹ ضرور پڑھتا ہوں پر وقت کی کمی کے باعث کچھ لکھ نہیں پاتا۔ جون کا شمارہ 28 تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ اس بار شہرِ خیال میں صدارت کی کرسی پر شاہد جہانگیر شاہد براجمان تھے۔ اور شاہد صاحب نے کراچی کے پرانے دنوں کی جو یادیں بتائیں تو ہم ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ پتا نہیں کب شہرِ قائد پھر سے زندہ ہو گا؟ سدرہ بانو ناگوری کا اظہارِ خیال بہت اچھا لگا۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ! آپ جو مسئلہ اٹھا رہی ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ یہ کبھی درست ہو سکے گا، ایک تو پہلے ہی ہم لوگ تعلیم کی کمی کی وجہ سے مار کھائے ہوئے ہیں، اور دوسری طرف یہ حال کہ اسکولوں کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ سب کچھ دیکھنے کے باوجود حکومتِ وقت مکمل اختیارات کے بعد بھی کچھ نہیں کر رہی تو پھر قلم سے احتجاج کرنے والوں کی اہمیت کہاں رہ جاتی۔ سچ بیتیاں شائع کرنے کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے اگر اس میں اور اضافہ کر دیا جائے تو اور اچھی بات ہے۔ پہلی سچ بیتی موت و حیات نے تو واقعی دکھی کر دیا۔ کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں رہتے ہیں۔ اعترافِ گناہ بھی بہت اچھی رہی جو ہمیں بروقت توبہ کرنے کی نصیحت کر رہی ہے۔ کیونکہ ہم جان بوجھ کے ایسا کرتے ہیں۔ خطا نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ باقی فلمی الف لیلۂ، وہ کون تھے، ترکی نمی دانم، تتلیاں اور خاص طور پر منظر امام کی تحریر جون بہت پسند آئی۔ آخر میں تمام دوستوں کو سلام۔''

☆ محمد عارف قریشی، فرنیچر مارکیٹ، بھکر سے لکھتے ہیں ''سرگزشت کے خطا نمبر کے لیے ایک سچ بیانی ''خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم'' ارسال ہے۔ یہ ایک ایسی خاتون کی کہانی ہے جو آج سے کچھ عرصہ پیشتر مقامی گرلز کالج میں لیکچرار رہ چکی ہیں۔ انہوں نے مجھ پر جس انداز میں اعتماد کا اظہار کیا، اس کا تقاضہ تھا کہ ان کے تلخ تجربے کو عام تو ضرور کیا جائے لیکن اس کے نام اور مقام بدل دیے جائیں، سو میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ میں نے یہ کہانی ان کی زبانی بیان کی ہے، شاید اس سے کوئی سبق حاصل کر سکے۔ (آپ کی تحریر پڑھنے کے لیے بورڈ کے حوالے کر دی ہے، فیصلہ وہی کریں گے)''

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے ''قبل از وقت پرچے کی آمد اور حیران کرنے کا سلسلہ جاری ہے اب یہ روایت قائم رہنا چاہیے۔ محفل میں نئے دوستوں کی شمولیت خوشی کا باعث ہے اور قارئین اب کھل کر بات کرنے لگے ہیں اور معلومات کا تبادلہ بھی جاری ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس کالم کو وسعت دی جائے تا کہ کہانی کے کرداروں پر تفصیل سے بحث ہو سکے اور اپنا نقطۂ نظر صحیح طور پر بیان کیا جا سکے۔ (آٹھ صفحے سے زیادہ کرنا ممکن نہیں) ترکی نمی دانم، میں کبھی دلچسپ پیرائے بھی آ جاتے ہیں لیکن آپس کی بے موقع گفتگو بے زار بھی کر دیتی ہے۔ بھوک، انفرادی واقعات پر مشتمل ہے، شیر گل کو بے بس کر کے شکار کیا گیا۔ اس کا اثر دیر تک رہے گا۔ ''سراب'' لہو گرم رکھنے کا بہانہ ثابت ہو رہا ہے۔ جہاں تک میرا تجزیہ ہے قارئین میں مقبولیت کے لحاظ سے نمبر ون جا رہا ہے اور آنے والے دنوں میں ہم ایسی ہی امید رکھتے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ''موت یا حیات'' انوکھے واقعات اور نئے انکشافات لیے ہوئے ہے۔ استادی، یعنی لوگوں کو بیوقوف بنانے کے کئی اصول گر ہیں بلکہ جب تک یہ باتیں عام ہوں گی تب تک نئی ایجادات ہو چکی ہوں گی۔ یعنی جب تک لالچی موجود ہیں دھوکا دینے والوں کا روزگار چلتا رہے گا۔ اندھی سوچ، میں کسی حد تک قصور پیروں کے پاس مسائل لے کر جانے والوں کا ہوتا ہے لیکن جو کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اس کا ذہن بناتے ہیں کئی جھوٹی کرامات سنا کر پہلے سے پریشان حال کی قوتِ فیصلہ اپنے تابع کر لیتے ہیں تب اسے دوسرا راستہ نظر نہیں آتا یوں آستانے کی رونق بنی رہتی ہے۔ ان دیکھا سودا، میں اشرف کی زیادتی ہے لیکن آج کل اولاد کی خودسری والدین کے بس کا سودا نہیں ہے لیکن جو کردار عظمیٰ نے ادا کیا باعثِ حیرانگی ہے۔ اشرف کو مسترد کرنے والی بات مجھے اچھی نہیں لگی اب گھر کی بات گھر میں رہ جاتی تو بہتر تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قربانیاں ہمیشہ عورت ذات نے دی ہیں لیکن یہاں اس روایت کی نفی ہوئی ہے۔ ناقابلِ تلافی، پڑھ کر ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ کوئی فیصلہ کرنے یا رائے دینے سے قاصر ہے۔ ہمارے قصبے میں میلہ بابا سیون شاہ کے موقع پر یہ منظر کئی بار دیکھا لیکن سب کھیل کا حصہ سمجھتے رہے۔ یہ جان لینے کی حد تک خطرناک ہے کبھی سوچا نہ تھا۔ اب تو سب پڑھ کر دل کانپ رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے قریب نہیں جانا چاہیے کیونکہ ان سے دشمنی تو کیا دوستی بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہم مجرم، ہمارے جذبات کو جھنجوڑنے اور احساسات کو جگانے کی اچھی کوشش ہے لیکن ہمارے ذہن اور وجود پر بے حسی کی ایسی چادر پڑی ہے کہ خود غرضی نے ہمیں اپنی ذات تک محدود کر دیا ہے۔ جھونپڑے میں بے وقت بچہ کیوں رو رہا ہے اب ہم نے دھیان دینا چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تک کبھی نہیں سوچا کہ روزانہ خوش رہنے اور مسکرانے والا دوست آج خلافِ معمول خاموش کیوں ہے۔ بس ذرا اس وقت سے جب یہ ساری کیفیات ہمیں حصار میں لے لیں گی۔ انجام ہوں، نے جرم و سزا کی ہنگامہ آرائی بھلا دی ہے۔ تسلسل اور روانی نے ایسا جکڑا کہ دل کی تیز اور بے ترتیب دھڑکنوں کا احساس تک نہ رہا۔''

☆چوہدری مدثر حسین کا خلوص نامہ اوپیڈ زکھاریاں سے "اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مذہب اسلام امن وسلامتی کا دینا ہے۔ اسلام عقیدہ توحید، انسانی وحدت، مساوات، رواداری، محبت واخوت اور اتحاد کی تعلیمات دیتا ہے۔ قرآن میں اکثر جگہ انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اسلام میں رواداری کی اس حد تک اہمیت ہے کہ کسی کو زبردستی اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لیے خون خرابہ بھی نہ کیا جائے۔ قرآن میں ارشاد ہے۔ "دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔" خون خرابہ تو دور کی بات ہے، اسلام تو سخت کلامی سے بھی منع کرتا ہے۔ ارشاد ہے "اور تم ان کو بھی گالی نہ دو جن کو یہ کافر لوگ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں۔" اسلام چاہتا ہے کہ انسانیت کی قدر ہو اور ایک متحد اور رواداری پر مشتمل معاشرہ وجود میں آئے۔ اسی لیے مشترکہ معاملات پر اہل کتاب کو اتحاد کی دعوت دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسے کلمہ پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔" قرآن کی تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ اسلام انتہا پسندی کا مذہب نہیں ہے اور نہ ہی دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے قتل کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن میں کسی بھی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے نفرت کرو، انہیں کمتر سمجھو یا انہیں قتل کرو۔ بلکہ اسلام مساوات انسانی پر یقین رکھتا ہے اور انسانیت کی مجموعی فلاح چاہتا ہے۔ کچھ لوگ اسلام کو ایک انتہا پسند مذہب ظاہر کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرآن کی ان تعلیمات پر غور کرنا چاہیے کہ اسلام کیا چاہتا ہے تعصب انگیزی اور انتہا پسند بن کر رب کی رضا حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ رب کی رضا انسانیت سے محبت میں ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کے پیروکاروں کو چاہیے کہ انسانیت سے محبت کو اپنا شعار بنائیں۔ یقیناً اللہ ان سے راضی ہوگا۔ (حضور پرچے پر تبصرہ کرنا کیوں بھول گئے)"

☆منشی محمد عزیز مئے کی وہاڑی سے آمد "محترم معراج رسول صاحب کے اداریے کا کیا کہنا۔ وہ ہمارے دل کی بات بڑے خوبصورت الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں تندرستی اور عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین۔ پیر صاحب کے عنوان کے تحت جناب حسن نظامی کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب صدارت کی کرسی آپ کو مبارک ہو۔ یہ خط یقیناً 2014 کی پہلی ششماہی کا بھرپور اور بہترین خط کہا جا سکتا ہے۔ ایک بار پھر مبارکباد۔ سدرہ بانو ناگوری، آپ کی ہم نام ہماری منی سی بہن ہیں۔ شبانہ حنیف! آپ پلیز جلد از جلد میرے ساتھ رابطہ کریں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس اور وکیل قرۃ العین زینب! آپ دونوں خواتین جلد از جلد بذریعہ خط اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ بشریٰ افضل جی! آپ لیٹ ہو گئیں۔ ویری بیڈ، میرے پاس مئی 2005 کا شمارہ موجود ہے جس میں رانا ادیب کی "جوالامکھی" شائع ہوئی تھی۔ شاہد جہانگیر شاہد، سدرہ بانو ناگوری، رانا سجاد، رانا شاہد اور آفتاب احمد نصیر کے خطوط بھرپور تھے۔ مقابلہ بیت بازی میں نوشین اکرام، نازش تبسم صوفی، ناہید صفدر اور افضل کریم کا انتخاب پسند آیا۔ چراغ ادب کے مرزا اثر لکھنوی کا کام میرے لیے بالکل نیا ہے جس کے لیے مجھے خود پہ حیرت ہے۔ (حیرت ہے، اتنے بڑے شاعر سے آپ ناواقف تھے) شکریہ ڈاکٹر ساجد امجد اور پیارے سرگزشت، وہ کون تھے، مجاز آزاد زبردست تحریر ڈھونڈ لائے۔ حیرت ہوتی اتنا پرانا جہاز دیکھ کر۔ تتلیاں میں تین بہنوں کی قربانی بالآخر رنگ لائی۔ موت یا حیات میں شائلہ شمی کی ہمت وحوصلہ قابل تعریف ہے۔ حیات اور اس کے خاندان کی سوچ انتہائی سطحی اور گھٹیا تھی۔ جسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ استادی، بھکاریوں کے جدید ترین طریقوں میں سے ایک طریقے سے متعلق تھی کہ کیسے یہ لوگ، دوسروں کو لوٹتے ہیں۔ ان دیکھا سودا، میں عظمیٰ کی سوچ بہت اچھی تھی۔ اشرف کو یہ سزا ملنا ہی چاہیے تھی۔ امیمہ سلیم ناقابل تلافی کے عنوان کے تحت حیرت انگیز اور ناقابل یقین تحریر لائی ہیں۔ ہم مجرم، عزیز صفی پوری کی اچھی کوشش ہے۔ یقیناً اگر ہم اپنا احتساب کریں تو تسلیم کریں گے کہ ہم بھی کہیں نہ کہیں مجرم ضرور ہیں۔ نہ خدا ملا، نام نہاد مسلمان کی کہانی جسے پڑھ کر افضل پہ شدید غصہ آیا جولین کی سوچ بہت اچھی تھی جو اس نے افضل کو ٹھکرا دیا۔ انجام ہوس، بڑے بڑے جاگیرداروں کے لڑائی جھگڑوں کے متعلق داستان تھی اور سب سے آخر میں شہر خیال کے دوستوں کے نام خصوصی التجا۔ دوستو! آیئے مل کر تمام امت مسلمہ کے لیے اور خصوصاً بالخصوص شہر خیال کے مرحومین باسی خالد حسن چیمہ آف پنڈی بھٹیاں اور ثمینہ شاہد آف شاہ کوٹ کی مغفرت کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھ کر مرحومین کے لیے دعا کریں کہ ایک دوست کا دوسرے مرحوم دوست کے لیے اس سے بڑا اور کوئی تحفہ نہیں ہے۔"

☆اعجاز حسین لدھیانہ کی تشریف آوری کچا کھوہ خانیوال سے "معراج رسول صاحب کی پُرمغز باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں اتر جانے والی تھیں، اللہ ہمارے حال پہ رحم فرمائے واقعی دل دکھتا ہے! یہ کیسا دور آ گیا ہے کہ وہ جوان جو ہماری حفاظت کی خاطر اپنا دن رات کا سکون غارت کرتے ہیں، اپنے پیاروں کو چھوڑ کے آتے ہیں، بس وطن کی محبت اور فرض کی بجا آوری کے لیے صحراؤں سے لے کر سمندروں اور برفیلے موسموں کی سختیاں برداشت کرتے ہیں تاکہ ہم لوگ چین وآرام سے رہیں مگر تف ہے ان بے ضمیر لوگوں پہ جو ان اداروں پہ چوٹ کرتے ہیں اور تنقید کرتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ یہی بہادران وطن ہیں جن کی وجہ سے پیارا پاکستان قائم ودائم ہے۔ لہٰذا گزارش ہے کہ ایسے عاقبت نااندیش خود کو درست کر لیں اس سے پہلے کہ وقت کی مہلت ختم ہو جائے اور وطن کی لکھی جانے والی تاریخ میں ان کو غداران وطن کا نام دیا جائے۔ کیونکہ محب وطن اپنے محافظوں پہ انگلیاں نہیں اٹھاتے، خدارا ہوش کے ناخن لیں۔ یک تمی ہمیشہ کی طرح شاندار تھی کیونکہ نابغہ روزگار ہستیاں روز روز نہیں پیدا ہوتیں۔ شاہد جہانگیر شاہد کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ سعید احمد آپ بھی ماشاء اللہ اچھے تبصرے کے ساتھ موجود ہیں خوش رہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ہمیشہ کی طرح شاندار تحریر کے ساتھ نظر آئے۔ چراغ ادب بہترین تحریر ہے۔ اثر لکھنوی جیسے لوگ ادب کے ماتھے کا جھومر ہیں اور یہ سرگزشت کا ہی خاصہ ہے کہ یہ ہمارے علم میں اضافہ کرتا ہے اور ایسی ہستیوں سے روشناس کراتا ہے جن کی باتیں اور تحریریں ہمارے لیے مشعل راہ

کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ کون تھے بھی اچھی تحریر تھی، کم از کم آج کا انسان یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ وہ ہی صرف ترقی کی معراج کو پہنچا ہے، کیونکہ اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانی قومیں بھی اپنے زمانے کے حساب سے انتہائی ترقی یافتہ تھیں۔ قلمی الف لیلیٰ کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ انتہائی شاندار۔ تین تتلیاں کی وہ تینوں بہنیں اپنے ملک کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے لیے انقلاب کا استعارہ ہیں۔ ترکی ٹمی والم ہلی سفیان آفاقی کی شاندار کوشش ہے۔ جرم وفا اچھی تحریر ہے۔ یہ کیسا ستم ہے کہ وطن سے محبت ہی قابل سزا گردانی گئی اور وطن سے محبت کے جرم میں گولی ماردی گئی۔ پی آئی اے کے افسراعلیٰ کی تحریر الوداع بھی اچھی ہے۔ محمد ایاز راہی کی بھوک بھی اچھی کاوش ہے۔ سراب حسب سابق شاندار ہے۔ موت وحیات عمدہ کہانی ہے، یہ تحریر ہمارے قول وفعل کے تضاد کو ظاہر کرتی ہے۔ استادی زبردست تحریر ہے۔ اندھی سوچ معاشرہ کی کوتاہ نظری کو بھاتی تحریر ہے۔ بعض اوقات کوئی کام مشیت ایزدی کی وجہ سے تاخیر کا شکار ہوتا ہے مگر ہم اپنی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے اسے بندش، جادو ٹونے کا نام دے دیتے ہیں، خدارا ہوش کے ناخن لیں کیونکہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ وقت مقررہ پہ وہ کام ہو جاتا ہے۔ ان دیکھا سودا ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے والدین کبھی بھی ہمارے لیے غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا کبھی بھی والدین کے فیصلوں کو چٹکیوں میں مت اڑائیں کیونکہ والدین خود تکلیف برداشت کر سکتے ہیں مگر اولاد کو دکھ نہیں دے سکتے۔ ناقابل تلافی سبق آموز تحریر ہے۔ کبھی بھی کسی چیز کو ایسی جگہ تک نہ لے جائیں کہ جہاں سے واپسی ناممکن ہو جائے۔ ہم مجرم ہیں ایک ناقابل فراموش تحریر ہے۔ اگر ہم بھی ایسے ہی سوچنے لگیں اور سوچیں کہ اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ دھرتی جنت کا نمونہ بن جائے اور کوئی بھی اپنے آپ کو مجرم نہ گردانے۔"

☆انجم فاروق ساحلی کا خلوص نامہ لاہور سے "اُمید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر وعافیت ہوں گے۔ خونی شیرنیاں اور سنگم پور کا آدم خور کو لکھنے میں جزئیات نگاری کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی طرف جلد از جلد توجہ فرمادیجیے۔ اکرم الہ آبادی والے مضمون کو مختصر کر کے دے دیا جائے جتنا بھی آ جائے (عزیز جان، سرگزشت کے مضامین آدھے ادھورے نہیں ہوتے بھرپور ہونا ضروری ہے) ایک صاحب وقار الرحمٰن ہیں۔ ان سے جہانزیب چوک مسجد کے باہر مغرب کے وقت روزانہ ہی ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ آپ کو اپنی کوئی تحریر بھی بھیج چکے ہیں۔ وہ بھی کہانی کے بارے میں استفسار کرتے رہتے ہیں۔ (ان کی کہانی کے بارے میں فون پر بتا دیا ہے)"

☆طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے "پیارے پیارے دوستو اور ادارے والو! دو مہینے سے میں B.List ہو رہی ہوں۔ بہت دکھ ہوتا ہے جب اپنے اتنے پیارے اور دل سے پڑھنے والے رسالے میں نام بلیک لسٹ میں آ جاتا ہے۔ میں اپنے خاندان بلکہ پوری چارسدہ کی واحد نمائندہ ہوں اور شاید آپ کے چند زیادہ عمر والوں کے صف میں شامل ہوں۔ آئندہ خیال رکھیں کہ میں اپنے ہی دوستوں کے سنگ شہر خیال میں نظر آ جاؤں۔ یہ دھمکی نہیں میری سرگزشت سے کھلے دل سے محبت ہے، اپنا حق مانگتی ہوں۔ خدارا اے میرے ملک کے بے حس حکمرانوں اور بے حس بڑوں، اس ملک کو قائداعظم اور علامہ اقبال کے اس خواب کو اندھیروں سے نکالو۔ اس کو سپر طاقت نہیں تو کم از کم اپنے اسلامی دوست ملک ترکی کے ہی برابر لے آؤ۔ لیڈیز کو عزت اور احترام دو تاکہ وہ بھی اس ملک کی ترقی میں اپنے حصے کا کام سرانجام دیں اور بہن اور بیٹیوں سے التماس ہے کہ خدارا اپنی حرمت اور عزتوں کی حفاظت کرو۔ بے شک خوشبو بنو لیکن مردوں کے لیے کھلونا نہ بنو۔ رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی بنو۔ پرنکا چوپڑہ، کترینہ کپور یا صوفیہ لورین نہ بنو۔ تم ماں بھی ہو، بیٹی بھی ہو، بہن بھی ہو اور بیوی بھی ہو۔ اس معاشرے کی مضبوط ستون بنو۔ انکل ہمیں اپنی آرمی پر فخر ہے۔ میرے دادا نے خود عالمی جنگ دوم میں حصہ لیا۔ اب میرے ایک چچا کا بیٹا آرمی میں ہے اور میرا بھائی بھی آرمی میں ڈاکٹر ہے۔ میں تو آرمی میں جانے کے لیے آج تک سسک رہی ہوں۔ انکل آپ کا یہ شعر میری سوچ اور شخصیت کی عکاسی کرتا ہے "میں جھکا ہوں نہ کبھی اور نہ جھکوں گا تا دم۔ یہ الگ بات ہے کہ تکتی رہے تہمت مجھ پر۔ پاکستان اس 14 اگست کو 67 سال کا ہو جائے گا لیکن لگتا ہے ابھی بھی بچہ ہے، اماں میں بھول گئی کہ 60 سال کے بعد انسان پھر بچہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس 67 سال کے بچے کو دوڑنے والے پاؤں عطا کرے۔ آمین ثم آمین۔ میں شاید کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی۔ خون بھی تو پٹھانوں والا ہے غیرت اور انا پرست احساس بھی بہت ہوں۔ اپنے لوگوں پر غصہ بھی بہت آتا ہے لیکن ان سے یعنی تمام پاکستانیوں سے محبت بہت ہے۔ اب شاہد بھائی آپ ہی بتائیں کہ آپ مجھ سے کتنے بڑے ہیں۔ میرے خیال میں تو آپ 50 اور 60 کے درمیان ہیں۔ شاہد بھائی آپ کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اور شوکت رحمان خٹک جو سرگزشت کے چمکتے ستارے ہیں ہمیشہ ہمیں اپنی تحریروں سے نوازتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ رحمان خٹک صاحب کو صحت عطا کرے (آمین۔) پلیز شاہد جہانگیر بھائی کسی دن میرے کالج ایف سی ڈبلیو پشاور آ کر مجھے اپنے درشن کرا دیں۔ آپ نے شاہد بھائی بالکل صحیح فرمایا ہے کہ سرگزشت جاسوسی اور سسپنس پشاور شہر میں سب سے آخر میں پہنچتے ہیں۔ قرۃ العین سسٹر رقیہ بیگم پر تو مجھے حد سے زیادہ غصہ آیا۔ یہ شوہر ذات گرگٹ کی نسل سے ہیں۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ یہ ایمان نہیں حماقت ہے۔ انور عباس شاہ بھائی لگتا ہے آپ کو بھی یہ ناچیز پسند نہیں آئی، کوئی بات نہیں بھائی۔ رانا سجاد بھائی آپ کی اس ناچیز بہن کے ساتھ بھی دو مہینے سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اللہ سمجھے ان ڈاک والوں سے۔ رانا سجاد بھائی آخر ہو نا مرد۔ شوبی کا لڑکیوں سے ملنا، الزام لڑکیوں پر لگانا ناانصافی ہے بھائی خیال رکھیے۔ واقعی سجاد بھائی خط نمبر کے لیے اگست تک انتظار کرنا پڑے گا۔ کیا کہیں سجاد بھائی آپ کے یہ صنف کرخت 80 فیصد تک مذہب جیسے خودغرض اور بے غیرت ہیں۔ لیکن کیا کہیں پھر بھی وہی ایک نعرہ کہ مرد کو خدا نے افضل ہونے کا درجہ دیا ہے تو پھر یہ افضل پن دکھاتے ہیں۔ مرد خود کچھ بھی کرے لیکن اپنے ذہنی گندگی کو صاف نہیں کر سکتا۔ عمران جونانی بھائی شکریہ کہ آپ نے میری اور درینہ

نفیس کی غیر حاضری کو محسوس کیا۔ واہ عمران بھائی آپ نے کہانی بھی لکھی ہے۔ رانا شاہد نے تو آتے ہی الفاظ کے چھکے چوکے لگادیے۔ بڑا زبردست اور معاشرے پہ تنقید والا خط تھا۔ رانا شاہد بھائی ہم کچھ بھی کہتے رہیں نہ حکمرانوں پر اثر اور نہ عوام پر اثر ہوتا ہے۔ احمد خان توحیدی بھی اس ناچیز کو بھی یاد کیا کریں۔ سٹی کی تاریخ کا پتا تو چل گیا بھائی۔ نشی عزیز مٹے کیا آپ کا قلم میرا نام لکھنے سے ڈرتا ہے۔ خطوط میں شاہد صاحب، اعجاز حسین، سدرہ بانو ناگوری، ڈاکٹر قرۃ العین، انور عباس شاہ، رانا سجاد، محمد عمران جونانی، رانا محمد شاہد، آفتاب احمد نصیر اشرفی، احمد توحیدی اور نشی عزیز مٹے کے خطوط شاندار رہے۔ نئے لوگوں اور مختصر خطوط بھی اوسط رہے۔ بشریٰ افضل، ڈاکٹر روبینہ نفیس، تفسیر عباس بابر، راجا ثاقب نواز ثاقب اور محمد جاوید سرکانی غیر حاضر تھے۔“

☆ بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے ”انکل کی کھری کھری باتیں سنیں اور صاحب ایک سطی سرگزشت میں سمندر میں کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ رسالہ دیر سے ملا تو ویٹنگ لسٹ میں ہی جگہ ملی تھی۔ شاہد جہانگیر کا خاصا لمبا تبصرہ تھا۔ مکمل اور جامع تبصرے کو یہ اعزاز تو حاصل ہونا ہی تھا۔ کیا خوب تبصرہ تھا۔ ہاں جی کرسی صدارت مبارک ہو۔ سعید احمد چانگ ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ۔ سدرہ بانو ناگوری کا تجزیہ اچھا تھا۔ ڈاکٹر قرۃ العین ہمیں یاد رکھا شکریہ۔ رانا سجاد آپ کو کیوں اتنا شکوہ ہے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی یاد کرنے کے انوکھے انداز پر شکریہ ویسے ہمارے شہر کے بارے میں بڑی معلومات رکھتے ہیں۔ اپنے تبصرے میں بڑی اچھی اور پیاری باتیں کی ہیں۔ موت یا حیات، میں شائلہ اگر سحرش کی بات پہلے ہی سن لیتی تو اتنی پریشانیوں میں نہ پڑتی اور نہ ہی ایک پاؤں سے محروم ہوتی زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے! استادی چوروں نے آج کل بڑے طریقے نکالے ہوئے ہیں چوری کرنے کے۔ ”نہ خدا ملا“ یہ ہمارے مسلمان ہیں ان کے عقیدے اتنے کچے ہیں کہ غیر مسلم لڑکی کی خاطر اپنا مذہب بدل لیا۔ جولین نے بہت اچھا کیا افضل کو ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ اس کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔ اسے کہتے ہیں گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اب اس کو چاہیے کہ دوبارہ مسلمان ہو جائے اور خدا سے گڑگڑا کر معافی مانگے! اتنا ہی پڑھ سکی ہوں وقت کی کمی کے باعث کیونکہ جاسوسی ڈائجسٹ بھی اس کے ساتھ آیا تھا ہاں انکل میں نے کہانی ارسال کی تھی۔ (تھوڑا انتظار کرلیں)“

☆ محمد عمران جونانی کی خیال آرائی کراچی سے ”جب یہ شمارہ ہاتھوں میں ہوگا تو رمضان قریب ہوگا۔ مہنگائی لوڈشیڈنگ اور بدامنی کے باوجود اس کی برکتوں کو سمیٹنے کی سعی نہایت ضروری ہے۔ کسی کی طرف سے تحفہ ملنا خاص تعلق کی نشانی ہے اللہ پاک ہماری کوتاہیوں کے باوجود رمضان تک پہنچا رہے ہیں تو ضرور رحمت مغفرت اور جہنم سے خلاصی ہمارا مقصد بنے گی بس ذرا سی ہمت درکار ہے۔ جون کے شمارے میں حسن رزاق کے قلم کی روانی سب پر بھاری ہے۔ انداز میں وہ روانی کہ انسان کھو کر رہ جائے۔ خاص کر آخری کالم میں حیدرآباد دکن کے جوڑے کے تذکرے نے تڑکے کا کام کیا حسن رزاق کے ادبی سفر کے بارے میں بنیادی معلومات مل جائیں تو نوازش ہوگی۔ ان کی کوئی کتاب چھپی ہے کیا؟ (یہ ان کی پہلی تحریر ہے) موت لواحقین کے لیے اداسی کا پیغام لاتی ہے۔ زندگی سے ناتا توڑتے ہوئے اثر لکھنوی اداسی کے ساتھ دنیا سے گئے لیکن زندگی بھرپور رہی، اپنی اور ساتھیوں کی قلمی سیرابی کا خوب سامان کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے روایتی انداز میں اثر صاحب کے ساتھ لکھنوی تہذیب، غالب، میر اقبال اور نظیر وغیرہ سے بھی ضمناً ملاقات کروائی۔ جولائی کا شمارہ بھی شاہد جہانگیر کے لیے اہم ثابت ہوگا کہ کرسی صدارت کی مبارکباد وصول کرتے پائے جائیں گے۔ کراچی اور خاص کر شاہ فیصل کالونی کا تذکرہ پسند آیا۔ اس علاقے کی صورت آج بھی قریب قریب ویسی ہی ہے۔ سعید چاند عرصہ بعد نظر آئے لیکن ملاقات تشنہ ہے جامع تبصرہ کا انتظار رہے گا۔ اعجاز حسین کا سچ بیانیوں پر بھرپور تبصرہ شہر خیال کی جان ہے یہ ناراضگی آپ ہی کا خاصہ ہے۔ سدرہ بانو کی آمد جیسے مقبول بازی لے گئی لہجے میں اپنائیت اور خلوص ہے۔ دارالحکومت سے قرۃ العین نے علم میں اضافہ کیا۔ بات بالکل ٹھیک ہے کہ اسکول والے داخلہ فیس لے کر بچے کو دیتے کیا ہیں۔ انور عباس نے بھی اچھا لکھا۔ بشریٰ افضال ملک رحمت، قیصر عباس، احسان سحر، محمد سلیم قیصر اور مصری بہن طاہرہ گلزار اتنے سارے جانے پہچانے نام تاخیر کی فہرست میں دیکھ کر افسوس ہوا اور رانا سجاد کی رجنی کانت اور سلطان راہی والی بات میں دم ہے۔ رانا شاہد تم نے تو کمال کر دیا، بہت خوب لکھا خوش رہیے۔ آفتاب نعیم نے قابل تقلید انداز میں تمام تحریریں ایک ایک سطر میں نمٹائیں۔ شبانہ حنیف کا شاید یہ پہلا خط ہے لیکن بے ساختہ انداز گہرے مطالعہ کی غمازی کرتا ہے۔ اسلم عالم نے بحیرۂ عرب کے دوسرے کنارے سے ای میل بھیجی محبت کی بات ہے۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے ”پچھلے دنوں شاہد حسین آرٹسٹ کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں پڑھا تھا اب ان کی کیسی طبیعت ہے (ابھی بھی علیل ہیں) شہر خیال کی محفل میں پہنچے تو شاہد جہانگیر اپنی خوشنوائی کے ساتھ پہلے نمبر پر رہے۔ شاہد بھائی آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے اپنی زندگی کے خوبصورت دور کو اتنے بھرپور طریقے سے گزارا۔ صدارت کی کرسی حاصل کرنے پر ہماری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔ سعید احمد چانگ کچھ خفا خفا سے نظر آئے۔ سعید بھائی اتنے گلے شکوے اچھے نہیں ہوتے آپ تو محفل کے چاند ہیں، ہم آپ کو بھلا کیسے بھول سکتے ہیں۔ نشی عزیز مٹے ویلڈن آپ کے اتنے خوبصورت تبصرے کو پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ رانا سجاد آپ نے بھی اچھا لکھا لیکن آپ کی ناامیدی بالکل اچھی نہیں لگی، ہم تو بالکل خیریت سے ہیں لیکن شہر قائد ہائے یہ کیا پوچھ لیا آپ نے، ہم تو ایک عرصہ ہوا اس شہر میں تبدیلی کے منتظر ہیں۔ روز دل دکھانے والی خبریں سننے کو ملتی ہیں لگتا ہے موت کے فرشتے نے اس شہر میں ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ بس دعا کریں کہ شہر قائد کا یہ محبتوں کا اور سکون کا گہوارہ بن جائے۔ چراغ ادب، ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے ادب کے اس روشن ستارے کا احوال نامہ پڑھا۔ یہ کیسی رسم دنیا ہے کہ جب تک وہ چراغ روشن رہا لوگ اس کے گرد پروانے کی

طرح منڈلاتے رہے لیکن جب اس چراغ کی روشنی بجھی تو کسی نے اس کی موت پر آنا بھی پسند نہ کیا۔ ابن کبیر نے ہمیشہ کی طرح اچھا لکھا۔ تتلی بہنوں کی عظیم قربانی واقعی داد و تحسین کے قابل ہے کہ جنہوں نے اپنے صبر اور خاموشی کے ہتھیار سے ظالم آمر کو اس کے حقیقی انجام تک پہنچادیا۔ ایاز راہی کی بھوک پڑھ کر تو قحط کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا، وہاں تو روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے معصوم بچے مرتے ہیں لیکن یہ کیسی نفس کی بھوک تھی کہ پیٹ بھر کر بھی شیر گل خود کو موت کے دلدل سے نہ بچا سکا۔ فلمی الف لیلہ میں پاکستانی فنکار چھائے رہے۔ انکل کی زبانی یہ جان کر حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ ہندوستان ہماری 60 سے زائد فلموں کو نقل کر چکا ہے یعنی ہماری فلم انڈسٹری بھی اتنی مضبوط تھی کہ بھارت کی نمبرون انڈسٹری اس سے دامن نہ بچا سکی۔ یہ سب آپ جیسے باہمت لوگوں کی مرہون منت ہی تھا۔ پہلی سچ بیانی میں حیات احمد نے اپنی حیات کے ساتھ بڑا ہی ظلم کیا۔ نہ خدا ملا میں افضل وکیٹر کے دین کے بارے میں خیالات جان کر بہت برا لگا۔ اعتراف گناہ میں ظفر صاحب تو اپنی اولاد کی بدولت گناہ کا اعتراف کرکے سزا سے بچ گئے اور ان کو ملنے والی اجنبی کی سزا بھی جلد ختم ہو جائے اولاد واقعی آزمائش ہوتی ہے جو انسان کو جھکنے پر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات بکنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ آخر میں تمام اہل سرگزشت کو رمضان المبارک کی بہت بہت مبارکباد۔“

☆ منظر علی خان، لاہور سے لکھتے ہیں ”اثر لکھنوی کے حالات زندگی متاثر کن تھے۔ ایسے انسان دوست لوگ خال خال ہی ملتے ہیں۔ جار آزاد کی وہ کون سے تحریر میں اسرار تھے زیادہ پُراسرار نہ تھے۔ (وہ معلوماتی تحریر تھی پُراسرار کیسے سمجھ لیا، کیا صرف عنوان پڑھا تھا؟) تتلیاں مناسب ترجمہ تھا۔ من ترکی کی دائم اچھا سیاحت نامہ ہے۔ 2 جون 625ء حضرت امام حسین کی پیدائش 3 شعبان 4 ہجری درست اور معلوماتی ہے۔ کیا 10 اکتوبر 680ء اور ہجری میں مطابقت ہے یا نہیں کل نظریے۔ الوداع اچھی تحریر ہے امریکی ماحول کی عکاسی ہے۔ بھوک کا افسانوی رنگ آزاد معاشرہ اور بندشوں میں مقید جذبات کا جائزہ نفسیاتی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔ سراب کو خوب کھینچا جا رہا ہے مگر کاشف زبیر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جدید معلومات سے پُرتحریر اپنی مثال آپ ہے۔ بچی آپ بیتیوں میں موت یا حیات معاشرہ کی خود غرضی اور سفاکی کو پیش کرتی ہے۔ استادی، لوگوں کو نفسیاتی طور پر مفلوج کرنے اور فائدہ حاصل کرنے کی کہانی ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ ناقابل تلافی، شعبدہ بازی کا کرشمہ تھی مگر خیال کی طاقت سے بہت کچھ ممکن ہے۔ پاکیزگی نیک نیتی کے ساتھ ساتھ خیال کی قوت شامل ہو جائے تو ناممکن کام بھی ممکن ہو جاتے ہیں۔ اور سحر القول واقعات پیش آنا ممکن ہے۔ ہم مجرم، معاشرتی برائیوں میں ہر شخص کے شامل ہونے کی بات ہے معاشرہ درست ہو جائے تو جرائم کم ہو جائے۔ نہ خدا ملا، ان لوگوں کی کہانی ہے جو عقیدہ اور یقین کے بارے میں متذبذب ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے مذہب چھوڑنا ان کے لیے آسان ہے۔ ورنہ دینی ماحول بدلنا آسان نہیں ہوتا۔ انجام ہوس، بالآخر کھانے کا سودا ہے کہ اپنی اغراض کی خاطر لوگ رشتے ناتے تک چھوڑ کر جان کے دشمن بن جاتے ہیں مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔ اعتراف گناہ دراصل اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ذرہ برابر نیکی کا بھی اجر ملے گا۔“

☆ انور عباس شاہ کا مکتوب دریاپور بھکر سے ”سب سے پہلے آپ کی صاف ستھری اور کھری کھری باتیں پڑھیں۔ واقعی کچھ مٹھی بھر عناصر ہماری عسکری قوت پر بے جا و الزام تراشی کر رہے ہیں اور مزید یہ کہ بجائے شرمندہ ہوتے کے سرخرو ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ خدایا پاکستان کو ان جیسے نام نہاد محب وطنوں سے محفوظ رکھے آمین۔ شاہد جہانگیر کے تبصرے نے تو دل موہ لیا، ایسا شاندار خط اور تبصرہ پڑھنے کا ہمیں پہلے کبھی موقع نہیں ملا۔ ماضی کے یادگار واقعات و لمحات اور فلمی دنیا کے متعلق ان کی معلومات کسی خزانے سے کم نہ تھیں۔ لگتا ہے ایک اور آفاقی صاحب ہمیں مل گئے ہیں شاہد جہانگیر خدا آپ کو سلامت رکھے لکھتے رہیے، ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ سعید احمد صاحب دل چھوٹا نہ کریں جلوہ افروز ہوتے رہا کریں۔ خط شائع نہ ہونا یہ سب محکمہ ڈاک کی کارستانی ہوتی ہے جس کی وجہ سے خط یا تو بروقت متعلقہ پتے پر پہنچتا ہی نہیں یا پھر راستے ہی میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ موبائل فون اور ای میل جیسی سہولیات میسر آ جانے سے محکمہ ڈاک پر بوجھ کافی کم ہو گیا ہے۔ محکمہ ڈاک کی کارکردگی کی ایک اور عمدہ مثال اسی مہینے تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط کی ہے۔ یہ ان معروف ہستیوں کے نام تھے جو ہر ماہ پابندی سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ شہر خیال کی زینت بنا کرتے تھے لیکن اس ماہ یعنی جون کے مہینے میں ہم ان کے تبصرے سے محروم رہے۔ اعتراف گناہ کو بے وجہ خاصا طول دے دیا گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہمیں کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ خدا نے اپنے پیارے بندوں کو جیسا بھی بنایا ہے ٹھیک بنایا ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ آج جو کچھ آپ کسی کے ساتھ کر رہے ہیں کل کو آپ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ صفدر صاحب کی تحریر استادی ابتدا میں تو خاصی دلچسپ لگی لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے پول کھلتا گیا۔ کہانی کے آخری لمحات میں تو ایسا لگتا تھا کہ یہ بھی بھتہ خوری کی کوئی قسم ہے کیونکہ موصوف نے ہمیں الٹی میٹم دے دیا ہے اور واضح طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ کسی کو دیں نہ دیں ہمارے بندے کو ضرور کچھ دیں ورنہ آپ کی خیر نہیں۔ میرے خیال میں یہ پیشکش صرف کراچی والوں کے لیے ہے۔ لہٰذا ہوشیار رہیں۔ انجام ہوس بھرپور ایکشن اور دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ نصرت کیسی مہارت اور دلیری کے ساتھ اپنے آپ کو اور شبو کو دشمنوں کے نرغے سے صاف بچا کر لے گیا حالانکہ موت قدم قدم پر ان کا پیچھا کر رہی تھی، ان کی بہادری کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ نہ خدا ملا تحریر تو دلچسپ تھی لیکن افضل نے ایک لڑکی کے پیچھے بنا سوچے سمجھے اپنا مذہب بھی بدلا اور لڑکی نے بھی اسے خوب کھری کھری سنائیں۔ ناقابل تلافی ایک عمدہ تحریر تھی اس کا انجام بہت ہی خوفناک تھا۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ آخر کاشی کو کیا ضرورت تھی اس قدر پنگا لینے کی۔ ان دیکھا سودا، ایک عمدہ اور سبق آموز تحریر تھی۔ اشرف صاحب نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری۔ آخر کار ان کو اپنے کیے کی سزا مل ہی گئی۔ منظر امام کے سلسلے تے خیر سے اپنا آدھا سفر طے کر ہی لیا۔ ابھی آدھا باقی ہے۔ انشاء اللہ یہ بھی بخیر

دخوبی طے ہو جائے گا۔ ترکی نمی دانم میں آفاقی صاحب ہمیں بیٹھے بٹھائے ترکی کی سیر کرا دیتے ہیں۔ موت یا حیات خاصی دکھی تحریر تھی۔ شائلہ شمسی کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ خداوند کریم ان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین)۔ فلمی ایکشن سے بھرپور اپنی سابقہ روایات کی طرح اس بار بھی سراب بازی لے گئی۔ کہانی کے مصنف کو مبارکباد قبول ہو۔ اس کے علاوہ چراغ ادب، وہ کون تھے، تتلیاں اور الوداع بے مثال تحریریں تھیں۔ ان تمام مصنفین کا بہت بہت شکریہ۔ سرگزشت کو رونق بخشنے والی سلسلہ وار تحریر فلمی الف لیلہ اپنی مثال آپ تھی، مزید اس میں گلوکار سلیم رضا کے بارے میں مختصر سے مضمون نے تو اس کو چار چاند لگا دیے۔ سلیم رضا واقعی ایک بے مثال گلوکار تھے۔ ان جیسی مردانہ وجاہت سے بھرپور آواز شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ اسی مضمون کے آخر میں آفاقی صاحب نے لکھا ہے کہ سلیم رضا نے ان کی فلم کنیز کا ایک گانا جس کے بول تھے" دونوں طرف ہے آج برابر لگی ہوئی۔" گایا تھا اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ گانا سلیم رضا نے نہیں بلکہ احمد رشدی نے گایا تھا اور فلم بھی کوئی اور تھی۔ اسی طرح سلیم رضا کی تاریخ وفات 31 نومبر 1984ء بتائی گئی ہے جبکہ نومبر 30 دن کا ہوتا ہے۔ ان کی تاریخ وفات غالباً نومبر 1983 ہے۔ 1983 کو کئی اخبارات نے فنکاروں کی موت کا سال قرار دیا تھا کیونکہ اسی سال کئی عظیم فنکار دنیا سے رخصت ہوئے تھے جیسے روشن آرا بیگم، احمد رشدی، وحید مراد اور سلیم رضا وغیرہ۔ روشن آرا بیگم شاید 1983 کا سورج چڑھنے سے ایک آدھ دن پہلے دنیا سے رخصت ہوئی تھیں۔ اب ہمیں خطا نمبر کا شدت سے انتظار ہے پلیز زیادہ انتظار نہ کروایئے گا۔ علاوہ ازیں اگر ہو سکے تو سرگزشت کے سالگرہ نمبر کے بارے میں بھی سوچئے گا ضرور یعنی جس مہینے سرگزشت کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا اسی مہینے اس کا سالگرہ نمبر نکالیں۔"

☆ ڈاکٹر قرۃ العین کا خط اسلام آباد سے" معراج صاحب کے اداریے سے ہمیں تو 100 فیصد اختلاف ہے مگر ہم اس پر تبصرے سے گریز کریں گے۔ (بات دل میں نہ رکھیں فوراً کہہ دیں) اس سال یعنی 2014 کا ہر شمارہ شاندار ہے اور ہمیں خط لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہد جہانگیر شاہد نے کافی تفصیلی تبصرہ لکھا ہے۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے ملیریا کا مریض ہونے کے باوجود اپنی تعلیم مکمل کی۔ تبصرہ بہت معلوماتی رہا۔ چراغ ادب، وہ کون تھے، بہترین مضامین تھے۔ چراغ ادب تو معلومات کا ایک بیش بہا دریا تھا۔ جبکہ مختار آزاد کا مضمون انتہائی دلچسپ رہا۔ رانا سجاد آپ کو ہماری غائب دماغی پر حیرت ہوئی؟ دراصل آج تک ہم نے کوئی فلم نہیں دیکھی۔ صرف 2 یا 3 پاکستانی فلمیں دیکھی ہوں گی جو عید یا بقرعید پر پی ٹی وی پر لگتی ہیں۔ لیکن پاکستانی فلمی اداکار ہمیں اچھے اچھے سے لگتے ہیں جبکہ بالی ووڈ وغیرہ کے اداکاروں کے بارے میں معلومات زیادہ دیر تک ذہن میں نہیں رہتیں۔ سچ بیانیوں میں سب سے بہترین کہانی اعتراف گناہ تھی۔ یقین جانئے اس نے ہمیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دل آزاری کس قدر بڑا گناہ ہے۔ ناقابل تلافی۔ بہت زبردست کہانی تھی۔ معلوم نہیں کیسے کیسے علوم اور اسرار اس دنیا میں موجود ہیں۔ لگتا ہے پروفیسر صاحب صرف شعبدے سے کام نہیں لے رہے تھے بلکہ جادو کا سہارا بھی لے رہے تھے جبھی تو ان کی بیٹی جان سے گئی۔ افضل منڈے مسیح صاحب، جولین تو آپ کے ہاتھ نہ آسکی۔ ہماری دعا ہے کہ آپ اپنے سچے دین کی طرف پلٹ آئیں۔ اسی میں نجات ہے۔ موت یا حیات، ایک بہت خوبصورت سچ بیانی تھی۔ شائلہ کے سسرال والے بہت ظالم لوگ تھے۔ کتنے آرام سے انہوں نے اس کے قتل کا فیصلہ کیا۔ دیگر کہانیاں بھی پسند آئیں۔ بشریٰ افضل، قیصر عباس خان اور طاہر گلزار کا خط تاخیر کی نظر ہوا۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے سب ساتھی خوش رہیں۔ سلامت رہیں اور ہمارا پیارا سرگزشت دن بدن ترقی کرتا رہے۔"

☆ قیصر عباس خان، بھکر کا نامہ خلوص "اداریہ میں کافی اہم مسئلے پر انکل جی نے روشنی ڈالی کہ جو لوگ الزام تراشی کر رہے ہیں وہ محب وطن پرست نہیں ہیں۔ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے (آمین)، سب سے پہلے اپنا نام تاخیر میں دیکھا۔ بہت افسوس ہوا کیونکہ ڈاک خانے والوں نے آپ تک بارہ دنوں تک خط نہیں پہنچایا لطف ہے ان پر۔ ساتھ ہی کچھ میں آپا بشریٰ افضل، آپا طاہرہ گلزار، نعیم خان گنڈہ پور کا نام بھی تاخیر میں دیکھ کر بہت زیادہ افسوس ہوا کہ میں ان کے تبصروں سے محروم رہا۔ شاہد صاحب، ڈاکٹر صاحبہ، انور شاہ، رانا محمد شاہد اشرفی، توحیدی اور خشی محمد عزیز نے جاندار تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ کچھ نئے لوگ بھی تھے۔ بہت اچھے تبصرے تھے۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ آج میں اقرار کرتا ہوں کہ پورا پرچا ہی مکمل معلوماتی ہے اور ساتھ یہ کہ میں شہر خیال کے بعد سچ بیانیاں پڑھتا ہوں پھر اپنی ناقص رائے دیتا ہوں۔ بعد میں باقی پرچے کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد، ابن کبیر، علی سفیان آفاقی، منظر امام، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اور باقی سب بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میں پہلے پڑھتا ہوں تب ان پر رائے نہیں دیتا ہوں ان کے تمام مضامین یا تحریریں کافی معلوماتی ہوتی ہیں، اور سوانح حیات میں ڈاکٹر صاحب جو بھی لکھتے ہیں کمال لکھتے ہیں۔ بس ایک خواہش ہے کہ ڈاکٹر ساجد امجد سے ملوں۔ تصویر دیکھوں یا ان کے بارے میں مکمل پڑھوں۔ پیدائش سے تعلیم تک اور آگے اب تک کے تمام حالات۔ ڈاکٹر انور سدید کی طرح وہ بھی بہت اچھی تحریر کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں ڈاکٹر انور سدید کو الگ سے پڑھتا ہوں۔ دوسری بات 1991 والا شمارہ اب ہمیں کیسے ملے گا۔ اگر کسی بھائی یا بہن کے پاس ہو تو پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں میں پہلی سچ بیانی مکمل فلم اسٹوری لگتی اور میں حیران ہوں کہ اپنی بیوی کو دنیا کی دولت کی خاطر قربان کر دینا اور جھوٹی انا کی خاطر کسی کی زندگی کو ختم کر دینا بہت بری بات ہے اچھا کیا کہ اسٹرنگ کو موذ ابرے کو سزا ملی اور اللہ تعالیٰ نے ننھی بہن کو بچا لیا۔ ان دیکھا سودا اشرف صاحب کے ساتھ ٹھیک ہوا۔ عظمیٰ نے اچھا فیصلہ کیا تھا کوئی اتنا بھی غرور نہ کرے کہ جو لفظ پڑھنے کے بعد وہ سب کو حقیر جانے۔ اگر رل لیتا تو کوئی حرج تھا۔ اعتراف گناہ، مجھے حیرانی ہوتی ہے جب مسلمان اللہ سے محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور اس کی مخلوق کو اس وجہ سے تنگ کرتے ہیں جو کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ آزمائش ہوتی ہے اور ساتھ یہ بھول جاتے ہیں ان کو بنانے والا وہی ہے جس نے ان معذوروں کو پیدا کیا۔ میری دعا ہے پاکپتن والے دوست کو اشفاق مل جائے اور ان

کو معافی مل جائے اور ظفر صاحب کو بہت بہت مبارک باد کہ توبہ قبول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے نعمت اور رحمت سے نوازا۔ اللہ ان کو صدا خوش رکھے (آمین)۔ محمد عامر ساحل، ڈاکٹر روبینہ نفیس سے اپیل ہے وہ حاضر ہوں کافی عرصہ ہوا ان سے ملے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی رحمت سے سرگزشت کو کامیابی دے اس کی ٹیم کو خوشیاں دے آمین۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے لاہور سے لکھا ہے" منظر امام صاحب کے جون کا کچا چٹھا کھلا دیکھ ہمیں یاد آیا کہ تین جون کو دنیا میں ہماری آمد نے بھی کچھ نہ کچھ تو ہلچل مچائی ہوگی۔ ہماری محب وطن فوج کی کردار کشی کرنے والے وقتی ہلچل مچانے کے بعد اب اپنا کچا چٹھا کھلا دیکھ کر معافی تلافی پر اتر آئے ہیں۔ اس موضوع پر آپ کی خیال آفرینی کو سیلوٹ ہے۔ پیر صاحب کی کرامات سے محظوظ ہوتے ہوئے شہر خیال کی محفل میں داخل ہوئے تو مریدین سرگزشت کو دیکھا جن کی نیازمندیاں عروج پر تھیں۔ مسند خلافت پر شاہد جہانگیر شاہد شاعر اعظم کی کرامت نما کوشش پر تعریفوں کے نذرانے وصول کرنے میں معروف تھے۔ رانا محمد شاہد نواب بیٹی سے حلوہ نہ اٹھائے جانے پر افسردہ تھے۔ ان ہی جیسے نیم مستفید لوگوں کے لیے ہم نے رواں سال فروری کے شمارے میں مدلل رائے دی تھی کہ سرگزشت اپنی ادبی کراماتوں کا نظارہ وقتاً فوقتاً دہراتا رہے۔ چراغ ادب کا ادب اگر جوش اور مجاز بھی کرتے تو اچھا تھا۔ کلام سنانے کا خبط دوست کی عادت سمجھ کر نبھایا جا سکتا تھا۔ لاطینی امریکا کی تین تتلیاں لائق تحسین تھیں۔ ترکی نمی دانم حسب معمول اور فلمی الف لیلہ میں خشونت سنگھ کا تذکرہ سرپرائز تھا۔ جرم وفا اس لیے منفرد تھی کہ بٹلر ہمارا پسندیدہ موضوع ہے۔ محمد ایاز راہی نے بھوک کے ذریعے نفسانی بھوک کے جذبات کی ترجمانی کے لیے جن الفاظ کا چناؤ کیا ہے ہمیں عصمت چغتائی اور منٹو یاد آ گئے۔ سراب پر تنقیدی جائزہ اگلے ماہ۔ تعریف تو ہوتی ہی رہتی ہے کیڑے نکالنے کے لیے کچھ تیاری تو چاہیے۔ سچ بیانی موت یا حیات مکمل فکشن تھی اس لیے وہ تاثر نہ چھوڑ سکی جو سرورق کی سچ بیانی کا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اندھا سودا اور ناقابل تلافی اچھی تھیں۔ مختار آزاد کی کھوج" وہ کون تھے" جون کے شمارے کی سب سے خوبصورت تحریر تھی۔ ڈاکٹر خالد ستارہ کا یہ انکشاف کہ بائیس سو سال قبل یا اس سے بہت پہلے انسان نے ہوائی جہاز کی ایجاد کر لی تھی اور شاید اسے استعمال بھی کیا تھا اور انہوں نے یہ نظریہ ایک لکڑی کے ماڈل جہاز پر تحقیق کر کے قائم کیا ہے۔ ان کے نظریہ کو عالم مغرب نے بہت پذیرائی بخشی اور بحیثیت مسلمان ہمیں بھی ان کے نظریے میں سقم نظر نہیں آتا البتہ جس جہاز کے ماڈل کو دیکھ کر ان کی تحقیق شروع ہوئی ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ ماڈل جہاز قبل مسیح کی کسی آخری صدی کے ماہر اور ذہین بڑھئی کے ذہنی تخیل کا کارنامہ ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں کے بڑھئی اور کمہار حضرات بعض عجیب وغریب چیزیں یا کھلونے بنا کر بچوں کو متوجہ کرتے ہیں یا ہمارا کوئی ماہر آرکیٹکٹ کوئی عالیشان بلڈنگ بنانے کے لیے اپنے تخیل کو پہلے ماڈل کی شکل میں تیار کرتا ہے کیونکہ بائیس سو سال قبل کا زمانہ حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کا زمانہ تھا لہٰذا اس وقت اور اس سے پہلے کی قریب ترین صدیوں میں ایسا ہونا ناممکن تھا کیونکہ ترقی جدیدیت کی مرہونِ منت ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے چھ سو سال بعد کا عرصہ یعنی حضور پاک کی آمد اور اس کے بعد کا بارہ سو سال کا عرصہ بھی ایسی کسی ایجاد کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کروڑوں سال پرانا انسان کیا اچانک دو سو سال سے ہی اتنا ذہین ہوا ہے کہ اتنی ترقی کر لی۔ اس کے لیے ہمیں قرآن پاک میں موجود چند واقعات کو دیکھنا ہوگا جو یہ بتاتے ہیں کہ انسان کبھی بھی اپنی ذہانت سے غافل نہیں رہا۔ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں انسانی ہاتھوں کی بنائی گئی تین منزلہ کشتی اپنے وسیع وعریض ہونے کی وجہ سے آج کے بڑے سے بڑے بحری جہاز کو شرما دیتی ہے۔ حضرت ہودؑ کی قوم عاد تباہ ہی اس لیے کر دی گئی کہ بڑے بڑے ستونوں والی فلک بوس عمارتیں بنانے سے ان کو منع فرمایا گیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے دور کے اہرام مصر اور حنوط شدہ لاشوں کی ممیاں آج کی سائنس کے لیے چیلنج بنی ہوئی ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے ایک وزیر نے ہزاروں میل دور سے ملکہ سبا کا شاہی تخت چند لمحوں میں دربار میں حاضر کر دیا تھا جبکہ ایسا کرنے سے جن بھی قاصر تھے۔ ان چند واقعات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ موجودہ ترقی جو صرف دو صدیوں کی مرہونِ منت ہے، سے کروڑوں سال پہلے انسان نے غفلت میں گزار دیے ہوں گے۔ دو صدیاں قبل کے ہمارے اجداد پسماندہ تھے چند صدیوں کے بعد ہم پسماندہ کہلائے جا رہے ہوں گے۔ جب چند صدیوں کی کرشمہ سازیوں کا یہ عالم ہے تو بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی اتنی ہی تعداد میں قوموں نے لاکھوں کروڑوں سالوں میں کچھ نہ کیا ہو۔ کس پیغمبر کی کس قوم پر کس وجہ سے کیا عذاب نازل کیا گیا ان میں سے چند کا ذکر قرآن پاک میں ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ شرک اور بت پرستی کے بعد ان کے نابود ہونے کی وجہ ان کی دیگر سرگرمیاں بھی تھیں اور وہ کئی موجودہ ترقی تو شرک اور بت پرستی، آج بھی عروج پر ہے اور جس قسم کی ترقی اور جدیدیت کا اہم حصہ ہیں وہ بھی نافرمانیوں کی طویل فہرست ہے۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے گھر گھر اور بچے بچے کے ہاتھوں میں وہ سب کچھ ہے جو خدا کی نافرمانی کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسے میں صرف ہوائی جہاز کی جدیدیت دیکھنے کی بجائے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم سچے امتی کہلا سکیں کیونکہ اس میں ہماری نجات ہے ورنہ ہونی تو ہو کر رہتی ہے اور اس مرتبہ جو ہوگا وہ آخری مرتبہ ہوگا۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

عدنان مرزا، اویس الحسن، نادر شاہ، کراچی۔ افتخار بیگ، حیدرآباد۔ نسیم احمد، رانا امداد حسین، محمد صالح، نوشین بٹ، لاہور۔ غضنفر علی خان، شیخوپورہ۔ دانیال انجم، بھکر۔ ذیشان اکمل، کوٹ ادو۔ فرمان مزمل، تھرپارکر۔ انعام الدین، میرپورخاص۔ قرۃ العین، ملتان۔ احمد خان، نوشہرہ۔ مصطفیٰ صدیقی، ہالہ۔ محمد امجد نسیم (العین) یو اے ای۔

ڈاکٹر ساجد امجد

ایک عام سا بچہ حالات کو اپنے لیے سازگار کرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اس نے سعئ مسلسل کے ذریعہ وہ مقام حاصل کیا کہ لوگ اس کی پرستش کرنے پر مجبور ہوئے۔ آج بھی لوگ اسے پوجتے ہیں کیونکہ اس نے ملک وملت کے وقار کز پوری دنیا میں بلند سے بلند کیا۔ اس نے افیون کے نشے میں پڑی رہنے والی قوم کو جگایا۔ ترقی کے لیے ایک سمت سُجھائی، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوم جسے حقیر ترین سمجھا جاتا تھا وہ سب سے آگے نکل گئی۔ اس کی ترقی سے یورپ وامریکا کے صنعت کار تک خوفزدہ ہیں

اس رہنما کی داستانِ زیست جس نے سوئی ہوئی قوم کو جگایا

ایسا نہیں تھا کہ فاقوں نے گھر دیکھ لیا ہو بس اتنا ہوا تھا کہ تقدیر سونے کا چمچ کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ وہ پیدا ہوا تو جڑی بوٹیوں سے نکالے ہوئے رس سے اس کے ہونٹوں کو تر کردیا گیا۔ خوشی کسے نہیں ہوتی یہاں بھی خوشی نے ڈیرے ڈالے تھے لیکن اس خوشی میں یہ احساس بھی شامل تھا کہ یہ بچہ اب وہ شان وشوکت نہیں دیکھ سکے گا جو کبھی اس گھرانے کی پہچان ہوا کرتی تھی۔

یہ گھرانا چین کے مشرقی ساحلی علاقے کے صوبے چیانگ سو کی آن کاؤنٹی کے نوابوں میں سے تھا جو اب اِدبار وفلاکت کا شکار ہوچکا تھا۔ کبھی جو تھا اب وہ نہیں تھا۔

ماں کے لیے فقیر اور نواب دونوں برابر ہوتے ہیں۔ یہ بچہ تو فقیر نواب تھا۔ وہ مفلس پیدا ہوا تھا لیکن گھرانا تو نوابوں کا تھا۔ ماں نے اچھے وقتوں کے چند بیش قیمت کپڑوں کو کاٹ کر اس کے لیے نئے کپڑے بنالیے تھے جو اسے پہنا دیے گئے تاکہ آنے والوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اسے معمولی کپڑے پہنائے گئے ہیں۔

اس کے باپ نے اس کے لیے نام کا پہلے ہی انتخاب کرلیا تھا۔ چوائن لائی جسے سب پیار سے چو کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ بچہ مستقبل میں چین کا وزیراعظم بنے گا۔

کئی دن بعد اس کے باپ نے ایک پرانی ڈائری میں اس کی تاریخ پیدائش 5 مارچ 1898ء درج کی۔ چو کی پیدائش کی خوشی چند روز برقرار رہی پھر سب کچھ پہلے کی طرح چلنے لگا۔ اس کے والد ادنیٰ سے ایک افسر تھے۔ ان کی آمدنی سے گھر کے مصارف پورے نہیں ہورہے تھے۔ خوش رہنے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا اور پھر وہی گھر کی مالی الجھنیں۔

یہ بھی غنیمت تھا مگر اس خاندان کو ایک بڑے حادثے کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اس روز چو کے والد گھر آئے تو سخت گھبرائے ہوئے تھے بلکہ اگر کوئی غور سے دیکھتا تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔

”چوائی کان کی طبیعت بہت خراب ہے بس یوں سمجھو کہ وہ آخری سانسیں لے رہا ہے۔“ انھوں نے اپنے بھائی کے متعلق بتایا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو وہ صرف بیس سال کا ہوا ہے۔"

"موت کسی کی عمر نہیں دیکھتی۔ بس تم جلدی چلو اسے دیکھنا ہے تو دیکھ لو۔"

چو کے والد کے چار بھائی تھے۔ چوائی کان سب سے چھوٹا تھا۔ شادی کو صرف ایک سال ہوا تھا۔ کوئی اولاد بھی نہیں تھی کہ زندگی اس کا ساتھ چھوڑنے کو تیار ہو گئی۔

چو کی والدہ جلدی جلدی تیار ہوئی۔ وہ وہاں پہنچی تو چو کا چچا زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کی بیوہ اس کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی۔ خاندان جمع تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ یہ موت ہی ایسی تھی۔ 21 سال کی بیوہ کو اب تنہا زندگی گزارنی تھی۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ چو دودھ پی کر سو چکا تھا کہ اندھیرے میں چوشاؤ کانگ (چوائن لائی کے والد) کی آواز سنائی دی۔

"تم چوائی کان کی بیوہ کی حالت دیکھ رہی ہو؟"

"بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ اس کی یہ حالت نہ ہو گی تو کیا ہو گی۔" چو کی ماں نے کہا۔

"اسے اس حالت سے باہر لانا اب ہماری ذمے داری ہے۔"

"ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے شوہر کا بدل تو کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا علاج اب بھی ہے کہ اس کا دھیان بٹایا جائے۔ اگر کوئی بچہ گھر میں ہوتا تو وہ بہل جاتی مگر اب تو وہ بالکل اکیلی ہے۔"

"ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس کی اولاد ہوتی تو وہ بہل جاتی۔"

"ایک بات کہوں؟" انہوں نے بیوی کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"کہیے، میں سن رہی ہوں۔"

"اگر ہم اپنے چوائن لائی کو اس کی گود میں ڈال دیں تو کیا وہ بہل نہیں جائے گی؟"

"وہ تو بہل جائے گی لیکن میرا کیا ہو گا۔ چو ابھی ایک ہی سال کا تو ہے۔"

"وہ تم سے الگ نہیں ہو گا۔ وہ صرف اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ تم بھی اس کے پاس ہی تو رہو گی۔"

"کچھ بھی ہو، میں اپنے بچے کی دیکھ بھال خود کروں گی۔"

"تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ ایک نیکی ہے جو تم کرو گی۔"

"کچھ بھی ہو جائے میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔"

اس کے بعد دونوں میاں بیوی میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ چوشاؤ کانگ کو معلوم تھا کہ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے جو وہ منوانا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی بیوی تیار نہیں ہوئی تو یہ ایک فطری بات ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔

چو کی ماں چپ ہو گئی تھی سوئی نہیں تھی۔ اس کا ذہن اس پیش کش پر برابر غور کر رہا تھا۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی اور پھر نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

صبح ہوئی اور دونوں ناشتے کے لیے بیٹھے تو دونوں ہی چپ تھے جیسے ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہوں۔ چو کی ماں تھوڑی تھوڑی دیر بعد شوہر کی طرف دیکھ لیتی تھی اور پھر اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"آپ نے رات کو جو کچھ کہا تھا......"

"ہاں کہا تھا لیکن پھر سوچا کہ میرا فیصلہ ٹھیک نہیں۔ کسی کو خوش رکھنے کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔"

"آپ کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ ہمیں اپنا بچہ چوائی کان کے سپرد کر دینا چاہیے۔ شاید اس طرح اس بے چاری کا کچھ دکھ دور ہو۔" چوشاؤ کانگ اتنے خوش ہوئے کہ ناشتے سے اٹھ گئے۔

"مجھے یقین تھا کہ تم جب سوچو گی تو اس نتیجے پر ضرور پہنچو گی۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم یہ فریضہ ادا کرنے جا رہے ہیں۔"

چوشاؤ کانگ دیکھ رہے تھے کہ ان کی بیوی نے یہ فیصلہ کر تو لیا ہے لیکن چہرے پر ملال کی پرچھائیاں بھی ہیں۔ "اس بے چاری کو دکھ تو ہو رہا ہو گا۔" انہوں نے سوچا۔

"فکر مت کرو، میں بہت جلد تمہارے گھر کو بچوں سے بھر دوں گا پھر دیکھنا تمہیں چو کی یاد بھی نہیں آئے گی۔"

چوشاؤ کانگ کی بیوی اس مذاق پر ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔

دونوں جلدی جلدی تیار ہوئے اور چوائی کان کی بیوہ کے پاس پہنچ گئے۔ اس کی عمر ابھی صرف اکیس سال تھی اور اس پر یہ حادثہ ٹوٹ پڑا تھا۔ ابھی اسے کچھ معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ دونوں کس خاص مقصد کے تحت آئے ہیں۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ ان کی آمد معمول کی آمد ہے۔ وہ چو کو گود میں لے کر بیٹھ گئی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"ہے کیسا شریر، مجھے دیکھ کر مسکرائے جا رہا ہے۔"

"ابھی ایک سال کا ہے لیکن تم سے مانوس ہو گیا ہے۔" چوشاؤ نے کہا۔

"اسے تو میرے پاس چھوڑ دیں، ٹھیک کر دوں گی اسے۔" اس نے چو کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ آج سے تم بھی اس کی ماں ہو۔ اسے اپنے ہی پاس رکھو۔"

"ارے نہیں، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ جس کی اولاد ہوتی ہے اسی کے پاس اچھی لگتی ہے۔"

"کیا یہ تمہاری اولاد نہیں ہے؟ تم اس کی دیکھ بھال کرو، تربیت کرو۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اس کی اچھی تربیت کرو گی۔ یہ اب تمہارے ہی ساتھ رہے گا۔ تمہارا دل بہلا رہے گا۔"

"میں نے تو ایک بات یونہی کہہ دی تھی۔"

"لیکن ہم بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں بلکہ ہم تو آئے ہی اس مقصد سے تھے۔ آج سے چو تمہارا بیٹا ہے۔"

ان دونوں نے جب بہت ضد کی تو وہ اسے گود لینے پر تیار ہو گئی۔

"میں اس کی پرورش اسی طرح کروں گی جس طرح اپنی اولاد کی کرتی۔ اگر ذرا سی بھی کوتاہی ہو تو بے شک آپ اسے میرے پاس سے لے جایئے گا۔"

"ہمیں پوری امید ہے کہ تم ہم سے اچھی اس کی پرورش کرو گی۔"

وہ دونوں وہاں سے اٹھے تو چوشاؤ بہت خوش تھا البتہ چو کی ماں کے چہرے پر ملال کی لکیریں اب بھی موجود تھیں۔ یہ وقتی طور پر بیٹے سے بچھڑنے کا دکھ تھا جو اس کے چہرے پر ابھر آیا تھا۔

"تم اداس کیوں ہوتی ہو؟" چوشاؤ کانگ نے کہا۔ "ہمارا بیٹا تو خوش قسمت ہے۔ سب بچوں کی ایک ماں ہوتی ہے اس کی دو دو مائیں ہیں۔ خوب نخرے اٹھوائے گا۔" چو کی ماں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

چوائن لائی اپنے مرحوم چچا کے گھر میں پلنے لگا۔ اس کی چچی جس کی گود میں وہ پرورش پا رہا تھا نہایت سلیقہ مند اور پڑھی لکھی خاتون تھی۔ اسے کلاسیکی تحریروں اور رومانوی داستانوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ اسے شاعری سے بھی شغف تھا۔ کلاسیکی شعرا کے دیوان اسے تقریباً حفظ تھے۔ وہ ننھے چو کو داستانوں کے اقتباسات سنایا کرتی تھی۔ نظمیں گنگنایا کرتی تھی۔ ان نظموں کو ننھا چو چپکے چپکے دل میں اتارتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چار سال کی عمر میں اسے مقبول و معروف شعرا کی نظمیں زبانی یاد ہو گئیں۔ یہ ایک حیرت ناک بات تھی جو سب کو حیرت میں ڈالے ہوئی تھی۔ اس عمر کے بچے عام طور پر آسان اور بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں یاد کر لیتے ہیں لیکن اسے کلاسیکی شعرا کی نظمیں ازبر تھیں۔

چوشاؤ کانگ اپنے بیٹے کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کو عالم بنائیں گے۔ اب اس کی تربیت انہی خطوط پر ہونے لگی۔ اسے مطالعے کی طرف زیادہ راغب کیا جانے لگا چنانچہ نو سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے چین کے بیش تر قدیم اور مقبول ناول اس کے مطالعے میں آ چکے تھے۔ کلاسیکی تحریروں پر مکمل عبور حاصل کر لیا۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس سے جو ملتا ششدر رہ جاتا۔ کسی ناول کا ذکر ہوتا تو وہ اس کے اقتباسات زبانی سنانے لگتا۔ کسی نظم کا حوالہ دیا جاتا اور وہ پوری نظم سنا دیتا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑا ہو کر بہت بڑا عالم بنے گا۔

اس کی صلاحیتیں اپنی جگہ لیکن اس کے حالات مسلسل بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے والد کی آمدنی گھر کے حالات پورے کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ گھر میں رکھی دورِ امارت کی یادگار چیزیں کم ہونے لگیں۔ چوشاؤ کانگ ان اشیا کو فروخت کر کے یا گروی رکھ کر اخراجات پورے کر رہے تھے۔ عسرت نے پوری طرح پنجے گاڑ لیے تھے۔ یہ چیزیں بھی کب تک ساتھ دیتیں۔ گھر خالی ہو گیا، اب قرض کی نوبت آ گئی۔ قرض ادا کہاں سے ہوتا۔ قرض خواہوں نے گھر کے پھیرے لگانے شروع کر دیے۔ عزیز رشتے داروں نے منہ پھیر لیا۔ وہ گھر جو کبھی مہمانوں سے بھرا رہتا تھا مفلس کی جیب کی طرح خالی ہو گیا۔

دس سالہ چوائن لائی تبدیلی کے ان مناظر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور ان گنت تجربات سے گزر رہا تھا۔ اسے تجربہ ہو رہا تھا کہ برے وقت میں کوئی کسی کا سہارا نہیں بنتا۔ صرف اپنی محنت ہے جو کسی کو اس بھنور سے نکال سکتی ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ ہم اتنے مفلس کیوں ہیں۔ اس کا جواب اس نے یہ تلاش کیا کہ دولت کی غلط تقسیم نے اس کے والد کو مفلس کر دیا۔ اس کے دادا کے زمانے تک گھر میں

دولت کی ریل پیل تھی۔ سماجی ناانصافیوں نے یہ دولت چھین لی۔ سرمایہ دار اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں اور عام آدمی غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ مزدور کو اس کی اجرت اتنی نہیں مل رہی ہے کہ وہ سفید پوشی کی زندگی گزار سکے۔ چند خاندان ہیں جو چین کی دولت پر قابض ہو گئے ہیں۔ جب تک ان سے نجات حاصل نہیں کی جائے گی یہ نظام یونہی چلتا رہے گا اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عوام اقتدار پر قبضہ نہیں کر لیتے۔ اس وقت وہ اتنا ہی سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

اس کے سوچنے سے کیا ہوتا تھا۔ حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ قرض خواہ تقاضوں کے بعد دھمکیوں پر اتر آئے تھے۔ اس ذلت نے اس کی ماں کو بیمار ڈال دیا۔ گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے، علاج ہوتا تو اچھی غذا کہاں سے نصیب ہوتی۔ موت کا داؤ چل گیا۔ اس کی ماں دیکھتے ہی دیکھتے چل بسی۔ وہ ماں کے سرہانے بیٹھ کر رونے سے زیادہ اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا کہ اس کی ماں کیوں مر گئی؟ علاج کے لیے پیسے کیوں نہیں تھے؟ وہی دولت کی غلط تقسیم اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ، جواب اسے مل گیا تھا، لیکن سرمایہ داروں سے کیسے لڑا جا سکتا تھا۔ اقتدار کے ایوانوں میں دراڑیں کیسے ڈالی جا سکتی ہیں۔ وہ ابھی اتنا چھوٹا تھا کہ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ ایک نفرت تھی جو اس کے دل میں پل رہی تھی۔

اس نفرت میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب اس کی دوسری ماں نے بھی محض چند مہینوں کے وقفے سے دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

اب وہ دھوپ میں کھڑا تھا، ننگے پاؤں ننگے سر۔

صحرا کیسا بھی ہو کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی نخلستان مل ہی جاتا ہے۔ اس کے پاؤں جلتے دیکھ کر اس کے تایا کو اس پر رحم آ گیا۔ وہ شمال مشرقی چین کے شہر شن یانگ میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنی محرومیوں اور غصے کو ساتھ لیے اس شہر کی طرف چل دیا۔ اس کے تایا کو اس سے زیادہ اس کی تعلیم کی فکر تھی۔ انہوں نے اسے شن یانگ کے ایک پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا۔ ''چو'' کی دوسری ماں یعنی کہ چچی نے اسے پڑھانے میں نہایت جاں سوزی سے کام لیا تھا۔ وہ کلاسیکی ادب سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ قدیم شعرا کی نظمیں اسے زبانی یاد تھیں۔

معرکتہ الآرا ناول ہمیشہ اس کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ اسی عمر سے آگے کا علم لے کر وہ اسکول پہنچا تو سب سے نمایاں نظر آنے لگا۔ اس کی قابلیت سے اس کے اساتذہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

وہ جن دنوں اسکول پہنچا، اسکول کے یومِ تاسیس منانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اس سلسلے میں مضمون نویسی کا ایک مقابلہ بھی منعقد ہونا تھا۔ اس کے اساتذہ نے اسے بھی اس مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ اس نے یہ دعوت بخوشی قبول کی اور ایک مضمون بہ عنوان ''یومِ تاسیس کے موقع پر چند تاثرات'' لکھا۔

اس مضمون کو اول قرار دیا گیا اور بے حد سراہا گیا کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس کا اسلوبِ تحریر نہایت خوبصورت تھا بلکہ حب الوطنی کے جذبات نے اسے نہایت وقیع بنا دیا تھا۔ اس کا یہ مضمون اتنا شاندار تھا کہ اسے چین کے طلبہ کی بہترین تحریروں کے دو مختلف مجموعوں میں شامل کیا گیا جو شن یانگ کے ایک اشاعت گھر نے شائع کیا تھا۔

وہ اپنے خاندان پر گزرنے والی افتاد سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ گھر سے جن جذبات کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا ان میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے بچوں کے برخلاف وہ اس عمر میں وطن کے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا اگر نظام یہی رہا تو دوسرے خاندانوں کا بھی وہی حال ہوگا جو اس کے خاندان کا ہوا ہے۔ اپنی اس سوچ کا اظہار وہ بار بار کرتا رہتا تھا۔

ایک روز کلاس ہو رہی تھی کہ استاد نے سوال کیا۔

''تم تعلیم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو؟''

استاد کا یہ سوال تمام بچوں سے تھا اور بچے باری باری جواب دے رہے تھے۔

ایک نے کہا ''میں اس لیے تعلیم حاصل کر رہا ہوں کہ اپنے خاندان کے وقار میں اضافہ کر سکوں۔''

دوسرا بولا ''تعلیم کا مقصد ہے معاشرے میں زندگی کے بہتر طور طریقے سیکھنا اور میں تعلیم حاصل کر کے یہی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

ایک طالب علم نے بالکل انوکھا جواب دیا ''میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تعلیم حاصل کر کے اپنے بوڑھے والد کو خوش کروں۔''

استاد کسی کے جواب سے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ''چو'' کی طرف دیکھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

''اب تمہاری باری ہے، تم بتاؤ تمہارے نزدیک تعلیم کا کیا مقصد ہے۔ تم تعلیم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو؟''

''چین کو خوابِ غفلت سے جگانے اور اسے مضبوط بنانے کے لیے۔'' چو کا یہ جواب اتنا شاندار تھا کہ استاد اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''شاباش! تمہارے خیالات نہایت تعمیری ہیں۔ کلاس کے بعد مجھ سے ملنا۔ میں تمہیں کچھ کتابیں دوں گا، ان کتابوں کے مطالعے کے بعد تمہارے شعور میں یقیناً اضافہ ہوگا۔''

اچھی کتابوں کا وہ ہمیشہ شائق رہا تھا۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان کا نام مسٹر کاؤ تھا۔

ان دنوں جنوبی چین کے سیاست داں ڈاکٹر سن یت سین کے جمہوریت پسندانہ تصورات شمالی چین میں بھی عام ہو رہے تھے لیکن سخت پابندیاں تھیں۔ انقلابی لٹریچر کا مطالعہ کرنا، اسے اپنے پاس رکھنا یا اس کی اشاعت قانونی جرم تھا۔ سزا اتنی سخت تھی کہ مجرم کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ مسٹر کاؤ اتنے بیباک تھے کہ کلاس روم میں بھی انتہا پسندانہ باغیانہ تصورات کی تعلیم دیتے تھے۔

مسٹر کاؤ نے ''چو'' کو باغیانہ لٹریچر پڑھنے کے لیے دیا۔

جب وہ یہ لٹریچر پڑھ چکا اور مسٹر کاؤ سے اس پر بحث کی تو وہ اس طالب علم کی معلومات پر حیران رہ گئے۔ انہیں بنا بنایا کامریڈ مل گیا تھا۔ وہ اسے بھروسے کے لائق سمجھ کر سیاسی پمفلٹ لا کر دینے لگے اور بحث کے دوران اسے سمجھانے لگے ''بادشاہت کی جگہ ایک جمہوری حکومت کا قیام کیوں ضروری ہے۔'' ان کی باتیں ''چو'' کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتی چلی گئیں۔ انقلابی نصب العین اس کے شعور میں پختہ ہوتا چلا گیا۔

مسٹر کاؤ کی تربیت نے اسے سیاسی طور پر نہایت پختہ بنا دیا۔ اسے ان سوالوں کا جواب مل گیا جو وہ خود سے کیا کرتا تھا۔ وہ اس نتیجے پر تو پہنچ چکا تھا کہ دولت کی غلط تقسیم تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ لیکن اسے جڑ سے کس طرح اکھاڑا جائے، یہ سوال اپنی جگہ تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ شہنشاہیت کا تختہ الٹ دینا ہی اس کا علاج ہے۔ مارکس کے لٹریچر نے اسے بہت کچھ سکھا دیا۔ ڈاکٹر سن یت سین کے خیالات سے وہ پوری طرح متفق ہو گیا۔ اس کا حل کمیونزم ہے۔ اس نے سوچا اور وہ کمیونزم پر مبنی لٹریچر کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔

اب وہ ایسے لڑکوں کی تلاش میں رہتا تھا جو انقلابی شعور رکھتے تھے۔ ایسے کئی لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو اس کے ایسے ہی ہم جماعت دوست نے اسے چھٹیوں کے چند دن اپنے گھر میں رہنے کی دعوت دی۔ وہ لڑکا شہر کے مضافات میں رہتا تھا اور ایسے علاقے چو کے پسندیدہ تھے۔ اس نے ہامی بھر لی۔

وہ اس کے گھر پہنچا اور اس کے دادا سے ملا تو اسے اور بھی خوشی ہوئی۔ وہ بوڑھے آدمی تھے لیکن گہرا انقلابی شعور رکھتے تھے اور نوجوان کی طرح حوصلہ مند تھے۔ انہیں بھی چو سے مل کر خوشی ہوئی اور کمیونزم کے بارے میں اس کی معلومات دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

یہ مضافاتی علاقہ تھا۔ کھیتوں اور میدانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ روز کہیں نہ کہیں گھومنا ہوتا تھا۔ ایک روز اس کے دوست کے دادا نے کھانے کی میز پر اعلان کیا۔

''کل میں تمہیں اس میدان میں لے کر چلوں گا جہاں جاپان اور روس کے درمیان جنگ لڑی گئی تھی۔ جنگ دوسروں کی تھی اور سرزمین چین کی تھی کیونکہ اس جنگ کا مقصد ہی یہ تھا کہ چین کے شمالی مشرقی صوبوں پر تسلط قائم کیا جائے۔''

''حکومت کیا کر رہی تھی؟''

''بیجنگ کی مجہول حکومت نے غیر ملکی حملہ آوروں کے ہاتھوں اپنے ملک کی پامالی روکنے کے لیے ایک انگلی تک نہیں اٹھائی بلکہ اپنی غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اتنی رعایت چاہی کہ بعض حدود کی نشان دہی کر دی کہ جنگ کا دائرہ اس سے آگے نہ بڑھے۔ انہیں عوام کی قطعی پروا نہیں تھی کہ جنگ کی وجہ سے ان مظلوموں پر کیا گزر رہی ہے۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی تھی۔''

''یہ ذلت صرف اس لیے اٹھانی پڑی کہ حکومت کمزور تھی۔ اگر چین مضبوط ہوتا تو غیروں کی کیا مجال تھی کہ چین کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے۔''

اس معمولی سے واقعے نے چو کے دل میں نہایت غیر معمولی جذبات بیدار کر دیے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چین کو کمزوری اور بدعنوانی کے بھنور سے نکالے گا۔

قدرت اسے ایسے مواقع عطا کرتی جا رہی تھی کہ جو اس کی تربیت میں معاون ثابت ہو رہے تھے۔

جب وہ 1913ء میں پندرہ سال کا ہوا تو اس نے شن یانگ کے پرائمری اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شن یانگ سے تھیان

چلا گیا۔ یہاں آکر اس نے دیکھا کہ سیاسی جوش و خروش عروج پر تھا۔ بیداری کی ایک لہر تھی جو ہر طرف واضح نظر آرہی تھی۔ چو بھی ان نوجوانوں سے دور نہ رہ سکا اور بہت جلد قوم پرستی کے اس نئے دھارے میں شامل ہوگیا۔

تعلیم کی طرف سے وہ کبھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اس نئے تعلیمی ادارے میں آنے کے بعد بھی وہ مستعدی سے تعلیم حاصل کرنے لگا تھا لیکن نصابی کتب پڑھنے کے بعد جتنا موقع ملتا وہ اسے ضائع نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس خالی وقت میں وہ سوشلسٹ لٹریچر پڑھتا۔ ڈاکٹر سن یت سین کی زیرِ نگرانی شائع ہونے والے رسالوں میں پیش کردہ نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں بھی اس کے زیرِ مطالعہ تھیں۔ غیر ملکی تراجم بھی اسے دستیاب ہوتے رہتے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے دنیا بھر میں شائع ہونے والے ترقی پسند ادب سے متعارف ہونے لگا۔

اب وہ اپنے نظریات میں اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ کوئی عملی قدم اٹھانے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم ”برائے احترام محنت و خوش حالی عوام“ کی بنیاد ڈالی اور ”محنت کا احترام“ کے نام سے ایک بلیٹن بھی جاری کیا۔

اب وہ ایک لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ تنظیم ایک ایسا متحرک اور فعال مرکز بن گئی جہاں ساتھی طلبہ ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں مستعار لینے کے لیے آنے لگے۔ ان نوجوانوں نے چھوٹے چھوٹے اجتماعات بھی منعقد کرنے شروع کر دیے جن میں چو اور اس کے ساتھی سامراجی طاقتوں کی طرف سے چین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشوں کو بے نقاب کرتے تھے۔

یہ خطرناک راہ تھی جس پر وہ بے جگری سے چل رہا تھا۔

نان کھائی کا شمار چین کے بہترین اسکولوں میں ہوتا تھا۔ اس لیے طالب علموں کو محنت بھی زیادہ کروائی جاتی تھی۔ ان محنتی طلبہ میں چواین لائی نے بہت جلد اپنی صلاحیتوں کو منوالیا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھا۔ وہ اسکول کے مقرروں کی ٹیم کا ممتاز ترین مقرر تھا۔ وہ بہترین مقرر ثابت ہوا اور اس کی کوششوں سے اس کا اسکول مسلسل دو سال تک دوسرے اسکولوں پر سبقت لیتا رہا۔

اپنی دیگر سرگرمیوں کے باوجود جب وہ چار سال بعد 1917ء میں فارغ التحصیل ہوا تو پوری کلاس میں اس کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اسے اپنے لیے کسی راہ کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ملازمت تلاش کرنا یا کالج میں تعلیم جاری رکھنا۔ اس کے حالات تو ایسے تھے کہ ملازمت تلاش کرنی چاہیے تھی لیکن اس نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اب سوال یہ تھا کہ چین میں یا کسی دوسرے ملک میں؟ دوسرے ملک میں تو کس ملک میں؟ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جاپان میں تعلیم حاصل کرنا بہتر رہے گا۔ اب رقم کا انتظام کرنا تھا۔ اس نے اپنے بعض دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلایا اور ایک خاطر خواہ رقم جمع کرلی۔

اس کا خیال تھا کہ جاپان میں اسے اپنے سوالوں کا جواب ضرور مل جائے گا۔ وہ چین کو بچانے اور اسے نئے سرے سے تعمیر کرنے کے لیے نئے راستے تلاش کرنا چاہتا تھا اور ایسے علوم حاصل کرنے کا خواہش مند تھا جو وطن واپس آنے کے بعد اس کے لیے کارآمد ثابت ہوں۔

وہ انہی خیالوں میں غلطاں جاپان پہنچ گیا لیکن یہاں پہنچ کر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی اور جاپان اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چین کی حدود میں اپنے مقبوضات میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔

اس نے جاپان پہنچتے ہی جاپانی زبان سیکھنی شروع کردی اور بہت جلد اس کی قواعد پر عبور حاصل کرکے اخبارات کے مطالعے پر قادر ہوگیا۔

اب وہ کالج میں داخلے کی تیاری کے لیے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

اسی دوران انقلابِ روس کا واقعہ پیش آگیا اور مزدوروں کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس کی توجہ اپنی کتابوں سے زیادہ اس طرف مبذول ہوگئی۔ وہ امتحان کی تیاری کی بجائے دنیا کے پہلے سوشلسٹ ملک میں ہونے والے واقعات کے بارے میں تمام دستیاب تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا۔

حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ اسے عملی میدان میں بھی کودنا پڑ گیا۔ جاپان میں مقیم چینی طلبہ تک یہ خبر پہنچی کہ توان چھی ژوئی کی حکومت، جاپان کے ہاتھوں چین کی خود مختاری کا سودا کر رہی ہے۔ یہ سننا تھا کہ چینی طلبہ بھڑک اٹھے۔ انہوں نے جاپان کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کردیا۔ جلسوں اور مظاہروں کا انعقاد ہونے لگا۔ چواین لائی ان مظاہروں میں پیش پیش تھا۔ اپنی شعلہ بار تقریروں سے چینی طلبہ کا لہو گرما رہا تھا۔

بیجنگ سے تشویش ناک خبریں آرہی تھیں۔ جنگی سرداروں کی حکومت عوام کے اس مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ جاپان کے ہاتھوں چین کو فروخت کرنے کا عمل ترک کردیا جائے۔ کئی جگہ نہتے عوام پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ چو نے مناسب سمجھا کہ وہ چین واپس جائے اور اس جنگ میں اپنا کردار ادا کرے۔ اس نے اپنا تعلیمی مستقبل داؤ پر لگایا اور وطن کی حفاظت کے لیے عازمِ وطن ہوگیا۔

اس نے یہاں آکر دیکھا کہ چین کے بارے میں جو کچھ سنا تھا حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ ہر شخص مضطرب ہے ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ حالات کی تبدیلی وقت کا سب سے بڑا تقاضا بن چکی تھی۔

4 مئی 1919ء کو وطن پرست طلبہ نے جنگی سرداروں کو اکھاڑ پھینکنے کی تحریک شروع کردی۔ اس تحریک نے بیجنگ میں نفرت اور تشدد کے شعلے بھڑکا دیے۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز غداروں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ایک بڑا احتجاجی جلوس نکالا گیا جس میں طلبہ کے ساتھ ساتھ عوام بھی شامل تھے۔ غصے میں بھرا ہوا یہ ہجوم ایک وزیر کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچا اور اسے نذرِ آتش کردیا۔ پولیس نے اس ہجوم کو منتشر کردیا لیکن طلبہ کو یہ یقین ہوگیا کہ طاقت کے ان مظاہروں سے وہ حکومت کو گرا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے متحد ہونے کی ضرورت ہے۔

بیجنگ کے طلبہ کے اس احتجاج نے قریبی شہر تھیان جن کے طلبہ کے لہو کو بھی گرما دیا۔ وطن پرستانہ سرگرمیاں منظم کرنے کے لیے ایک طلبہ یونین کا قیام عمل میں آگیا۔

اس یونین کے پہلے اجلاس ہی میں یہ فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ یونین کے ترجمان کے طور پر ایک اخبار جاری کیا جائے اور اس کے ذریعے جاگیرداری کے خلاف جدوجہد کے لیے رائے عامہ ہموار کی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ایڈیٹر کسے بنایا جائے۔ یونین کے رہنما ایڈیٹر کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے۔

ان رہنماؤں کو معلوم ہوا کہ چواین لائی واپس آچکا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ اپنی صلاحیتیں منوا چکا تھا۔ ان رہنماؤں کی نظریں اس کی طرف گئیں۔ چو تو وطن واپس آنے کے بعد جدوجہد کے لیے بے چین تھا اس نے فوراً یہ ذمے داری قبول کرلی۔

21 جولائی 1919ء کو تھیان جن اسٹوڈنٹ کا پہلا شمارہ شائع ہوگیا جس کی پیشانی پر یہ حروف جگمگا رہے تھے۔ ”جمہوریت عوام کی، حکومت عوام کے ذریعے، عوام کے لیے۔“

یہ اخبار ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اس میں شامل وطن پرستانہ جذبات پر مبنی مضامین اور سادہ زبان نے اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس کی تعدادِ اشاعت بیس ہزار تک پہنچ گئی اور اسے روزنامے میں تبدیل کردیا گیا۔

”مرد اور عورت کے درمیان مساوات قائم کی جائے اور جاگیردارانہ رسوم کی ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے جن میں وہ جکڑی ہوئی ہیں۔“

ان خیالات کا اظہار ہوتا تھا کہ یہ اخبار عورتوں میں بھی مقبولیت حاصل کرگیا۔ یہ مقبولیت تھیان جن سے نکل کر شمالی چین کے دوسرے علاقوں تک پھیل گئی۔ چواین لائی صرف ایڈیٹر نہیں تھا۔ اس کا قلم ایسے مضامین تخلیق کر رہا تھا جن کا معیار اور تیکھے جملے عوام کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔

”جاگیردارانہ نوکر شاہی کی حکم رانی کے خاتمے کے لیے بھرپور جدوجہد کی جائے۔“

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالبات نے بھی عورتوں کی وطن پرست تنظیم کے نام سے ایک تنظیم قائم کرلی پھر طلبہ کی قوت میں اضافے کے لیے دونوں تنظیمیں ایک دوسرے میں ضم ہوگئیں اور اسے تنظیم بیداری کا نام دیا گیا۔ دونوں جانب سے دس دس اراکین مرکزی تنظیم میں شامل ہوئے۔

ان دس اراکین میں ایک مسلمان لڑکی تنگ ینگ چھاؤ بھی تھی جس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ یہ تنظیم کی سب سے کم عمر رکن تھی۔ اس لڑکی میں کوئی ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ چواین لائی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہ وہ اسے دل دے بیٹھا تھا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ ذاتی مفادات کو اولیت دی جاتی۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے رہے لیکن کبھی کسی جانب سے اظہارِ محبت نہ ہوسکا۔ ویسے وہ اچھے دوست بن گئے۔

چواین لائی کی سفارش پر ایک رسالہ بیداری کے نام سے جاری کیا گیا۔ شاید چواین لائی کا مقصد یہ بھی ہو کہ اس طرح وہ لڑکی اس کے قریب رہے گی لیکن وائے قسمت کہ اس کا صرف ایک شمارہ شائع ہوسکا لیکن اتنے دنوں میں اسے یہ معلوم ہوگیا کہ تنگ ینگ چھاؤ ایک نہایت متاثر کن مقررہ ہے اور بے حد سیاسی سمجھ بوجھ رکھتی ہے۔

جنوری 1920ء میں اس وقت حالات بے حد نازک ہو گئے جب پولیس نے طلبہ تحریک کو کچلنے کی ٹھان لی۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہونے لگیں۔ گرفتار ہونے والوں میں چوائن لائی اور تنگ ینگ چھاؤ بھی تھی۔ جو طلبہ گرفتار نہیں ہو سکے تھے انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ گرفتار ہونے والے طلبہ بھی جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ حکومت خوف زدہ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ شعلے پورے چین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ان کو طلبہ کو رہا کر دیا گیا۔

فرانسیسی حکومت نے ''چینی فرانسیسی تاوان جنگ فنڈ'' سے ایک ورک اسٹڈی پروگرام شروع کیا تھا۔ پارٹی نے چو کو اس پروگرام میں شرکت کی اجازت دے دی۔ وہ تقریباً دو سو طلبہ کے ساتھ بحری جہاز کے ذریعے چین سے فرانس روانہ ہو گیا۔ تنگ ینگ چھاؤ ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر بن گئی۔

وہ فرانس پہنچا تو بائیس سال کا پختہ کار سیاسی نوجوان تھا جو کئی تحریکیں چلانے کے بعد کندن بن چکا تھا۔ اس کی فرانس آمد ان چینی نوجوانوں کے لیے نہایت پُرکشش ثابت ہوئی جو چین سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ چوائن لائی ان سب میں ممتاز تھا کیونکہ اس نے جاپان میں رہ کر مارکسزم اور نئی سودیت ریاست کے بارے میں خاطر خواہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ پکا کمیونسٹ بن چکا تھا۔ فرانس آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مارکسزم کے مطالعے کو جاری رکھے اور چین کے مصائب کا علاج دریافت کرے۔ وہ ان دونوں مقاصد کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مسلسل مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے مارکسی لٹریچر کے مطالعے کے لیے انوکھا طریقہ دریافت کیا تھا۔ وہ خود کو بیڈ روم میں لیٹ کر مطالعہ تک محدود رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتا تھا اس کے عملی نمونے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر پیرس کے مضافاتی علاقے میں رہائش اختیار کی اور فرانسیسی کارخانوں میں ملازمت کی تاکہ مزدوروں کی زندگی کو قریب سے دیکھ سکے، ان کے مسائل سے واقف ہو اور فرانسیسی طرز معاشرت کو جان سکے۔ اس کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہا اور محنت کش طبقے کے مسائل بھی اس کے علم میں آتے رہے۔

ایک روز وہ اپنے ہوٹل میں بیٹھا کسی کتاب کے صفحے الٹ رہا تھا کہ اس کے نام چین سے ایک خط آیا۔ ایسے خطوط آتے ہی رہتے تھے لیکن اس پوسٹ کارڈ کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکا تھا کیونکہ یہ اس شہر سے آیا تھا جہاں تنگ ینگ چھاؤ رہتی تھی۔ اس کا اندازہ درست نکلا، جب خط پڑھنے سے پہلے اس نے یہ دیکھا کہ خط اس کی دوست تنگ ینگ چھاؤ کی جانب سے ہے۔ آخر وہ مجھے فراموش نہیں کر سکی، اس نے دل ہی دل میں کہا اور خط پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ خط بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد دونوں طرف سے خط و کتابت شروع ہو گئی۔ شروع میں ان خطوط کی نوعیت خالص سیاسی تھی لیکن پھر فطری طور پر ان خطوط کی نوعیت بدل گئی اور یہ خطوط نجی معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ بے تکلفی کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کا احساس بھی نمایاں ہونے لگا۔ نتیجے میں خطوط کی تعداد بڑھنے لگی۔ وہ تقریباً روز اسے خط لکھنے لگا۔ اتنے ہی خط اسے موصول ہونے لگے۔

اب شاید وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ تنگ سے وہ شادی کرے گا۔ بعض خطوط میں اس نے یہ اشارے کر بھی دیے تھے۔ وہ ابھی فرانس ہی میں تھا کہ چین کے شہر شنگھائی میں چینی کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ماؤزے تنگ اس کے بانی مندوبین میں سے تھے۔

اس سے بھی بڑا اتفاق یہ ہوا کہ اس سے پہلے چوائن لائی اور یورپ میں مقیم دوسرے چینی مارکسی اپنی ''کمیونسٹ گروپ'' کر چکے تھے۔ اب جبکہ چین میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کمیونسٹ گروپ کے اراکین کو باقاعدہ اراکین کی حیثیت دے دی گئی۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کی پیرس شاخ کو ''یورپی جنرل برانچ'' نام دیا گیا جس کا منتخب سیکریٹری چوائن لائی تھا۔

یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ چوائن لائی کسی عہدے پر فائز ہو اور اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کوئی جریدہ جاری نہ کرے۔ وہ اخبارات کی اہمیت کا قائل تھا اور ایڈیٹر شپ کا تجربہ بھی رکھتا تھا لہٰذا اس نے لاچیونیز (نوجوان) کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ بعد میں اس کا نام ''ریڈ رے'' یعنی سرخ شعاع رکھا گیا۔

یہ اخبار یورپ میں مقیم نوجوانوں کے لیے بے حد اثر آفریں ثابت ہوا۔ چوائن لائی کے مضامین اس میں تواتر سے شائع ہوتے تھے۔

چین میں کمیونسٹ اور وطن پرست خفیہ طور پر طاقت جمع کر رہے تھے کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اپنے نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے کسی قدر تشدد کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ زیرِ زمین رہ کر سرخ فوجیں تیار ہو رہی تھیں۔ ان کی

سرپرستی ڈاکٹر سن یت سین کر رہے تھے۔ آخر 1924ء میں انہوں نے کارکنوں سے اپیل کی کہ چین کو شمال کے جنگی سرداروں کی حکومت سے نجات دلانے کے لیے ''کوانگ چو'' سے شمالی مہم کا آغاز کیا جائے۔

قوم پرست اور کمیونسٹ پارٹی کی فوجیں متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور شمال کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ یہ پہلی انقلابی خانہ جنگی تھی۔

کمیونسٹ پارٹی نے محسوس کیا کہ جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس کارکن کم پڑ رہے ہیں چنانچہ اس نے یورپ میں مقیم اپنے اراکین کو خدمات انجام دینے کے لیے چین واپس بلا لیا۔ چوائن لائی یورپی برانچ کا سیکریٹری تھا لہٰذا اسے بھی آنا پڑا۔ وہ ستمبر 1924ء میں کوانگ چو پہنچ گیا۔ اسی شہر سے انقلابی فوج نے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا۔ انہیں مسلسل کامیابیاں مل رہی تھیں۔ انقلابی فوجیں مشرق کی سمت پیش قدمی کر رہی تھیں اور ایک کے بعد دوسرا شہر قبضے میں آتا جا رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے چوائن لائی کو خفیہ طور پر شنگھائی بھیجنے کے احکام دیے۔ اس نے بھیس بدلا اور شنگھائی پہنچ گیا۔ یہ شہر اب بھی جنگی سردار چھوان فانگ کے قبضے میں تھا۔ چوائن لائی کو یہ مشن سونپا گیا تھا کہ وہاں کے مزدوروں کو ایک مسلح بغاوت کے لیے تیار کریں تاکہ اندر سے بغاوت کر کے اس شہر پر بھی قبضہ کیا جا سکے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس سے پہلے دو بغاوتیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اس تیسری بغاوت کو ہر حال میں کامیاب کرنا تھا۔

چوائن لائی نے شنگھائی پہنچتے ہی جائزہ لینا شروع کیا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے پہلے دو بغاوتیں ناکام ہوئیں۔ جلد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس کا سبب منظم قیادت کا فقدان تھا۔ پچھلی قیادت نے رابطہ مہم ٹھیک طور پر نہیں چلائی جس کی وجہ سے مزدور متحد نہیں ہو سکے۔ انہیں بروقت کارروائیوں کی اطلاع نہیں مل سکی۔ انہیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔

وہ بھیس بدلے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کامریڈ چوائن لائی شنگھائی میں داخل ہو چکا ہے۔ اسے موقع بھی اچھا مل گیا۔ شمالی مہم میں حصہ لینے والی فوجیں شنگھائی کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ حکومت کی تمام تر توجہ ان باغیوں کی طرف تھی۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

جنگی سردار سون چھوان فانگ سخت بدحواس تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ باغیوں نے شنگھائی کے چند مضافات پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنے عہدے داروں کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ ہمیں اندر سے خطرہ نہیں ہے۔ اپنی تمام فوجی طاقت باغیوں کو شنگھائی میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے استعمال کی جائے۔

جس وقت یہ مشورے ہو رہے تھے عین اسی وقت چوائن لائی جس نے فرضی نام کوان شنگ رکھ لیا تھا ایک خفیہ مقام پر مزدور یونینوں کے چند سرگرم رہنماؤں سے مشوروں میں مشغول تھا۔

زیادہ دیر ایک مقام پر ٹھہرنا حفاظتی نقطۂ نگاہ سے مناسب نہیں تھا۔ سب نے طے کیا کہ اب چاؤ شی یان کی قیام گاہ پر چلا جائے۔ وہ چوائن لائی سمیت کل پانچ افراد تھے۔ وہ سب خاموشی سے سیڑھیاں اترے لیکن سڑک پر جانے سے پہلے ان میں سے ایک آگے آ گیا کہ اگر خطرہ ہو تو اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر سکے۔ وہ کچھ دیر بعد سڑک کا ایک چکر لگا کر واپس آ گیا پھر سب لوگ سڑک پر کچھ دور گئے اور پھر دائیں طرف ایک گلی میں مڑ گئے۔ ایک کتا انہیں دیکھ کر بھونکا اور پھر دم دبا کر ایک طرف بھاگ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک مکان تھا جسے جھاڑیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے اندر لوہے کی سیڑھیاں تھیں۔ ان سب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اچھی طرح اطمینان کر لیا اور سیڑھیاں چڑھ گئے۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ ایک رہنما نے دستک دی، اندر سے آواز آئی۔

''کون؟''

''کوان شنگ۔'' رہنما نے چوائن لائی کا فرضی نام لیا۔ دروازہ کھل گیا۔

''سب ٹھیک تو ہے نا؟'' چوائن لائی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''سب ٹھیک ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہے۔'' چاؤ شی یان نے کہا۔ ''ابھی ابھی حکومت کا ایک آدمی میرے پاس سے اٹھ کر گیا ہے۔''

''حکومت کا آدمی یہاں تک آ گیا اور تم کہتے ہو سب خیریت ہے؟''

''خیریت اس لیے ہے کہ وہ اپنا ہی آدمی ہے۔ حکومت کی خبریں پہنچاتا رہتا ہے۔''

"تو یہ بات ہے، تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ اب بتاؤ کیا خبر لایا تھا؟"

"حالات بہت امید افزا ہیں۔ اگر اس وقت ہم کوئی عملی قدم اٹھائیں تو ہمیں کامیابی ہوگی۔ تمام فوجیں بیرونی خطرے کے دفاع کے لیے سرگرم ہیں۔ کسی کو یہ احساس ہی نہیں کہ اندر سے بھی بغاوت ہوسکتی ہے۔ ہمیں اس بے خبری سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

آدھی رات گزر چکی تھی۔ مذاکرات کے کئی دور ہوچکے تھے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ 21 مارچ کو عام ہڑتال کا آغاز کیا جائے گا اور اس کے بعد مسلح قوت کے ذریعے سرکاری دفاتر پر قبضہ کرلیا جائے گا۔

"ساتھیو! شنگھائی سات ڈسٹرکٹوں میں منقسم ہے۔ ہمیں ان پر بہ یک وقت یلغار کرنی ہے۔ ہراول میں پانچ ہزار مزدور ہوں گے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے مزدوروں کا انتخاب کرنا ہوگا جو تجربہ کار ہوں یعنی پچھلی بغاوتوں میں بھی حصہ لے چکے ہوں۔"

بندوقوں کی تعداد ان کے پاس کم تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے چوائن لائی نے ایک تجویز دی جس پر سب نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ چوائن لائی کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

"پیٹرول کے خالی کنستروں میں پٹاخے ڈال کر متواتر دھماکے کیے جائیں۔ اس سے یہ تاثر ملے گا کہ ہم مشین گنوں سے فائرنگ کررہے ہیں۔"

کئی دن تک بڑی رازداری سے تیاری کی جاتی رہی اور پھر مقررہ تاریخ کو اچانک مزدوروں نے کام چھوڑ کر ہڑتال کا آغاز کردیا۔ ہزاروں باغیوں نے اچانک دشمن کو جالیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس اسٹیشنوں اور دوسرے مضبوط ٹھکانوں کا محاصرہ کرلیا۔ تیس گھنٹے تک بے جگری سے لڑتے رہے۔

چوائن لائی کی سربراہی میں یہ بغاوت کامیاب ہوئی۔ حکام ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔ شنگھائی پر قبضہ ہوگیا۔ یہ ایسی کامیابی تھی جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کامیابی نے چوائن لائی کی قائدانہ صلاحیتوں پر مہر ثبت کردی۔ اب اس کی شہرت پوری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ انقلابی بغاوت کے ساتھ اس کا تذکرہ ناگزیر ہوگیا تھا۔

دائیں بازو کا گروہ جیانگ کائی شیک کی فوجوں کی ہمراہی میں چوائن لائی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا جو شنگھائی سے دفعتاً غائب ہوگیا تھا۔

ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا تھا وہ تنگ یںگ چھاؤ سے نہیں مل سکا تھا۔ یہ ایک سال تو چین میں آنے کے بعد کا عرصہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے تنگ سے ملے پانچ سال ہوگئے تھے۔ اس دوران ان کا رابطہ صرف خطوط کے ذریعے تھا۔ ان خطوں کے ذریعے ہی وہ شادی کا فیصلہ کرچکے تھے۔ فرانس سے چین آنے کے بعد اپنے فرائض منصبی انجام دینے میں وہ ایسا مصروف ہوا کہ تنگ سے ملاقات کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن قسمت انہیں ایک جگہ جمع ہی نہیں کررہی تھی۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ طوفان سے بھی لڑنا ہے کشتی بھی بچانی ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس نے تنگ کو کسی جگہ بلایا اور جب تنگ وہ پہنچی حالات کوئی ایسا رخ اختیار کرلیتے کہ چو کو وہاں سے نکلنا پڑ جاتا۔ دونوں آگے پیچھے دوڑ رہے تھے لیکن یک جا نہیں ہو پا رہے تھے۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ تنگ کا تبادلہ کوانگ چو ہوگیا۔ وہ جنوب کی طرف سفر کرتی ہوئی پہلے شنگھائی گئی اور پھر کوانگ چو کی طرف روانہ ہوگئی جہاں اس کا محبوب چو موجود تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے اپنی آمد کی خبر اس تک پہنچادی تھی اور یہ امید کررہی تھی کہ وہ لینے ساحل پر آئے گا۔ چو کو بھی معلوم ہوچکا تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی اس سے ملنے بلکہ اس سے شادی کرنے کوانگ چو پہنچنے والی ہے۔

کوانگ چو میں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ باغی فوجیں مختلف شہروں میں سامراجی طاقتوں سے نبرد آزما تھیں۔ پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ چوائن لائی کو ڈائریکٹر کی حیثیت سے ہیڈکوارٹر میں موجود رہنا ہوتا تھا لیکن پھر بھی کوئی معنوی حیثیت اس سے ملنے نہیں آرہی تھی کہ وہ نظر انداز کردیتا۔ اسے اپنی محبوبہ کو دیکھے ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا تھا۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہورہا تھا۔ دونوں نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ جس شہر میں بھی یک جائی کا موقع ملا وہ شادی کرلیں گے۔ یہ موقع مل گیا۔ تنگ یںگ چھاؤ اپنی ملازمت پر آرہی تھی۔ چوائن لائی وہاں موجود تھا۔

چوائن لائی نے ساحل پر جانے کے لیے وقت نکال لیا تھا لیکن عین وقت پر حالات ایسے ہوگئے کہ اس کے لیے ہیڈکوارٹر سے نکلنا ممکن نہ رہا۔ اس نے جلدی جلدی تنگ کی ایک تصویر تلاش کی اور اپنے نائب کو طلب کیا۔

"چھن کنگ، میں نے تمہیں ایک ذاتی کام سے بلایا ہے بلکہ اگر غور کرو تو یہ بھی پارٹی ہی کا کام ہے۔ میں تمہیں ایک تصویر دے رہا ہوں۔ یہ لڑکی تھیان جن کی پارٹی تنظیم سے وابستہ ہے۔ تم یہ تصویر لے کر گودی پر چلے جاؤ۔ یہ لڑکی کشتی سے اتر کر یقیناً مجھے تلاش کرے گی۔ اس تصویر کی مدد سے اگر تم اسے پہچان سکو تو اسے لے کر میرے پاس چلے آنا اور ہاں اس سے میری طرف سے معذرت بھی کرلینا کہ میں اسے لینے نہ آسکا۔"

چھن کنگ نے وہ تصویر لے لی اور گودی پر پہنچ گیا لیکن پوری کوشش کے باوجود وہ اس تصویر کی مدد سے تنگ کو پہچان نہ سکا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ تصویر پانچ سال پہلے کی تھی شاید اس لیے بھی وہ اس تک نہ پہنچ سکا کہ گودی پر بھیڑ بہت تھی۔

تنگ یہ امید لے کر آئی تھی کہ چو اس کے استقبال کے لیے گودی پر موجود ہوگا۔ وہ بھیڑ میں اسے ڈھونڈتی رہی اور پھر مایوس ہوکر ایک طرف چل دی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے پاس چو کی رہائش گاہ کا پتا موجود ہے۔ اس نے اس پتے کو اچھی طرح ذہن نشین کیا اور وہاں پہنچ گئی۔ وہ ایک چھوٹی سی بلڈنگ تھی جس میں چو نے ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔ یہ کمرا کھلا رہتا تھا تاکہ اگر کوئی دوست اس کی غیر موجودگی میں آئے تو وہ اس کی واپسی تک آرام کرلے۔ اس کے گھر میں تھا ہی کیا جو کوئی چوری کرلیتا۔ تنگ کمرے میں داخل ہوئی اور چو کی بے پروائی پر تعجب کیے بغیر نہ رہ سکی۔ کوئی اس طرح بھی گھر کھلا چھوڑ کر جاتا ہے؟ یہ ایک کمرا بھی سلیقے کا نہیں تھا۔ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ چیزیں بھی کیا چائے بنانے کے کچھ برتن تھے یا کتابیں۔ اس نے آتے ہی کمرے کی جھاڑ پونچھ کی، کتابیں سلیقے سے جمائیں۔ پلنگ کی چادر درست کی اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ وہ اندر سے چٹخنی لگانا نہیں بھولی تھی۔

چوائن لائی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے نائب کو تنگ نہیں مل سکی تو وہ یہ سمجھا کہ تنگ کو کسی وجہ سے آنے میں تاخیر ہوگئی ہے۔

وہ رات گئے گھر واپس آیا اور کمرے کو اندر سے بند پایا تو وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس کا مطلب ہے تنگ پہنچ گئی ہے۔ اندر اس کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔" اس نے دستک دی۔

"باہر کون ہے؟" تنگ نے آواز پہچان لی تھی فوراً دروازہ کھول دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں پھر جیسے تنگ کو ہوش آگیا۔

"پیارے چو، اب اندر بھی آجاؤ یا باہر ہی کھڑے رہو گے۔" چوائن لائی اندر آگیا اور تنگ کو بے اختیار اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"ہم پورے پانچ سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔" چو نے کہا۔

"اور اس امید پر کہ اب ہمیشہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے۔"

"ابھی ہماری مشکلیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ وطن کی آزادی ابھی بہت دور ہے۔ اس کے لیے ہمیں بار بار ایک دوسرے سے جدا ہونا ہوگا۔"

"میں ثابت قدم رہوں گی چو۔" تنگ نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ تم مجھے لینے گودی پر کیوں نہیں آئے جبکہ میں تمہیں اطلاع دے چکی تھی؟"

"میرا ہیڈکوارٹر میں رہنا بہت ضروری تھا۔ برطانوی حکام کے خلاف کوانگ چو اور ہانگ کانگ کے مزدوروں کی ہڑتال کی رہنمائی میرے ذمے رکھی گئی ہے۔ میں تمہیں لینے نہیں آسکتا تھا۔ میں نے اپنے ایک نائب کو تمہارے استقبال کے لیے بھیج دیا تھا لیکن وہ تمہیں ڈھونڈ نہیں سکا۔ شکر ہے میرا ایڈریس تمہارے پاس تھا۔"

"اور یہ کیا بے پروائی ہے، تمہارا کمرا کھلا ہوا تھا۔ تالا ڈالنے کی زحمت بھی نہیں کرتے ہو۔"

"سوچو، اگر تالا ہوتا تو تمہیں کمرے سے باہر بیٹھ کر راہ داری میں میرا انتظار کرنا ہوتا۔ میری اس عادت نے تمہیں بہت بڑی زحمت سے بچالیا۔" اس نے تنگ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

وہ رات انہوں نے باتوں میں گزار دی۔ دوسرے دن اسے تنگ کو شریکِ حیات بنانا تھا۔ یہ باتیں اسی شادی کے گرد گھوم رہی تھیں۔ چوائن لائی اسے نشیب و فراز سمجھا رہا تھا۔ ان خطرات سے آگاہ کررہا تھا جن میں وہ گھرا ہوا تھا۔ تنگ ان خطرات سے لاعلم نہیں تھی۔ اس نے عہد کیا کہ وہ چوائن لائی کو اس کے فرائض سے نہیں روکے گی اور ہر طرح اس کا ساتھ دے گی۔

دوسرے دن چو نے چند پارٹی ساتھیوں کی موجودگی میں تنگ سے شادی کرلی۔

یہ دور نہایت پُرآشوب تھا۔ انقلابیوں کو کئی شہروں

میں تسلط حاصل ہوگیا تھا لیکن حکومت کی فوجیں ان کا برابر پیچھا کر رہی تھیں۔ شادی کو چند روز ہی گزرے تھے کہ چواِئن لائی کو روپوش ہونا پڑا۔ اس نے بھیس بدلا اور کشتی کے ذریعے چوچیانگ گیا اور وہاں سے نان چھانگ روانہ ہوگیا۔ یہ بات اس کے لیے طمانیت کا باعث تھی کہ نان چھانگ کے پبلک سیکورٹی بیورو اس کے قریبی دوست چوتہ تھے جو پانچ سال قبل اس کے ساتھ برلن میں کام کرچکے تھے۔ انہوں نے اسے اپنی ذاتی رہائش گاہ میں ٹھہرالیا جہاں کسی ناپسندیدہ آدمی کی رسائی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے پارٹی کے دوسرے سرگرم اور مخلص اراکین بھی پہنچ گئے اور مختلف جگہوں پر روپوش ہوگئے۔ ان کے خفیہ اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ کئی اجلاسوں کے بعد یہ طے کیا گیا کہ رات کے سناٹے میں بغاوت کا آغاز کردیا جائے۔ بغاوت کے لیے وہ پیشہ ورانہ فوجی تیار کھڑے تھے جو سوویت یونین سے واپس آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے تھے۔ پبلک سیکورٹی دستوں کے ساتھ مل کر ان کی تعداد تیس ہزار ہوگئی تھی۔ انہیں حکومتی دستوں کے مقابلے میں عددی برتری حاصل تھی جن کی تعداد دس ہزار تھی۔ انقلابی فوجوں نے کوانگ چو اور صوبہ کوانگ تونگ کے دوسرے کئی اہم علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئیں لیکن اس بغاوت نے مزدوروں اور کسانوں کی سرخ فوج کو جنم دے دیا جو آیندہ کئی معرکے سر کرنے والی تھی۔

یہ آگ کچھ ٹھنڈی پڑی تو چواِئن لائی پھر کوانگ چو میں اپنی بیوی سے آملا پھر یہ جدائی اور ملاپ ان کی زندگی کا معمول بن گئی۔ جب ان کے درمیان جدائی کا مرحلہ آتا تو ہر بار یہی محسوس ہوتا کہ اب وہ دوبارہ کبھی نہیں مل سکیں گے کیونکہ اچانک گرفتاری یا پھانسی کی سزا مقدر بن چکی تھی۔

یہ جوڑا ان خطرات کا پامردی سے مقابلہ کررہا تھا۔ اب اس شادی کو دو سال ہوچکے تھے۔

شنگھائی کے حالات دگرگوں تھے۔ وہاں کمیونسٹوں کا قبضہ تو ہوگیا تھا لیکن چیانگ کائی شیک کی فوجیں اس قبضے کو چھڑانے کے لیے سرگرم تھیں۔ چواِئن لائی کو ایک مرتبہ پھر شنگھائی جانا پڑا۔ تنگ اس کے ساتھ نہیں جاسکی کیونکہ اس کے ہاں ولادت متوقع تھی۔

سننے میں یہ آرہا تھا کہ قوم پرست رہنما کمیونسٹوں سے معاہدۂ شرکت توڑنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دراصل قوم پرستوں پر مذہبی رہنماؤں کا زیادہ اثر تھا اور کمیونسٹ مذہب کے مقابلے میں انسانیت کو اولیت دیتے تھے۔ پگوڈا میں بیٹھے مذہبی رہنما کے اشارے پر معاہدہ ٹوٹ جاتا تو ایک بڑا خطرہ یہ تھا کہ جنگی سردار کی فوجیں دوبارہ شنگھائی پر قابض ہوجائیں گی۔ اس موقع پر چواِئن لائی کا وہاں ہونا بہت ضروری تھا۔ اسی لیے اسے شنگھائی بھیج دیا گیا۔ تنگ کو ولادت کے بعد شنگھائی روانہ ہونا تھا لیکن پھر ایسا ہوا کہ کوانگ چو کے حالات بگڑنے لگے۔ پارٹی کا حکم ہوا کہ وہ فوری طور پر کوانگ چو چھوڑ دے۔ دو کامریڈ یہ پیغام لے کر اس کے پاس آئے۔ وہ جس حالت میں تھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ سفر کرسکے۔ پارٹی کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ چواِئن لائی شنگھائی میں اس کا منتظر تھا۔ بچے کی ولادت کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے مجبوری کی حالت میں کوئی ایسی دوا کھائی جس سے اس کا حمل ضائع ہوگیا۔

اس کا علاج کرنے والی نرس اور ڈاکٹر کی مدد سے اسے چوری چھپے کوانگ چو سے شنگھائی پہنچا دیا گیا۔ یہ کتنی بڑی قربانی تھی۔ اس فرار کے عوض اسے اپنے بچے سے محروم ہونا پڑا۔

وہ شنگھائی اس حال میں پہنچی کہ اس کی گود اور پیٹ دونوں خالی تھے۔ چواِئن لائی اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کررہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"اگر میں کوانگ چو چھوڑ کر یہاں نہ آگیا ہوتا تو ہم اپنے بچے سے محروم نہ ہوتے۔"

"اس میں تمہارا کیا قصور، غلطی تو میری ہے۔ مجھے اسقاط کے بارے میں پہلے تم سے بات کرلینی چاہیے تھی۔"

"ہاں شاید میں تمہیں روک سکتا۔"

اس وقت چواِئن لائی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ تنگ جو کچھ کر بیٹھی ہے اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ اسے تو اندازہ کئی سال بعد ہوا جب تنگ کے کوئی بچہ نہیں ہوا اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ وہ دونوں بچوں کے شیدائی تھے لیکن وطن کی آزادی میں سرگرم رہنے کا یہ تحفہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کہ وہ زندگی بھر بچے سے محروم رہے۔

شنگھائی کے مزدوروں کو خود اپنے ہی اتحادیوں کی دغابازی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے جنگی سرداروں کی حکومت پر تو قبضہ کرلیا لیکن قوم پرستوں نے ان سے معاہدہ توڑ کر ان پر حملے شروع کردیے، نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے جنگی سردار چیانگ کائی شک سے معاہدہ کرلیا۔ چیانگ کائی

شک کی فوجیں داخل ہوئیں تو کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ شنگھائی قتل گاہ کا منظر پیش کرنے لگا۔ چواِئن لائی اور اس کے نائبین زیرِ زمین چلے گئے۔ تنگ کے لیے یہ ایک سخت مرحلہ تھا۔

روپوشی کی زندگی گزارتے ہوئے اسے تین سال ہوگئے تھے۔ اس دوران اس کے کئی ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ اب اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ دشمنوں کو اس کے ٹھکانے کا علم بھی ہوجائے گا۔ موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی کہ وہ زیرِ زمین کارکنوں کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ ایک کشتی کے ذریعے نکلا اور قصبہ دوہان پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ وہاں بھی چھپا رہا اور پھر جنوبی چین کے صوبے چیانگ شی کے دارالحکومت نان چھانگ روانہ ہوگیا۔ یہاں رہ کر نان چھانگ بغاوت کی تنظیم اور رہنمائی کرتا رہا۔

قوم پرستوں کے لیے وہ ایک چھلاوا بن گیا تھا جو ہر جگہ سے غائب ہوجاتا تھا ہر جگہ نظر آتا تھا۔ پوری حکومتی طاقت اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

نان چھانگ سے وہ ایک قریبی شہر ژوئی جن چلا گیا جہاں ماؤزے تنگ اور دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے مشورے کے بعد ایک اور بڑی مہم کا آغاز کرتا تھا۔

چیانگ کائی شیک نے فوجی فتوحات کے طفیل مشرقی چین کے صوبوں چیانگ سو اور چیانگ پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ چیانگ سو کے بعد اس نے شنگھائی اور پھر ملک کے دوسرے حصوں میں خون ریزی شروع کردی۔

یہ خانہ جنگی چین کی تاریخ میں دس سال تک عوام کو خون میں نہلاتی رہی۔

یہ نہایت پُرآشوب دور تھا۔ یہ حکم جاری کردیا گیا کہ جہاں بھی کہیں کوئی کمیونسٹ نظر آئے اسے قتل کردیا جائے۔ یہ حکم گرفتاری کا نہیں قتل کا تھا لہٰذا ایک کمیونسٹ کو قتل کرنے کے لیے ایک ہزار غیر متعلقہ لوگوں کو بھی قتل کرنا پڑتا تو فوجی اس سے باز نہ آتے۔

بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جو کمیونسٹ نہیں بھی تھے وہ بھی خوف سے لرزہ براندام ہوگئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اراکین روپوش ہوگئے تھے لیکن خفیہ پولیس کے ایجنٹ کمیونسٹوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے لہٰذا ایجنٹس کا شکار بنتے رہتے تھے۔ اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بہت سے اراکین اپنی جان بچانے کے لیے مخبر بن گئے۔ مشرقی چین کے صوبے شان تونگ کی مقامی حکومت نے ان غداروں کی مدد سے کمیونسٹوں کے خفیہ ٹھکانوں پر متعدد بار حملے کیے اور بے شمار کامریڈ گرفتار کرلیے گئے۔

چواِئن لائی کو اپنے دشمنوں سے زیادہ ان دوستوں پر غصہ آرہا تھا جو روپوش اراکین کی مخبری کررہے تھے۔ وہ نڈر بھی تھا اور ثابت قدم بھی۔ اس وقت اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ وقت آنے پر وہ سنگ دلی کا مظاہرہ بھی کرسکتا ہے۔ اس کا ذاتی محافظ ایک نڈر آدمی تھا اور چین کے روپچی کرانے میں مہارت رکھتا تھا اس نے ایک دوسرے محافظ کو اس نے یہ فرض سونپا کہ وہ پارٹی کے اندر غداروں کو ختم کردیں۔

وہ خود اس مشن کی نگرانی کرتا رہا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک اس کے محافظوں نے اسے یہ یقین نہیں دلا دیا کہ مشن مکمل ہوگیا۔

پارٹی نے 1934ء میں فیصلہ کیا کہ آزادی کے حصول کے لیے لانگ مارچ کیا جائے گا۔ انقلابی فوج کی نفری میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ جنگی سرداروں کے مظالم نے عام لوگوں کو بھی ان سے بدظن کردیا تھا۔ چواِئن لائی اس لانگ مارچ کا سب سے سرگرم رہنما ثابت ہورہا تھا۔ وہ شہروں شہروں گھوم کر لانگ مارچ کے لیے رائے عامہ ہموار کررہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لانگ مارچ کا یہ سفر انتہائی تکلیف دہ ہوگا۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے گزرنا ہوگا۔ لانگ مارچ کو ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کیا جائے گا لیکن وہ جس بات کا تہیہ کرلیتا تھا وہ کرکے رہتا تھا۔

وہ جسمانی خطرات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کا اظہار اس پُرخطر لانگ مارچ کے دوران بھی ہوا۔ لانگ مارچ کے دوران یخ آلود دلدلی گھاس کے علاقے سے گزرتے ہوئے اس کا محافظ سخت علیل ہوگیا اور طرفہ تماشا یہ کہ اس کے پاس غذا بھی ختم ہوگئی۔ چواِئن لائی سے یہ دیکھا نہیں گیا۔ اس نے اپنا آخری راشن اپنے محافظ کو دے دیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اب اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں بچا۔ سفر طویل تھا اور اب اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کے بعد کے دنوں میں اس نے جنگلی جڑی بوٹیوں پر گزارہ کیا۔ ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ ناقابلِ علاج بیماریوں بلکہ موت کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ وہ خود بھی دیکھ رہا تھا کہ ان جڑی بوٹیوں کو کھا کر کئی لوگ موت کے منہ میں جاچکے ہیں۔ چواِئن لائی

کا کہنا تھا کہ اس کا محافظ علیل ہے اسے غذا کی سخت ضرورت ہے۔

ان جڑی بوٹیوں نے بالآخر اپنا اثر دکھایا۔ وہ ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا ہوگیا۔ اب اس کے لیے پیدل چلنا دشوار تھا۔ سرکردہ رہنماؤں سے لے کر عام پیادہ فوجیوں تک ہر شخص کے لیے یہ ایک کٹھن مسافت تھی اور اکثر یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ ان مشکلوں کو عبور کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ چواین لائی کو اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ وہ اس تصور سے بے چین تھا کہ اسے اسٹریچر برداروں نے اٹھا رکھا ہے جبکہ پارٹی کے فوجی کمیشن کے نائب صدر کی حیثیت سے انقلاب کے لیے اس کی زندگی بہت اہمیت رکھتی تھی اور وہ پیدل چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ جن ساتھیوں نے اسے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے وہ کس قدر جسمانی مشقت برداشت کر رہے ہوں گے۔ جہاں خود چلنا مشکل ہے وہاں وہ مجھے اٹھا کر چل رہے ہیں۔ اس کے ساتھی بضد تھے کہ وہ اسٹریچر پر لیٹا رہے۔

صوبہ چیانگ شی کے ساحلی علاقوں سے جنوب مغرب میں زردمٹی کی سطح مرتفع تک ایک خاصے طویل فاصلے تک وہ اسٹریچر پر لیٹا رہا اور بالآخر اپنی قوتِ مدافعت کو کام میں لاتے ہوئے وہ صحت یاب ہوگیا۔

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے جنگ کرتے اور خانہ جنگی کے عذاب میں مبتلا ہوئے کمیونسٹوں کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس تمام دورانیے کا بیشتر وقت زیرِ زمین رہ کر گزرا تھا۔ قدم قدم پر خطرے تھے۔ مسلسل تعاقب ہو رہا تھا۔ ہر طرف مخبر بکھرے ہوئے تھے۔ کون سا رہنما کہاں چھپا ہوا ہے یہ معلوم ہوتے ہی اسے گرفتار کرکے قتل کر دیا جاتا تھا۔ چواین لائی خود بھی کئی مرتبہ موت کے منہ میں جانے سے بچا۔ اس کی قسمت اچھی تھی ورنہ اس کے کیسے کیسے نامور ساتھی اس راہ میں قتل کر دیے گئے۔ چواین ان کے صدمے کو اپنے سینے کا تمغا بنائے آگے بڑھتا رہا۔ قوم پرست (کومنتانگ) کمیونسٹوں سے الگ ہوکر حکمرانوں سے مل گئے تھے اس لیے یہ کام مزید مشکل ہوگیا تھا۔ آزادی کی منزل قریب آتے آتے دور چلی گئی تھی۔ چواین لائی جیسا مدبر ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہا کہ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں میں کسی طرح مصالحت ہو جائے لیکن سازشیں یہ موقع کب دینے والی تھیں پھر یہ اسباب خود پیدا ہوگئے۔

شمال مشرق میں جاپانی جارحین چین کے ایک بہت بڑے علاقے پر قبضہ کرچکے تھے۔ اس موقع پر چاہیے تو یہ تھا کہ سب مل کر بیرونی دشمن کا مقابلہ کرتے لیکن جنگی سردار چیانگ کائی شیک نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جاپانیوں سے لڑنے کی بجائے کمیونسٹوں کے خلاف جنگ جاری رکھی جائے۔ اس کے اس حکم سے اس کی فوج میں بددلی پھیل رہی تھی۔ کومنتانگ کی فوجوں کی کمان چیانگ کائی شیک کے دو جنرل لیانگ اور یانگ کر رہے تھے۔ انہوں نے کومنتانگ اور خود اپنی فوج کے جذبات چیانگ کائی شیک تک پہنچائے۔

”جناب، ہمیں چاہیے کہ ہم آپس کی تلخیاں بھلا کر بیرونی دشمن کا مقابلہ کریں۔ وطن کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔“

”کیا چین میرا وطن نہیں؟ لیکن ذرا سوچو، جاپان اگر یہاں آ بھی گیا تو ہمیں چین سے باہر نہیں نکالے گا لیکن اگر کمیونسٹ اقتدار پر قابض ہوگئے تو وہ ہمیں چین میں نہیں رہنے دیں گے۔ اس لیے ہمارے اولین دشمن وہ ہیں جاپانی نہیں۔“

”ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر کمیونسٹ اقتدار میں آ بھی گئے تو ہم اقتدار سے باہر ہوں گے لیکن غلامی کا طوق ہمارے گلے میں نہیں ہوگا کیونکہ ان کا تعلق بھی اسی وطن سے ہے جبکہ جاپان قابض ہوگیا تو ہم غلام ہو جائیں گے۔“

”جاپانیوں سے کسی بھی وقت مصالحت ہو سکتی ہے فی الحال تو ہمیں کمیونسٹوں کو نیست و نابود کرنا ہے۔“

”قوم پرست آپ کی اس پالیسی سے متفق نہیں ہیں۔ یہ لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ کر کمیونسٹوں سے مل جائیں۔“

”میں نے دونوں کے درمیان غلط فہمی کی ایسی خلیج حائل کر دی ہے جسے یہ دونوں کبھی نہیں پاٹ سکتے۔ تم بے فکر رہو۔“

یہ دونوں جنرل بار بار اس پالیسی میں تبدیلی کی درخواست کرتے رہے۔ ان کے نزدیک یہ رویہ دیوانگی کے مترادف تھا۔

جب یہ جنرل اپنی کوششوں میں ناکام ہوگئے تو انہوں نے اسے گرفتار کرلیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اغوا کرلیا تاکہ اس پر دباؤ ڈال کر جاپانی حملہ آوروں کے خلاف لڑنے پر مجبور کیا جائے۔

اس کے اغوا نے چین میں ایک ہلچل مچا دی اور پھر اغوا کرنے والے جنرلوں کی کوششوں سے آیندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے مذاکرات کا آغاز ہوا۔ ان مذکرات میں شرکت کے لیے کمیونسٹوں کی نمائندگی کے لیے چواین لائی کے نام کا انتخاب ہوا۔ چواین لائی پہلی فرصت میں شی آن، صوبہ شینشی کے دارالحکومت روانہ ہوگیا۔

ان مذاکرات کے تین فریق تھے چیانگ کائی شیک، دونوں جنرل اور چیانگ کے سب سے بڑے دشمن کمیونسٹ جن کی نمائندگی چواین لائی کر رہا تھا۔ چواین لائی اب بہت زیادہ معتبر خیال کیا جانے لگا تھا۔ لوگ اسے ادب سے مخاطب کرتے۔

ان مذاکرات کے نتیجے میں چیانگ کائی شیک اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور ہوگیا۔ چواین لائی کے تدبر نے صرف یہی نہیں کیا کہ وطن کا مقدمہ شاندار طریقے سے لڑا بلکہ قوم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ کمیونسٹوں کے ساتھ اشتراک کرلیں جس طرح وہ دونوں پہلے متحد تھے اور جسے چیانگ کائی شیک کی سازشوں نے ختم کر دیا تھا۔

دونوں نے مل کر طے کیا کہ وہ جاپانی جارحین کے خلاف متحد ہوکر مزاحمت کریں گے۔ چواین لائی نے اس موقع پر بے پناہ دانائی کا ثبوت دیا۔ چیانگ کائی شیک کمیونسٹوں کا قدیمی دشمن تھا۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں کمیونسٹ اس نے قتل کروا دیے۔ اب وہ چواین لائی کے سامنے تھا لیکن چواین لائی نے اس سے انتقام لینے کی کوئی شرط عائد نہیں کی۔ یہ چواین لائی کی حکمتِ عملی ہی تھی کہ یہ دقیق مذاکرات بہ آسانی کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہوئے۔ یہ اس کی شاندار حکمتِ عملی تھی کہ اب کسی کمیونسٹ کو زیرِ زمین کام کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

اس کی ان کامیابیوں نے اسے عالمی توجہ کا مرکز بنا دیا۔

اسے یہ اعزاز حاصل ہوگیا کہ کومنتانگ حکومت اور کمیونسٹوں کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دینے لگا۔ ایک مدبر اور سفارت کار کی حیثیت سے ثابت قدم ضرور تھا لیکن کٹر پن کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ ایک منتظم کی حیثیت میں وہ اپنے اوپر بھی اسی قدر سختی روا رکھتا تھا جتنی کہ اپنے ماتحتوں پر۔

چو کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ کسی بھی شخص کے خلاف حتیٰ کہ کسی ایسے شخص کے خلاف بھی اپنے دل میں کینہ نہیں رکھتے تھے جس نے ان کے ساتھ نازیبا سلوک کیا تھا۔ ان کی یہ خصوصیت بھی اسی قدر نمایاں تھی کہ وہ کسی ایسے شخص کو نہیں بھولتے تھے جس نے سرکاری طور پر یا ذاتی حیثیت میں انقلاب اور ملک کے لیے اچھا کام کیا تھا۔

اپنی منفرد خوبیوں کی بدولت وہ پارٹی میں اپنی جگہ بناتے آگے بڑھتے رہے۔ 1943ء میں جب ان کی عمر 45 سال تھی وہ زمانہ جنگ کے دارالحکومت چھونگ چھینگ میں کمیونسٹ پارٹی کے وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے سات اصول مقرر کیے تھے اور آیندہ دنوں میں وہ ان اصولوں پر عمل کرتے بھی رہے البتہ وہ اس اصول پر عمل نہ کرسکے جس کے مطابق اپنی صحت اور غذا پر توجہ دینے کے پابند تھے۔ وہ عوام کے لیے تو دن رات کام کرسکتے تھے لیکن اپنی صحت کے لیے چند لمحات بھی نہیں نکال سکتے تھے۔ انہیں ہفتے کے ساتوں دن رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے لیے ورزش کا وقت ہی نہیں نکال پاتے تھے البتہ دوسروں کے لیے ان کے پاس بہت وقت تھا۔ وہ انہیں فیض پہنچانے کے لیے ہر وقت بے چین رہتے تھے۔ ان کے نزدیک پارٹی صرف اسی طرح قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ معلوم کرسکتی ہے کہ عوام کیا سوچ رہے ہیں اور ان کے کون سے مسائل فوری توجہ کے متقاضی ہیں۔ عوام کے وجود کے بغیر وہ ہر وجود کو لایعنی سمجھتے تھے۔

وہ اس روز تصویروں کی ایک نمائش دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر ایک ایسی پینٹنگ آویزاں تھی جس میں چیئرمین ماؤزے تنگ اور مارشل چوتہ کو ایک عوامی پارک میں ٹہلتے ہوئے دکھایا گیا تھا لیکن ان کے نزدیک یا پس منظر میں ایک بھی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چواین لائی کی نظر اس تصویر پر پڑی تو ان کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

”عوام کہاں ہیں؟“ چواین لائی نے کہا۔ ”تفریح کے لیے آنے والے دوسرے لوگ کہاں ہیں۔ کیا انہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے؟“ اس سرزنش پر منتظم کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

وزیرِاعظم بننے کے بعد بھی ان کا یہی عالم رہا۔ وہ بے دھڑک عوام کے مجمعوں میں گھس جاتے تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے گھل مل کر گفتگو کرنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کے ذہن میں اس بات کا ہلکا سا بھی تصور نہیں ہوتا تھا کہ وہ وزیرِاعظم ہیں۔

وہ بڑی تیزی سے پارٹی میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔

چین، جاپان جنگ کے دوران (1937) ایک ڈپلومیٹ کی حیثیت سے انہوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ انہیں چینی کمیونسٹ پارٹی میں امور خارجہ کی ذمے داری سونپی گئی۔ بیرونی امور سے متعلق پارٹی کا پہلا دفتر دوہان (وسطی چین) کے ایک ہوٹل کے ایک خستہ حال کمرے میں کھولا گیا۔ اس کا عملہ صرف تین چار افراد پر مشتمل تھا۔ یہی دفتر تھا یہی بیڈ روم تھا۔ دو ٹوٹے پھوٹے ٹائپ رائٹر اس دفتر کی کل ملکیت تھے۔

اس کمرے میں وہ غیر ملکی مہمانوں سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ یہ غیر ملکی اس کمرے کی حالت دیکھ کر یقیناً حیران ہوتے ہوں گے اور اس سے بھی زیادہ حیران وہ یہ دیکھ کر ہوتے تھے کہ اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہوا چواین لائی مستعدی کا مجسمہ ہے۔ ان کا علم وسیع ہے، حالات سے پوری طرح باخبر ہے اور جنگ و سیاسی صورتِ حال کا نہایت گہرائی سے تجزیہ کرتا ہے۔ ان کی پریس کانفرنسوں میں امریکا، برطانیہ، فرانس اور دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے صحافی شریک ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صحافی نے ان سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

"شاید آج سے تیس سال بعد ہم اس بات پر فخر کریں گے کہ ہمیں چواین لائی کو جاننے کا شرف حاصل تھا۔"

ہندوستانی صحافی باسو نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ میں اس بات پر اب بھی فخر محسوس کرتا ہوں۔"

انہوں نے اپنے عملے کو بھی اپنی طرح مستعد بنا دیا تھا۔ ان کے سامنے انہوں نے پانچ اصول بیان کیے تھے جن پر انہیں عمل کرنا تھا۔

1۔ اپنی آنکھوں کو مصروف رکھنا یعنی مطالعے میں مصروف رہنا۔ مارکسی لٹریچر اور ماؤزے تنگ کی تحریروں اور پارٹی کی پالیسیوں کا مطالعہ کرنا۔

2۔ اپنے کانوں کو مصروف رکھنا یعنی جنگ اور ملک کے بارے میں لوگوں کے خیالات سننا اور ان کی آرا سے دفتر کو مطلع کرنا۔

3۔ اپنی زبان کو مصروف رکھنا یعنی پارٹی کی پالیسیوں اور اصولوں کا پرچار کرنا۔

4۔ اپنے ہاتھوں کو مصروف رکھنا یعنی دوسروں کی بجائے اپنے آپ پر انحصار کرنا۔

5۔ اپنی ٹانگوں کو مصروف رکھنا یعنی دوڑ بھاگ کرنا۔

اس بات کا انتظار کیے بغیر کہ کوئی خود آ کر ہمارے دروازے پر دستک دے۔

ان کا عملہ ان کی نصیحتوں پر عمل کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ضروری سہولتوں کے فقدان کے باوجود انہوں نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

1938ء میں دوہان پر جاپان کا قبضہ ہو گیا۔ اس قبضے کے بعد دفتر کو ایک اور مقام چھونگ چھینگ منتقل کر دیا گیا۔ یہاں عملہ بڑھا دیا گیا اور یہ عملہ چواین لائی کے زیرِ نگرانی کام کرنے لگا۔ یہاں دوہان کے مقابلے میں سہولتیں زیادہ تھیں لیکن معاملات روز بہ روز پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ قوم پرست ایک مرتبہ پھر جاپانیوں کا ساتھ دینے اور کمیونسٹوں پر حملے کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس موقع پر چواین لائی کی دانش مندی اور بہترین خارجہ پالیسی نے قوم پرستوں کے کان کھڑے کر دیے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جاپانی جارحیت مغربی مفادات پر کاری ضرب لگا رہی ہے۔ لندن اور واشنگٹن، چین پر اپنا غلبہ قائم رکھنے کے لیے بے قرار ہیں اس لیے وہ کسی بھی طرح اندرونی چپقلش کو بڑھانے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ آپس کی لڑائی کا فائدہ جاپان کو پہنچتا۔ انہوں نے سفارتی سطح پر ایسی کوششیں شروع کر دیں جن کے ذریعے انگریزوں اور امریکیوں کو اپنا ہمدرد بنایا جائے۔ ایسی صورت میں قوم پرستوں کو کمیونسٹوں پر حملہ کرنا اور جاپان کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا۔ انہوں نے غیر ملکی اخباری نمائندوں کی پریس کانفرنسیں بلائیں اور ان کے سامنے اپنا نقطہ نظر بیان کیا اور انہیں اپنا دوست بنانے کی پیشکش کی۔ انہوں نے اور ان کے نائبین نے مسلسل کوششوں کے ذریعے ان پابندیوں کی دھجیاں بکھیر دیں جس کے تحت کومنتانگ (قوم پرست) کے سوا کسی اور سیاسی پارٹی کے لیے سفارتی حلقوں سے رابطہ ممنوع تھا۔ چیانگ کائی شیک کی حکومت نے یہ پابندی اس لیے لگائی تھی کہ ان کی برائیوں پر پردہ پڑا رہے۔ چواین لائی نے اس کی حکومت کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا۔

اب چواین لائی کو یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ چیانگ کائی شیک ان کی سفارتی کوششوں پر پانی پھیرنے کے لیے کمیونسٹوں پر ضرور حملہ کرے گا اور کومنتانگ سے کمیونسٹوں کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرے گا۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت تھی کہ ان کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ چیانگ کائی شیک کی فوج نے صوبہ آن

ہوئی کے جنوب میں اچانک کمیونسٹوں کے دستوں پر حملہ کر دیا۔ کمیونسٹوں کی زیرِ قیادت نئی چوتھی آرمی کو غیر فعال بنا دیا گیا۔ یہ اس کی طرف سے غداری کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اسی طرح شنگھائی میں کمیونسٹوں کا قتلِ عام کر چکا تھا۔ اس نے ایک ہی وار میں اتنے سارے دستوں کو غیر فعال بنا کر جاپانی فوج کا وہ مقصد پورا کر دیا جس میں وہ اپنی مسلسل کوششوں کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اگر دوسری جنگ عظیم نہ چھڑ گئی ہوتی تو جاپان اس غداری سے فائدہ اٹھا کر پورے چین پر قابض ہو گیا ہوتا۔

چین کے اتحادی ممالک کا اضطراب دیکھتے ہوئے کومنتانگ نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ نئی چوتھی آرمی نے احکامات کی خلاف ورزی کی تھی اور بغاوت کر دی تھی اس لیے یہ حملہ ناگزیر ہو گیا۔

چواین لائی اب تک خاموش تھے لیکن اس پروپیگنڈے کے بعد انہوں نے بھی اپنی خبر جاری کر دی اور اصل حقائق سے دنیا کو آگاہ کیا۔

اس وقت تک چیانگ کائی شیک کمیونسٹ فوجوں پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑی فوج جمع کر چکا تھا۔ اسے اپنی طاقت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اکثر قہقہے لگاتے ہوئے کہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر کمیونسٹوں کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس کا یہ دعویٰ اس لیے درست معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ان کا سارا ساز و سامان اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ واشنگٹن بھی اسے بڑے پیمانے پر ہتھیار فراہم کر رہا تھا لیکن اسے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے تقریباً سات سال انتظار کرنا پڑا اور پھر بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

چیانگ کائی شیک کی اس ناکامی کا بڑا سبب چواین لائی کی شاندار ڈپلومیسی تھی۔ ان کی شخصیت اور بے لاگ گفتگو، سادگی اور سیاسی بصیرت دوسروں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی تھی۔ غیر ملکی صحافی ان کے دوست بن گئے تھے۔ اتحادی ممالک کے سربراہان ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ انہوں نے چین کا مقدمہ کچھ اس انداز سے لڑا کہ چیانگ کائی شیک تنہا رہ گیا۔

چواین لائی جہاں امریکا کے فوجی اور سفارتی حلقوں کی بڑی شخصیتوں کے درمیان وقت گزارتے تھے وہیں ان کے عام امریکی سپاہی بھی دوست تھے۔ یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کے لیے امریکی فوجی طیارہ فراہم کر دیتے تھے۔ اس طرح انہیں نوجوان امریکیوں سے گھل مل کر بات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کی یہی کوششیں تھیں کہ امریکیوں نے چیانگ کائی شیک کے سر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ہتھیاروں کی رسد رک گئی اور کمیونسٹ فوج کے سرخ سپاہیوں نے چیانگ کی فوجوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ انہیں ہر معرکے میں کامیابی ہو رہی تھی اور فتح قریب نظر آنے لگی۔ یہ فتح آزادی کا سورج طلوع ہونے کی نوید دے رہی تھی۔ بادشاہت سے چھٹکارا اور عوامی جمہوریہ چین کا آغاز۔

یہ جنگ چواین لائی کی سربراہی میں لڑی جا رہی تھی۔ وہ چیف آف دی جنرل اسٹاف تھے۔ ان کے پاس جب وقت کی قلت ہو گئی تو فارن افیئرز سیکشن کی نگرانی کا کام جنرل چیان ینگ کے سپرد کر دیا گیا لیکن جب فتح قریب نظر آنے لگی وہ اور ماؤزے تنگ بیجنگ کی طرف پیش قدمی کرنے سے قبل اپنے آخری پڑاؤ شی پائی پھون پہنچے تو انہوں نے پارٹی کے خصوصی ترجمان کے فرائض دوبارہ سنبھال لیے۔ حتمی فتح سامنے نظر آ رہی تھی۔ اب انہیں آزادی کے بعد کے لیے نئی خارجہ پالیسی وضع کرنی تھی۔ انہوں نے بڑی تعداد میں ایسے افراد کو تربیت دینا شروع کیا جو فارن سروس کے کام پر عبور رکھتے ہوں۔ کچھ لوگوں کو خارجہ پالیسیوں کے بارے میں ریسرچ کرنے پر لگا دیا جو قریب الوقوع ملک گیر آزادی کے بعد نافذ کی جانی تھیں۔

کمیونسٹ فوجیں تیزی سے یلغار کرتی ہوئی بیجنگ میں داخل ہوئیں تو عوام نے گھروں سے نکل کر استقبال کیا۔ یہ ہمہ گیر فتح کی آخری منزل تھی جسے سرخ سپاہیوں نے سر کر لیا تھا۔

فتح حاصل کرنا مشکل نہیں ہوتا فتح قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چواین لائی اور ماؤزے تنگ کو اب ان خطوط پر سوچنا تھا کہ انتظامی امور کس طرح انجام دیے جائیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک حکومت تشکیل دی جائے اور مختلف عہدے تقسیم کیے جائیں۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ قربانیوں کا صلہ بھی اچھا ملے اور حق دار کو اس کا حق پہنچے۔ چواین لائی خوش قسمت تھے کہ ماؤزے تنگ نے ان کا نام وزیر اعظم کے لیے منتخب کیا۔

چیئرمین ماؤزے تنگ کو عوامی جمہوریہ کی آزادی کا اعلان یکم اکتوبر 1949ء کو صبح دس بجے تھیان آن من ٹاور سے کرنا تھا۔

آزادی کے اعلان سے ایک دن قبل تھیان آن من چوک کے جنوبی سرے پر عظیم عوامی ہال اور چینی انقلاب کے موجودہ میوزیم کے درمیان ایک یادگار نصب کی گئی۔ اس یادگار کا سنگ بنیاد چیئرمین ماؤزے تنگ نے رکھا اور یہ کتبہ نصب کیا۔

زندہ جاوید ہیں وہ عوامی جاں باز جنہوں نے گزشتہ تین سالوں کے دوران عوامی جنگ آزادی اور عوامی انقلاب کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

زندہ جاوید ہیں وہ عوامی جاں باز جنہوں نے 1840ء سے لے کر اب تک قومی خودمختاری آزادی اور عوامی بہبود کے لیے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے لڑائی میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

چینی عوامی سیاسی مشاورتی کانفرنس

30 ستمبر 1949ء

اس کتبے کو دیکھنے کے لیے عوام ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ جن کے پیارے اس جدوجہد میں مارے گئے تھے ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں لیکن چہرے خوشی سے سرشار تھے کہ ان کی قربانیاں رائگاں نہیں گئیں۔ آزادی بھی ملی اور ان کے کام کو کسی نے سراہا بھی۔ ان کے احسانات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کتبے پر ثبت ہو گئے۔ ماؤزے تنگ اور چواین لائی نے انہیں فراموش نہیں کیا۔

”یہ کتبہ شاندار کیوں نہ ہو اسے ماؤزے تنگ نے تحریر کیا ہے۔“

”یہ کتبہ یادگار کیوں نہ ہو اس کی خطاطی کامریڈ چواین لائی نے کی ہے جو کل ہمارا وزیراعظم بن جائے گا۔“

”وہ یقیناً اس کا حق دار ہے۔“

”ماؤزے تنگ زندہ باد، چواین لائی زندہ باد۔“

”انقلاب ثقافت، خوش آمدید۔“

دوسرے دن صبح ہی معزز شخصیات تھیان آن من چوک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں جہاں آزادی کی تقریب کا آغاز ہونا تھا۔

روسٹرم رکھ دیا گیا۔ مائیکروفون لگا دیا گیا۔ ماؤزے تنگ اور چواین لائی ایک ساتھ چلتے ہوئے روسٹرم کی طرف آئے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ چواین لائی نے مائیکروفون کے سامنے آ کر خطاب کیا تو ماؤزے تنگ ان کے قریب کھڑے تھے۔

یہ تقریب ایک دور کے اختتام اور ایک نئے دور کی علامت تھی۔

ماؤزے تنگ وہ شخص تھے جو شروع سے آخری فتح تک انقلاب کی قیادت کرتے رہے۔ چواین لائی ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے ان سے زیادہ مشہور تھے لیکن انہیں معلوم تھا کہ یہ عظیم فتح ماؤزے تنگ کی بہترین حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے اس لیے ہمیشہ ان کا احترام کرتے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ماؤزے تنگ اپنی بیماری کے سبب منظرنامے سے ہٹتے چلے گئے اور زمام اختیار چواین لائی کے ہاتھ میں رہی البتہ وہ ماؤزے سے مشورے کرتے رہے۔

چواین لائی جانتے تھے کہ اس نئے چین میں خارجی امور کی اہمیت کیا ہو گی۔ بیرونی دنیا کو اپنا دوست بنانے میں کتنی محنت کرنی ہو گی۔ وہ سب سے پہلے فارن افیئر سیکشن میں گئے۔ ان کے پہنچتے ہی عملے نے انہیں گھیر لیا۔

”ہمیں جو فرض سونپا گیا تھا ہم اس میں سرخرو رہے۔ کل ہم باقاعدہ طور پر اپنے سفارتی کام کا آغاز کریں گے۔ فی الحال آج تمہیں یہ کرنا ہے کہ چیئرمین ماؤزے کی تقریر کا متن غیر ملکی سفارت خانوں اور قونصل خانوں کو ارسال کر دو۔“ چواین لائی نے عملے کو ہدایت کی اور اپنے نام کی مہر ان کے حوالے کی جو سفارت کاروں کے نام بھیجے جانے والے خطوط پر لگائی جانی تھی۔

وزارت عظمیٰ کے ساتھ ساتھ وزارت خارجہ کا قلم دان بھی انہیں دیا گیا تھا۔

انہوں نے اپنے عملے سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہر قوم کو دو اقسام کی جنگیں لڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ الفاظ کی جنگ اور تلوار کی جنگ۔ الفاظ کی جنگ میں تقریری اور تحریری دونوں الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ ڈپلومیسی الفاظ کی جنگ کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ جو لوگ ڈپلومیسی کی حدود میں کام کرتے ہیں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ یہ جنگ لڑتے رہیں گے۔ نئے چین کے پاس جو پرانے چین سے مختلف ہے کوئی آزمودہ راہ نہیں ہے اس لیے ہمیں ہر کام نئے سرے سے شروع کرنا ہو گا۔

سرمایہ دار ممالک کی تقلید کرنے کا سوال خارج از امکان ہے۔ سوویت ڈپلومیسی کی تقلید بھی چین کے لیے مناسب نہیں۔ ہمیں اپنے ملک کے تقاضوں کو دیکھنا ہو گا اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہو گا۔

چین کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول یہ ہوں گے۔

”امن کی حامی طاقتوں سے دوستی کا رشتہ استوار کرنا۔ موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کی خواہش مند طاقتوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنا اور جنگ باز طاقتوں کو... تنہا کرنا۔ عالمی میدان میں امن کے لیے ایک متحدہ محاذ کی تشکیل کرنا ہمارا مقصد ہو گا۔“

انہوں نے ان اصولوں کی خود بھی پاس داری کی اور اپنے عملے کو بھی مجبور کیا۔

اگر چین کے ابتدائی دنوں میں خارجہ پالیسی انہوں نے اپنے ہاتھ میں نہ لی ہوتی تو چین اپنے اندر ہی سمٹ کر رہ گیا ہوتا۔ شاید کوئی اسے تسلیم کرنے کو بھی تیار نہ ہوتا۔ چواین لائی کے بے پناہ مطالعے، انگریزی پر عبور اور لچک دار طبیعت نے جلد ہی انہیں مقبول عالمی رہنما بنا دیا۔ انہیں دل مٹھی میں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ وطن کی خاطر اپنی بے عزتی ہنسی خوشی برداشت کر لیتے تھے اور بالآخر ان کا حریف متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ایسے کئی مظاہرے ان کی سوانح سے وابستہ ہیں۔

ایک مرتبہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ بیجنگ آئے۔ اس دورے کا مقصد امریکی فضائیہ کے ان افراد کی رہائی تھا جنہیں چین کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

مذاکرات کے بعد چواین لائی، سیکریٹری جنرل کو ان کی کار تک چھوڑنے گئے تو ان کی نظر ایک شخص پر پڑی جو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھا ہوا تھا اور سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ یہ سردی کا موسم تھا اور کھلی جگہ پر یہ سردی ناقابل برداشت تھی۔

”یہ کون شخص ہے؟“ انہوں نے اپنے عملے سے پوچھا۔

”یہ شخص مسٹر ہیمر شولڈ کا محافظ ہے۔“

”اسے سردی میں ٹھٹھرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسے گرم لابی میں کیوں نہیں بٹھایا گیا؟“ چواین لائی نے اپنے ماتحتین کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”یہ ایک امریکی ہے اور ہم کسی امریکی سے کوئی سروکار کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یہ تو ہیمر شولڈ کو سوچنا تھا کہ وہ کسی امریکی کو چین کی سرزمین پر لے جا رہے ہیں۔“

کوریائی جنگ ابھی کچھ عرصہ پہلے ختم ہوئی تھی اس لیے چینیوں کا یہ اندازِ فکر بے جا نہیں تھا لیکن چواین لائی کا اندازِ فکر مختلف تھا۔ وہ ایسے مواقع کبھی ضائع نہیں کرتے تھے۔

”وہ امریکی سہی لیکن ہے تو ہمارا مہمان۔ تم ایک عام امریکی اہلکار سے خائف کیوں ہو؟“ مزید کہا۔ ”اسے ہمارے اگلے استقبالیہ میں شرکت کی دعوت دو۔“

جب ہیمر شولڈ کو استقبالیہ دیا گیا۔ اس استقبالیہ میں وہ امریکی محافظ بھی مدعو تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ جنیوا کانفرنس کے دوران پیش آیا۔ امریکی وفد کا سربراہ سیکریٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر چواین لائی کے بہت خلاف تھا اور چین کو تسلیم کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ لاؤنج میں اس کا سامنا چواین لائی سے ہوا اور چواین لائی نے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ یہ نہایت حقارت آمیز سلوک تھا اور چواین لائی کو اس پر احتجاج کرنا چاہیے تھا لیکن وہ ہر سرکاری عمل کو اپنی ذات سے بالاتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے کسی جوابی کارروائی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ کسی ردعمل کا مظاہرہ کرتے تو مذاکرات میں چین کی نمائندگی متاثر ہوتی۔ انہیں چین عزیز تھا نہ کہ اپنی ذات۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کے بعد فوسٹر جنیوا سے چلا گیا اور جنرل بیڈل اسمتھ وفد کی سربراہی کرنے لگا۔

ایک دن چواین لائی لابی میں پہنچے تو بیڈل اسمتھ کو بیٹھے دیکھا جو اپنی پیالی میں کافی انڈیل رہا تھا۔ چواین لائی اپنے فطری اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی میز پر پہنچے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بیڈل اسمتھ نے بھی ذرا مختلف طریقے سے وہی حرکت دہرائی جو جان فوسٹر کر چکا تھا۔ اس نے ہاتھ ملانے سے زبانی انکار تو نہیں کیا لیکن عمل سے یہی ثابت کیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سگار تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں کافی کی پیالی اٹھا لی تاکہ یہ دکھا سکے کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی نہیں۔ وہ معافحہ کرنے سے معذور ہے۔ چواین لائی نے اس وقت بھی کسی منفی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہاتھ ملائے بغیر ہی اس کے سامنے بیٹھ گئے اور اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ بیڈل اسمتھ کو لامحالہ ان کی باتوں کا جواب دینا پڑا۔ کچھ دیر تک یک طرفہ گفتگو ہوتی رہی اور پھر بیڈل کو بھی شامل ہونا پڑا۔ بیڈل یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ”چین ایک قدیم اور عظیم تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔“

چواین لائی کے حسن اخلاق نے بیڈل اسمتھ کا دل جیت لیا۔ وہ تعلقات بڑھانے پر مجبور ہو گیا۔ یہ موقع اسے

جلد مل گیا۔ کانفرنس کا اختتامی اجلاس ہو رہا تھا۔ چواین لائی لابی میں کسی سے محو گفتگو تھے کہ بیڈل وہاں پہنچ گیا۔ خود چل کر ان کے پاس آیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''میں آپ کی مدبرانہ سوچ اور سمجھ بوجھ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ سے ملاقات کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔'' چواین لائی کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔

''آپ کو یاد ہے جب ہم پچھلی بار ملے تھے تو میں نے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن آپ کے دونوں ہاتھ خالی نہیں تھے اور آپ ہاتھ نہیں ملا سکے تھے۔''

بیڈل اس یاد دہانی پر ایک خفیف ہنسی ہنسے بغیر نہ رہ سکا اور بڑی گرم جوشی سے چواین لائی کا بازو دبا کر آگے بڑھ گیا۔

چواین لائی کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیڈل اسمتھ ان کا ہم نوا بن گیا چنانچہ جب کانفرنس میں ہندچینی کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو چواین لائی نے اس کے حل کے لیے ایک تجویز پیش کی۔ بیڈل اسمتھ نے محسوس کیا کہ یہ تجویز سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور خواہ مخواہ کی دشمنی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس کی اس حمایت پر امریکی وفد میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ تمام ارکان اس بات پر شور مچاتے رہے تھے کہ ان کے سربراہ نے چین کی تجویز پر موافقت کا اظہار کیوں کیا۔ بیڈل، چواین لائی سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ پہلے تو اس نے اپنے وفد کو سمجھانے کی کوشش کی اور جب وہ نہیں مانے تو اپنی جگہ والٹر رابرٹس کو قائم مقام بنا کر خود واپس چلا گیا۔ رابرٹس نے چین کی تجویز کو رد کر دیا۔

اس کے باوجود یہ معاہدہ طے پا گیا کہ ہندچینی میں باہمی دشمنی کو ختم کرنے کے لیے اس کا سیاسی حل تلاش کیا جائے گا۔

ڈلس کی مخالفت کے باعث امریکا کو یہ نقصان اٹھانا پڑا کہ وہ برسوں تک ویت نام میں ایک لاحاصل جنگ میں الجھا رہا۔

برطانیہ کے وزیرِ خارجہ کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت امریکی وفد نے فریقین کے گرفتار شدہ افراد کی واپسی کے بارے میں مجوزہ مذاکرات کا طریقہ طے کرنے کے لیے چینی وفد سے ملاقات کی۔ اس کے نتیجے میں سفارتی سطح پر چین اور امریکا کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا اور یہ مذاکرات وقفے وقفے سے پندرہ برس تک جاری رہے۔

اس کانفرنس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ برطانوی وزیر خارجہ کو چواین لائی کو قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلسل رابطے کرنے لگا۔ دونوں کے رابطوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت ایک دوسرے کے دارالحکومت میں نائب سفیر کی سطح پر ایک دفتر رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس کانفرنس میں چواین لائی کی کوششوں سے پُرامن بقائے باہمی کے پانچ اصول معرضِ وجود میں آئے۔ ان پانچ اصولوں کی تفصیل یہ تھی۔ ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کا احترام، باہمی عدم جارحیت، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت، مساوات، باہمی مفاد اور پُرامن بقائے باہمی۔

انہی اصولوں کی بنیاد پر افروایشائی کانفرنس انڈونیشیا کے شہر بانڈونگ میں ہوئی۔ چواین لائی کو بھی دعوت دی گئی۔ ان کا اپنڈی سائٹس کا آپریشن ہو چکا تھا۔ وہ ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے لیکن اس کانفرنس کی اہمیت کے پیشِ نظر انہوں نے ہر قیمت پر شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے عملے کے ہمراہ چارٹرڈ طیارے پرنسس کشمیر میں سفر کرنا تھا۔ یہ خبر عام بھی ہو گئی تھی کہ وزیرِاعظم چین اس طیارے میں سفر کریں گے۔

اس طیارے کو ہانگ کانگ میں رکنا تھا — ائرپورٹ پر طیارے میں ایندھن بھرا جا رہا تھا کہ کومنتانگ کے ایجنٹوں نے اس میں ایک ٹائم بم چھپا دیا۔ ایندھن بھرنے کے بعد طیارہ روانہ ہو گیا۔ طیارہ ہوا میں تھا کہ ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ ظاہر ہے کسی کو بچنا نہیں تھا۔ عملے کے علاوہ گیارہ افراد ہلاک ہو گئے۔ حسنِ اتفاق یہ ہوا کہ چواین لائی اس جہاز میں سوار ہی نہیں ہوئے تھے۔ عین وقت پر انہیں رنگون جانا پڑ گیا تھا اور وہ دوسری کسی پرواز سے روانہ ہونے۔ یوں ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔

بانڈونگ کانفرنس میں اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا گیا کہ ایشیا اور افریقا کے نو آزاد ممالک کو سامراجی طاقتوں کی غارت گری کے خلاف موثر طور پر اپنی اقتصادی اور سیاسی آزادی برقرار رکھنے کے لیے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔

یہ کانفرنس ایک ہفتے تک جاری رہی۔ وہ دن رات مصروف رہے۔ سونے کے لیے کسی بھی دن تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ملا۔ ان کی یہ کوششیں رائگاں نہیں گئیں۔ اس کانفرنس میں جو باتیں طے ہوئیں ان میں ان پانچ

دنیا کے نقشے پر ایک ملک ایسا ہے جو آزاد ہونے کے باوجود غلام ہے۔ اس ملک میں انصاف ملتا نہیں، بکتا ہے۔ اس ملک میں قانون غریب کو کچل دیتا ہے اور سرمایہ دار قانون کو کچل دیتا ہے۔ اس ملک کے حکمران سو فی صد عوام سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اس ملک کی پولیس دو فرائض انجام دیتی ہے عوام کو تنگ کرو اور اپنی جیبیں بھرو۔ اس ملک کے عوام حکمران کو لٹیرا کہتے ہیں۔ اس ملک میں پانچ سات ہزار کی چوری کرنے والا جیل کی ہوا کھاتا ہے اور پانچ سات کروڑ کی چوری کرنے والا ملک کا مہذب، شریف شہری بن جاتا ہے۔ اس ملک میں رشوت کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس ملک میں شرافت کی زندگی عذاب سے کم نہیں ہے۔ اس ملک کے حکمران ایک شطرنج کی طرح ہیں جس سے دوسرے ملکوں کے حکمران کھیلتے ہیں۔ اس ملک کے غریب عوام پر ظلم ناانصافی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس ملک میں حق دار کو حق نہیں ملتا۔ اس ملک میں غریبوں کی جھونپڑیوں کو جلا کر سرمایہ دار کے شیش محلوں کو گرمایا جاتا ہے۔ اس ملک میں محافظ لوٹتے ہیں۔ اس ملک کی معیشت نے اتنی ترقی کی ہے کہ امیر، امیر سے امیر تر ہو گیا ہے اور غریب، غریب سے غریب تر۔ اس ملک میں خود ہی دو، خود ہی لو اور خود ہی معاف کر دو پر عمل ہوتا ہے۔ اس ملک میں سرکاری خزانے میں جمع ہونے والی رقم کا تناسب چالیس فیصد اور ہر مہینے ملازمین کی جیب میں جانے والا الاؤنس ساٹھ فیصد ہوتا ہے۔

اصولوں کی روح کارفرما تھی جو انہوں نے جنیوا کانفرنس میں پیش کیے تھے۔ ایک ایسا ضابطہ معرضِ وجود میں آیا جو ایشیا اور افریقا اور بعد میں لاطینی امریکا کے ممالک کے باہمی تعلقات کا پیمانہ بن گیا۔

اس وسیع خطے کے لیے جسے تیسری دنیا کہا جاتا ہے چواین لائی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بانڈونگ کانفرنس کامیابی سے گزر گئی تھی۔ چواین لائی نے اپنے مقاصد بڑی حد تک حاصل کر لیے تھے۔ اب وہ چین کو دنیا میں متعارف کروانے کے لیے دوروں پر نکلے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے ایشیا اور یورپ کے گیارہ ممالک کے دورے کیے۔ وہ ان دوروں کو دوستی، امن اور علم کی جستجو سے تعبیر کرتے تھے۔

ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اب وہ چین کو ترقی کے بامِ عروج پر لے جانے کے لیے چین میں آئل انڈسٹری کو فروغ دینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ دوسرے ممالک اس انڈسٹری کے فروغ کے لیے کیا کام کر رہے ہیں۔ ان کا مطالعہ کر کے ان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے لہٰذا وہ جہاں بھی گئے ریفائنریوں اور متعلقہ تنصیبات کا معائنہ ضرور کیا۔

بانڈونگ کانفرنس کے بعد انہوں نے وزارتِ خارجہ کا عہدہ مارشل چھن ای کو سونپ دیا۔ اس وقت تک انہوں نے اس وزارت کی بنیادیں اتنی مضبوط کر دی تھیں کہ مارشل کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ جہاں بھی گئے چین کے موقف کی انہیں وضاحت نہیں کرنی پڑتی تھی تاہم چین کے بیرونی تعلقات کے ضمن میں ان کی شخصیت کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ وہ دنیا کے سب سے زیادہ دورے کرنے والے وزیرِاعظم سمجھے جاتے تھے۔ یہ دورے سیر تفریح نہیں تھے بلکہ وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ان دوروں کے نتیجے میں چین میں انڈسٹری کا جال بچھ گیا۔ اس لائق اور محنتی وزیرِاعظم کی کوششوں سے یہ ہوا کہ چین سوئی سے لے جہاز تک بنانے لگا۔ اس کا مال بیرونی منڈیوں تک پہنچا تو چین میں خوش حالی کے جھنڈے نصب ہو گئے۔

1960ء کے بعد یعنی اپنی آزادی کے صرف دس بارہ سال بعد چین اس قابل ہو گیا کہ غریب ممالک کو امداد دے سکے۔ انہوں نے چینی امداد کے آٹھ رہنما اصول پیش کیے۔ تیسری دنیا کے ممالک نے اس تصور کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

چین کا ماضی ان کے سامنے تھا۔ وہ بڑی طاقتوں کے استحصال کا شکار رہ چکا تھا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا چینی امداد میں استحصال کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انہوں نے دو اصول وضع کیے اور ان پر پابندی سے عمل کروایا۔ امداد حاصل کرنے والے ملک کو اس قابل بنانا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اس قابل ہو جائے کہ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر ترقی کر سکے۔ امدادی منصوبوں پر کام کرنے والے چینی کارکنوں کو اس بات کا پابند کرنا کہ وہ مقامی کارکنوں کی بہبود میں حصہ لیں اور ان ہی جیسے حالات میں کام کریں۔

وہ اصول وضع کر کے بھول نہیں گئے بلکہ دیدہ ریزی

سے جائزہ بھی لیتے رہے۔ نہ صرف فائلوں پر جائزہ لیا بلکہ وقتاً فوقتاً ان علاقوں کا دورہ بھی کیا اور وہاں چینی امداد سے چلنے والے منصوبوں کا خصوصیت کے ساتھ معائنہ بھی کیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان پر کس انداز سے عمل کیا جارہا ہے اور کن مسائل پر مزید توجہ درکار ہے۔

وہ جس ملک میں جاتے ان کا عوامی انداز وہاں کے عوام کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ نچلے درجے کے ملازمین نے تو یہ دیکھا تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی دورے پر آتا ہے تو ان ملازمین کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ ان بڑے آدمیوں کی گردن اکڑی رہتی تھی۔ اپنے ہم منصبوں کے سوا کسی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس چواین لائی کا حال یہ تھا کہ وہ رسمی قیود کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جب رخصت ہونے کا وقت آتا تو وہ خود کار ڈرائیوروں، کچن کے عملے اور محافظوں کے پاس جا کر ان سے ہاتھ ملاتے ان کا شکریہ ادا کرتے کہ انہوں نے ان کے دورے کو خوش گوار بنایا۔

وہ بھارت کے دورے پر نئی دہلی پہنچے تو رپورٹر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ نئی دہلی میں چینی سفارت خانے کے اچھوت ملازموں سے ہاتھ ملا رہے ہیں اور شفقت و محبت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ رپورٹروں کے لیے یہ بالکل انوکھی بلکہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ بڑا آدمی تو دور کنار، بڑی ذات کا ہندو بھی ان اچھوتوں سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔ ان کے پیشے جاروب کشی وغیرہ کی وجہ سے انہیں نیچ سمجھا جاتا ہے اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک رپورٹر سے رہا نہیں گیا اس نے پوچھ ہی لیا۔

”سر، آپ ان لوگوں سے ہاتھ ملا رہے ہیں؟“

”کیوں، کیا یہ انسان نہیں؟“

”میرا مطلب ہے یہ نیچ ذات ہیں، گندا کام کرتے ہیں۔ ان کی طرف تو لوگ دیکھتے بھی نہیں۔“

”یہی تو ظلم کا نظام ہے۔ میں اسی کے خلاف تو آواز اٹھا رہا ہوں۔ یہ وہ کام کرتے ہیں جو آپ نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ آپ سے اور مجھ سے بڑے لوگ ہیں۔“

رپورٹر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ یہی وہ خاموش سفارت کاری تھی جو چین کے وزیراعظم ہر ملک میں جا کے کر رہے تھے۔ ان کی سادگی اور عوام دوستی کی خبروں سے اخبارات بھر جاتے تھے۔

وہ اپنے دوروں میں ضروری پروٹوکول کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔ بے خوفی کا مظاہرہ اکثر ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ خرطوم (سوڈان) پہنچے تو منتظمین نے یہ تجویز پیش کی کہ وزیراعظم چواین لائی اور میزبان ائرپورٹ سے گیسٹ ہاؤس تک کھلی کار میں سفر کریں تاکہ دارالحکومت کے باشندے اپنے چینی مہمان کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ سوڈان کے حالات ان دنوں اچھے نہیں تھے لہٰذا کھلی کار میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چینی وفد کے عملے کو اس تجویز سے اختلاف تھا۔ جب چواین لائی کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے نائبین سے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ اس تجویز پر عمل کریں اور سوڈانی حکام کے ساتھ مل کر کھلی موٹر کار کا انتظام کریں۔

”سر اس میں خطرہ ہے۔“

”ہمیں دوستی زیادہ عزیز ہے، جیسا کہا جارہا ہے ویسا کرو۔“

انہوں نے کھلی کار میں، چین سوڈان دوستی زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کے درمیان گیسٹ ہاؤس تک کا سفر طے کیا۔ چین کے لیے ایک صبر آزما وقت وہ تھا جب مارکسزم اور لینن ازم کے بنیادی اصولوں پر مناظرے کے نتیجے میں بیجنگ اور ماسکو کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے۔ روس نے چین پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور حالات بگڑ گئے۔ روس اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ چین خوف زدہ ہو کر سوویت یونین کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ اس نے چینی حکومت کو اطلاع دیے بغیر سیکڑوں معاہدے منسوخ کر دیے اور امدادی منصوبوں پر کام کرنے والے تمام افراد کو بیک وقت واپس بلا لیا۔ ان قرضوں کی ادائیگی کا تقاضا بھی شروع کر دیا جو کوریائی جنگ کے دوران لیے گئے تھے۔

یہ چواین لائی کی بے خوفی ہی تھی کہ انہوں نے اس دباؤ کا جواب دینے کے لیے مناظرانہ جدوجہد تیز کر دی اور روس کی غارت گری کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ حالات ایک بار پھر سازگار ہونے لگے اور صرف ایک سال میں چین اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پا چکا تھا۔

یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ امریکا سے بگڑتے ہوئے تعلقات بہتری کی سطح پر آگئے۔ یہ تعلقات یہاں تک خوشگوار ہوئے کہ امریکی صدر رچرڈ ایم نکسن 1973ء میں بیجنگ ائرپورٹ پر اترے اور ان کے سات روزہ دورے کا آغاز ہوا۔

73 سالہ وزیراعظم چواین لائی چین کی سرزمین پر

قدم رکھنے والے پہلے امریکی صدر کا خیر مقدم کرنے کے لیے طیارے کی سیڑھی کے قریب کھڑے تھے۔ شدید سردیوں کے دن تھے۔ انہوں نے سردی سے بچنے کے لیے بھورے رنگ کے چوغے پر گہرے رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ باوقار انداز میں کھڑے ہونے کے باوجود نہایت لاغر نظر آرہے تھے۔

عوام اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ چو ایک سنگین بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ان پر کئی بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور اب تشخیص ہو چکا تھا کہ انہیں کینسر ہے۔ بیرونی مہمان تو صرف یہی سمجھے ہوں گے کہ وہ بیمار ہیں یا بہت تھکے ہوئے ہیں یا عمر کا تقاضا ہے کہ اب ان کی عمر 73 سال کی ہو چکی تھی۔

اس بیماری اور نقاہت کے بعد انہوں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ بیمار ہیں اور اگر بیمار بھی ہیں تو کس سنگین بیماری میں مبتلا ہیں۔ انہیں مذاکرات میں مسلسل مشغول رہنا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سماجی تقریبات، عشائیے اور ظہرانے بھی تھے جو صدر امریکا کی پذیرائی کے لیے منعقد کیے جارہے تھے اور چواین لائی کو بہ حیثیت وزیراعظم ان میں شریک ہونا ہوتا تھا۔ مذاکرات کے درمیان یہ البتہ دیکھا جاتا تھا کہ وہ مختلف وقفوں سے مختلف اقسام کی گولیاں کھاتے رہتے تھے۔ یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ شرکائے گفتگو یہی سمجھتے ہوں کہ ہائی بلڈ پریشر وغیرہ کی گولیاں ہیں جو انہیں کھانی پڑتی ہیں۔

ایک روز گفتگو کے دوران انہوں نے صدر نکسن سے عجیب بات کہی یا ان کے منہ سے نکل گئی۔

”اگر اچانک مجھ پر دل کا دورہ پڑے اور میں مر جاؤں تو آپ کو اس سے گفتگو کرنی پڑے گی جو میری جگہ لے گا۔ یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیے۔“ یہ بات انہوں نے غیر ارادی طور پر کہہ دی تھی۔ وہ اپنے مہمان کو یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ مرنے والے ہیں لیکن انہیں اپنی حالت کا اندازہ بھی تھا۔

”یہ بات آپ اس لیے تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟“ صدر نکسن نے چونک کر پوچھا۔

”اتنی بھی خراب نہیں کہ میں مر ہی جاؤں۔“ چواین لائی نے مصنوعی ہنسی ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

”پھر آپ نے یہ بات کیوں کی؟“

”اس لیے کہ موت کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت آسکتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مذاکرات میں تعطل پیدا ہو۔ یہ ایک مفروضہ تھا حقیقت نہیں۔“

بات آئی گئی ہوگئی۔ مذاکرات ختم ہوئے اور اعلامیہ جاری ہوا تو بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ دونوں ممالک بیس سال کے عرصے سے ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ امریکی ذرائع ابلاغ عوامی جمہوریہ چین کو بین الاقوامی مجرم کہتا تھا جبکہ چینی اخبارات امریکا کو کٹر سامراجی طاقت کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ سوویت یونین اور چین کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ روس نے چین کی سرحد پر اپنی دس لاکھ فوج جمع کر کے ان تعلقات کو مزید کشیدہ کر دیا۔ ان حالات میں امریکا سے تصادم کی جگہ مفاہمت ہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ چواین لائی کی دور اندیشی نے اس راستے پر قدم رکھ دیا۔ انہوں نے صدر نکسن کے دورے سے پہلے ہی اخبارات کے ذریعے حالات کی تبدیلی سے عوام کو آگاہ کیا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے۔ صدر نکسن کو اب تک گالیاں دی جارہی تھیں کہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے چین آنے کی دعوت کیوں دی گئی ہے۔ کٹر سامراجی، عوامی ہال میں دعوتیں کیوں اڑا رہا ہے۔ اس آگاہی کے باوجود چواین لائی کے مخالفین اس دورے کے خلاف تھے اور شور مچا رہے تھے کہ چواین لائی اپنے اصولوں سے ہٹ گئے ہیں۔ وہ ایک سامراجی ملک کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک چواین لائی کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔

بیس سال کی دشمنی ایک ہفتے میں... ختم نہیں ہو سکتی تھی لیکن یہ امید کی جا سکتی تھی کہ رفتہ رفتہ یہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے گی۔

نکسن رخصت ہو گئے۔

چواین لائی کی حالت روز بروز بگڑتی جارہی تھی۔ کام کا بوجھ اتنا تھا کہ ان کے پاس اسپتال میں داخل ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ روز بروز لاغر سے لاغر تر ہوتے جارہے تھے۔ پارٹی کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ بہت سارے قریبی مددگاروں اور ساتھیوں کو برطرف کیا جا چکا تھا۔ ان کے پاس معمولی سا عملہ رہ گیا تھا جس سے وہ کام چلا رہے تھے۔ کام کا بوجھ اتنا بڑھا کہ صحت جواب دے گئی۔ انہوں نے اب عوامی اجتماعات میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ منظر سے بالکل ہٹ گئے تھے۔ بیماری کو چھپایا جارہا تھا لیکن عوام یہ سوچ ضرور رہے تھے کہ

وہ منظر سے کیوں ہٹ گئے ہیں۔ کچھ کو یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ وہ بیمار ہیں، کچھ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ بھی کوئی سیاسی داؤ ہے۔ کچھ یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھے کہ ان کے مخالفین نے انہیں خاموش کروادیا ہے۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں ہورہی تھیں۔

ان سب باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت تھی۔ چواین لائی حسب معمول پارٹی اور حکومت کے روز مرہ کے معاملات انجام دے رہے تھے لیکن مخالفین اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ ان مخالفین میں سے ایک وانگ ہونگ ون کچھ زیادہ ہی بے قرار نکلا۔ وہ چھانگ شا روانہ ہوگیا جہاں ماؤزے تنگ مقیم تھے۔ اس نے چھانگ شا پہنچ کر ماؤ سے ملاقات کی اور وزیراعظم اور نئی کابینہ کی تشکیل کا مسئلہ اٹھایا۔

”وزیراعظم اب کام کرنے کے لائق نہیں رہے۔ کابینہ اس سے فائدہ اٹھارہی ہے اور من مانی کرنے پر تلی ہوئی ہے لہٰذا یہ بڑا ضروری ہے کہ نئے وزیراعظم کا انتخاب ہو اور موجودہ کابینہ کو فارغ کردیا جائے۔“

ماؤ کو معلوم تھا کہ چواین لائی کی بیماری ناقابل علاج ہے اور ان پر ان کی صحت سے زیادہ بوجھ پڑ رہا ہے۔ اس لیے شاید وہ وانگ ہونگ کی تجویز پر غور کرتے لیکن وانگ ہونگ نے جلد بازی سے کام لیا اور ماؤزے تنگ کو قائل کرنے کے لیے چواین لائی پر بے بنیاد الزامات کی بارش کردی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اب ایک لمحے بھی انہیں برداشت کرنا چین کو تباہ کرنے کے برابر ہوگا۔ ماؤزے تنگ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے کہ چواین لائی بیمار ہیں لیکن اس جیسے مخلص رہنما پر کوئی الزام لگائے یہ انہیں برداشت نہیں تھا۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گئے اور وانگ ہونگ کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے صاف کہہ دیا کہ چواین بدستور کام کرتے رہیں گے۔

چواین لائی کے مخالفین جن سازشوں میں لگے ہوئے تھے وہ اس سے بے خبر نہیں تھے۔ انہیں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وانگ ہونگ نے چیئرمین سے ملاقات کی ہے۔ ضروری تھا کہ وہ بھی ملاقات کریں۔ انہوں نے اپنے سیکریٹری کو اس سفر سے آگاہ کیا تاکہ فلائٹ کا بندوبست ہو۔

اسپیشل فلائٹ گروپ کے ارکان انہیں ایک بار پھر اپنے درمیان پاکر بہت خوش ہوئے کیونکہ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا کہ انہوں نے کوئی سفر نہیں کیا تھا۔

اخباروں نے بھی اس خبر کو نمایاں کرکے شائع کیا۔ اس خبر سے لوگوں کو بھی یہ تاثر ملا کہ انہوں نے اپنی بیماری کو شکست دے دی ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ بدستور بیمار تھے۔ سفر کے قابل ہرگز نہیں تھے۔ وہ تو صرف اس لیے سفر پر نکلے تھے کہ چین کا مستقبل داؤ پر تھا۔

انہوں نے ماؤزے تنگ سے خلوت میں ملاقات کی اور تمام باتیں تفصیل سے زیر بحث آئیں۔ بالآخر چیئرمین ماؤزے تنگ نے فیصلہ سنادیا کہ چواین لائی بدستور زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ وزرا کا انتخاب بھی وہ اپنی مرضی سے کرسکتے ہیں۔

وہ چھانگ شا کے سفر سے واپس آئے تو پہلے سے بھی زیادہ کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ چلنے میں دقت محسوس ہورہی تھی لیکن چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے اپنے عملے کے ارکان سے ایک ایک کرکے ہاتھ ملایا اور ان کی خیریت دریافت کی۔ جب ان کی خیریت دریافت کی گئی تو وہ صرف اتنا کہہ سکے۔

”سفر خوشگوار رہا۔“

☆☆☆

معالج کب سے انہیں مجبور کررہے تھے لیکن اس کے لیے انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑتا۔ اس پابندی کے لیے وہ تیار نہیں تھے لیکن اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ انہیں بیجنگ اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ انہیں مثانے کا کینسر تشخیص ہوا تھا۔ اس کے علاج کے لیے انہیں ایک سے زیادہ آپریشنوں سے گزرنا تھا جو اسپتال میں داخل ہوئے بغیر نہیں ہوسکتے تھے۔

اسپتال میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ ریاستی امور سے غافل رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا نائب وزیراعظم روزمرہ کے امور انجام دے رہا تھا لیکن ان کاموں کی نگرانی اور غیر ملکی مہمانوں سے ملاقات کو وہ نظرانداز نہیں کرسکتے تھے۔ ان کاموں کی انجام دہی کے لیے انہوں نے اپنا دفتر بیجنگ اسپتال میں منتقل کردیا۔

وزیراعظم بننے کے بعد سے اب تک ایک سادہ سا کمرا ان کا دفتر تھا جس میں ماؤزے تنگ کے ایک مجسمے کے سوا کوئی اور آرائشی چیز نہیں تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کشادہ میز تھی جس کی حالت بتاتی تھی کہ بہت زیادہ استعمال ہوچکی ہے۔ چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہی ان کا دفتر تھا اور یہی چیزیں دفتر کے طور پر اسپتال کے ایک کمرے میں منتقل

ہوگئیں۔

1975ء کے اختتام تک انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ اس وقت کو زیادہ سے زیادہ معروف رہ کر گزارنا چاہتے تھے۔ ایک معروفیت ان کے ہاتھ آگئی۔ ایک چینی ڈکشنری (نیو چائنا ڈکشنری مرتب ہورہی تھی) انہوں نے اس لغت کا مسودہ نظر ثانی اور اصلاح کے لیے اپنے پاس منگوالیا۔

مولفین اس خدشے میں مبتلا ہوگئے کہ وزیراعظم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ بیچ میں اٹک جائے۔ مسودہ واپس نہ آسکے یا بہت دیر لگ جائے۔

ایک دن یہ مسودہ پبلشنگ ہاؤس لایا گیا تو تمام اراکین حیرت زدہ رہ گئے۔ وزیراعظم نے ان کی توقع سے بہت پہلے مسودہ واپس کردیا تھا۔ ان پر ان کے دستخط بھی تھے اور حاشیوں پر تبصرے بھی تحریر کیے تھے لیکن یہ دیکھ کر تمام اراکین افسردہ ہوگئے کہ تحریر میں شکستگی نمایاں تھی۔ یہ معلوم ہورہا تھا کہ جب وہ لکھ رہے تھے تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

حالت کی اس خرابی کے باوجود بعض سرکاری تقاریب ایسی ہوتی تھیں جہاں ان کی نمائندگی کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ فولاد کا بنا ہوا یہ آدمی ان تقاریب میں شرکت کرتا تھا۔

عوامی جمہوریہ کے قیام کی چھبیس ویں سالگرہ آئی تو ان کی شرکت لازمی تھی۔ ان کے کئی آپریشن ہوچکے تھے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ وہ تقریب میں شرکت نہ کریں لیکن وہ اس قومی دن کے استقبالیہ میں شریک ہونے اور اس تقریب کی صدارت کرنے کے لیے عوامی ہال میں داخل ہوئے تو مہمانوں پر ایک خوشگوار حیرت طاری ہوگئی۔ ان کی صحت کے بارے میں لوگ فکرمند تھے اور اب وہ ان کے درمیان تھے۔ انہوں نے تقریر بھی کی۔ یہ مختصری تقریر تالیوں کی گونج میں ختم ہوئی۔ دیر تک تالیوں کے شور کے سوا ہال میں کچھ نہیں تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند نظر آرہے تھے لیکن ان کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ تقریب میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ پچھلے دو برس سے سرطان کے مرض میں مبتلا ہیں۔

چوتھی قومی عوامی کانگریس سے بھی خطاب کیا جس کا اجلاس جنوری 1975ء میں ہوا تھا۔

پارٹی کی دسویں مرکزی کمیٹی کے دوسرے مکمل اجلاس کی صدارت بھی کرنی تھی۔ پارٹی کی اندرونی کشمکش شدت اختیار کرگئی۔ وہ اس بحران سے بچنے کے لیے سخت محنت کررہے تھے۔ ان کے خیال میں قوم سنگین بحرانوں میں گھری ہوئی تھی اور اس سے نکلنا ضروری تھا۔ وہ کئی ہفتوں تک ان اجلاسوں کے لیے تقریریں تیار کرتے رہے۔ ایک ایسا مریض جس کے لیے بیٹھنا بھی دشوار تھا وہ سخت دماغی محنت کررہا تھا۔ ماؤزے تنگ بار بار انہیں پیغام بھجوا رہے تھے کہ تقریر کو زیادہ سے زیادہ مختصر رکھنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس پر کچھ نہ کچھ عمل بھی کر رہے تھے۔

چواین لائی کا وزن تیزی سے گھٹ رہا تھا لیکن سب سے زیادہ تشویش اس بات پر تھی کہ ان کے پیروں میں سوجن آگئی تھی۔ اب ان کے لیے دشوار ہوگیا تھا کہ چمڑے کے جوتے پہن سکیں۔ انہیں یہ فکر تھی کہ وہ مہمانوں کا خیر مقدم کس طرح کریں گے۔ انہی دنوں کوریائی لیڈر کم ال سنگ کی آمد ہوئی تو انہوں نے اپنے لیے کپڑے کا ایک ڈھیلا ڈھالا جوتا بنوالیا۔

یہ آخری مہمان تھے جن سے بیجنگ اسپتال میں انہوں نے ملاقات کی۔

اب ان کا ایک ہی شغل رہ گیا تھا کہ اسپتال میں اپنے کاؤچ پر بیٹھے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اہم ترین امور پر غور کرتے رہیں۔ ان دنوں ایک سوال انہیں چاروں طرف سے گھیرے رہتا تھا۔ کیا کینسر کا علاج دریافت کرلیا جائے گا؟ انہیں قوی امید تھی کہ چین روایتی چینی طب کے گراں قدر تجربے اور علم کی مدد سے اس مہلک بیماری پر فتح پاسکتا ہے۔ آخری دنوں میں وہ پُرزور انداز میں اس خواہش کا اظہار کرنے لگے تھے کہ چین کے روایتی ڈاکٹروں اور مغربی طب کے ڈاکٹروں کو ایک ساتھ مل کر اس بلند مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وہ ایک اہم آپریشن سے گزرے تھے اور بہت کمزور ہوگئے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ چینی عوامی فوج آزادی کے مارشل اور نائب وزیراعظم اور کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی بیورو کے رکن خدلونگ کی میموریل سروس ہونے والی ہے تو وہ اس میں شرکت کے لیے بے چین ہوگئے۔ ڈاکٹر ایک مرتبہ پھر اس حق میں نہیں تھے کہ وہ باہر نکلیں لیکن انہوں نے اس مشورے کو نظرانداز کردیا۔

لوگوں کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ سوگواروں کے درمیان کہیں نظر آئیں گے لیکن وہ اچانک وہاں نمودار ہوگئے۔ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ اس وقت بھی ان کے جسم پر

ایک بے شکن سوٹ تھا اور بالوں میں اچھی طرح کنگھی کی ہوئی تھی لیکن بہت زیادہ سن رسیدہ نظر آرہے تھے۔ چلتے ہوئے اپنے پاؤں اٹھانے کے لیے پوری طاقت خرچ کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتے ہوئے اس بستر کی طرف بڑھے جس پر وہ رجسٹر رکھا ہوا تھا جس میں لوگ اپنے تاثرات لکھ رہے تھے۔ قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ لکھتے ہوئے ان کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ دستخط کرنے کے بعد انہوں نے ماؤ زے تنگ کی بیوی کی طرف دیکھا۔

''میں کامیاب نہ ہوسکا۔ میں اسے بچا نہ سکا۔''

''یہ تو ہونا ہی تھا۔'' ماؤ زے تنگ کی بیوہ نے کہا۔

''بہت جلد میرا بھی وقت آنے والا ہے۔ میں خود کو نہ بچا سکوں گا۔'' انہوں نے کہا اور وہاں سے ہٹ گئے۔ ان کے مددگار انہیں وہاں سے لے کر چلے گئے۔

ان کا ایک آپریشن اور ہونے والا تھا۔ تیاریاں کی جارہی تھیں کہ انہیں اطلاع ملی کہ جنوب مغربی صوبے یون نان میں رانگیے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں پھیپھڑے کے سرطان کی شرح میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ انہوں نے ژی تھان اسپتال کی پارٹی سیکریٹری کو اپنے پاس بلا بھیجا۔

''کیا تمہیں اس صورت حال کا علم ہے؟''

''جی ہاں، ہم اسے بڑی تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔''

''آپ لوگ اس سلسلے میں کیا کررہے ہیں؟''

''کئی اجلاس ہوچکے ہیں جن میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔''

''اس مرض کی افزائش روکنے کے لیے فوری طور پر وہاں ایک طبی ٹیم روانہ کی جائے۔ اس کے بعد اجلاس بھی کرتے رہنا۔''

وہ اپنی حالت بھول کر اس مرض کے علاج کے لیے کوشاں تھے۔ وہ مختلف ڈاکٹروں کو آمادہ کررہے تھے کہ وہ اس مرض (سرطان) کے علاج کے لیے تجربات کرتے رہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس سے محفوظ رہیں۔

تقریباً چودہ آپریشن ہوچکے تھے۔ ہر آپریشن کے بعد ان کی حالت سنبھل جاتی تھی مگر پھر بگڑ جاتی تھی۔ انہیں تقریباً دو سال اسپتال میں رہتے ہوئے ہوچکے تھے۔

اپنے دوست ماؤ زے تنگ کی رسم تعزیت میں شریک ہونے کے تقریباً سات ماہ بعد ان کی حالت پھر بگڑ گئی۔ ان پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ 7 جنوری 1976ء کی رات کو کسی وقت دھیرے سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ انہیں آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھ کر ڈاکٹر اور نرسیں ان پر جھک گئیں۔

''یہ رات کا وقت ہے نا؟''

''جی سر۔''

''اس وقت ٹائم کیا ہوگا؟''

''رات کے گیارہ بجے ہیں۔''

''تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟''

''سر، آپ کی خدمت کے لیے۔''

''اب تم میرے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ جاؤ دوسروں کی خبر گیری کرو۔ وہ تمہارا انتظار کررہے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے تم ان میں سے کسی کو بچالو۔'' انہوں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ پھر غشی میں چلے گئے تھے۔

8 جنوری 1976ء کی صبح نو بج کر ستاون منٹ پر چینی انقلاب کا یہ عظیم رہنما داغ مفارقت دے گیا۔ ان کی بیماری چھپائی گئی تھی موت نہیں چھپائی جاسکتی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی پوری قوم سکتے میں آگئی۔ یہ صرف ایک وزیراعظم کی موت نہیں تھی ایک ایسے عوامی آدمی کی موت تھی جس نے دل و جان سے عوام کی خدمت کی تھی۔

میت گاڑی جس میں چواین لائی کا تابوت رکھا تھا۔ بیجنگ اسپتال سے انقلابیوں کے پاپاؤ شان قبرستان کی طرف روانہ ہوئی۔ لوگ اس سے پہلے ہی غول در غول قبرستان کی طرف جانے والی شاہراہ پر جمع ہوچکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں لوگ جمع ہوگئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ بچوں کو ان کے والدین نے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ لوگ بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے ہوئے تھے۔ عورتوں نے اپنے بالوں میں سفید کاغذی پھول لگائے ہوئے تھے۔ (یہ پھول چین میں سوگ کی علامت سمجھے جاتے ہیں)

شاہراہوں پر گھٹی گھٹی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ قبرستان نزدیک آیا تو یہ سسکیاں دردناک چیخوں میں تبدیل ہوگئیں۔

سڑکیں جو ٹریفک کے شور سے گونجتی رہتی تھیں اب وہاں میت گاڑی کے رینگنے کی آواز تھی یا لوگوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ماخذات

چواین لائی (آپ بیتی) ترجمہ: احفاظ الرحمٰن

تاریکی کا آسیب

شکیل صدیقی

اس کی ابتدائی زندگی پُرآزار تھی اور اسی زندگی نے اسے حوصلہ مند بنایا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے عیش وعشرت کی ارضی جنت تک پہنچ گیا۔ اس نے خود کو اپنے آپ میں منفرد اداکار بناکر ایسا نام کمایا کہ لوگ مثالیں دینے لگے۔

ہالی ووڈ کے ایک مشہور اداکار کی زندگی کا عکس

اسٹیفن ایڈون کنگ اسکاٹ لینڈ کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی قامت چھ فٹ چار انچ ہے اور وزن تقریباً 200 پاؤنڈ۔ اس کی رنگت عام برطانوی افراد کی طرح سے سفید ہے مگر آنکھیں نیلی ہیں۔ سر کے بال موٹے اور سیاہ ہیں، جب کہ داڑھی کے بال کہیں کہیں سے سفید ہیں (اس نے ابھی داڑھی نہیں رکھی ہے) مونچھ کے بال البتہ سیاہ ہیں، اس لیے کہ وہ کبھی کبھار شوقیہ مونچھیں رکھ لیتا ہے۔ اس کی بینائی چونکہ بچپن ہی سے قابل اعتبار نہیں

ہے، اس لیے وہ چشمہ لگاتا ہے۔ وہ اپنی تصاویر پر دستخط نہیں کرتا۔ البتہ جب اس کا کوئی مداح بے پناہ فرمائش کرتا ہے تو وہ تصویر پر دستخط کر کے اسے بھجوا دیتا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ اس کا دل کیسا ہے تو اس نے جواب دیا: "میرا دل ایک چھوٹے لڑکے جیسا ہے اور میں نے اسے ایک مرتبان میں ڈال کر اپنی میز پر رکھ دیا ہے۔"

اس کی کتابیں دنیا کی 33 زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور 35 ممالک میں فروخت ہو چکی ہیں۔ مجموعی طور پر اس کے ناول اور کتابیں 30 کروڑ کی تعداد میں آ چکی ہیں۔ اس وقت وہ تین ریڈیو اسٹیشنوں کا مالک ہے۔ اس کے مداحوں نے اسے 'ماسٹر آف ہارر' کا خطاب دے رکھا ہے۔

اسٹیفن ایڈون کنگ پورٹ لینڈ مین میں 21 ستمبر 1947ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والدین کی غیر متوقع اولاد ہے۔ اس لیے کہ معالجین نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ان کے ہاں اولاد نہیں ہوگی، لہٰذا جب اسٹیفن پیدا ہوا تو انہیں بہت حیرت ہوئی۔ وہ ڈونالڈ اور نیلی روتھ کا پہلا بیٹا تھا۔

اس کے والدین پلس بری کنگ میں رہتے تھے۔ غالباً اسی لیے کنگ اس کے نام کا جزو ہے۔ والدین میں جب ناچاقی ہوگئی تو انہوں نے علیحدہ ہونا مناسب سمجھا مگر یہ علیحدگی بڑے پراسرار انداز میں ہوئی۔ اس کا باپ سیلز مین تھا اور برقی آلات فروخت کیا کرتا تھا۔ اس کے لیے اسے ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا تھا۔ ایک رات وہ سگریٹ کا پیکٹ لینے کے لیے گھر سے نکلا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ اسٹیفن کی عمر اس وقت صرف دو برس کی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا کہنا ہے کہ دو برس کی عمر میں 'میں نے ان کا خاکہ دماغ میں محفوظ کرلیا تھا لیکن حقیقت میں میرا باپ کیسا تھا، میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔'

اسے اور اس کے چھوٹے بھائی ڈیوڈ کو اس کی ماں نے پروان چڑھایا۔ دونوں بھائیوں نے مختلف جگہوں پر رہائش اختیار کی۔ مثلاً وہ انڈیانا کے علاقے فورٹ وین میں رہے جہاں ان کے باپ کے اور بھی رشتے دار تھے۔ ان کے نزدیک رہنے کی بنا پر اس کی ماں کی ڈھارس بندھی رہتی تھی۔

اسٹیفن خود کو غیر محفوظ سمجھتا تھا۔ وہ نفسیاتی بیمار ہوگیا تھا۔ وہ سوتے میں چونک جاتا تھا کہ باپ کی طرح سے اس کی ماں بھی اسے اور بھائی کو چھوڑ کر کہیں چلی جائے گی۔ اسے ہولناک خواب آتے تھے۔ ایک بار اس نے اپنی ماں کو تابوت میں لیٹے دیکھا۔ وہ خود ایک برگد کے درخت کی سب سے اونچی شاخ سے لٹک رہا تھا اور اس کی گردن میں رسّی کا پھندا لگا ہوا تھا۔ کوے اس کے سر کے گرد منڈلا رہے تھے۔ ایک نے نزدیک آ کر اس کی دائیں آنکھ پر چونچیں بھی ماری تھیں۔ بہرحال وہ خواب تھے جو اس کی زندگی کی ناہمواریوں کی بنا پر اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوگئے تھے۔

اس کی ماں کو جب قرار نہ ملا تو وہ اپنے چھوٹے سے خاندان کو لے کر کنکٹی کٹ کے علاقے اسٹارٹفورڈ میں آ بسی۔ اس وقت اسٹیفن کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ قسمت نے وہاں بھی ان کے قدم جمنے نہیں دیے، تنگ آ کر اس کی ماں نے دوبارہ مین کے علاقے ودرہام میں سکونت اختیار کرلی۔

اس وقت اسٹیفن نے ایک ہولناک حادثہ دیکھا۔ اس کا ایک دوست ٹرین سے ٹکرایا اور پھر کٹ کر ہلاک ہوگیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اسٹیفن کے خوفناک کہانیاں لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ مگر اسٹیفن نے اس خیال کو مسترد کردیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی یادداشت میں اس واقعے کا ہلکا سا پرتو تک نہیں ہے۔ اس کے اہل خانہ نے بتایا کہ جب وہ گھر واپس آیا تھا تو اس کی زبان گنگ تھی اور وہ بے حد سہما ہوا تھا۔ بعد میں خاندان والوں کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنے دوست کو حادثے سے دوچار ہوتے دیکھا تھا۔

اس کی ماں کے والدین بڑھاپے کی وجہ سے پریشان کن زندگی گزار رہے تھے۔ تب اسٹیفن کی خالہ روتھ نے اپنی بہن سے گزارش کی کہ اگر وہ والدین کی دیکھ بھال کرلے گی تو وہ اسے گزارے کے لیے مناسب رقم دے دے گی۔ نیلی نے والدین کی خدمت کرنے کی رضامندی ظاہر کردی۔

خاندان کے افراد نے نہ صرف یہ کہ اس کے ماہانہ اخراجات برداشت کیے بلکہ اسے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا مکان بھی لے کر دے دیا۔ جب اسٹیفن کے نانا اور نانی کا انتقال ہوگیا تو اس کی ماں کو پائن لینڈ ہوٹل کے کچن میں کھانا پکانے کا کام مل گیا۔

اسٹیفن نے ودرہام کے گرامر اسکول میں تعلیم کا آغاز کیا اور اس کے بعد لزبن فالز ہائی اسکول اور 1966ء میں گریجویٹ کرلیا۔ یونی ورسٹی آف مین میں ہی اس نے اسکول کے ہفتہ وار اخبار میں کالم لکھنا شروع کردیا تھا۔ اس اخبار کا نام 'دی مین کیمپس' تھا۔ اسٹیفن کو چونکہ سیاست سے بھی دلچسپی تھی لہٰذا اس نے چھوٹی سی سینیٹ بنائی اور خود اس کا ممبر بن بیٹھا۔ اس کی سینیٹ کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ

جنگ سے نفرت کی جائے اور انسانیت کو امن اور بھائی چارے سے رہنے دیا جائے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ امریکا نے ویت نام میں جو جنگ شروع کر رکھی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ جنگ پر خرچ ہونے والے اخراجات آخر لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیوں نہیں کیے جاتے؟

اسٹیفن نے 1970ء میں جب گریجویشن کرلیا تو سے ہائی اسکول لیول کے بچوں کو پڑھانے کی اجازت دے دی گئی۔ مگر جب میڈیکل بورڈ نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا تو اسے فیل کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسے ہائی بلڈ پریشر ہے۔ اس کی بینائی کمزور ہے اور سماعت میں نقص ہے۔ اسٹیفن مایوس ہو کر ایک طرف نہیں بیٹھ گیا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا، لہٰذا اس نے اپنی ایک ساتھی لڑکی تابیتھا سے شادی کرلی۔

وہ مین یونی ورسٹی کی فوگلر لائبریری میں کمبائنڈ اسٹڈی کیا کرتے تھے۔ دونوں میں آنکھ مٹکا ہوگیا۔ اسٹیفن کو چونکہ معلم کی حیثیت سے میڈیکل بورڈ نے پڑھانے کی اجازت نہیں دی تھی اس لیے وہ ایک لانڈری میں مزدوری کرنے لگا۔ وہ لکھنے کے مرض میں مبتلا تھا چنانچہ 1959ء میں ایک مقامی اخبار میں مضامین لکھنا شروع کردیے۔ وہ اخبار میمو گراف مشین پر طبع ہوتا تھا اور اس کی اشاعت صرف ایک سو تھی۔

اسے محلّے کے شوقین خواتین و حضرات پڑھتے تھے، اس لیے کہ اس میں محلّے کی دل چسپ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً مسز اسمتھ کے ہاں چوتھا بچہ پیدا ہوا ہے۔ مسز جوزف اچانک مسٹر رچرڈ میں دل چسپی لے رہی ہیں اور ایک ہفتے بعد اپنے شوہر سے طلاق لے کر رچرڈ سے شادی کرلیں گی۔ مسٹر خود بھی شادی شدہ ہیں لیکن اب ان کا دل اپنی بیوی سے بھر گیا ہے، وغیرہ۔

اسٹیفن کو اس سے کوئی بڑی شہرت تو حاصل نہ ہوئی، بہرحال محلّے والے اس کے نام سے ضرور واقف ہوگئے۔ اس لیے اسے اس وقت شاباش ملی جب اس نے ایک چلتے ہوئے اخبار میں کہانیاں لکھنا شروع کردیں۔ ان کہانیوں کا معاوضہ اسے نصف سینٹ ملا کرتا تھا۔ یہ بڑی رقم نہیں تھی لیکن اس کا دل بڑھانے کے لیے بڑی رقم تھی۔ اس لیے اسے حوصلہ ہو رہا تھا کہ اس کی کہانیاں پسند کی جاتی ہیں لہٰذا اخبار کا مدیر اسے شائع کر رہا ہے اور معاوضہ بھی دے رہا ہے۔ کہانیاں لکھنے کا اسے اتنا شوق تھا کہ اس نے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں۔ جب اس کے اساتذہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس پر پابندی لگا دی۔ ان کا کہنا تھا کہ لکھنے کے لیے مطالعہ کرے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اس نے مردوں کے ایک میگزین میں ایک کہانی لکھ کر بھیجی۔ کہانی اتفاق سے شائع ہوگئی اور اس کے دوستوں نے واہ واہ مچا دی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مزید لکھے۔

اسٹیفن نے کمرشل مصنف کی حیثیت سے 1967ء میں 'اسٹارٹلنگ مسٹری میگزین' میں 'دی گلاس فلور' نامی کہانی لکھی جو شائع ہوگئی اور اسے مناسب معاوضہ بھی ادا کیا گیا۔

اسٹیفن کی ابتدائی کہانیاں سائنس فکشن پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ اس کی سائنسی معلومات بے حد ہلکی تھیں اس لیے وہ تفصیلات میں نہیں جاتا تھا۔ پبلشر وہ کہانیاں بچوں کے صفحات پر شائع کرتے تھے اس لیے وہ بچوں کو سنسنی خیز لگتی تھیں۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ خود اس کے رونگٹے اس دن کھڑے ہوگئے جب اس نے اپنی آنٹی کے گھر کے اسٹور میں رکھے ہوئے ایک بکس کو کھولا۔

اس بکس میں بہت سی کتابیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اسٹیفن کنگ نے ان کتابوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا تو معلوم ہوا کہ چند سائنس فکشن کتابیں ہیں اور باقی خوفناک کہانیوں کے مجموعے۔ اس نے وہ سارے مجموعے پڑھ ڈالے تو دل میں چسک پیدا ہوئی کہ اسے اسی انداز میں لکھنا چاہیے۔ بڑے ہوں یا چھوٹے پراسرار بہت سب کو پسند آتی ہے اور انسان نامعلوم دنیاؤں کے بارے میں معلوم کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ وہ چیزیں اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں جو ان جانی اور ان دیکھی ہوں۔

اس کی شادی ہوچکی تھی اور وہ خود کو مزدوری کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کمزور سا شخص ہے، اس لیے مشقت کا کام نہیں کرسکتا۔ شادی کے بعد بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے اس نے مردوں کے رسائل میں کہانیاں ہی لکھنا شروع کردیں۔ یہ ابتدائی کہانیاں اس کے ایک مجموعے 'نائٹ شفٹ' میں شائع ہوئیں۔

اپنی بیماریوں پر قابو پانے کے بعد اسے میڈیکل بورڈ نے ایک انگریزی اسکول میں پڑھانے کی اجازت دے دی۔ مین میں وہ اسکول ہیمپڈن میں تھا۔ صبح وہ تعلیم دیا کرتا تھا اور شام کو کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ یہ کام اس نے ہفتہ وار

چھٹیوں میں بھی انجام دینا شروع کر دیا۔

وہ ایک اچھا معلم تھا۔ طالب علم اس کی کلاس میں دل چسپی لیتے تھے اور خاموشی سے درس لیتے تھے۔ مگر اسٹیفن کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اسے جکڑ کر رکھ دیا ہو۔ اس نے بتایا ''میں جب پڑھا کر گھر آتا تھا تو بہت تھکا ہوا ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں اسٹیج پر ڈراما کر کے آرہا ہوں۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اس کے بعد مجھے اپنے طالب علموں کی کاپیاں چیک کرنا پڑتی تھیں۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ کام یعنی تحریر کے لیے وقت ہی نہیں بچ پاتا تھا۔

میں نے حساب لگایا کہ اگر میں مزید تین برس تک یہی کچھ کرتا رہا اور میرے معمول میں فرق نہ آیا تو میں کسی کیچوے کی طرح ناکارہ ہو کر رہ جاؤں گا۔ کہانی لکھنا تو در کنار میں کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں تک نہیں کھینچ پاؤں گا۔

☆☆☆

وہ ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا، عمر اندازاً چالیس برس رہی ہوگی۔ اپنے آفس کے فرش پر آنکھیں بند کیے خاموش پڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص سامنے سے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس عالم میں وہ منظر بہت ہول ناک لگ رہا تھا۔ پُر ہول خاموشی میں چمگادڑوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی جو آفس سے باہر پاگل انداز میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ وہ وکٹورین طرز کی ایک عمارت تھی جہاں وہ آفس قائم تھا۔

منظر پڑھ کر یقیناً آپ کے دماغ میں آیا ہوگا کہ یہ اسٹیفن کنگ کے کسی ناول کا باب ہے۔ لیکن اس وقت آپ حیرت کے بحرِ زخار میں غوطے کھانے لگیں گے جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ کسی اور کا نہیں بلکہ خود اسٹیفن کنگ کا قصہ ہے۔ اس نے اس روز بیئر کے ان گنت ڈبے پیے تھے اور کوکین بھی استعمال کی تھی۔ فرش پر بدہوشی کی حالت میں گرنے پر اس کی ناک فرش سے ٹکرا گئی تھی، اس لیے ناک سے خون نکلنے لگا تھا جو رستا ہوا سینے تک پہنچ گیا۔ جس سے قمیص سرخ ہو گئی تھی۔

یہ خوف ناک کہانیوں کا مصنف اسٹیفن کنگ تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، مصنف اتنی سخت محنت کرنے اور تھکن اتارنے کے لیے منشیات کا سہارا لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اسٹیفن نے بھی زیادہ شراب پینا شروع کر دی اور اس کا نشہ جب تسکین نہ دے سکا تو اس نے منشیات بھی استعمال کرنا شروع کر دیں، جس میں افیون، بھنگ، ویلیم، زینکس اور نائکل بھی شامل ہے۔ اس نشے بازی کا وہ 1980ء تک شکار رہا۔ اسے اپنی ماں کے مرنے کا بھی بہت قلق تھا، اس لیے وہ اس کی قبر پر جا کر رویا کرتا تھا۔ اہلِ خانہ اور دوست بیئر کے ڈبے اور سگریٹ کے ٹوٹے اس کے کمرے سے صاف کیا کرتے تھے اور اسے پیہم سمجھاتے رہتے تھے کہ وہ خود کو یوں ختم نہ کرے۔ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی تحریروں کے منتظر رہتے ہیں۔

اسے منشیات کی لت کب لگی تھی؟ بعض افراد کا خیال ہے کہ اپنے پہلے ناول کی کامیابی کے بعد، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مطمئن ہو جاتا اور خوشیاں مناتا، لیکن اندر سے وہ کمپلیکس کا شکار ہو گیا۔ اسے اندیشے ستانے لگے کہ اگر اس کا دوسرا ناول ناکام ہو گیا تو اس کی شہرت کی ڈور کٹ جائے گی اور وہ آوارہ پتنگ کی طرح گمنامی کی دھند میں ڈوستارہ جائے گا۔

وہ چونکہ ہارر رائٹر تھا، اس لیے اس کے دماغ میں ہر وقت منفی چیزیں گردش کرتی رہتی تھیں، مثلاً سانپ، بچھو، چوہے، چمگادڑیں اور تیرہ نمبر کا فوبیا۔

1973ء میں اس نے ایک کہانی کا خاکہ بنایا اور اس پر کام کرنے لگا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک لڑکی ''کارئیٹا دہائٹ'' تھی۔ کہانی ابھی اختتام تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ اس سے اکتا گیا اور اس نے صفحات کوڑے کی ٹوکری میں ڈال دیے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی بیوی تابیتھا نے اس مسترد شدہ مسودے کو کوڑے کی ٹوکری سے نکال کر پڑھ لیا۔

اسے مسودہ پسند آیا۔ اس نے اپنے شوہر سے بحث و تمحیص کی کہ یہ حقیقت میں کہانی نہیں بلکہ ناول ہے۔ اسٹیفن نے ایک نئی ہمت اور حوصلے کے ساتھ اسے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ جب کہانی ختم ہوئی تو وہ ناول کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے ناول کا نام 'کیری' تجویز کیا۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی تھی جو پراسرار قوتوں کی مالک ہوتی ہے۔

ناول 'کیری' جنوری 1973ء میں مکمل ہو گیا تو ڈبل ڈے اینڈ کمپنی کو اس کا مسودہ دیا۔ انہوں نے اس سے مئی میں اس کے حقوق ڈھائی ہزار ڈالر میں خرید لیے۔ اسٹیفن کنگ کے لیے یہ بڑی رقم تھی۔ جب کہ اس کی بیوی کو ابھی اس کی صلاحیتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

دوسری طرف کمپنی نے اسے بتایا کہ اگر ناول پیپر بیک پر چھپنے کے بعد بیسٹ سیلر لسٹ میں شامل ہو گیا تو پھر اسے اضافی معاوضہ ملنے لگے گا کہ اسے بچوں کو انگریزی بھی

پڑھانا پڑے گی اور وہ صرف ناول لکھ کر گزارا کر سکے گا۔ اسے فل ٹائم رائٹر کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

1973ء کے اواخر میں جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی ماں بیمار ہے اور اسے شدت سے یاد کر رہی ہیں تو وہ بے چین ہو گیا اور اپنے چھوٹے سے خاندان سمیت جنوبی مین میں منتقل ہو گیا۔ اس نے جھیل سباگو کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ماں کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا دوسرا ناول 'سیکنڈ کمنگ' لکھنا شروع کر دیا۔ وہ ناول ختم ہوا تو تیسرے ناول کا پلاٹ ذہن میں آ گیا اور اس نے 'یروشلم لاٹ' نامی ناول لکھ ڈالا۔ اسی اثنا میں 59 برس کی عمر میں اس کی ماں کا سرطان میں انتقال ہو گیا۔

موسم بہار میں اس کا ناول 'کیری' شائع ہوا اور بکسٹالوں کی زینت بن گیا۔ تھوڑی سی آمدنی ہوئی تو اسٹیفن کنگ نے نئے ناول کا پلاٹ تیار کیا اور خاندان سمیت کالاریڈو چلا گیا۔ اسی اثنا میں ایک فلم ساز نے اس کے ناول 'کیری' کے حقوق فلم بنانے کے لیے خرید لیے۔ کنگ کی مفلسی امارت میں تبدیل ہو گئی۔ دل چسپ بات یہ ہوئی کہ اس کی بیوی کو بھی اس کی صلاحیتوں پر یقین ہو گیا اور اس نے کنگ کو مصنف تسلیم کر لیا۔ 12 مئی 1973ء اس کے لیے خوش قسمتی کا دن ثابت ہوا۔ اس کے پبلشر نے اس کے ناول 'کیری' کے حقوق دوسرے ادارے کو چار لاکھ ڈالر میں فروخت کر دیے، تاکہ وہ اس کا نیا ایڈیشن شائع کر سکے۔

پبلشر نے کنگ کو فون کر کے یہ اطلاع دی اور بتایا کہ معاہدے کے مطابق وہ اسے بیس ہزار ڈالر ادا کرے گا۔ کنگ کا دل چاہا کہ وہ خوشی سے چیختا ہوا کسی جنگل میں چلا جائے اور درندوں، پرندوں، چرندوں اور حیوانوں تک کو یہ خوش خبری سنا ڈالے۔ سر دست وہ انسانوں میں تھا، لہٰذا اس نے اپنی بیوی کو وہ ہیر ڈرائیر خرید کر تحفے میں دیا جس کی فرمائش وہ عرصے سے کر رہی تھی۔

کولاریڈو میں وہ ایک برس رہا اور اس نے اپنا ناول 'دی شائننگ' مکمل کر ڈالا۔ پھر 1975ء میں وہ اپنے وطن مین واپس آ گیا اور اس نے کرائے کا مکان چھوڑ کر مغربی مین میں ایک مکان خرید لیا۔ وہاں اس نے اپنا تیسرا ناول 'دی اسٹینڈ' لکھا۔ مکان میں چونکہ بچوں کا شور غل اور دھما چوکڑی مچا رہتا تھا اس لیے وہ ایک ماہ کے لیے اسٹیس پارک کے اسٹینلے ہوٹل کے کمرا نمبر 217 میں چلا گیا۔

وہ بعض اوقات تنہائی میں خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا۔ مگر

☆ 1998ء میں فاربس میگزین نے 40 فکشن مصنفوں کی ایک فہرست بنائی جنہوں نے تحریروں کے ذریعے لوگوں کو تفریح فراہم کرنا اپنا شعار بنایا۔ چالیس مصنفوں میں اس کا نمبر 31 واں تھا۔

☆ 2001ء میں اٹھائیسویں سالانہ ویژن ایوارڈ منعقد ہوئے اور اس میں فلم، ٹیلی ویژن، موسیقی اور ٹیکنالوجی سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مصنف کی حیثیت سے اسٹیفن کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

☆ اس نے اپنی زندگی میں کئی ریکارڈ قائم کیے ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنا ایک ناول 'دی رننگ مین' جو 300 صفحات پر مشتمل تھا صرف دس روز میں مکمل کر لیا تھا۔

☆ اسٹیفن کو 2003ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے گولڈ میڈل دیا گیا ہے۔

☆ 1996ء میں اسے ایک کہانی پر او۔ ہنری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ کہانی کا نام 'دی مین ان بلیک سوٹ' تھا۔ بعد میں اس کہانی پر فلم بھی بنی۔

☆ اسٹیفن کو اب تک 6 برام اسٹوکر، 6 ہارر گائڈ اور 5 لوکس ایوارڈ مل چکے ہیں۔

☆ 2003ء میں رائٹرز ایسوسی ایشن نے اسے لائف اچیومنٹ ایوارڈ دیا۔

☆ 2007ء میں کینیڈین لٹریری گائڈ نے لائف اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا۔ اس سے پہلے کسی غیر کینیڈین کو یہ ایوارڈ نہیں دیا گیا تھا۔

☆ جب اس کی قوت متخیلہ اپنے عروج پر پہنچ گئی اور وہ ایک برس میں کئی ناولیں لکھنے لگا تو اس نے ایک قلمی نام 'رچرڈ بیچ مین' بھی اختیار کر لیا۔ اس نام کے تحت اس نے 1977ء میں 'ریگ'، 1979ء میں 'لانگ واک' 1981ء میں روڈ ورک، 1982ء میں 'دی رننگ مین' اور 1984ء میں 'دی تھنیز' اشاعت کے لیے مختلف اداروں کو دیا۔ اس کے علاوہ وہ جان سوئڈن کے نام سے بھی لکھتا ہے۔ دی رننگ مین پر بننے والی فلم میں آرنلڈ شوازنیگر نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم باکس آفس پر بے حد مقبول ہوئی تھی۔ دل چسپ بات یہ کہ ناول 'رننگ مین' اس نے ایک ہفتے میں لکھا تھا۔

☆ وہ مجموعی طور پر 90 ناول لکھ چکا ہے۔

یہاں تنہائی ملنے پر اسے لکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں اس کی بیوی تابیتھا بھی اس سے ملنے کے لیے آئی۔ یہ دیکھ کر اسے مسرت ہوئی کہ اس نے اپنا ناول تین چوتھائی مکمل کرلیا ہے۔ اس نے کنگ کو مشورہ دیا کہ اب آیندہ وہ اپنے ناول ہوٹل کے کمروں میں بیٹھ کر لکھے۔ بچوں سے بہت دور، تاکہ اسے ارتکاز حاصل ہوسکے اور اس کی محویت ختم نہ ہو۔ کنگ نے اس سے اتفاق کیا۔ اس کے بہت سے ناولوں کا مرکزی مقام ہوٹل ہی ہوگیا۔ ایک ناول میں اس نے ہوٹل کے بارٹینڈر کو مرکزی کردار کی حیثیت دے دی۔

اس کے بعد 'ڈیڈ زون' کی باری آئی۔ اس ناول کے حقوق اس نے وائکنگ نامی پبلشر کو فروخت کیے۔ جسے ناول شائع کرنے کا قدیم تجربہ تھا۔ اس کے بعد اس نے تین ناول مزید لکھے۔ اس طرح سے اس کے ناولوں کی مجموعی تعداد سو ملین (دس کروڑ) سے بھی زیادہ ہوگئی۔

اس کے دوسرے ناول کے سرورق پر اس کے نام کے ساتھ خوفناک مصنف بھی درج تھا اور کیری کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے پڑھنے والوں نے اسے دہشت ناک مصنف کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ ناول کی فروخت سے پبلشر کو پچاس لاکھ ڈالر حاصل ہوئے جس میں سے نصف اس نے کنگ کو ادا کردیے۔

اپنے ناول کے پلاٹ کے لیے اب اسے لندن کی فضا سازگار دکھائی دی تو 1977ء میں اس نے اپنے خاندان کو چھوڑا اور ایک سال لندن میں بسر کیا۔ دسمبر کے وسط تک وہ وطن واپس آگیا اور اس نے سینٹرلوویل میں ایک اور مکان خرید لیا۔ یہ نیا مکان بینگور نامی مقام پر تھا۔ بینگور میں نیا مکان خریدنے کی ایک اور وجہ تھی کہ یونی ورسٹی آف مین میں تخلیقی رائٹنگ پر لیکچر دینا منظور کرلیا تھا۔

ناول نویسی کے ساتھ روپیا کمانے کا شوق کم نہیں ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنے پبلشر تبدیل کرنا شروع کر دیے۔ وائی کنگ ایک بڑا اشاعتی ادارہ ہے اور ہزاروں کی تعداد میں کتابیں شائع کرچکا ہے۔ اس نے اسٹیفن کنگ کو بہت اچھا معاوضہ دے کر اس کی ناولیں شائع کیں، لیکن اٹھارہ برس کے بعد 1997ء میں اسٹیفن نے اعلان کیا کہ وہ اپنے پبلشر وائی کنگ کو چھوڑ رہا ہے۔ اس لیے کہ اسے ایک مکان خریدنا ہے جس کی قیمت ایک کروڑ ستر لاکھ ڈالر ہے۔ اس ناول کا نام بیگز آف بون (ہڈیوں کا تھیلا) ہوگا۔ کسی پبلشر نے اسٹیفن کے مطالبے پر کان نہیں دھرا اور اسے ایڈوانس دینے پر تیار نہیں ہوا۔

بہرحال سیمسن اینڈ شوسٹر کی سمجھ میں آگیا کہ اس کے ناول اب بھی گرم کیک کی طرح سے فروخت ہوتے ہیں۔ انہوں نے اسے ایڈوانس کے طور پر اسی لاکھ ڈالر ادا کر دیے۔ یہ معاہدہ ایک ہزار صفحات کے ناول کے لیے ہوا تھا۔ اسٹیفن نے اس کے لیے یہ شرط بھی عائد کردی کہ ناول کی فروخت کے بعد جو منافع ہوگا اس میں سے اسے پچاس فی صد حصہ ادا کیا جائے گا۔

اس کے تقریباً سارے ناولوں پر فلمیں بن چکی ہیں۔ وہ کئی ٹیلی وژن سیریزوں کا مصنف بھی ہے۔ ناولوں کے بعد اس نے اپنی کہانیوں کو نئے انداز سے اضافہ کرکے لکھا اور فلم بندی کے لیے دے دیا۔ ان میں سے زیادہ تر فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔

اب وہ ناول نگار کی حیثیت سے چاردانگ عالم میں اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ اس لیے یونی ورسٹی کا خیال تھا کہ اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ 1979ء کے موسم بہار میں وہ سینٹرل لوویل میں واپس آگیا۔ اس کے خاندان نے فیصلہ کرلیا کہ وہ گرمیوں میں لوویل ہاؤس میں اور سردیوں میں بینگور میں رہیں گے۔ سردیوں کے لیے انہوں نے فلوریڈا کو بھی اپنے لیے بہتر پایا۔ اس کے ہاں تین اولادیں ہوئیں۔ جن میں نوی رینشل، جوزف ہل اور اوون فلپ شامل ہیں۔ بڑے لڑکے کی شادی ہوچکی ہے، اس لیے اب وہ دادا بن گیا ہے اور اس کے تین پوتے ہیں۔

جوزف ہل نے بھی لکھنے کو شعار بنالیا ہے۔ اس کا قلمی نام 'جوہل' ہے۔ وہ باپ کی طرح سے دہشت ناک ناولیں لکھتا ہے۔ اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ مارکیٹ میں آچکا ہے اور ناول پر ایک یہودی ہدایت کار نائل جورڈن فلم بنانے والا ہے۔ جب کہ دوسرے بیٹے اوون فلپ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 2005ء میں شائع ہوا ہے۔

1980ء میں اس نے بینگور میں 24 منزلہ مکان خریدا اور اس کی تزئین و آرائش کرائی۔ مکان کی کھڑکیوں کی شیشوں پر چمگادڑوں کی تصویر بنوائیں اور چاروں طرف لوہے کی ریلنگ لگوائی تاکہ کوئی غیر وہاں منہ اٹھا کر داخل نہ ہوسکے۔ اس کے مداحوں کو علم ہوا تو انہوں نے مکان کے چکر کاٹنا شروع کردیے تاکہ اس کی جھلک نظر آجائے۔ وہ اپنے ہیرو کو دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔

انہیں قطعی پتا نہیں تھا کہ وہ منشیات کے نشے میں ڈوبا

احتجاجی بینرز

کہتے ہیں عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو منہ کے اندر زبان رکھتی ہیں، دوسری زبان کے اندر منہ رکھتی ہیں۔ ویسے ایک بات تمام عورتوں میں مشترک ہے کہ وہ کان نہیں رکھتیں۔ دنیا کا دستور ہے، وہی چیز اپنے پاس رکھی جائے جسے استعمال کرسکیں۔ چناں چہ شوہر اپنے پاس کانوں کا رکھنا بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ رہ گئی بات ڈاڑھی کی تو اسے مرد اپنی مردانگی کے اظہار کے لیے رکھنا چاہتے ہیں حالاں کہ شوہر بننے کے لیے اکثر مرد ڈاڑھیوں کو منڈوا دیتے ہیں، وجہ اس کی ہمیں کوئی خاص معلوم نہیں، صرف اتنا پتا ہے کہ شادی کے بعد مرد، مرد نہیں رہتے، زن مرید بن جاتے ہیں، یعنی شادی کے بعد مرد بیوی کا مرید بن جاتا ہے۔ مرد کے چہرے پر مونچھوں کو جو مقام حاصل ہے، وہ احتجاجی بینرز کا ہے، اسے عین ناک کے نیچے لہرانا ضروری سمجھا جاتا ہے، چناں چہ والدین اپنی ناک کی خاطر مونچھوں کے آگے جھک جاتے ہیں اور بیوی کے آگے مونچھیں۔ فرائڈ سے کسی نے پوچھا کہ عورت کس قسم کا شوہر چاہتی ہے؟ تو بولا، اپنے باپ جیسا۔ چناں چہ لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کا وہی حشر کرتی ہے جو اس کی ماں نے اس کے باپ کا کیا ہوتا ہے، ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ لڑکی کی رخصتی کے وقت میکے والے دھاڑیں مار مار کر اس لیے روتے ہیں کہ انہیں لڑکی کی جدائی کا غم ہوتا ہے حالاں کہ لڑکی کی والدہ کی آنکھوں کے سامنے اس وقت اپنے شوہر کا ماضی اور داماد کا مستقبل ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کے کمرے میں لڑھک رہا ہوتا ہے۔ ایک روز اس کی بیوی تابیتھا نے دیکھا کہ وہ مدہوشی کی حالت میں پڑا ہے اور اس نے ڈھیروں قے کرکے فرش خراب کردیا ہے۔ اس نے میز کی ساری درازیں اور کمرے میں رکھے ہوئے شیلفوں کی تلاشی لی اور اس میں سے ساری منشیات کی چیزیں نکال لیں اور اپنے کمرے میں آگئی۔

دوسرے دن اس نے اپنے رشتے داروں اور بچوں کو کمرے میں جمع کیا اور اسٹیفن کو بلا کر کہا کہ وہ اب تک ان چیزوں سے شوق کرتا رہا ہے۔ اس نے ان چیزوں سے ترک تعلق نہ کیا تو وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اسٹیفن کے لیے یہ لمحہ فکریہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کا خاندان اسے چھوڑ دے گا اور ہوسکتا ہے کہ وہ ان کے غم میں زندہ نہ رہے۔ اس نے توبہ کر لی۔ ابتدا میں یہ رہا کہ وہ چھپ چھپا کر نشہ آور چیزیں استعمال کرتا رہا لیکن پھر ساری چیزیں ایک طرف ہوگئیں اور وہ صاف ستھرا ہوگیا۔

پھر اسے جس چیز کا اندیشہ تھا وہی سامنے آگیا۔ منشیات سے اس پر جو بے خودی طاری رہتی تھی وہ اس کے سہارے لکھ لیا کرتا تھا مگر جب ان چیزوں کا ساتھ چھوٹ گیا تو وہ لکھنے اور نت نئے واقعات سوچنے سے معذور ہوگیا۔ اس کے دماغ کا خانہ خالی ہوگیا۔

اس موقع پر تابیتھا نے اس کی مدد کی اور اس کیفیت سے باہر لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ راتوں کو اس کے سرہانے بیٹھ جاتی تھی اور اسے کہانی کا پلاٹ بنانے کو کہتی۔ پھر اس سے بحث و مباحثہ کرتی۔ جب کوئی خیال فائنل ہوجاتا تو وہ اسے مجبور کرتی کہ اب وہ اسے ٹائپ کرے۔

کہانی کی خوبیوں اور خامیوں سے قطع نظر وہ پلاٹ بنانے لگا اور انہیں پھیلانے لگا۔ اگلی چھلانگ میں اس کے اندر بیٹھا ہوا مصنف چھلانگ لگا کر باہر آگیا۔ دماغ کے سوتے پھر ابلنے لگے اور ناول نگار ایک بار پھر میدان عمل میں آگیا۔ اب جو ناول لکھے گئے۔ ان میں دھند، تاریکی اور آسیب غائب تھا۔ بہرحال اس کے مداحوں کو یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنی روش پر لوٹ آئے گا اور ان کی تشنگی دور کردے گا۔

تو کیا اب وہ کوئی نشہ نہیں کرتا؟ ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔

میں صرف سگریٹ پیتا ہوں۔ دن میں تین سگریٹ سلگاتا ہوں۔ صبح، دوپہر اور رات۔ میرا ڈاکٹر کہتا ہے کہ تم تین سگریٹ پیتے ہو لیکن یاد رکھنا کہ یہ تیس کے برابر ہیں۔ اگر تم نے ایک سگریٹ زیادہ پی لیا تو یقین کرو کہ یہ چالیس ہوجائیں گے۔ چالیس سگریٹ پینے سے پھیپھڑوں کو کتنا نقصان پہنچتا ہے، یہ تم کو معلوم ہی ہوگا؟

وہ چونکہ تخلیق کار ہے چنانچہ اپنے کالج کے زمانے وہ اسٹیج پر ماڈلنگ کرتا، خود اداکاری کرتا اور سیٹ پر عجیب عجیب چیزیں رکھواتا تھا۔ اس نے کئی بار صوتی اثرات دینے کے لیے حیرت انگیز چیزیں استعمال کیں۔ جب اس کے ناول فلم بند ہونے لگے تو بہت سے ہدایت کاروں نے اس کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اسٹیفن کنگ نے جارج رومیرو کی فلم 'نائٹ رائڈر' میں اپنی تخلیقانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ خیر سے اس نے 1985ء میں ایک فلم کا منظر نامہ لکھا اور اس کی

ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ فلم کا نام "میکسیمم اوورڈرائیو" تھا جو اس کی لکھی ہوئی ایک کہانی 'ٹرکس' پر مبنی تھی۔

وہ اور اس کی بیوی تابیتھا ایک مقامی اسکول میں نادار بچوں کو وظیفے تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی قومی اداروں میں بھی مفلس بچوں کی امداد کے لیے رقومات جمع کراتے ہیں۔

اسے راک اینڈ رول موسیقی سننے کا اور ایسی تقریبات میں شریک ہونے کا شوق ہے جہاں راک اینڈ رول کے پروگرام ہوتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ گھنٹوں ساحل پر گانے بجانے کی محفلیں سجاتا ہے۔ وہ لیوی کمپنی کی پتلون پہنتا ہے اور پیپسی پینا پسند کرتا ہے۔ ایک قیمتی بال پوائنٹ اپنی جیب میں ضرور رکھتا ہے۔ اسے بیس بال کے مقابلے ٹیلی ویژن پر دیکھنا پسند ہیں۔ وہ ان کا دیوانہ ہے۔

دہشت ناک اور خوفناک ناولیں لکھنے میں اس نے کافی تجربات کیے ہیں۔ اس نے مکمل ناولوں کے علاوہ سیریز بھی لکھی ہیں جن میں "ڈارک ٹاور سیریز" بہت مشہور ہوئی جس میں مرکزی کردار مخصوص تھے۔ اس سیریز کا پہلا ناول 'گنز لنگر' تھا جو زیادہ مقبول نہ ہوا۔ وہ چند بکسٹالوں کے شیلفوں کی زینت ہی بن سکا۔ اسٹیفن نے ہمت نہیں ہاری اور پانچویں ناول پر اس سیریز کو مقبول کرا دیا۔ اس کے قارئین کو اب اس سیریز کے ناولوں کا انتظار رہتا ہے۔

اس کے ناولوں کے بارے میں ایک تبصرہ نگار کا کہنا ہے کہ بعض اوقات ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اس کا انداز بیان قدرے مختلف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سیلمیز لاٹ جدید دور کے ماحول میں بیان کی ہوئی کہانی ہے جو اس سے پیشتر برام اسٹوکر اپنے ناول 'ڈراکیولا' میں پیش کر چکا تھا۔ جب کہ 'دی اسٹینڈ' کی کہانی 'لارڈ آف رنگز' سے بہت ملتی جلتی ہے جو جے۔ آر۔ آر ٹالکنز نے لکھا ہے۔ جس میں بدی اور اچھائی کی قوتیں برسرپیکار ہوتی ہیں۔

ایک انٹرویو کے دوران اس سے پوچھا گیا کہ وہ خوفناک اور ماورا کہانیاں کیوں لکھتا ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس نے جواب دیا کہ گزشتہ دنوں میں نے گوگل پر ایک کہانی پڑھی تھی اور اس کے مصنف کا کہنا ہے کہ وہ حقیقی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے:

ایک شخص کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور اسے پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ کر گھر لے آیا۔ پھر اس نے ایک جار میں الکوحل بھری اور ہاتھ کو اس میں ڈال دیا۔ اس جار کو اس نے تہ خانے میں رکھ دیا۔ اپنا علاج کرایا اور زخم پر پٹی بندھوائی۔ اس کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ ایک بار سردی کے موسم میں اس کے بازو کی وہ جگہ جہاں کبھی اس کا ہاتھ جڑا ہوتا تھا، بہت ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے پوچھا کہ تمہارا ہاتھ کہاں ہے؟

اس شخص نے جواب دیا کہ تہ خانے میں ایک جار میں بند ہے۔ ڈاکٹر نے ہدایت دی کہ اسے جا کر چیک کرو۔ وہ شخص تہ خانے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ جار جو کہ شیلف پر رکھا تھا ٹوٹ گیا ہے اور کھڑکی سے آنے والی سرد ہوا ہاتھ میں لگ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے جار کو لے جا کر آتشدان کے قریب رکھ دیا۔ اسے سردی لگنا بند ہو گئی۔ اسے آپ کیا کہیں گے؟

اسٹیفن بلاناغہ لکھتا ہے۔ جن دنوں وہ لکھنے کی چھٹی کرتا ہے وہ کرسمس کا دن ہوتا ہے، اس کی سالگرہ یا پھر چار جولائی جو اس کی بیوی کی سالگرہ ہے۔ بعض اوقات وہ دو یا تین کہانیوں کا پلاٹ ایک ساتھ لے کر بھی چلتا ہے۔ جو کہانی ذہن میں آ جاتی ہے وہ اس پر کام کرنے لگتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لکھنے کے ساتھ پڑھتا بھی ہے۔ وہ رائٹر جو لکھتے ہیں مگر پڑھتے نہیں وہ کبھی اچھے قلمکار نہیں بن پاتے، البتہ کچھ اوزان بن جاتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ وہ کیوں لکھتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ غالباً پیدا ہی لکھنے کے لیے ہوا تھا، اس لیے وہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ لکھنا ہی اس کی زندگی ہے۔ اس کے پسندیدہ رائٹروں میں رچرڈ میتھیسن اور ایچ پی لوکرافٹ شامل ہیں۔ ان کے بعد اگر وہ کسی سے متاثر ہے تو 'ایڈگر ایلن پو' ہے۔ اس نے اپنے ناولوں میں پو کے متعدد کوٹیشن استعمال کیے ہیں۔

اس سے جب ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کہ ناول یا کہانی لکھنا چاہیے تو اس نے جواب دیا کہ اس کی پہلی لائن قاری کو اپنی طرف بلاتی ہوئی ہونا چاہیے۔ اگر پہلی لائن نہیں تو پہلا پیراگراف ایسا ہونا چاہیے کہ قاری اس میں کھو جائے، ورنہ پہلا صفحہ ایسا ہونا چاہیے کہ قاری کو جکڑ لے اور اس کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کہانی کو پھر سے لکھنا چاہیے۔ قاری اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔ وہ کہانی کو ایک طرف پھینک دے گا۔

مگر میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ کہانی کی پہلی سطر ہی جھٹکا دینے والی ہونی چاہیے۔ باقی کہانی میں کچھ نہیں ہو۔ کہانی طاقت ور ہو تو پھر قاری اسے آخر تک پڑھتا چلا جائے گا۔ کہانی یا ناول میں تجسس ہونا ضروری ہے ورنہ اسے کوئی نہیں پڑھے گا۔

اسٹیفن کا کہنا ہے کہ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر محظوظ ہوتے ہیں، اس لیے وہ انہیں خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں یہ صورت حال بھی پیش کرتا ہے کہ بحالت خوف و دہشت لوگ ایک دوسرے سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔

لوگوں کو خوف زدہ کرنے کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ پہلے اپنے کرداروں کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد حالات و واقعات سے خوف زدہ ہونے لگتے ہیں۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنے ناول لکھ چکا ہے کیا اب بھی کوئی ایسا خیال ہے جس پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو؟ اب وہ کس موضوع پر لکھنا چاہتا ہے؟

اسٹیفن نے جواب دیا کہ اس کے دماغ میں ہزاروں خیالات گردش کرتے رہتے ہیں، جو دماغ توڑ کر باہر آنا چاہتے ہیں۔ ٹریفک بالکل جام ہے۔ میں ان میں سے کسی ایک خیال کو باہر آنے کا موقع دیتا ہوں۔ تھوڑا تھوڑا کرکے باہر نکالتا ہوں۔

میں ساٹھ برس کا ہو گیا ہوں۔ اب میں کتنا لکھ سکتا ہوں؟ زیادہ سے زیادہ دس برس تک میرا دماغ مزید تخلیق کر سکے گا۔ میں اپنے ناول 'لزی اسٹوری' اور 'دی اسٹینڈ' سے بھی اعلیٰ ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ پبلشر مجھے اس کی بھاری رقم ادا کرے۔ میں کسی قیمتی مکان میں منتقل نہیں ہونا چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس ناول پر فلم بنائی جائے یا وہ ٹی وی پلے کے طور پر چھوٹے اسکرین پر پیش کیا جائے۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ دھوم مچ جائے اور میں اس کے حوالے سے یاد رکھا جاؤں۔

☆☆☆

1999ء میں اسٹیفن ایک اندوہناک حادثے سے دوچار ہوا۔ وہ بڑی سڑک (ہائی وے) کے کنارے جا رہا تھا کہ اسے سائڈ سے ایک ٹرک نے ٹکر مار دی تو وہ اچھل کر فضا میں چودہ فٹ اوپر چلا گیا۔ جس کے نتیجے میں اس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اس کی چند پسلیاں، ایک ٹانگ کی ہڈی اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے علاوہ اس کے پھیپھڑوں کو شدید نقصان پہنچا۔ وہ اس طرح سے مجروح ہوا تھا کہ اس کے بچنے کی امید نہ رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے جان توڑ کوشش کی اور اس کے متعدد آپریشن کیے جس کے نتیجے میں اس کا ڈھانچا جڑ گیا۔ تین ہفتوں کے بعد اسے میڈیکل سینٹر سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اسٹیفن نے احتیاط برتی اور وہیل چیئر پر بیٹھ کر وقت گزارا۔ دو ماہ بعد وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ ایک ماہ تک فزیو تھراپی کرانے کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا اور عام انسانوں جیسا ہو گیا۔ اس سے اخباری نمائندے نے پوچھا کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں باسٹھ برس کا ہوں، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری مجروح ٹانگ بیاسی برس کی ہو چکی ہے۔

یہ کہانی یہاں پر ختم نہیں ہوئی۔ اسٹیفن نے وہ ٹرک خرید لیا جس نے اسے شدید زخمی کیا تھا پھر ایک سال بعد جب وہ اپنی صحت مندی کی خوشیاں منا رہا تھا تو اس نے ایک ہتھوڑے سے اس ٹرک کے اپنے ہاتھ سے ٹکڑے کر دیے۔ جب ڈرائیور سے پوچھا گیا کہ یہ حادثہ کیسے ہوا تو اس نے بتایا کہ اس کا کتا جو پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا، اچانک اچھلنے کودنے لگا، اس لیے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ جج نے اس پر ہلکا سا جرمانہ عائد کرکے اسے گھر جانے دیا۔

وہ تندرست تو ہو گیا لیکن اس کی تخلیقی صلاحیت بہرحال متاثر ہو گئی، اس لیے کہ اب وہ زیادہ دیر تک بیٹھ نہیں سکتا۔ اس نے 2002ء میں اعلان کیا کہ اب وہ ناول نہیں لکھے گا۔ اس اعلان سے پیشتر وہ 'دی پلانٹ' نامی ناول لکھ رہا تھا جسے بعد میں آن لائن پیش کر دیا گیا۔ اس کا آنے والا ناول 'رائڈنگ دی بلٹ' ہے۔ 2004ء میں اس نے اپنی زندگی کا سب سے طویل ناول 'انڈر دی ڈوم' لکھا۔ جو بہت جلد نیویارک ٹائمز کی بیسٹ سیلرز لسٹ میں داخل ہو گیا اور کئی ہفتوں تک گرم کیک کی طرح فروخت ہوتا رہا۔

وہ کافی عرصے تک تھکن اتارتا رہا اس کے بعد 2011ء میں اس کا ناول 11/22/63 مارکیٹ میں آیا۔ اس ناول کا ہیرو ماضی میں سفر کرکے جان ایف کینیڈی کے قاتل کو کینیڈی کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ 2013ء میں اس کا ناول 'جوائے لینڈ' آیا۔ سراغ رسانی پر مبنی اس ناول میں قتل کی ایک واردات کی کہانی ہے۔ اس کے علاوہ اکتوبر 2013ء میں اس نے اپنے ناول 'دی شائننگ' کا دوسرا حصہ پیش کیا، جو نیویارک ٹائمز کی بیسٹ سیلر لسٹ کی رو سے فروخت کے اعتبار سے پہلے نمبر پر رہا۔

سیداحتشام

فلسطین، جوروظلم کی سرزمین جس پر مسلمانوں کا حق ہے پھر بھی وہ ان کی نہیں ہے. وہاں کے مظلوموں پر کیسے کیسے افتاد ٹوٹے اسے ہم نے بھی بھلادیا ہے۔ ماضی قریب کی یہ روداد خونِ مسلم کو جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے کہ کس طرح اپنی ہی سرزمین سے انہیں نکال باہر کیا گیا.

لہورلا دینے والی روداد خونچکاں

آبی جہاز پر سوار بے خانماں برباد مسافروں کو دیکھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ ان پریشان حال مہاجروں کی زبوں حالی نے اسے اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ بعض اوقات یہ بھول جاتا تھا کہ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے امیگریشن ڈپارٹمنٹ کا نمائندہ ہے۔ شاذونادر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی خالص امریکی، اچھی خاصی عربی زبان بول لیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے محکمے میں بے حد اہم شخص تصور کیا جاتا تھا۔ عربی زبان بولنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا لڑکپن جدہ میں گزرا تھا جہاں اس کا باپ شہر کے محکمہ آب رسائی میں ٹیکنیشین کی حیثیت سے ملازم تھا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ واپس امریکا چلا گیا تھا اور شروع شروع میں انگریزی اسے عجیب وغریب زبان لگتی تھی۔

امریکا کے لیے فلسطین سے وسیع پیمانے پر بے دخل کیے جانے والے ان مہاجرین پر نگاہ رکھنا اشد ضروری تھا۔ چنانچہ امریکی حکومت کی ایما پر، کارٹر، ایک جلاوطن شہری کے روپ میں مہاجرین کے اس جہاز پر موجود تھا۔ تقریباً سارے مسافر فلسطین کے مقام حینہ سے سوار ہوئے تھے اور کسی بھی ملک میں پناہ حاصل کرنے کے ارادے سے ملک در ملک چکر لگا رہے تھے لیکن کوئی بھی ملک اپنے مسائل کے پیشِ نظر انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ برطانیہ نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے خیال سے بے حد سخاوت اور فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جہاز کے لیے تیل فراہم کیا تھا اور مہاجرین سے لدا ہوا یہ جہاز برطانیہ کے فراہم کردہ ایندھن کے بل بوتے پر بحیرہ اوقیانوس عبور کر چکا تھا۔ یہ لوگ اب تک یوروگوئے، برازیل پناما، وینزویلا کے دروازے پر دستک دے چکے تھے لیکن کوئی بھی ملک ان بدنصیب مہاجروں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔

جہاز کے بوڑھے کیپٹن میک نے عہد کیا تھا کہ وہ ان بے وطن مہاجروں کے لیے کہیں نہ کہیں کوئی جگہ تلاش کرے گا۔ وہ آزادی کا زبردست حامی تھا اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح جہاز پر سوار کر کے سمندر کے حوالے کر دیے جانے پر سخت برہم تھا۔ اس کی انسانیت نوازی نے مسافروں کو حوصلہ بخشا تھا اور صورتِ حال اتنی بری نہیں تھی جتنی ایسے حالات میں ہونی چاہیے تھی۔ جہاز کے سستے حصے میں ڈھائی سو مسافروں کا ہجوم تھا جب کہ تقریباً تین درجن مسافروں نے کیبنوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ جہاز میں اشیائے خوردونوش کی قلت تھی اور جب سمندر میں جوار بھاٹا آتا تھا تو جہاز ہچکولے کھانے لگتا لیکن نئے وطن کی آس نے ان مہاجروں کے حوصلے بلند کر رکھے تھے۔ حیفہ کو خیرباد کہنے کے بعد سے اب تک صرف چار مسافروں کی موت واقع ہوئی تھی۔

☆☆☆

کارٹر شروع ہی سے مسافروں پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ مہاجروں کے اس جہاز پر کم ازکم ایک اسرائیلی جاسوس موجود تھا اور کارٹر کا کام اسے شناخت کرنا تھا۔ وہ ''ریاتف'' کے مقام سے تین ہفتے قبل فلسطینیوں کے ایک فرضی حامی اور محب وطن کی حیثیت سے سوار ہوا تھا۔ یہ ایک اچھا بہروپ تھا لیکن اپنے اس بہروپ کی وجہ سے وہ مسافروں میں مقبول نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے ایک مسافر کے ہر مسافر اس سے دور بھاگتا تھا اور وہ واحد مسافر شروع ہی میں اسے شناخت کر چکا تھا لیکن کارٹر بھی اس مسافر کی اصلیت سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ تھا اور وہ بھی کارٹر کی طرح مسافروں پر نظر رکھنے کی غرض سے جہاز پر موجود تھا۔ اس نے کارٹر کو اپنا نام اینڈرسن بتایا تھا ساتھ ہی اسے اپنے مشن سے آگاہ کیا تھا۔ وہ بھی مہاجر کا روپ اختیار کیے ہوئے تھا۔ وہ مصنوعی طور پر لنگڑاتا بھی تھا۔ اس نے خود کو اسرائیلی قید سے فرار ہونے والا ایک پولیس آفیسر ظاہر کیا تھا۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کو نظر انداز کرنا ہی دانش مندی تھی لیکن ان تین ہفتوں کے دوران میں انہوں نے کئی موقعوں پر بے حد محبت بھرے انداز میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کیا تھا مگر وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے قریب نہیں رکتے تھے۔

''جہاز پر ایک ایسا مسافر بھی سوار ہے جس پر اسرائیلی حکومت ہاتھ ڈالنے کے لیے بے چین ہے۔'' اینڈرسن نے کارٹر سے سرگوشی کی۔ ''میں اس جہاز ''پورانیا'' پر حیفہ سے روانگی کے وقت سوار ہوا تھا لیکن اب تک اس مسافر کو شناخت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں اور نہ ہی اس ایجنٹ کو پہچان سکا ہوں جو یقیناً اسی جہاز پر موجود ہے۔ دونوں بلا کے چالاک ہیں۔ اگر وہ سستے حصے والے میں ہیں تو میرے لیے انہیں شناخت کرنا ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے عربی زبان کم کم آتی اور میں ان لوگوں میں گھل مل نہیں سکتا لیکن اگر وہ ہمارے سیلون والے حصے میں ہیں تو بات دوسری ہے۔

''کارٹر میں تم سے شرط لگا سکتا ہوں، جیسے ہی کوئی ملک ان مہاجرین کو لینے پر آمادہ ہو جائے گا، خواہ وہ کوئی بھی ملک ہو، ویسے ہی کوئی ناخوش گوار واقعہ جنم لے گا۔ میرا قیاس ہے کہ ہمارے اس اسرائیلی دوست نے اس وقت تک کے لیے اپنی کارروائی ملتوی کر رکھی ہے کیونکہ ایک امریکی جہاز پر کسی کو قتل کر کے بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔''

''قتل؟'' کارٹر چونک پڑا۔

اینڈرسن نے شانے اچکائے۔ ''دراصل اسرائیلی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی پہنچ کہاں تک ہے۔'' وہ بولا۔

کارٹر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکا

کیونکہ اس نے اپنے مجمعے سے خاموش رہنے کا عہد کیا تھا۔

☆☆☆

شاید وہ بہت کچھ جانتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کسی شخص سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ اس نے عرشے پر موجود مسافروں کی طرف دیکھا۔ ان میں مولوی سلمان اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھا، جو اس کے بازوؤں سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے شاید ہی باپ بیٹی کی ایسی پُرجوش اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والی جوڑی دیکھی تھی لیکن ممکن ہے، غریب الوطنی کے احساس اور ان کے ساتھ پیش آنے والے عظیم المیے نے قدرتی طور پر انہیں اس حد تک ایک دوسرے سے قریب کردیا ہو۔ ہر جمعہ کو، جو ان کا مقدس دن ہوتا ہے، سلمان مذہبی جلسہ منعقد کرتا تھا۔ وہ اپنے فرقے کے لوگوں کے درمیان تقریر کرتے ہوئے، کوئی بہت ہی برگزیدہ ہستی نظر آتا تھا۔

کارٹر نے ایک بات نوٹ کی تھی۔ وہ یہ کہ لڑکی کسی مسافر سے بات نہیں کرتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ قصداً کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ طعام کے موقعوں پر بھی اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ دونوں باپ بیٹی کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ عرشے پر ٹہلتے نظر آتے تھے لیکن لڑکی زیادہ تر اپنے کیبن ہی میں مقید رہتی جو اس کے باپ کے کیبن سے ملحق اور کارٹر کے کیبن سے کچھ ہی فاصلے پر مخالف سمت میں واقع تھا۔ لڑکی کو ایک اعتبار سے خوبرو اور پُرکشش کہا جاسکتا تھا۔ اس کی عمر تقریباً پچیس سال رہی ہوگی۔ سر اور آدھا چہرہ ڈھکا رہتا تھا۔ اپنے باپ کے برعکس وہ دبلی پتلی تھی۔ کارٹر کے ذہن میں ایک دو مرتبہ اس کی ماں کا خیال آیا تھا۔ نہ جانے وہ زندہ تھی یا اسرائیلیوں کے ظلم و بربریت کا شکار ہوگئی تھی۔

ان دونوں پر نگاہ رکھنے والا واحد شخص کارٹر ہی نہیں تھا۔ بلکہ ایک اور درمیانی عمر اور چھریرے جسم کا چشمے والا شخص بھی ان پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ یقیناً مسلمان نہیں تھا۔ اس کا نام سلاونسکی تھا اور وہ جب سے جہاز پر سوار ہوا تھا، اس وقت سے ان دونوں باپ بیٹی کو نگاہ میں رکھے ہوئے تھا لیکن اس نے کبھی ان سے گفتگو کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کارٹر نے باپ بیٹی کے قریب سے گزرتے ہوئے، لڑکی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی کے گلے کی رنگت بقیہ حصوں کی بہ نسبت بدرنگ تھی۔ اسکارف ذرا سا ہٹا ہوا تھا اسی لیے رنگت نظر آگئی تھی۔

☆☆☆

جہاز کے بوڑھے کیپٹن میک کے ہاتھ میں میگا فون تھا اور اس کے پاس ہی ایک مسافر کھڑا تھا۔ "آ جنگ" وہ بولا۔ "توجہ فرمایئے۔ ممکن ہے، ہمیں ہوانا میں اترنے کی اجازت دے دی جائے۔ تاہم کیوبا کی حکومت اب تک اس بات کا فیصلہ نہیں کرسکی ہے۔ ہم ایک دو دن میں اس کے فیصلے سے آگاہ ہوجائیں گے۔ دریں اثناء امریکی حکومت کیوبا کی حکومت سے مہاجرین کو عارضی پناہ دینے کی پُرزور سفارش کررہی ہے۔ کیوبا کی حکومت کے فیصلے سے آگاہ ہونے تک جہاز ہوانا کی بندرگاہ سے باہر کھلے سمندر میں کھڑا رہے گا۔ ساتھیو! اپنے حوصلے بلند رکھو۔ اگر کیوبا کی حکومت نے ہمیں مسترد کردیا تو ہم اپنی کوششیں ترک نہیں کریں گے اور میں اپنے پورا نیا کو یورپ کے پانیوں میں ہرگز واپس نہیں لے جاؤں گا۔"

مہاجروں کی بیشتر تعداد انگریزی زبان سے نابلد تھی۔ مسافر ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے، آگے بڑھ کر کیپٹن کے قریب پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کی حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کیپٹن پر اس طرح جمی ہوئی تھیں گویا اس نے ان پر سحر پھونک دیا ہو۔ ماحول میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ کیپٹن نے اعلان ختم کرکے میگا فون اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک مسافر کو تھما دیا تاکہ وہ اس کے اعلان کا عربی میں ترجمہ کرکے سب کو سنا دے اور جونہی وہ اپنے اس فرض سے فارغ ہوا مجمع سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اس آہ و بکا میں سارے جہاں کی مایوسی اور محرومی گھلی ہوئی تھی۔ ان کے شانے جھول گئے تھے اور سر جھک گئے تھے۔ غالباً انہیں اس قسم کی طفل تسلیاں پہلے بھی دی جاتی رہی تھیں۔ جہاز کا عملہ مجمعے کو ہانک کر نیچے پہنچا رہا تھا۔ وہ مایوس اور دل شکستہ، بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگے تھے۔ عرشہ، مسافروں سے خالی ہوتا جارہا تھا۔ جو لوگ چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھی جو حسبِ معمول اپنے باپ سے چپکی ہوئی تھی اور سلاونسکی بھی تھا، جس کی نگاہیں معمول کے مطابق ان کا تعاقب کررہی تھیں۔ اینڈرسن حسبِ عادت تنہا ٹہل رہا تھا۔ کارٹر جونہی اس کے قریب سے گزرا، اس نے اپنے جبڑوں کو جنبش دیے بغیر سرگوشی کی۔ "میں نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

کارٹر کوئی جواب دیے بغیر عرشے کے سرے تک گیا۔ پھر مڑا اور اس کے قریب سے گزرتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں؟"

"میں نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے کامل یقین ہے...... میں کسی کی شکل کبھی نہیں بھولتا۔"

کارٹر دوبارہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور باپ بیٹی کے قریب سے گزرتے ہوئے، لڑکی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اگلی مرتبہ اینڈرسن نے سرگوشی کی۔ "شاید براعظم یورپ کے کسی مقام پر......اس سال یا گزشتہ سال۔"

جہاز کا سائرن بج اٹھا۔ طعام کا وقت ہوگیا تھا۔ سیلون کے مسافر نیچے اترنے لگے۔ طعام کی میز پر کارٹر کی نشست میز کے دوسرے سرے پر سلمان اور اس کی بیٹی کے تقریباً مقابل واقع تھی۔ سلاونسکی اس کے دائیں جانب ایک نشست چھوڑ کر بیٹھا تھا اور ان دونوں کے درمیان ایک تندرست و توانا عورت براجمان تھی۔ طعام کے دوران بہت ہی مختصر سی گفتگو ہوئی۔ جلا وطنوں کی طبیعت ہلکی پھلکی گفتگو پر آمادہ نہیں ہورہی تھی اور پھر اتنی ساری زبانیں بولی جارہی تھیں کہ لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ اینڈرسن کافی فاصلے پر براجمان ہونے کی وجہ سے کارٹر کی نگاہوں سے تقریباً اوجھل تھا۔ ہاں، کیپٹن میک اپنے چیف افسروں کے درمیان میز کے وسط میں تھا۔ لوگ خاموشی سے کھانے میں مشغول تھے۔ کھانا تقریباً اختتام کو پہنچ گیا تھا کہ دفعتاً کیپٹن اپنی نشست سے اٹھ کر سب سے مخاطب ہوا۔

"دوستو! آج میں ایک پھل سے آپ لوگوں کی تواضع کرنا چاہتا ہوں جو ہمدردوں نے ہمیں ساحل سے بھیجا ہے اور ان کے اس سلوک نے ہمارا دل جیت لیا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے اسٹیوارڈ جان کو اشارہ کیا۔

اسٹیوارڈ جان اپنی شکل و شباہت، بالوں کی رنگت اور سرو نیلی آنکھوں کی وجہ سے نہ صرف سوفی صد نازی نظر آتا تھا بلکہ نازی ہی تھا لیکن مسافروں سے اس کا رویہ ہمیشہ قابلِ تعریف رہا تھا۔ کیپٹن کا اشارہ پاکر وہ باہر چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں سنگتروں سے بھری ایک بہت بڑی قاب سنبھالے داخل ہوا۔ مسافروں کے منہ سے مسرت بھری چیخیں نکل گئیں۔ جان نے سنگترے تین بڑی ڈشوں میں سجا دیے۔ فلسطین چھوڑنے کے بعد کسی نے بھی سنگترے نہیں دیکھے تھے۔ اگرچہ جنوبی امریکا کے مختلف ساحلوں سے انہیں کھانے پینے کی مختلف اشیا بھیجی گئی تھیں لیکن ان میں سنگترے شامل نہیں تھے۔

کارٹر اور اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تندرست عورت نے سنگتروں پر بیک وقت ہاتھ مارا۔ نتیجتاً نصف درجن سنگترے ڈش سے لڑھکتے ہوئے، مولوی کی بیٹی کی گود میں جا گرے۔ وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور سنگترے اٹھا کر خاموشی سے میز پر رکھ دیے۔ کارٹر نے دیکھا، اس کے معذرت طلب کرنے کے باوجود لڑکی نے اپنی نگاہیں نہیں اٹھائیں۔ ہر شخص سنگترے کے چھلکے اتارنے اور کھانے میں مصروف ہوگیا تھا۔ پھر کارٹر نے محسوس کیا، لڑکی نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی تھی۔ یہ محض ایک لمحہ کی بات تھی۔ پھر وہ سنگترے کھانے میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

"میں ان بے چاروں کو سنگترے کھاتے ہوئے دیکھ کر بے حد خوشی محسوس کررہا تھا۔" اسٹیوارڈ جان نے کارٹر کا شکریہ ادا کرنے پر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"تم مسافروں سے بہت اخلاق سے پیش آتے ہو۔" کارٹر نے اعتراف کیا۔

"کیوں نہ آؤں؟" وہ بولا۔ "مسٹر مرفی، آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم سارے عیسائی درندے نہیں ہیں۔"

"کاش تمہارے بیشتر ہم وطن بھی تمہاری طرح محسوس کرتے۔" کارٹر نے کہا۔

"مسٹر مرفی، یقین کریں، ہم میں سے لاکھوں افراد صرف اسرائیل کی شکست دیکھنے کے لیے زندہ ہیں۔"

کارٹر عرشے پر چلا گیا۔ رات ہوچکی تھی۔ ہوانا کی جگمگاتی روشنیاں بے حد قریب محسوس ہورہی تھیں۔ سیلون کے تقریباً سارے ہی مسافر عرشے پر موجود تھے اور حسرت آمیز نظروں سے جھلملاتی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔ نچلے عرشے پر بھی کچھ مسافر موجود تھے۔ وہاں سے قرآنی آیتوں کی آوازیں ہولے ہولے لہراتی ہوئی، کارٹر کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اس نے جھک کر نیچے دیکھا اور اسے یاد آگیا کہ یہ جمعہ کی شب تھی اور مسلمانوں کے مقدس دن جمعہ کی شب کا آغاز ہوچکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا، آگے بڑھنے لگا۔ وہاں اس کی نگاہ مولوی کی بیٹی پر پڑی جو کچھ فاصلے پر عرشے کے جنگلے کے پاس تنہا کھڑی تھی۔ اس کی نظریں بندرگاہ کی جھلملاتی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں لیکن عرشے پر صرف وہی تنہا نہیں تھی۔ ایک طرف اینڈرسن بھی تنہا کھڑا تھا۔ کارٹر خاموشی سے اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ "تمہارے کھیل کی رفتار کیا ہے؟" اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے، میں صحیح راہ پر لگ گیا ہوں۔ تم اپنی

سناؤ۔'' اینڈرسن نے بھی دھیرے سے پوچھا۔

''میں نے ایک کو شناخت کرلیا ہے۔'' کارٹر نے سرگوشی کی۔

''ایک کو؟...... کیا تمھیں ایک سے زیادہ کی تلاش ہے؟''

''میں ایک نازی اور ایک ایسے مسافر کی تلاش میں ہوں جو آپس میں گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ ان میں کون سے دو افراد مجھے مطلوب ہیں۔''

''اگر تمہاری مراد سلادنسکی سے ہے تو......'' اینڈرسن نے سرگوشی کی۔ ''میں شروع ہی سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔''

''میری مراد سلادنسکی سے نہیں ہے حالانکہ وہ میرا دوسرا مطلوبہ شخص ہوسکتا ہے۔'' کارٹر نے کہا۔

''ان میں سے دو افراد سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

اسی لمحے دو مسافر کہیں سے ان کے قریب آگئے۔ ان کے قریب آنے کے انداز سے بیگانگی اور بے پروائی ٹپک رہی تھی لیکن کارٹر ان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا، مولوی کی بیٹی کے پاس پہنچ گیا جو بدستور ساحل کی روشنیوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ وہ بھی اس کی تقلید میں روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر عربی زبان میں گویا ہوا۔

''میرے خیال میں آپ اس بات کی توقع کررہی ہیں کہ کل ہم لوگ ساحل پر پہنچ جائیں گے۔''

''ہم بھی اس کی توقع کررہے ہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اس کی آواز مدھم اور مترنم لیکن قدرے بھاری تھی۔ ایسی آواز بے شمار مردوں کے لیے حد درجہ کشش رکھتی ہے لیکن اس نے گردن موڑ کر کارٹر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''نچلے عرشے سے تلاوت کی مدھر لے سنائی دے رہی ہے۔'' کارٹر نے سلسلہ تکلم دراز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''آپ عموماً اپنے والد کے ہمراہ نظر آتی ہیں...... ہے ناں؟''

''ہاں، عموماً۔'' اس نے جواب دیا۔ اس دفعہ اس کے لہجے میں قدرے برہمی کی آمیزش تھی۔ گویا وہ تنہائی چاہتی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے سنگترے گرادیے تھے۔ وہ محض میری حماقت تھی۔'' کارٹر بولا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے پلکیں اٹھا کر کارٹر پر ایک تیز سرسری نظر ڈالی اور اپنی گردن موڑ لی۔

اس کا یہ انداز اس بات کا مظہر تھا کہ وہ اب مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کارٹر اس کے پاس سے ہٹ کر عرشے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے مڑ کر اس جگہ نظر دوڑائی جہاں لڑکی کھڑی تھی تو وہ جگہ سنسان نظر آئی۔ لڑکی جا چکی تھی۔ تقریباً سارے ہی مسافر نیچے جا چکے تھے۔ عرشے کا آخری حصہ بالکل ویران ہورہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آخری حصے تک پہنچ گیا اور اس نے سمندر کی تاریک لہروں پر نظریں مرکوز کردیں۔ اب وہ یقین کی سرحد کو چھو چکا تھا۔ اسے مطلوبہ شخص مل گیا تھا لیکن ابھی دوسرا اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔

معاً اسے کچھ فاصلے پر جنگلے کے قریب ہی کسی شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹ کر اس جانب دیکھا اور سکتے میں رہ گیا۔ فرش پر ایک شخص ساکت پڑا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اسے خیال گزرا کہ ممکن ہے وہ بحری بیماری میں مبتلا ہوکر بے ہوش ہوگیا ہو۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن سمندر بالکل پُرسکون تھا اور پھر سمندر میں کئی ماہ گزار دینے کے بعد عموماً اس قسم کی شکایت نہیں ہوتی ہے۔ وہ چند لمحے کھڑا اس شخص کو گھورتا رہا لیکن اس شخص میں کسی طرح کی بھی جنبش نہ تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اسٹیو اوا جان تھا اور مردہ تھا۔ اس کی پشت پر ایک گہرا زخم تھا۔ قاتل نے عقب سے دل کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے زخم میں یا اس کے اردگرد کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ قتل کے بعد ہتھیار سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس کے لباس کی تلاشی لی گئی تھی کیونکہ ساری جیبیں الٹی ہوئی تھیں۔ شاید قاتل عجلت میں تھا یا پھر اسے جیبوں کو سیدھا کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن قتل انتہائی مہارت سے کیا گیا تھا۔

☆☆☆

کارٹر نے فوراً عملے کے ایک فرد کو بلا کر اسے اس واردات سے آگاہ کیا۔ اس نے کارٹر سے لاش کے پاس رہنے کی درخواست کی اور کیپٹن کو بلانے چلا گیا اور قبل اس کے کہ کارٹر اس صورتِ حال کو سمجھ پاتا، وہ شخص کیپٹن کو اپنے ساتھ لے کر آگیا۔ کیپٹن نے لاش کا معائنہ کیا۔ ''یہ کب ہوا؟'' اس نے کارٹر سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' کارٹر نے جواب دیا۔ ''میں نے تقریباً چار منٹ پہلے لاش دیکھی ہے۔''

''تم نے کسی کو بھی قریب سے نہیں دیکھا؟''

''عرشے پہ جم غفیر تھا۔ میں اپنے خیال میں مگن ٹہل رہا تھا ادھر آیا تھا کہ اس پر نظر پڑ گئی۔''

''اچھا، اب سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں مسافروں کو اس سانحے سے لاعلم رکھنا ہے۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ جان علیل ہے۔ اگر ہمیں یہاں، ہوانا میں اترنے کی اجازت نہ ملی تو پھر ہمیں مجبوراً انہیں بتانا پڑے گا کہ جان مر گیا ہے۔ یہ مسافروں میں خوف اور دہشت پھیلانے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش آسکتا ہے لیکن یہ ہرگز توقع نہیں تھی کہ جان شکار بنے گا...... بے چارا۔''

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ یہودیوں سے نفرت کرتا ہے اور اسرائیل کی شکست کا متمنی ہے۔'' کارٹر نے آگاہ کیا۔

''اور یہ سچ ہے۔'' کیپٹن نے پُرجوش لہجے میں تائید کی۔ ''یہ ایک اچھا انسان تھا۔ میں نے اسے استنبول سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ تم اپنی زبان بند رکھو گے اور بالکل گونگے بن جاؤ گے، سمجھ گئے؟'' اس نے اپنے ماتحت کو ہدایت کی جو دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے جان کی لاش کو ایک ٹک گھورے جا رہا تھا۔

''آؤ، ہم لاش کو اس کے کیبن میں پہنچا دیں لیکن انداز ایسا ہو کہ دیکھنے والا یہی سمجھے کہ یہ چل رہا ہے۔'' کیپٹن نے نرمی سے کہا۔ ''اور تم بھی ہمارے ساتھ آؤ۔'' اس نے آخری جملہ کارٹر سے مخاطب ہوکر کہا۔

''میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔'' کارٹر نے پیشکش کی۔

''نہیں ہم یہ کام خود کرلیں گے۔ تم بس عام انداز میں ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔ یہی کافی ہوگا۔''

☆☆☆

جہاز کے عملے کو اس سانحے سے آگاہ کرنا ضروری تھا اور جب انہیں علم ہوا تو وہ حواس باختہ ہوگئے۔ لیکن کیپٹن نے انہیں خاموش کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آیا اور کارٹر کو لے کر اپنے کیبن کی سمت روانہ ہوگیا۔ کیبن میں پہنچ کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ''تم جان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا میں مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہوں؟'' کارٹر نے سوال کیا۔

''ہر شخص اسی فہرست میں شامل ہے اور تم جائے وقوعہ پر موجود تھے۔ برسبیل تذکرہ تمہاری وطنیت کیا ہے؟''

''میں نے بہ حیثیت چیک خود کو رجسٹر کرایا ہے، مجھے فلسطینیوں کا حامی ہونے کے شک پر نکال دیا گیا ہے۔''

''یہ میں جانتا ہوں۔ اور اگر یہ سچ ہے تو تم پہلے چیک ہو جس نے عملی طور پر غدار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے مسافروں کو کس طرح بے وقوف بنایا ہے۔ لیکن تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے اور نہ ہی اوبلونسکی مجھے بے وقوف بنا سکتا ہے۔''

اوبلونسکی، اینڈرسن کا جعلی نام تھا۔ کارٹر مسکرایا۔ ''کیپٹن، تم کافی ہوشیار ہو۔'' وہ بولا۔

''تمہارا خیال غلط ہے۔ اوبلونسکی انگریز ہے اور اس کا تعلق سیکرٹ سروس سے ہے۔ تم دونوں، مسافروں کی صف سے بہ آسانی الگ کیے جاسکتے ہو۔ تمہیں کسی قسم کا اقرار کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''میں کر بھی نہیں سکتا۔'' اس دفعہ کارٹر نے شکست تسلیم کرلی۔ ''میں تم سے معاملہ صاف رکھنا چاہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے اس واقعہ سے نتیجہ اخذ کرلیا ہوگا۔''

''میں اپنی سوچ سے خوب آگاہ ہوں لیکن مجھے ریکارڈ کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔'' کیپٹن بولا۔ ''تمہیں پتا ہے، ہمارا ریڈیو ٹوٹا ہوا ہے۔ میں ساحل پر موجود حکام کو جگانے کے لیے ایک لانچ بھیج رہا ہوں۔ وہ آکر تمہیں پوچھ گچھ کے لیے لے جائیں گے۔''

''اور اس دوران میں میں کیا کروں گا؟''

''نیچے جاؤ اور وہیں انتظار کرو۔ مسافروں میں شامل نہ ہونا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔''

''اگر میں گرفتار ہوگیا تو ازراہ کرم، میری طرف سے امریکی قونصل کو مطلع کردینا۔'' کارٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کیپٹن نے اس پر اعتبار کیا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا، کیبن سے نکل کر خاموشی سے روانہ ہوگیا۔ اس کے ذہن پر ایک بوجھ سا تھا۔ اگر جان واقعی مہاجروں کا ہمدرد تھا تو ممکن ہے یہودیوں کے لمبے ہاتھوں نے اسے شکار کرلیا ہو۔ اگر وہ ایک رضاکار فوجی تھا تو بھی یہودیوں کی نگاہ میں اس کے جرائم کی نوعیت کم نہیں ہوگئی تھی۔ جنوبی امریکا میں یہودیوں

کا جال پھیلا ہوا تھا اور ان کے لیے چھوٹی یا بڑی کارروائی یکساں اہمیت کی حامل تھی۔

کارٹر نے بے بسی سے شانے اچکائے۔ کاش وہ ہوانا کے حکام کی مداخلت سے پہلے اپنی تفتیش مکمل کرسکتا لیکن یہ ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اس قتل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا، لہٰذا اس کا سراغ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بجلی کی بچت کے خیال سے جہاز کی ساری بتیاں دس بجے ہی گل کردی گئی تھیں۔ جہاز مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک ایک سایہ تاریکی سے نکل کر تیزی سے اس پر جھپٹا۔ وہ چونک کر پلٹا لیکن دوسرے ہی لمحے حملہ آور کا گھونسا اس کی پیشانی پر پڑا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس کی کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہو۔ وہ لٹو کی مانند چکرا کر دور جا گرا اور اٹھتے اٹھتے اس نے دیکھا کہ حملہ آور اس پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بلند کرکے اپنے جسم کو سمیٹا اور حملہ آور کے آہنی مکے سے بچنے کے لیے تیزی سے ایک طرف ہوگیا۔ گھونسا اس کے شانے پر پڑا اور بایاں بازو سن ہوگیا۔ حملہ آور نے اس پر چھلانگ لگائی اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوکر عرشے کے فرش پر دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ کارٹر نے حملہ آور کی کلائی اپنی گرفت میں لے لی تاکہ اس کے گھونسوں سے بچ سکے۔ دونوں میں زبردست زور آزمائی ہونے لگی۔ اس کے بعد گھونسوں کا آزادانہ تبادلہ ہونے لگا۔ یکایک کارٹر نے پوری قوت سے اس کے منہ پر داہنا مکا مارا اور بائیں مکے سے اس کی ٹھوڑی پر شدید ضرب لگائی۔ حملہ آور کی گرفت کمزور پڑگئی لیکن پھر کارٹر کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اسے سیلون کا ایک دروازہ اپنی لگا ہوں... میں تیرتا ہوا محسوس ہوا تھا اور اس نے گھٹنوں کے بل دوبارہ کھڑے ہونے کی جدوجہد کی تھی لیکن پھر ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔ بے ہوشی کی یہ کیفیت عارضی تھی۔ چند ہی ثانیے کے بعد اس نے اپنے شانے پر کسی کی گرفت محسوس کی۔ کوئی اسے قدموں پر کھڑا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر اس کے کانوں سے کسی کی آواز ٹکرائی۔ ”خود کو سنبھالو۔ میں اینڈرسن ہوں۔ میں تمہاری تلاش میں ادھر آیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوجاؤ گے۔“

☆☆☆

”میں تمہارا احسان مند ہوں۔“ وہ اینڈرسن سے مخاطب ہوا۔ ”ممکن ہے، کوئی میری طرف سے مشکوک ہوگیا ہو لیکن میں نہیں سمجھتا کہ مجھے شناخت کرلیا گیا ہے۔“

”کیا تم حملہ آور کو جانتے ہو؟“ اینڈرسن نے پوچھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن وہ سلاونسکی جیسا لگتا تھا۔“

”ٹھیک ہے، وہ سلاونسکی ہی تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ معاملے کو کس طرح آگے بڑھایا جائے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری راہیں جدا ہیں۔“

”وہ میرا مطلوبہ شخص نہیں ہے۔“ کارٹر نے جواب دیا۔ ”یہ وہ گمنام شخص نہیں ہے جس کی نگرانی پر مجھے مامور کیا گیا ہے۔“

”اس نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایک لمبا چکر چلایا ہے کہ وہی تمہارا مطلوبہ شخص ہے۔“

”وہ دوسرا مطلوبہ شخص ہوسکتا ہے۔“ کارٹر بولا۔

”کیا تمہاری مراد مہاجر سے ہے؟ مہاجر کسی کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کرسکتے۔ وہ تو خود قتل ہونے سے بچنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔“ اینڈرسن نے کہا۔

”اشتعال میں آکر وہ یہ حرکت کرسکتے ہیں۔ شاید حملہ آور نے یہ سمجھا ہو کہ میں یہودی ہوں اور کسی سے انتقام لینے کی غرض سے یہاں موجود ہوں۔ میری شہرت یہاں کچھ اسی نوعیت کی ہے۔“

اینڈرسن خاموش رہا۔ یہ اس کا کھیل نہیں تھا۔ وہ کارٹر کی طرف سے پہل کرنے کا منتظر رہا لیکن بجائے اس کے کارٹر پوچھ بیٹھا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟“

”مولوی کی بیٹی کو؟...... یقیناً...... غالباً کسی ڈرامے میں دیکھا ہے۔ تم نے بھی غور کیا ہوگا کہ اس کی شخصیت پر ایکٹریس کی چھاپ ہے۔“ اینڈرسن نے کہا۔

”ہاں، میں غور کرچکا ہوں۔“ کارٹر بولا۔

”لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میں اسے شناخت نہیں کرپا رہا ہوں۔ حالانکہ میری یادداشت تقریباً فوٹوگرافک ہے۔ لیکن تم اس میں دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟ کیا تمہارے خیال میں وہ سلاونسکی کی شریک کار ہے؟“

اینڈرسن کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کارٹر بولا۔ ”مجھے تمہیں بتانا تو نہیں چاہیے تھا لیکن...... بات یہ ہے کہ اسٹیوارڈ جان کا قتل ہوگیا ہے۔“

اینڈرسن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”کیا؟ کب؟ کہاں؟“

کارٹر نے پورا واقعہ شروع سے آخر تک بیان کردیا۔

پھر بولا۔ ”شاید تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے محض کوئی شے حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کیا گیا ہے۔ اس کی جیبوں کی تلاشی لی گئی تھی اور وہ خالی پائی گئی ہیں۔“

”یہ لوگ لاش کہاں لے گئے؟“ اینڈرسن نے پوچھا۔

”اس کے کیبن میں۔“ کارٹر نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں محض اس وجہ سے آگاہ کردیا ہے کیونکہ صبح تفتیش و تحقیق شروع ہوگی۔“

”شکریہ۔“ اینڈرسن بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ ہماری راہیں جدا ہیں لیکن تمہیں یہ خیال کیسے گزرا کہ لڑکی سلاونسکی کی شریک کار ہے؟“

”وہ اپنے باپ سے قطعی مشابہت نہیں رکھتی۔“ کارٹر نے جواب دیا۔

”اب تم سلاونسکی کے سلسلے میں کیا قدم اٹھاؤ گے؟ کیا خاموش رہ کر اُسے دوسری مرتبہ قتل کرنے کا موقع دوگے؟“ اینڈرسن نے پوچھا۔

کارٹر نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”کرنا کیا ہے۔“

”کیپٹن میک اسے حراست میں لے سکتا ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہی تمہارا مطلوبہ شخص ہے۔“

”میں اپنے دونوں مطلوبہ اشخاص یعنی شکار اور شکاری دونوں پر بیک وقت ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں۔“ کارٹر نے کہا۔

”میرا مشن......!“ اینڈرسن نے بولا۔ ”اس جہاز پر محض یہودی ایجنٹ پر نگاہ رکھنا ہے۔ اگر تم سلاونسکی کو گرفتار نہیں کرانا چاہتے تو...... بہرحال، میں تم سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ تم اپنے کام کو بہتر سمجھتے ہو۔“

”میں تمہارا حد درجہ مشکور ہوں کہ تم نے میری جان بچائی۔“ کارٹر نے کہا اور اٹھ کر خاموشی سے کیبن سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس نے ابھی اس بات کا فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آیا سلاونسکی ہی وہ مہاجر تھا یا نہیں جو اس کے لیے خاص اہمیت رکھتا تھا لیکن وہ ایک بات ضرور جانتا تھا کہ وہ یہودی ایجنٹ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ سلاونسکی نے محض غلط فہمی کی وجہ سے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن اس پُراسرار واقعہ کے پردے میں پوشیدہ حقیقت کو سامنے لانا ضروری تھا۔

وہ اپنے کیبن میں چلا گیا اور سوٹ کیس کا قفل کھول کر اس نے اندر سے ایک پستول نکالا اور سوٹ کیس کو دوبارہ مقفل کرکے پستول جیب میں ڈال کر راہداری میں نکل گیا۔ راہداری مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ جونہی لڑکی کے کیبن کے قریب سے گزرا، اس کے کانوں سے مدھم آوازیں ٹکرائیں۔ اس کے قدم یکایک تھم گئے۔ اس نے سننے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی اس کے پلے نہیں پڑا۔ اس کی رگِ تجسس پھڑک اٹھی۔ وہ دبے پاؤں مولوی کے کیبن کی سمت بڑھ گیا۔ کیبن میں مکمل تاریکی تھی۔ وہ اس کی دیوار سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ملحق کیبن سے گفتگو کی مدھم آوازیں مسلسل آرہی تھیں، پھر بھی وہ کچھ سمجھنے سے قاصر رہا۔ ہاں، ایسا ضرور لگ رہا تھا کہ مولوی کسی بات پر سخت احتجاج کررہا تھا اور اس کی بیٹی اس سے لڑ رہی تھی۔ ان دونوں کی باہمی محبت اور شفقت کے پیشِ نظر بیٹی کا رویہ عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ وہ جتنی خاموشی سے کیبن میں داخل ہوا تھا، اتنی ہی خاموشی سے کیبن سے نکل گیا۔

اب اس کا رخ سلاونسکی کے کیبن کی طرف تھا۔ کیبن کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا بلکہ اس پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ اس کے ذہن کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اس نے قدم اندر رکھ کر دروازہ خاموشی سے اپنے عقب میں بند کردیا۔ کیبن اتنا تاریک نہیں تھا۔ کھڑکی سے چاند کی کرنیں بستر پر کمبل کے نیچے دراز سلاونسکی کو واضح کررہی تھیں۔

کارٹر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا، اس کے قریب پہنچ گیا اور آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف کرکے غرّایا۔ ”اٹھو، سلاونسکی...... اور ہاں! تکیے کے نیچے سے پستول اٹھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں، تم جاگ رہے ہو۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟“

اسی لمحے دیوارگیر بستر کے قریب ہی فرش پر کوئی چیز دھماکے سے گری۔ کارٹر نے سلاونسکی کے رخسار کو چھوا۔ رخسار برف کی مانند سرد تھا۔ کارٹر نے اسے کھینچ کر بٹھا دیا۔ اس کی گردن ایک طرف جھول گئی۔ وہ مرچکا تھا۔ کارٹر نے لاش کا جائزہ لیا۔ اس کی پشت پر عین ریڑھ کی ہڈی کے مقام پر ایک گہرا زخم تھا۔ کیبن کی ساری چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ کسی نے بری طرح کیبن کی تلاشی لی تھی۔

کارٹر ایک ٹھنڈی سانس لے کر مڑا اور اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ فرش پر پڑے ہوئے ایک سوٹ کیس سے الجھ کر گر پڑا۔ فرش پر سلاونسکی کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

وہ ہتھیلی ٹیک کر اٹھا اور دوسرے ہی لمحے کوئی سرد شے اس کے رخسار سے لگی۔ ساتھ ہی ایک کرخت لیکن پُرسکون آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''حرکت مت کرنا مسٹر مرلی...... یا جو کوئی بھی تم ہو۔ پستول کی نال پر سائلنسر لگا ہوا ہے...... دیکھنا، اس کے پاس پستول تو نہیں ہے۔'' اس آواز نے دوسرے ہیولے کو مخاطب کیا اور دوسرے ہیولے نے پستول کارٹر کے ہاتھ سے اچک لیا۔ یہ مولوی تھا...... پستول بدست لڑکی دوبارہ مخاطب ہوئی۔ ''بہت خوب...... اب ہم ڈیڈی کے کیبن میں چل کر گفتگو کریں گے۔ چلو حرکت میں آ جاؤ۔''

☆☆☆

کارٹر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ راہی کے کمرے میں گہری تاریکی تھی لیکن لڑکی کارٹر کے بے حد قریب کھڑی تھی۔ ''تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔'' وہ مخاطب ہوئی۔ ''یعنی کاغذات کی۔''

''میں تمہارا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔'' کارٹر کے لہجے میں اچنبھا تھا۔

''میرے ضبط کا امتحان مت لو۔'' وہ غرّائی۔ ''کیا مجھے تم کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں شروع ہی میں تمہیں پہچان گئی تھی اور طعام کے موقع پر تمہاری احمقانہ حرکت نے یہ ثابت نہیں کر دیا تھا کہ...... درحقیقت تم کون ہو۔ کیا میں یہ بتاؤں کہ اس شخص سے تمہارا کیا تعلق تھا جسے سلاونسکی کہتے تھے؟ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں اس کی بو پا چکی ہوں تو اس نے کاغذات تمہارے حوالے کر دیے۔ اب کیا تم وہ کاغذات زندہ حالت میں میرے حوالے کرنا چاہو گے یا مرنا پسند کرو گے؟''

''مس' تم سے بحث کرنے کی کوشش عبث ہے۔ تم نے انتہائی غیر مناسب رویہ اختیار کیا ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں وہ کاغذات کبھی نہیں دیکھے جن کا تم ذکر کر رہی ہو۔''

''میں سات تک گنوں گی...... یہ مدت تمہارے لیے کافی ہو گی۔ ایک...... دو...... تین...... چار......!''

''رکو...... رکو۔'' اچانک مولوی دہشت سے چیخ اٹھا۔ ''ممکن ہے یہ سچ کہہ رہا ہو۔ سلاونسکی نے وہ کاغذات کہیں چھپا دیے ہوں گے یا کسی اور کے حوالے کر دیے ہوں۔ ہم مزید کسی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگنا نہیں چاہتے۔ ہم دوسرا قتل کرنا نہیں چاہتے۔''

''شٹ اپ، بوڑھے احمق......!'' فرماں دار بیٹی گرجی۔ ''پانچ...... چھ......!'' وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔ ''سات......!'' مولوی رونے لگا۔ کارٹر اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی اسے گولی نہیں مارے گی۔ تاہم اس کا ذہن شدید تناؤ کا شکار ہو گیا تھا۔ ویسا ہی تناؤ کیبن کے ماحول پر چھا گیا تھا۔

یکا یک لڑکی نے قہقہہ لگایا۔ ''تم میری دھونس میں نہیں آئے لیکن یہ محض دھونس نہیں تھی۔ اگر مجھے کامل یقین ہوتا کہ کاغذات تمہارے پاس ہیں تو میں بلا جھجک تمہیں گولی مار دیتی۔ اب میں ایک متبادل تجویز پیش کرتی ہوں۔ تم عرشے تک جاؤ گے اور سارے کپڑے اتار کر سمندر میں چھلانگ لگا دو گے۔ تیر کر ساحل تک پہنچ سکو گے یا نہیں، یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔ اگر کامیاب ہو گئے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو گا کہ سلاونسکی کو کس نے قتل کیا ہے۔ بولو...... یہ سودا منظور ہے؟ جواب ہاں یا ناں میں دو۔''

''ہاں۔'' کارٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

☆☆☆

پستول کی نال پر سیڑھیاں اترتے ہوئے، اس بات کی کوئی اُمید نہیں تھی کہ اس بار بھی اینڈرسن یا کسی اور جانب سے کوئی مداخلت ہو گی۔ اسے کامیابی کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ لڑکی کی ہدایت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ جہاز کے جس حصے میں نمودار ہوئے تھے، وہ بالکل ویران تھا۔

''کوئی چال چلنے کا فائدہ نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے، کپڑے اتار کر چھلانگ لگا دو۔ میں تمہیں تین منٹ کی مہلت دیتی ہوں۔'' لڑکی بولی۔

''میں انسان ہوں کوئی گھڑی نہیں۔'' کارٹر جل کر بولا اور کپڑے اتارنے لگا۔

اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ غور کر رہا تھا کہ کس پہلو سے لڑکی پر حملہ کرے۔ دائیں پہلو سے؟ نہیں لڑکی کے پستول کی گولی عین اس کے قلب میں پیوست ہو جائے گی...... بائیں پہلو سے......؟ لیکن اس صورت میں اس کے جگر کا بھرتا بن جائے گا۔ یہ انتہائی سنسنی خیز لمحات تھے۔ اس نے اپنا کوٹ اتار دیا تھا۔ یکا یک اس نے کوٹ لڑکی کے سر کی طرف اچھال کر بائیں جانب چھلانگ لگائی۔ کوٹ لڑکی کے سر کے گرد لپٹ گیا۔ لڑکی نے بوکھلا کر گولی

چلا دی۔ فضا گولی کی آواز سے تھرا اٹھی۔

اچانک مولوی نے لڑکی کا پستول والا ہاتھ، بازو سے تھام لیا اور دوسرا ہاتھ شانے پر رکھ کر اسے پیچھے گھسیٹ لیا۔ ''جلدی کرو، جلدی...... میں مزید نہیں ٹھہر سکتا۔'' وہ چیخا۔

لڑکی کوٹ میں الجھ کر رہ گئی تھی اور اس سے قبل کہ وہ بڈھے کو دھکا دے کر کوٹ سے نجات حاصل کرتی، کارٹر نے بڑھ کر اس کے جبڑے پر بھرپور مکا مارا۔ وہ اچھل کر دور جا گری اور فرش پر بکھر کر ساکت ہو گئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آواز پیدا کرتا ہوا دور جا گرا تھا۔

جائے واردات پر سب سے پہلے پہنچنے والا شخص اینڈرسن تھا۔ اس کے پیچھے کیپٹن، اپنے اس ساتھی کی رفاقت میں چلا آ رہا تھا جس نے جان کی لاش اٹھانے میں اس کی مدد کی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے فرش پر بکھری ہوئی بے ہوش لڑکی پر نگاہ ڈالی، پھر کارٹر پر اور آخر میں مولوی کی جانب دیکھا جو متواتر چیخے جا رہا تھا۔

''خاموش۔'' کیپٹن غرّایا۔ ''کیا تم جہاز کے مسافروں میں خوف و ہراس پھیلانا چاہتے ہو؟ اور یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟'' کیپٹن نے تیزی سے سوال کیا۔

''یہ اس شخص کے بارے میں کہہ رہا ہے جو اس وقت تمہارے سامنے لڑکی کے بھیس میں بے ہوش پڑا ہے۔'' کارٹر نے کیپٹن سے کہا۔ ''اس بڈھے کو لے جا کر لاک اپ میں بند کر دو۔ جان اور سلاونسکی کو اسی نے قتل کیا ہے۔''

☆☆☆

کیپٹن کے کیبن میں اینڈرسن کہہ رہا تھا۔ ''مجھے یقین تھا کہ میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا تھا لیکن وہ چونکہ لڑکی کے بھیس میں تھا، اس لیے مجھے اس کو پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کا نام شلز ہے اور وہ بھیس بدلنے میں ماہر ہے۔ پانچ چھ سال قبل اس نے برلن میں کافی دھوم مچائی تھی۔ بہر حال...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے بہروپ نے مجھے بھی دھوکا دے دیا لیکن تم اس کی طرف سے کیوں مشکوک ہو گئے تھے؟'' اس نے کارٹر سے پوچھا۔

''دراصل اس کے گردن کی رنگت نے میرے ذہن میں شبہات کو جنم دیا تھا اور تم نے بھی اس پر غور کیا ہو گا لیکن یہ کوئی بہت اہم یا چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے جس شے پر غور کیا وہ اس کے گھٹنے تھے۔ عورتوں کے گھٹنوں کی بناوٹ مردوں کے گھٹنوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ جاننے کے لیے تمہیں کسی ماہر بشریات سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک عام آدمی بھی اس سے واقف ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے گھٹنے مردوں جیسے تھے۔ تاہم میرے شبہے نے اس وقت تک یقین کی منزل کو نہیں چھوا تھا تاوقتیکہ میں نے اس پر ایک پرانا اور آزمودہ حربہ استعمال نہیں کیا۔'' کارٹر نے ایک لمحہ توقف کیا اور دوبارہ گویا ہوا۔ ''اس روز طعام کے موقع پر میں نے قصداً سنگتروں پر ہاتھ مارا تھا اور سنگترے اس کی گود میں جا گرے تھے اور جب اس کے گھٹنے آپس میں ملنے کی بجائے پھیل گئے تو میرے شبہے نے یقین کی منزل کو چھو لیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ میری اس چال کو سمجھ گیا اور جان گیا کہ میں اس کی حقیقت سے واقف ہو گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اہم شخص جس کی مجھے نگرانی کرنی تھی، اس جہاز پر موجود ہے لیکن مجھے اس وقت تک یقین نہیں آیا کہ وہ شخص سلاونسکی ہے، تب تک اسے شلز نے قتل نہ کر دیا۔ علاوہ ازیں میں مہاجرین میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔''

''لیکن سلاونسکی نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔'' اینڈرسن نے کہا۔ ''اس کی کیا وجہ تھی؟''

''دراصل، وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس جو کاغذات تھے، وہ اتنے اہم تھے کہ وہ اپنے قریب آنے والے ہر شخص کی جانب سے مشکوک ہو جایا کرتا تھا۔ اسے میرے بارے میں بھی کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ شاید وہ یہ سمجھا ہو کہ میں ہی وہ یہودی ایجنٹ ہوں جو اس کے کاغذات حاصل کرنا چاہتا ہے یا پھر ممکن ہے میری نازیوں سے فرضی حمایت کی شہرت نے اسے اس حرکت پر اکسایا ہو۔''

''تو پھر شلز نے جان کو کیوں قتل کیا؟'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' اینڈرسن نے جواب دیا۔ ''جان میرے لیے کام کر رہا تھا اور شلز اسے برطانوی ایجنٹ کی حیثیت سے پہچان گیا تھا۔ ممکن ہے اس نے اسے اشتعال یا خوف کے باعث قتل کر دیا ہو یا پھر اس نے سوچا ہو کہ میں اور کارٹر ایک دوسرے سے شریک کار ہیں اور ہم نے کاغذات جان کے حوالے کر دیے ہیں۔ میرا کام صرف اسرائیلی جاسوس کا پتا لگانا تھا اور میں کسی قسم کے کاغذات کی موجودگی سے قطعی لاعلم تھا۔ یہ تمہارا کھیل تھا کارٹر۔''

''مسٹر'' کارٹر مولوی سے مخاطب ہوا۔ ''اب تمہارا فرض ہے کہ تم سب کچھ تفصیل سے بیان کر دو۔''

مولوی آگے بڑھا۔ اس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

''ہاں۔'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں ہامی بھری۔ ''میں تم لوگوں کو بتاتا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ سلاونسکی کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ رالمہ میں مقیم تھا۔ وہ میرا بہت پرانا دوست تھا اور ریڈار کی ایک نئی قسم ایجاد کرنے کے تجربات کررہا تھا جو کسی بھی حکومت کے لیے ایک انتہائی اہم ہتھیار ہوتا لیکن چونکہ اس کی ماں فلسطینی تھی، لہٰذا اسے کیمپ میں پہنچادیا گیا۔ بعد میں جب اسرائیلیوں کو اس کی ایجاد کی اہمیت کا علم ہوا تو انہوں نے اسے رہا کردیا تاکہ وہ اپنے تجربات مکمل کرسکے لیکن وہ اپنی ایجاد کے فارمولے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح فرار ہوگیا۔''

مولوی ایک لمحے کے لیے رکا اور سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔ ''اس کے فرار ہونے پر اسرائیلیوں نے اس ابلیس شلز کو فارمولا حاصل کرنے پر مامور کیا۔ اس شخص نے پتا لگا لیا کہ میں سلاونسکی کا پرانا دوست ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ میری بوڑھی ماں کو میرے دوستوں نے اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ لہٰذا اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ میری ماں کو یہودیوں کے حوالے کردے گا۔ وہ غریب اسی سال سے بھی زیادہ عمر کی ہے اور اندھی ہے۔ میں یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اسے کسی کیمپ میں بھیج دیا جائے چنانچہ میں اس کے ہاتھوں کھلونا بننے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے میری بیٹی کا روپ دھارا۔ اور مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے پر مجبور کردیا۔ خدا کی پناہ میں کتنی سخت اذیت میں مبتلا تھا، بیان نہیں کرسکتا۔ اب خدا کا شکر ہے، میری ماں سکون کی موت مرے گی۔''

''غور طلب امر یہ ہے کہ......!'' کارٹر نے اسے مخاطب کیا۔ ''وہ کاغذات کہاں ہیں؟ اگر وہ شلز کے ہاتھ نہیں لگے اور اس نے انہیں کہیں چھپایا بھی نہیں ہے تو......؟''

''نہیں، جناب......!'' مولوی بول پڑا۔ ''سلاونسکی جانتا تھا کہ اس کی نگرانی کی جارہی تھی، لہٰذا اس نے کاغذات میرے حوالے کردیے تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ شلز کو ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہیں گزرا کہ کاغذات میرے زیرِ جامہ کے نیچے موجود تھے۔''

☆☆☆

جب مہاجرین کے علم میں یہ بات آئی کہ جہاز پر ایک قاتل موجود ہے اور پولیس بوٹ آکر وہ لاشیں لے گئی ہے لیکن قاتل اب بھی ان کے درمیان موجود ہے تو جہاز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک زبردست خوف و ہراس پھیل گیا۔ پولیس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ چونکہ قتل کیوبا کے حدود میں ہوئے ہیں چنانچہ قاتل ان کے حوالے کیے جائیں۔ جبکہ کیپٹن میک کا یہ موقف تھا کہ قتل چونکہ امریکی جہاز پر ہوا ہے، لہٰذا قاتل کو امریکی حکومت کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس پر مقدمہ چلاسکے۔

کیوبا کی پولیس اور کیپٹن میک کے درمیان اس مسئلے پر کافی بحث ہوتی رہی لیکن کیپٹن اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ ناچار کیوبا کی پولیس نے اس کے موقف کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا۔

☆☆☆

''اٹینشن...... توجہ فرمایئے۔'' کیپٹن میک اپنے ہاتھ میں میگا فون تھام کر چیخا۔ ''کیوبا کی حکومت تمام مہاجرین کو اپنی سرزمین پر عارضی پناہ دینے پر رضامند ہوگئی ہے...... ترجمہ کرکے انہیں بتادو۔'' اس نے آخری جملہ اپنے ساتھی سے کہا اور میگا فون اسے تھمادیا۔

مترجم نے مسافروں کو خوش خبری سنادی اور سارے مسافر ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے۔ وہ رو رہے تھے، ہنس رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ اظہارِ مسرت کے سارے ہی انداز نظر آرہے تھے۔ کارٹر، اینڈرسن کی طرف مڑا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور تھا، لہٰذا تمہیں اپنے مشن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتا سکا۔'' وہ بولا۔ ''شاید ہمیں مستقبل میں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے۔''

''یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔'' اینڈرسن نے خلوص سے جواب دیا۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ ان دستاویزات سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا جو اگر شلز کے ہاتھ لگ جاتے تو پتا نہیں کتنی بڑی تباہی آتی۔ میرا کام محض ایک یہودی کا پتا لگانا تھا اور تم نے اس کا پتا لگا لیا۔ اس طرح میرا کام آسان ہوگیا۔ حالانکہ ہم دونوں کا ہدف ایک ہی تھا، صرف نوعیت مختلف تھی۔''

کارٹر عرشے کا جنگلا تھامے ساحل کو قریب آتے ہوئے دیکھنے لگا، پھر اس نے ہٹ کر مسافروں کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسوؤں نے دیے سے روشن کردیے تھے۔

جنگ و محبت

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ دونوں اپنی اپنی فوجوں کو لے کر ایک دوسرے کے مقابل آئے' ایک طرف ترک فوج کا کمانڈر، حبیب جیسا بہادر سپاہی تو دوسری جانب تاتاری خون، شہنشاہ تیمور تھا لیکن دونوں ہی مستقبل سے بے خبر تھے۔ ان کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ جلد ہی ایک دوسرے کے رفیقِ سفر بن کر دنیا کو حیران کردیں گے۔

تاریخ کے جھروکے سے ایک حیران کردینے والا قصہ

یہ پانچ سو سال قبل کا ذکر ہے۔ قسطنطنیہ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ بازاروں، گلیوں اور گھروں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ترکی کے جانباز جوانوں کی لاشیں باسفورس کی سطح پر تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ شاہی محل کے عین سامنے تیموری افواج اپنا ڈیرا جمائے بیٹھی تھی۔ ترک سپہ سالار زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنی زندگی کا فیصلہ سننے کو تیار بیٹھا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اس پر خوف طاری نہ تھا۔

''موت مانگتا ہے...... یا زندگی؟'' معاً تیموری فاتح اعظم کی آواز بلند ہوئی۔

یزدانی نے بہادروں کی طرح سر اٹھا کر جواب دیا۔ ''اگر عزت کی زندگی ملے تو بہتر ہے ورنہ موت، کیونکہ ذلت کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔''

تیمور کو ایسے الفاظ سننے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔ تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''عزت کی زندگی تو اس لیے چاہتا ہے کہ ایک بار پھر قسطنطنیہ کو عیاشی کا مرکز بنا سکے۔ میں اسلام کی خدمت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں اور اس وقت عیاش ترکوں کو نیست و نابود کرنا سب سے بڑی خدمت ہے۔''

یزدانی نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے پیچھے کھڑا نوجوان جوشِ غیظ کے مارے آگے آکر بولا۔ ''تو خود کو مسلمان کہتا ہے۔ خدا کی مخلوق کو تباہ و برباد کرنا، سبزہ زار کو اجاڑنا اسلام ہے؟ کیا یہی رسول کریمؐ کی تعلیم ہے؟ مجھے لگتا ہے تو مجھے قتل کردے گا۔ لیکن حقیقت کا اظہار کرنا ہی ایک سچے مسلمان کا فرض ہے۔ بتا، کیا یہ سب اسلام کی خدمت ہے یا ملک گیری کی ہوس ہے؟ کیا بے کس اور معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا اسلام پرستی ہے؟''

ہر سُو خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظریں اس بے باک اور خوبصورت نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

یزدانی کو اس نوجوان کی لاش اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مگر تیمور کا ہاتھ جدھر تھا، اُدھر رک گیا۔ نوجوان کی باتیں تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہوگئیں...... بسا اوقات بڑے بڑے بزرگوں کی نصیحت کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوتا ہے۔ مگر کبھی ایک لفظ انسان کی زندگی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یزدانی اپنی موت سے خوفزدہ نہ تھا مگر اپنے نوجوان بیٹے کے انجام کا خیال آتے ہی گھبرا گیا۔ نرم لہجے میں بولا۔ ''یہ ابھی بچہ ہے اور ناتجربہ کار ہے۔ اس کی باتوں کی پروا نہ کرنا۔''

تیمور کی دنیا ہی بدل چکی تھی، وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا یزدانی کے قریب آیا اور پوچھا۔ ''یزدانی، تمہارا اس نوجوان سے کیا رشتہ ہے؟''

''یہ میرا بیٹا ہے اور اس کا نام حبیب ہے۔'' یزدانی نے بتایا۔

''حبیب! تمہارے الفاظ سخت اور تلخ ہیں مگر ان میں سچائی ہے..... تم نے میری زندگی کا رخ ایک لمحے میں بدل دیا ہے۔ میرا خیال ہے انقلاب آتا ہوا نظر آنے لگا ہے۔'' تیمور یہ کہہ کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کے آثار نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔

☆☆☆

جس وقت سورج رات کی تاریکی ہٹاتے ہوئے دنیا کو اپنے چہرے سے منور کرنے کی تیاریوں پر تھا اس وقت تیمور فکر و سوچ میں گم تھا۔ وہ یزدانی اور اس کے بیٹے حبیب کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ سپاہیوں نے اسے دیکھ کر دروازہ کھولا اور تیمور اندر داخل ہوگیا۔

وہ یزدانی سے بولا۔ ''یزدانی! تیرے نوجوان بیٹے نے میری سوچ، میرے خیالات میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا ہے۔ میں ساری رات تیرے بیٹے کے الفاظ پر غور کرتا رہا ہوں، حقیقت مجھ پر عیاں ہوچکی ہے۔ میں اب تک سچائی سے کوسوں دور تھا اور حقیقت میں گمراہ تھا...... جبکہ اسلام...... واقعی تباہی اور غارت گری نہیں بلکہ محبت اور یگانگت سکھاتا ہے۔ جبر نہیں...... محبت کا درس دیتا ہے۔''

یزدانی اور اس کا بیٹا حبیب اس اچانک تبدیلی پر حیران و ششدر ہوکر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ امیر تیمور نے حبیب کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حبیب! آج تمام ترک رہا کردیے جائیں گے۔ کیا تم نے ایک گمراہ انسان کو سیدھے راستے پر آتے دیکھا ہے۔''

''اس قدر دانی کا میں مشکور ہوں۔ مگر حبیب ابھی ناتجربے کار ہے۔'' یزدانی نے جواب دیا۔

''کیا تم میری اس درخواست کو قبول نہیں کرسکتے؟ اسے میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دو۔''

یزدانی خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اسی روز شام کو سارے ترک قیدیوں کو رہا کردیا گیا۔ ماتم کدہ بنے قسطنطنیہ میں مسرت و خوشی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ یزدانی آتش پرست تھا۔ مگر کئی سالوں سے وہ دل کی گہرائی کے ساتھ اسلام سے متاثر ہوتا رہا تھا۔ یزدانی کی غیر معمولی بہادری اور جرأت کے سبب سارے ترک اسے خاصی عزت و احترام کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ اس کی ایک ہی بیٹی امت الحبیب تھی جو یزدانی کو

بیٹوں سے بھی زیادہ پیاری تھی اور جس کی پرورش بھی اس نے بیٹوں ہی کی طرح کی تھی۔ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی، گھڑسواری کرتی اور تھوڑے دنوں میں ہی اس نے حرب و ضرب کے فن میں دسترس حاصل کرلی تھی۔ میدانِ جنگ میں اپنے باپ کے ساتھ شجاعت و بہادری کے کارہائے نمایاں انجام دیتی رہی تھی، خلیفۂ وقت...... اس کی بہادری سے اس قدر خوش تھا کہ اسے اٹھارہ سال کی عمر میں ایک اعلیٰ فوجی عہدے پر فائز کردیا تھا۔ یہی لڑکی حبیب کے نام سے جانی جاتی تھی۔

امت الحبیب کے والدین اسے امیر تیمور کے ساتھ بھیجنے پر تیار نہ تھے۔ مگر حبیب کے دل میں نہ معلوم کیا آئی کہ وہ تیمور کے ساتھ جانے پر تیار ہوگئی۔ عزیز و اقارب کی منت سماجت کے باوجود اسے جانے سے کوئی نہیں روک سکا تھا۔ آخرکار وہ تیمور کے ساتھ چلی گئی۔

چار دانگ حبیب کی انصاف پسندی اور شجاعت کے چرچے ہونے لگے۔ حبیب اب تیمور کا وزیر بن چکا تھا۔ تیمور اسے اس قدر چاہنے لگا تھا کہ وہ اس کے کان سے سنتا تھا اور اسی کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

سمرقند میں امن و امان کی حکومت تھی۔ سب لوگ نوجوان وزیر حبیب پر اپنی جان نچھاور کرنے پر تیار رہتے تھے۔ تیمور تو اسے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی نظروں سے دور نہیں کرتا تھا۔

ایک روز تیمور نے محبت بھری نظروں سے حبیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں...... حبیب! کیا تمہیں یہ معلوم ہے؟''

''آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ بھلا میں آپ کے احسانات کیسے بھلا سکتا ہوں۔'' حبیب نے کہا۔

تیمور نے دوبارہ مسکراتے ہوئے اور بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حبیب تم بہت خوبصورت نوجوان ہو، پھر بھی تنہا زندگی گزار رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا کی حسین ترین عورت بھی تمہیں اپنے محبوب کے روپ میں دیکھ کر خود کو خوش قسمت ترین انسان سمجھے گی۔ لیکن اگر تم واقعی تنہا زندگی گزارنا چاہتے ہو تو پھر شاہی محل میں چل کر رہو، وہاں تمہیں ہر طرح کا آرام میسر ہوگا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیوں بے اختیار تمہاری طرف کھنچا جارہا ہوں۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہو۔'' تیمور کی آواز میں محبت کی مٹھاس تھی اور آنکھوں سے محبت بھرے جذبات نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

یہ سن کر حبیب کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھی شاید تیمور اس کے راز سے واقف ہوگیا ہے۔ اس خوف کے باعث اس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور کہا۔

''میں تو آپ کا شکریہ ادا کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ آپ کے احسانات اور ذرہ نوازی کے سامنے الفاظ کم پڑنے لگے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ شاہی محل میں رہنا میرے لیے مشکل ہے۔''

''کیوں......؟'' امیر تیمور نے دریافت کیا۔

''اس لیے کہ جہاں دولت ہوتی ہے، اُدھر لوٹ مار کا خطرہ ہوتا ہے پھر زیادہ قدردانی اور عزت افزائی دشمن پیدا کرنے کے مترادف بھی ہوتی ہے۔'' حبیب نے جواب دیا۔

''حبیب! کیا تمہارا کوئی دشمن بھی ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہاں! اول تو میں خود اپنا دشمن ہوں۔'' حبیب نے جواب دیا۔

تیمور کے سارے دلائل بے کار ثابت ہوئے۔ وہ کچھ سوچتا رہا پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حبیب نے سکون کا سانس لیا۔ اس طرح اس کا راز...... راز ہی رہا۔

ملک کے مغربی حصے میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ حبیب تیموری افواج لے کر اس بغاوت کو کچلنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ بغاوت والے علاقے میں عیسائی رہتے تھے مگر مسلمانوں نے تلوار کے زور پر اس علاقے کو فتح کرکے انہیں غلام بنالیا تھا...... عیسائیوں پر ''جزیہ'' عائد کرنے کے علاوہ انہیں گرجاؤں میں گھنٹا بجانے کی بھی ممانعت تھی جس کے خلاف عیسائی دنیا میں ہلچل مچ گئی تھی اور وہ اپنے جائز حقوق کی حفاظت کی خاطر لڑنے مرنے پر آمادہ تھے۔

حبیب کئی دنوں تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخرکار عیسائیوں پر عائد جزیہ کو معاف کیا گیا اور گرجاؤں میں گھنٹا بجانے کی پابندی ختم کردی گئی۔

مسلمان لشکر یہ سن کر بغاوت پر آمادہ ہوگیا اور قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ حبیب قلعے میں بند ہوگیا۔ مگر وہ اب بھی سچائی کی خاطر جنگ کرنے اور لڑنے پر تیار تھا۔

تیمور کو جب حبیب کی خبر نہ ملی تو وہ پریشان ہوگیا۔ آخر کار تیمور کی خدمت میں ایک قاصد پہنچا اور کورنش بجالا کر عرض کی۔

''جہاں پناہ! جزیہ معاف کردیا گیا۔''

''جزیہ معاف کردیا گیا؟ مگر کس کے حکم سے؟'' تیمور نے دریافت کیا۔

''وزیر کے حکم سے اور ساتھ ہی گرجاؤں میں گھنٹا بجانے کی بھی اجازت دے دی گئی ہے۔'' قاصد نے عرض کیا ۔''وزیر کافروں کے ساتھ مل چکا ہے اور آپ سے باغی ہوگیا ہے۔ اسلامی لشکر نے قلعے کا محاصرہ کرلیا ہے۔''

قاصد نے آگے بتایا تو تیمور نے جوش اور غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔''قلعے کا محاصرہ کرلیا گیا اور حبیب قتل ہونے کے لیے تیار ہے۔''

وہ دیوانوں کی طرح اپنے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا۔ پھر ایک دم قاصد کی طرف پلٹا اور کہنے لگا۔ ''حبیب کافروں سے جاملا ہے۔ کیا تجھے پتا ہے کہ کافر کسے کہتے ہیں۔ کافر وہ ہوتا ہے جو مظلوم اور کمزور کو تنگ کرے جو دوسروں کا حق غصب کرے، جو دوسروں کی آزادی چھین لے۔ او بدذات! تو اسی وقت یہاں سے نکل جا۔''

اس کے بعد تیمور منزلوں پہ منزل مارتا ہوا بغاوت والے علاقے میں پہنچا۔ جب حبیب تک یہ خبر پہنچی کہ تیمور آگیا ہے تو اس نے بھی تیمور سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے ہتھیار سنبھال لیے۔ جبکہ عیسائیوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ تیمور کے غصے اور انتقام سے اچھی طرح واقف تھے۔ مگر ان کے تمام اندیشے اس وقت بے بنیاد ثابت ہوئے جب قلعے کا محاصرہ ختم کردیا گیا اور تیموری افواج کا سفید جھنڈا صلح کے نام پر لہراتا نظر آیا۔

حبیب، عیسائی پادریوں کے ساتھ قلعے سے باہر نکلا اور تیمور کے قدموں میں جاگرا۔ تیمور نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا... اور مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا تو مجھ سے لڑنے کے لیے واقعی تیار تھا حبیب؟''

''ہاں! اصول اور صداقت کے سامنے تیمور کی کوئی وقعت نہ تھی۔'' حبیب نے جواب دیا۔

تیمور کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی اور حبیب نے آہستگی کے ساتھ خود کو تیمور کی آغوش سے الگ کردیا۔

ایک ہی دن میں نقشہ بدل چکا تھا۔ تیمور عیسائیوں کا علاقہ ان کے حوالے کرکے حبیب کے ساتھ واپس آگیا۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ تیمور اور حبیب باغیچے میں محو گفتگو تھے۔ تیمور نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''حبیب! میں اپنے دل کی ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں۔''

حبیب نے دھڑکتے دل سے کہا۔''جہاں پناہ! حکم کیجیے۔''

''اب تم اس وسیع سلطنت کو سنبھالو۔ تم ہی اس کے مالک ہو۔ میں اب یادِ الٰہی میں مصروف ہوجانا چاہتا ہوں۔'' تیمور نے کہا۔

''منظور ہے۔'' حبیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خدا تمہیں سلامت رکھے۔'' تیمور نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد حبیب نے کہا۔''اگر آپ کو یہ معلوم ہوجائے کہ آپ کا وزیر حبیب...... ایک مرد نہیں...... بلکہ عورت ہے تو پھر......؟''

تیمور نے ہنستے ہوئے کہا۔''وہ میرے دل کی ملکہ ہوسکتی ہے۔''

حبیب نے شرماتے ہوئے کہا۔''کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟''

''نہیں'' تیمور بولا۔''اس لیے کہ میں نے تمہیں قسطنطنیہ میں ہی پہچان لیا تھا کہ تم مرد نہیں عورت ہو۔''

یہ سن کر حبیب نے شرم وحیا کے باعث اپنی نگاہیں جھکالیں۔ پھر تیمور نے اسے اپنی آغوش کے قریب کرتے ہوئے اس کی حیا بار آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔''کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو، حبیب؟''

''یہ آپ اپنے دل سے پوچھیں۔'' حبیب نے محبوبانہ انداز میں جواب دیا۔

دوسرے دن پورے ...... ترکستان میں یہ خبر عام ہوگئی اور ہر طرف خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جانے لگا۔ بڑی دھوم دھام سے تیمور اور حبیب رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوکر ایک دوسرے کے سچے رفیق اور ہم سفر بن گئے۔ اس کے بعد حبیب کو حمیدہ بانو بیگم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

قسط نمبر: 229

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں، جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اورمیل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

ایک زمانے میں پی ٹی وی سارے خاندان کے لیے ایک مقبول تفریح اور سیکھنے کا ذریعہ تھا۔ اس ادارے نے قابل تعریف اداکار، ہدایت کار، گلوکار اور ہنرمندوں کو تربیت دے کر بہت بڑا کام کیا جس کی وجہ سے ساری قوم کو ایک بہترین اور صحت مند وقت گزاری کا موقع مل رہا تھا۔ پی ٹی وی ایک ایسا چینل تھا جو سارے خاندان کے چھوٹے بڑے فرد کو دل بستگی کا سامان فراہم کرتا تھا۔

پی ٹی وی کا جب آغاز ہوا تو اس کے ایم ڈی اسلم تھے

جنہوں نے اس چینل کو حکومت کی مداخلت سے پاک رکھا تھا۔ تب تک حکومت اور بیورو کریسی کی مداخلت سے یہ چینل آزاد تھا اس کا ہر پروگرام قابلِ دید ہوتا تھا۔ انگریزی فلمیں اور بہترین دلچسپ پروگرام مغربی ممالک سے منگا کر ٹی وی پر دکھایا جاتا تھا۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک قابلِ فخر ادارہ تھا جس کے مقابلے میں بھارتی دوردرشن کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ بہترین موسیقار، گائیک، ڈراما نگار پی ٹی وی سے اپنے پروگرام نشر کرتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے فن کار بھی تھے جنہیں ٹی وی پروگراموں میں پہلی بار پیش کیا گیا اور انہیں ایسی تربیت دی گئی کہ بہت جلد دوسرے لوگوں کو ... بھی اپنے فن کے اظہار کا موقع ملا۔ برصغیر کے معروف اور نامور ترین فن کار اپنی فن کارانہ صلاحیت کو پیش کرتے اور داد حاصل کرتے تھے۔

ریڈیو پاکستان اس وقت بھی قابلِ تعریف اداکاروں کی خدمات حاصل کرتا تھا لیکن سرکاری اور غیر سرکاری طریقہ کار کا فرق اس وقت بھی نمایاں تھا۔ ایک مثال یہ ہے کہ استاد بڑے غلام علی خان جیسے مایہ ناز گائیک کو ریڈیو سے ایک پروگرام کا دو سو روپے معاوضہ دیا جاتا تھا۔ جب معاوضے کے مطالبات مسترد کردیے گئے تو انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہفتے میں ان کے پروگراموں کی تعداد بڑھادی جائے لیکن اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل بخاری صاحب نے اس کے لیے بھی معذرت کرلی۔ ادھر ہندوستان سے استاد بڑے غلام علی خان کو بلاوے پر بلاوے آرہے تھے اور بہت پُرکشش آفرز دی جارہی تھیں۔ استاد بڑے غلام علی شاید کم معاوضے پر اپنا پیٹ کاٹ کر فن کی خدمت کرتے رہتے مگر پاکستان میں ان کی پذیرائی اور قدر و قیمت بھی نہیں تھی۔ بالآخر دل برداشتہ ہوکر انہوں نے رختِ سفر باندھا اور ہندوستان روانہ ہوگئے۔ جہاں انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا گیا اور قدموں میں بڑے بڑے فلمی اداکاروں نے سر جھکادیا۔ بڑے غلام علی خان کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی حیثیت اور مرتبہ کیا ہے۔

یہ تذکرہ تو محض اس وقت کے حالات کی ایک جھلک دکھانے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس وقت موضوع یہ ہے کہ پی ٹی وی نے اپنے پروگراموں کے ذریعے قوم کو ایک معیاری اور بہترین تفریح فراہم کی تھی۔

چھوٹے بچے جو موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے اور خداداد صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھے انہیں موقع دیا گیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنائیں۔ بچوں کے لیے موسیقی سکھانے کے جو پروگرام شروع کیے گئے تھے ان میں ملی ترانے، قومی نغمے اور گلوکاری کے آداب بھی سکھائے جاتے تھے۔ اس پروگرام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فلمی صنعت کے نامور موسیقار مثلاً سہیل رعنا، مصلح الدین اور خلیل احمد جیسے ماہرِ فن بچوں کی محفل میں بیٹھ کر گپ شپ کرکے ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے تھے۔ پاکستان کے بہت سے نامور گلوکار اور گلوکارائیں ان ہی پروگراموں کے ذریعے سامنے آئے اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ عدنان سمیع جیسے موسیقار اور گلوکار، نازیہ حسن، حدیقہ کیانی، شازیہ منظور جیسے فن کار ان ہی پروگراموں کے ذریعے سامنے آئے ہیں۔

نازیہ حسن کو پاکستان بلکہ برصغیر کی پہلی پوپ گلوکارہ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے کیریئر کا آغاز پی ٹی وی کے بچوں کے پروگرام ہی سے کیا تھا۔

نازیہ حسن نے اسٹیج پر اوچھی حرکتوں سے پرہیز کیا۔ پاکستان میں اور بیرونی ملکوں میں انہوں نے Girl Next Door کی حیثیت حاصل کرلی تھی جسے سارے خاندان والے اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ بعد میں وہ اپنے والدین کے ساتھ انگلستان چلی گئیں جہاں انہوں نے اپنے بھائی زوہیب حسن کے ساتھ گلوکاری کی تربیت جاری رکھی۔ گھر والوں نے بھی ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا لندن میں انہوں نے اپنے بھائی زوہیب کی مدد سے ایک ویڈیو البم پیش کیا۔ ایک بالکل نو وارد نو آموز اور گمنام لڑکی کے گائے اس گیت نے برصغیر سمیت ساری دنیا میں دھوم مچادی۔ گیت کے بول تھے۔

”آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے۔“

اس ایک نغمے نے نازیہ حسن کا نام چاردانگ عالم میں مشہور کردیا۔ نازیہ اور ان کے بھائی زوہیب نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ دراصل وہ گلوکاری کو اپنا ذریعۂ معاش نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ یہ ان کا شوق تھا۔ اس شوق کو انہوں نے دوسرے پیشہ ور گلوکاروں سے زیادہ شہرت دی۔ اسٹیج پر ان کے گانے کا انداز مہذب اور باوقار ہوتا تھا۔ اسٹیج پر انہوں نے مٹکنے اور تھرکنے کی روایت کو کبھی نہیں اپنایا۔ وہ جب اسٹیج پر نمودار ہوتی تھیں تو اسٹیج ان کی باوقار شخصیت کی وجہ سے سج جایا کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ان

کے بھائی نے بھی اسٹیج پر ان کے ساتھ گلوکاری شروع کردی۔ اپنے بیشتر گیت یہ دونوں خود ہی بناتے تھے۔ طرزیں بھی ان ہی کی بنائی ہوئی تھیں۔ نازیہ حسن نے اردو میں پوپ میوزک کا انداز بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان کے اس گانے کی مقبولیت سے متاثر ہوکر بھارتی فلم ”قربانی“ میں بھی یہ نغمہ شامل کیا گیا اور نازیہ حسین کی کھرڑ اور مہذب آواز نے سب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم مکمل کرلی تھی اور اقوام متحدہ کے کسی ادارے سے بھی وابستہ رہیں۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ اس معصوم بھولی بھالی لڑکی کا انجام بہت دردناک ہوا۔ سسرال والوں نے ان کی قدر نہ کی۔ انہوں نے ایک بچے کو بھی جنم دیا تھا مگر اسے بہت چھوٹا سا چھوڑ کر دنیا سے رخصت

ہوگئیں۔ جن وجوہات کی بنا پر وہ اس دردناک انجام کو پہنچیں انہیں شاید احساس تک نہ ہوا کہ انہوں نے معاشرے، موسیقی اور ایک خاندان کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے اور دنیائے موسیقی کو کیسے بے بہا سرمائے سے محروم کردیا۔

دیکھیے ' دراصل تذکرہ حدیقہ کیانی کا کرنا تھا۔ حدیقہ نے بھی پی ٹی وی کے بچوں کے پروگرام ہی سے آغاز کیا تھا۔ حدیقہ کیانی نے رفتہ رفتہ گلوکاری کی دنیا میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ حدیقہ نے بہت کم انٹرویوز دیے ہیں اور ان کی حقیقی زندگی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ حدیقہ نہ صرف گلوکاری میں ایک بڑا نام ہے بلکہ انہوں نے ایک حساس اور ہمدرد دل بھی پایا ہے۔ فلاحی کاموں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔

نازیہ حسن اپنے بھائی اور والدین کے ہمراہ

نازیہ حسن اپنے بیٹے کے ہمراہ

سیلاب آئے زلزلہ آئے، کوئی اور آفت ملک پر نازل ہوجائے، حدیقہ امدادی کاموں میں پیش پیش رہتی ہیں، اور دور دراز ویران علاقوں میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ اپنا سرمایہ بھی ان کاموں پر خرچ کرتی ہیں اور اس بلند مقصد کے لیے چندہ بھی اکٹھا کرتی ہیں۔

قدرت نے انہیں بھی ایک معصوم چہرے سے نوازا ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور مہذب پس منظر اور تربیت نے انہیں ایک خصوصی مقام عطا کیا ہے۔ تعلیم یافتہ اور اچھی تربیت حاصل کرکے ایسی ہی فن کارائیں سامنے آتی ہیں۔ نازیہ حسن کی طرح حدیقہ کیانی نے بھی پوپ میوزک اور روایتی مشرقی گلوکاری میں قابلِ قدر مقام حاصل کیا ہے۔

ایک چھوٹی سی معصوم بچی نے اپنے شوق اور لگن کی بدولت سہیل رعنا کی تربیت سے پوری طرح استفادہ کیا اور آج وہ ایک بین الاقوامی شخصیت کی مالک ہیں۔ سہیل رعنا کے پروگرام میں وہ اتنی چھوٹی تھیں کہ گا بھی نہیں سکتی تھیں۔ صرف دوسروں کے گانوں پر سر ہلاتی رہتی تھیں۔

نازیہ حسن کے ساتھ تو ان کے بھائی گایا کرتے تھے لیکن حدیقہ کیانی نے جب گلوکاری کا آغاز کیا تو ان کی بہن

ان کے ساتھ گایا کرتی تھیں اس لیے کیانی سسٹرز کے نام سے ان کی گلوکاری اور شہرت کا آغاز ہوا۔ کافی عرصے تک یہ دونوں بہنیں ساتھ گاتی رہیں مگر کچھ عرصے بعد کسی وجہ سے حدیقہ کی بہن نے گانا بند کردیا اور حدیقہ کیانی نے تنہا گلوکاری شروع کردی اور بہت کامیابی اور مقبولیت حاصل کی۔ وہ اپنی کوشش اور فن کاری کے باعث ترقی کی منزلیں طے کرتی رہیں۔ آج ان کا نام اور ان کی آواز ہر جگہ گونج رہی ہے۔ انہوں نے آغاز میں گلوکاری کا سیدھا سادہ انداز اپنایا۔ انہوں نے کشمیری اور دوسرے علاقوں کے لوک گیتوں کی وجہ سے شہرت حاصل کی لیکن رفتہ رفتہ چند سال بعد وہ نئے رنگ میں جلوہ گر ہوئیں۔ مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے مغربی الفاظ اور مغربی انداز اپنایا۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ ایک موسیقی کے مقابلے کے پروگرام میں بھی جج کے کردار میں ان کی حرکتیں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کیا یہ وہی حدیقہ کیانی ہے؟

ان کا تو رنگ ڈھنگ اور انداز ہی بدل گیا۔ ڈر ہے کہ وہ اسی راستے پر چل کر کون سے جدید انداز اپنائیں گی۔

ان کی گلوکاری نے سب کے دل موہ لیے تھے مثلاً دوپٹا میرا ململ کا۔

اس گانے سے انہیں بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔ سہیل رعنا، خلیل احمد، مصلح الدین اور نثار بزمی جیسے موسیقاروں نے جس کو سکھایا ہو اور اللہ نے سریلی آواز بھی دی ہو وہ کیوں نہ مقبولیت اور شہرت حاصل کرے گی؟

حدیقہ نے ایک اور نیا تجربہ کیا۔ انہوں نے ایک پنجابی لوک گیت اور ایک انگریزی گانے کی آمیزش سے ایک ملا جلا نغمہ مرتب کیا۔

پنجابی لوک گیت کے بول ہیں۔

بوئے باریاں تے نالے کنداں ٹپ کے آواں گی ہوا بن کے۔

اس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ چاہے دروازے اور کھڑکیاں بند ہوں دیواریں پھاند کر آؤں گی۔ یہ موسیقی کا ایک بالکل نیا انداز تھا۔ انہوں نے اس پنجابی فوک گیت میں پنجابی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی قسم کا گیت ترتیب دیا تھا۔ یہ ایک بالکل نیا انداز تھا۔ اس پر تنقید اور نکتہ چینی بھی کی گئی لیکن اس گانے کو بے حد پسند کیا گیا۔ ایک پاکستانی موسیقار وزیر افضل (جو کہ اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے الزام لگایا کہ حدیقہ نے ان کے گانے کی دھن چوری کرکے یہ گیت بنایا ہے۔ وزیر افضل کا یہ دعویٰ درست نہیں ثابت ہوسکا لیکن حدیقہ نے اس کامیابی سے متاثر ہوکر اردو گانوں میں پنجابی الفاظ استعمال کرکے ایک نرالی قسم کی موسیقی کی طرح ڈالی۔ اس گانے میں انہوں نے اداکاری بھی کی تھی اور ایک ذہنی مریضہ کا کردار ادا کیا تھا۔ ان کا اردو پنجابی کی آمیزش کا انداز پسند کیا گیا تو انہوں نے اسی انداز کا ایک اور گانا بنا کر پیش کردیا اس کے بول تھے۔

یاد بچھن دی آئی

اکھ ہنجواں نال بھر آئی

یہ البم 2009 میں ریلیز ہوا تھا۔ اس گانے کی پروڈکشن لندن میں کی گئی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انگریزوں نے بھی اس گانے کو بہت پسند کیا۔

حدیقہ کیانی کا تعلق ایک شریف اور تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ 11 اگست 1994ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم ..... راولپنڈی میں ہی حاصل کی۔ گائیکی اور موسیقی کا شوق دیکھ کر گھر والوں نے بھی بچپن ہی میں ان کی حوصلہ افزائی کی۔ لاہور آکر انہوں نے بچوں کے پروگرام ”رنگ برنگی دنیا“ میں باقاعدگی سے شرکت کی اور اساتذہ سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے فن کارانہ رجحان کے پیشِ نظر گھر والوں نے انہیں معروف آرٹ کے تعلیمی ادارے این سی اے (نیشنل کالج آف آرٹ) میں داخل کرادیا۔

حدیقہ نے عوام کے سامنے پہلی مرتبہ راولپنڈی کے لیاقت ہال میں گلوکاری کا پُراعتماد مظاہرہ کیا۔ اسی روز سننے والوں نے کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں موسیقی کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہو رہا ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی تقاریب میں بھی شرکت کی اور ملک سے باہر یونان، ترکی، بلغاریہ وغیرہ میں بچوں کے پروگراموں میں شرکت کرکے کئی ایوارڈز بھی حاصل کیے۔ یہاں سے حدیقہ کیانی کے اصلی سفر کا آغاز ہوا، انہوں نے لاہور کے کئی تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقار استاد فیض خان سے بھی تربیت حاصل کی۔ جہاں جہاں سے موسیقی کے موتی چن سکتی تھیں وہاں وہاں سے اپنے فن میں اضافے کی کوشش کی۔

وہ مختلف ممالک میں بھی گلوکاری کا مظاہرہ کرتی

لندن، کینیڈا، یورپ میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ایوارڈ سمیٹے۔ حدیقہ کیانی کی والدہ ان کے لیے نغمات لکھتی ہیں۔ وہ بہت اچھی شاعرہ ہیں اور حدیقہ ان کے ساتھ مل کر اپنے گانوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ ان کی والدہ گانوں کی طرزیں بنانے میں بھی مشورہ دیتی ہیں۔ حدیقہ کیانی نے یوں تو یورپ امریکا اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا لیکن انہیں عالمی شہرت ہوسٹن (امریکا) میں ایک میوزک شو میں شریک ہونے کے بعد حاصل ہوئی۔ یہ شو 2008 میں ہوسٹن پارک میں منعقد ہوا تھا۔ اس شو کی مہمان خصوصی شیلا جیکسن تھیں جو بذاتِ خود ایک عالمی شہرت یافتہ گلوکارہ ہیں۔ شیلا جیکسن یو ایس ہاؤس جیسے ادارے کی نمائندہ بھی ہیں۔ ان کے اس شو میں پندرہ ہزار سے زائد موسیقی کے دلدادہ خواتین اور مردوں نے حصہ لیا تھا۔ ایک غیر ملک کے اتنے بڑے مجمع کے سامنے گلوکاری کا مظاہرہ کرنا ان کی خود اعتمادی کی دلیل ہے۔

حدیقہ ان کامیابیوں کی وجہ سے مغرور نہیں ہوئیں بلکہ وہ پہلے سے زیادہ انکساری اور انسانیت سے محبت کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ مظفر آباد کے ہولناک زلزلے میں انہوں نے فلاحی کاموں کا ایک شاندار مظاہرہ کیا۔ انہوں نے زلزلے میں یتیم و یسیر ہونے والے ایک بچے کی کفالت کی ذمے داری بھی قبول کی اور اس کی پرورش کے تمام اخراجات برداشت کررہی ہیں۔ 2006 میں انہیں اسلام آباد میں بہترین گلوکارہ کی حیثیت سے تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ حدیقہ کیانی نے زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے پاکستان میں اور بیرون ملک چندہ اکٹھا کرنے کی مہم چلائی۔ وہ اپنی تمام مصروفیات کو چھوڑ کر زلزلہ زدہ علاقوں میں اجڑے ہوئے غریب لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے گاؤں گاؤں پیدل پھرتی رہیں۔ اس طرح انہوں نے ایک حساس اور ذمے دار فنکارہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

2006 ہی میں حدیقہ نے ایک نیا تجربہ کیا۔ انہوں نے ”رف کٹ“ کے نام سے اپنے انگریزی گانوں کا البم پیش کیا۔ اس البم میں شامل ان کے کئی گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ عاطف اسلم کے ساتھ انہوں نے ایک گانا ”آس پاس“ گایا جس کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور مختلف ٹی وی چینلز سے یہ گانا بار بار نشر کیا گیا۔ حدیقہ کیانی پہلی ایشیائی گلوکارہ ہیں جنہوں نے بی بی سی لندن سے پیپسی کولا کے مقابلے میں شرکت کی اور کامیابی حاصل کی۔ اس موقع پر سولہ لاکھ سے زائد شائقین نے ان کی موسیقی کے انداز کو سراہا۔ اس گانے کا البم 70 لاکھ سے زیادہ تعداد میں فروخت ہوا تھا۔ اس تجربے سے حوصلہ پاکر انہوں نے ”روشنی“ کے نام سے ایک نیا البم پیش کیا جس کی ایک کروڑ سے زائد کاپیاں فروخت ہوئیں جو کہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

انہوں نے سید نور کی فلم ”سرگم“ کے لیے بھی عدنان سمیع کے ساتھ گلوکاری کی۔ ایک موسیقار کی حیثیت سے عدنان سمیع کی پہلی فلم تھی۔ ”فلم سرگم“ کی موسیقی بہت پسند کی گئی تھی۔ یہ کسی فلم میں گانے کا پہلا موقع تھا جس نے ان کی شہرت اور مقبولیت میں مزید اضافہ کردیا۔ اب وہ ایک عالمگیر شہرت کی مالک گلوکارہ بن چکی ہیں جو اپنے شائستہ اور مہذب انداز کے حوالے سے بھی بہت مقبول ہیں۔

اس گانے میں حدیقہ نے اداکاری بھی کی تھی اور روتے ہوئے اصلی آنسو بہائے تھے۔ شاید وہ اس گانے میں کھو گئی تھیں اور ان پر وہی کیفیت طاری ہوگئی تھی جو گانے کے عین مطابق تھی۔ اس گانے میں حدیقہ کے بھائی عرفان نے بھی حصہ لیا تھا۔

حدیقہ کیانی ایک گلوکارہ کے علاوہ ایک بہت اچھی مقررہ اور فیشن ڈیزائنر بھی ہیں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ کہ وہ اپنے ہیئر اسٹائل خود بناتی ہیں۔ بال بنوانے کے لیے بھی کسی بیوٹی پارلر نہیں گئیں۔

یوں تو بچوں کی موسیقی کے پروگرام کی وجہ سے کئی گلوکاراؤں نے نام پیدا کیا لیکن نازیہ حسن اور حدیقہ کیانی کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ لیکن اس پروگرام نے نصف درجن سے زیادہ گلوکار اور گلوکارائیں موسیقی کی دنیا کو دی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حدیقہ کیانی نئی نسل کی مقبول ترین گلوکارہ ہیں۔

☆☆☆

کیا ہم ہنستا مسکرانا اور خوش ہونا بھول چکے ہیں۔ مشکلات اور مسائل تو پہلے بھی تھے لیکن کبھی کبھی ہنسی اور قہقہے کی آواز سنائی دے جاتی تھی لیکن اب تو جیسے ہر کوئی تفکرات کے سمندر میں غرق ہے۔ ایک اعتبار سے یہ لوگ حق بجانب بھی ہیں۔ پاکستان کی اٹھارہ کروڑ آبادی کا مشکل سے ایک یا ڈیڑھ فیصد ہوگا جس نے ہنسی خوشی اور قہقہوں پر اجارہ داری حاصل کر رکھی ہے۔ ہر حکمران کے زمانے میں عام لوگوں کے لیے مشکلات اور مسائل کے انبار میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ حالات نے سفید پوش متوسط طبقے کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ حالانکہ ہر ملک کا متوسط طبقہ ہی ریڑھ کی ہڈی ہے لیکن مہنگائی، بے روزگاری اور حکومت کی بے نیازی نے اس ریڑھ کی ہڈی پر سب سے زیادہ ضرب لگائی ہے۔

ہنسی اور مسکراہٹ انسانوں کے لیے ایک زیور اور زیبائش کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں اشفاق احمد مرحوم کا بیان کیا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک روز اشفاق صاحب اپنے بابا جی کے ساتھ کہیں جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ بابا جی کی نظریں سڑک پر گزرنے والے ہر شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بابا جی بہت خاموش اور فکرمند نظر آ رہے تھے۔

اشفاق صاحب نے پوچھا "بابا جی آپ آج کس خیال میں گم نظر آ رہے ہیں؟"

بابا جی بولے۔ "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کوئی ایک شخص بھی مجھے مکمل لباس میں نظر نہیں آ رہا۔"

"اشفاق صاحب نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور کہا "بابا جی سبھی لوگ تو اچھے کپڑوں میں ملبوس ہیں۔"

بابا جی بولے "حکمران کا لباس مکمل نہیں ہے۔"

اشفاق صاحب نے ایک بار پھر اطراف میں نظریں دوڑائیں اور پھر بولے۔ "بابا جی میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ سب مکمل لباس میں ہیں پھر بھی آپ کو لباس سے محروم کیوں نظر آ رہے ہیں۔"

بابا جی بولے۔ "تم نے صحیح کہا۔ یہ سب لوگ معمولی اور قیمتی لباس پہنے ہوئے ہیں مگر ان کی شخصیت میں ایک بڑی کمی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ ہے کہ ان سب کے چہرے مسکراہٹ سے محروم ہیں۔ یاد رکھو مسکراہٹ بھی انسان کی شخصیت کا ایک ضروری حصہ ہے لیکن دیکھو، ان کے چہروں پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہیں ہے جو لباس کا ایک ضروری حصہ ہوتی ہے۔"

بابا جی نے درست ہی کہا تھا کہ آس پاس کسی شخص کے چہرے پر خوشی، مسکراہٹ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہر کوئی فکرمند اور کسی سوچ میں گم نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد اشفاق صاحب نے خود سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا تو انہیں ہر شخص نامکمل نظر آیا۔ اس کے بعد اشفاق صاحب کو احساس ہوا کہ مسکراہٹ انسان کے لیے کتنی ضروری ہے۔ مسکراہٹ نہ صرف انسان کے چہرے کو جگمگا دیتی ہے بلکہ سارے ماحول میں اجالا کر دیتی ہے۔ حالانکہ مسکرانے کے لیے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لیے صرف زندہ دلی اور حاضر جوابی کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں امریکا کے انتخابات کا واقعہ یاد آیا جس کا اس زمانے میں بہت چرچا ہوا تھا۔ صدر روز ویلٹ سولہ سال تک امریکا کے صدر رہ چکے تھے۔ ان کے بعد صدر ٹرومین کو کافی مقبولیت حاصل رہی۔ اس کی ڈیموکریٹک پارٹی کو پورا یقین تھا کہ کامیابی ان کے امیدوار کے حصے میں آئے گی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی جانب سے گورنر ڈیوی امیدوار تھے اور عام طور پر خیال کیا جا رہا تھا کہ صدارتی محل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ خود گورنر ڈیوی کو بھی اپنی کامیابی کا یقین تھا کیونکہ صدر روز ویلٹ اور ٹرومین مقبول اور کامیاب صدر ثابت ہوئے تھے۔ سب کو یقین تھا کہ اس پس منظر کی وجہ سے گورنر ڈیوی یقیناً کامیاب ہو جائیں گے لیکن ایک معمولی واقعے نے کایا پلٹ دی اور گورنر ڈیوی کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہو گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ ری پبلکن پارٹی کے ایک جلسے میں چند لوگوں نے گورنر ڈیوی سے چبھتے ہوئے سوالات پوچھے تو گورنر ڈیوی غصے میں آ گئے اور پارٹی کے ورکرز پر برس پڑے۔ اس ایک واقعے کو میڈیا نے بہت اچھالا۔ اخبار ٹری بیون نے لکھا "ڈیموکریٹک پارٹی شکست کھا گئی۔ گورنر ڈیوی ناکام

ہو گئے اور ایک معمولی سی بدمزاجی اور بدتہذیبی کی وجہ سے گورنر ڈیوی جیتی ہوئی بازی ہار گئے کیونکہ وہ اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکے تھے اور امریکی ووٹر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ بدمزاجی اور غصے کی وجہ سے جو شخص اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکا وہ ملکی امور کیسے خوش اسلوبی اور خوش دلی سے ادا کر سکے گا۔

یوں تو صدر ٹرومین بھی غصے میں آ جاتے تھے لیکن وہ بہت جلد اپنے مزاج پر قابو پا کر لوگوں کو خوش کرنے کا گر بھی جانتے تھے جس کی وجہ سے لوگ ان کے غصے کو بھول جاتے تھے اور ان کی فقرے بازی پر ہنس دیا کرتے تھے۔

وہ ایک کامیاب اور فتح یاب امریکی فوجی کمانڈر رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کے ریٹائرڈ ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ 1941 میں جب جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کیا تو جنگ کا رخ ہی پلٹ گیا۔ آئزن ہاور کو ترقی دے کر فل جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا کیونکہ امریکی صدر جانتے تھے کہ کامیابیاں جنرل آئزن کے قدم چومتی ہیں۔ وہ ایک ذہین اور بہت اچھے جنرل ہیں۔ آئزن ہاور کو امریکی "آئنک" کہا کرتے تھے۔ امریکی فوج کے چیف جنرل مارشل نے بہت سوچ سمجھ کر جنرل آئزن کا انتخاب کیا تھا۔ وہ جنگی چالوں میں مہارت رکھتے تھے اور ان کے فیصلے عموماً کامیاب ثابت ہوتے تھے۔ ایک کامیاب کمانڈر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے کرکٹ کے کپتان کی طرح قائدانہ صلاحیتیں ہونی ضروری ہیں۔ جنرل آئزن ہاور نے افریقا میں جرمنوں کے خلاف نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ قائد کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے ماتحتوں اور سپاہیوں کی محبت اور وفاداری حاصل رہے۔ ایسے قائد کے لیے اس کے ماتحت جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جنرل آئزن ہاور میں یہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ حاضر جواب اور خوش مزاج بھی تھے۔ کمانڈر کا چارج لینے کے بعد فوجیوں کے ایسے گروپ سے خطاب کیا جن میں امریکی، برطانوی، افریقی، فرنچ اور عرب فوجی بھی شامل تھے۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے پہلے کبھی آئزن ہاور کو نہیں دیکھا تھا مگر ان کے کارناموں کے بارے میں سن رکھا تھا۔

جنرل آئزن ہاور فوجی یونیفارم میں ملبوس تھے جو کچھ تنگ تھی جس کی وجہ سے وہ ایک فوجی سے زیادہ پولیس آفیسر

نظر آ رہے تھے۔

جنرل آئزن ہاور نے موقع محل کے مطابق تقریر کی اور حاضرین کو بتایا کہ آئندہ جنگوں کے لیے انہیں کیا کرنا ہوگا۔

تقریر ختم کرنے کے بعد جنرل آئزن ہاور ڈائس سے نیچے اترے لیکن ان کا پیر قالین میں الجھ گیا اور وہ سنبھل نہ سکے اور سیڑھیوں سے لڑھک کر فرش پر گر گئے۔ احترام اور رعب کے باوجود تمام حاضرین بے ساختہ ہنس پڑے۔ جنرل آئزن نے کسی شرمندگی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا اور وہ بے اختیار مسکرا دیے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر فوجیوں نے خوش ہو کر اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھال دیں۔ اس واقعے سے وہ بہت لطف اندوز ہوئے۔ گرنے کے بعد بجائے ناراض ہو کر رخصت ہونے کے انہوں نے بھی مسکراتے ہوئے اپنی ٹوپی ہوا میں اچھالی اور فوجیوں کی خوشی میں شریک ہو گئے۔ ایک ہی لمحے میں ماحول بدل گیا اور سب اس خوشی اور قہقہوں میں شریک ہو گئے۔ اس واقعے نے تمام ماتحت فوجیوں کو جنرل کا گرویدہ کر دیا اور انہوں نے سب کا دل جیت لیا۔

اس طرح کا ایک واقعہ قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ پیش آیا تھا جو ناگپور میں مسلم لیگی لیڈروں کے ایک اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ دو دن کے بعد عیدالاضحیٰ آنے والی تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ عید کی نماز بھی اسی گراؤنڈ میں ادا کی جائے۔

عید کی نماز کے موقع پر پچاس ہزار سے زائد افراد عید کی نماز ادا کرنے کے لیے میدان میں موجود تھے۔ یہ 27 دسمبر 1941 کا واقعہ ہے۔ نماز اور خطبہ ختم ہونے کے بعد ایک ہجوم نے قائداعظم کو گھیر لیا۔ وہ سب قائداعظم سے ہاتھ ملانے یا ان سے عید ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس طرح کے ہجوم سے قائداعظم گھبراتے تھے۔ قائداعظم ان سب سے ہاتھ ملانے کی بجائے اسٹیج پر پہنچ گئے اور مائیکروفون کی طرف بڑھے۔ انہوں نے مائیکروفون

سنبھالنے کے بعد کہا "میرے دوستو، آپ سب کو عید مبارک ہو۔" اس کے جواب میں مجمع نے بیک آواز کہا۔ "آپ کو بھی عید مبارک ہو۔" قائداعظم مسکرائے اور بے تکلفانہ انداز میں سب سے مخاطب ہو کر کہا "آپ سب کے جذبات کی میں قدر کرتا ہوں۔ میری بھی خواہش ہے کہ ہر شخص سے ہاتھ ملاؤں اور عید کی مبارکباد دوں۔ اگر میں آپ میں سے صرف چند لوگوں سے مصافحہ کرتا تو محروم رہ جانے والوں کو بہت مایوسی ہوتی۔ میں عید کے مبارک موقع پر کسی کو مایوس یا خاموش نہیں دیکھنا چاہتا۔ لیکن آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ پچاس ہزار لوگوں سے مصافحہ کرنے کے بعد میں صرف دونوں ہاتھ یہیں چھوڑ کر جاتا۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ آپ کا قائد ہاتھوں سے محروم ہو جائے؟"

سب نے چلا کر کہا "بالکل نہیں۔ ہم تو آپ کو معمولی تکلیف میں بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔"

قائداعظم نے مسکرا کر دونوں ہاتھ ہلا کر کہا "شکر ہے کہ میں یہاں سے اپنے دونوں ہاتھ صحیح سلامت لے کر جا رہا ہوں۔ آپ سب کا بہت شکریہ اور عید مبارک۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھے اور جب تک نظر آتے رہے دونوں ہاتھ ہلا کر سب کو الوداع کرتے رہے۔

جنرل آئزن ہاور کی طرح قائداعظم بھی عموماً سنجیدہ رہتے تھے اور بہت کم مسکراتے تھے۔ قائداعظم جلسہ عام میں ہی مسکراتے تھے لیکن بہت کم۔ ان میں مزاح کی حس بہت زیادہ تھی۔ جیسا کہ اس مشہور واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم مسلم لیگ کے ایک اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ قائداعظم جب تقریر کرتے تھے تو انگریزی نہ سمجھنے والے بھی خاموشی سے ساکت ہو کر ان کی تقریر سنا کرتے تھے۔ یہ ان کی آواز کا رعب و دبدبہ تھا یا بولنے کا انداز جو سب کو مسحور کر دیتا تھا۔ جو لوگ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ان کے انداز بیان سے واقف تھے وہ بھی پوری توجہ سے ان کی تقریر سنا کرتے تھے۔

ایک بار کسی نے ایک ان پڑھ دیہاتی سے پوچھا "تم تو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے پھر بھی اتنے غور سے قائداعظم کی تقریر سن کر تائید میں سر ہلاتے رہتے ہو۔"

اس شخص نے جواب دیا "میں ان کی تقریر تو نہیں سمجھ سکتا لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ جو کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔"

ایک بار قائداعظم تقریر کر رہے تھے کہ مولوی فضل حق جو مسلم لیگ کے ایک ممتاز لیڈر اور بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے پنڈال میں داخل ہوئے۔ سب کی نظریں مولوی فضل حق کی جانب اٹھ گئیں۔ انہیں شیر بنگال کہا جاتا تھا کیونکہ وہ بہت نڈر اور بے باک تھے۔

قائداعظم اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور کہا "شیر آ گیا ہے اس لیے میمنے کو چھپ جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

جب مولوی فضل حق اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو قائداعظم نے کھڑے ہو کر دوبارہ تقریر شروع کر دی۔

قائداعظم مسکرانے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے بشرطیکہ کوئی دلچسپ اور لطیف بات کی جائے۔

یہ دو مثالیں صرف اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ مسکراہٹ انسان کی سجاوٹ بلکہ اس کا زیور ہوتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی کسی جانور کو بھی مسکراتے ہوئے دیکھا ہے؟ جی نہیں۔ دراصل یہ خوبی اللہ تعالیٰ نے صرف انسان ہی کو عطا کی ہے۔

یقین کیجیے، مسکرانے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ البتہ چہرے کی رگیں اور عضلات میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ صرف مسکراہٹ سے مسکرانے والے کا چہرہ جگمگا اٹھتا ہے بلکہ محفل میں موجود ہر شخص مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ باہمی کشیدگی دور کرنے اور ماحول کو پُرسکون کرنے کے لیے بھی مسکراہٹ ایک نفسیاتی وجہ ہے۔

مہذب ملکوں میں مسکرانا ان کی عادت میں شامل ہے۔ جب ہم پہلی بار ملک سے باہر گئے تو ہمارا پہلا پڑاؤ بیروت تھا۔ یہ شہر اس زمانے میں اپنی خوبصورتی اور رنگینی کے حوالے سے بہت مشہور تھا۔ اس کو مشرق کا پیرس کہا جاتا تھا۔

ہم اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ جب برٹش ائیرویز کے ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو دروازے پر کھڑی ہوئی ائیر ہوسٹس نے مسکرا کر ہمیں ویل کم کہا۔ اس کے بعد بھی جب ہم ائیر ہوسٹس کو طلب کرتے تھے تو وہ چراغ الٰہ دین کے جن کی طرح فوراً حاضر ہو جاتی تھی۔ مسافروں کی بات مسکراتے ہوئے غور سے سنتی اور بلا تاخیر ان کی ضرورت پوری کر دیتی تھی۔

بیروت سے رخصت ہوتے وقت امیگریشن کے کاؤنٹر پر ایک خوش شکل خاتون تشریف فرما تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اس طرح مسکرائیں جیسے مدت سے ہمیں جانتی

ہیں۔ ہم نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا کہ شاید ان کا کوئی شناسا ہمارے پیچھے کھڑا ہے مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ لیکن ان خاتون کی مسکراہٹ کی وجہ سے اجنبیت کی برف پگھل گئی اور ہم نے بے تکلفی سے ان سے بات چیت شروع کر دی۔

مسکرانا غالباً غیر ملکیوں کے مزاج کا ایک حصہ ہے۔ ہم امریکا کی جارج کاؤنٹی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب گھر سے باہر نکلے تو فٹ پاتھ پر ایک خاتون ہمارے پاس سے گزریں تو نگاہیں ملتے ہی... مسکرائیں لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ ہم کافی دور تک ٹہلتے ہوئے چلے گئے تاکہ اس علاقے کے جغرافیے سے واقفیت ہو سکے۔ راستے میں، دکان میں بینک میں جس سے بھی ہمارا سامنا ہوا وہ نگاہ ملتے ہی مسکرایا ضرور۔ پاکستان میں ہم نے کبھی کسی اجنبی سے مسکرا کر ملتے نہیں دیکھا اس لیے بہت اچھا لگا۔ غیر ملکی کرنسی تبدیل کرنے گئے تو وہاں ایک اسمارٹ، درمیانہ عمر کے صاحب بیٹھے تھے۔ جیسے ہی نظریں ملیں ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ظاہر ہے کہ جواب میں ہمیں بھی مسکرانا پڑا۔ خواہ کوئی آپ کا کام نہ کرے اور معذرت کر دے، ملاقات کا آغاز مسکراہٹ ہی سے کرے گا بعد میں ہم نے دیکھا کہ ہر مہذب ملک میں مسکرانا ایک ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ نے کار غلط پارک کر دی ہے یا ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ہے تو بھی پولیس کے سپاہی آپ کی طرف آئے گا تو پہلے مسکرائے گا اور پھر دریافت کرے گا۔ "امید ہے آپ کا دن اچھا گزرے گا۔ ایسا جملہ سن کر یہی خیال آئے گا کہ یہ تو بہت خوش مزاج اور نرم دل پولیس والا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کہے گا "سر، آپ نے فلاں ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔"

اور جیب سے چالان کی کاپی نکال کر چالان آپ کے حوالے کر دے گا۔

پھر Have a good day کہہ کر مسکراتا ہوا چلا جائے گا۔ اگر پولیس والا کسی ملزم کو گرفتار کرے گا تو پہلے مسکرائے گا۔ پھر مزاج پرسی کرے گا اور چالان کی پرچی حوالے کر دے گا۔

چالان ہونے کے بعد مقررہ تاریخ تک آپ اس کے خلاف عدالت جانا چاہتے ہیں تو اپنا موقف پیش کر سکتے ہیں۔ اگر جج آپ سے متفق ہوا تو چالان ضائع کر دے گا ورنہ آپ پر مسکراتے ہوئے جرمانہ ٹھونک دے گا۔

البتہ ایک بار ہم کو مسکراہٹ تو ملی لیکن چالان کی پرچی نہیں ملی ہوا یہ کہ ہم رات کو گیارہ بجے کے قریب واشنگٹن کے ریستوران سے اپنے گھر واپس جا رہے تھے جو ورجینیا میں تھا۔ رات کا وقت تھا اور سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ اس لیے ہم تیز رفتاری سے کار چلا رہے تھے۔ امریکی شہروں میں یہ رواج ہے کہ مختلف علاقوں میں حدِ رفتار تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً جہاں آبادی زیادہ ہے یا کوئی گنجان علاقہ ہے تو رفتار کی حد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہر جگہ رفتار کے لیے سائن بورڈ لگے ہوتے ہیں لیکن مجھے اول تو سائن بورڈ پڑھنے کی عادت نہیں ہے دوسرے سوچا کہ اتنی رات گئے ٹریفک تو ہے نہیں سڑکیں خالی پڑی ہیں اس لیے کار کو ساٹھ ستر کلومیٹر کی رفتار سے بھگاتے رہے۔

اچانک ایک جگہ پیچھے ہمیں پولیس کار کی روشنی نظر آئی۔ ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ اتنی رات گئے بھی پولیس ہمارا پیچھا کرے گی۔ لیکن کچھ دیر بعد یقین آ گیا کہ یہ پولیس والا ہماری ہی تاک میں ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اسی رفتار سے کار چلاتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ چند لمحے بعد پولیس کار ہمارے ساتھ آ کر رک گئی اور ایک اسمارٹ پولیس والا اپنی کار سے اتر کر ہماری طرف آیا۔

اس نے جھک کر کھڑکی میں سے ہمیں دیکھا۔ مسکرایا اور گڈ ایوننگ کہنے کے بعد بولا۔ "سر، میں کئی کلومیٹر سے آپ کا پیچھا کر رہا ہوں۔ آپ بہت تیز رفتاری سے کار چلا رہے تھے۔"

ہم نے کہا "دراصل پاکستان سے نئے نئے آئے ہیں اس لیے روڈ سائین نہ دیکھ سکے۔ مگر آفیسر آپ نے ہمارے لیے اتنا پیٹرول خرچ کر دیا۔"

مسکرا کر بولا۔ "سر، یہ ہماری ڈیوٹی ہے اب آپ بتایئے کہ کس دفعہ کے تحت آپ کا چالان کاٹا جائے کیونکہ آپ نے کئی مقامات پر اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "یہ فیصلہ تو آپ کریں گے اور ہمیں آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔"

وہ مسکرایا اور بولا۔ "سر، آپ نے... غور نہیں کیا ہے میں اس سے متفق تو نہیں ہوں لیکن پہلی غلطی پر ہم اپنے ملک میں آئے ہوئے مہمان کو ایک موقع دیتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے۔ میں آپ پر آئندہ نظر رکھوں گا۔ اگلی بار آپ کو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ اوکے! گڈ نائٹ اینڈ موسٹ ویلکم ٹو امریکا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا لیکن اس دن کے

بعد ہم نے دوبارہ یہ غلطی نہیں کی۔
مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ آپ اپنی مسکراہٹ سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور دوسروں کے دل جیت سکتے ہیں۔ مسکراہٹ کو اپنایئے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، فائدہ ہی فائدہ ہے۔

☆☆☆

30 مارچ کو ناصر کاظمی کی برسی بالکل خاموشی سے گزر گئی۔ کچھ لوگوں نے مختصر تقاریب اپنے طور پر منعقد کیں لیکن یہ ناصر کاظمی جیسے شاعر کے شایانِ شان نہ تھا۔ ناصر کاظمی اپنے اسلوب اور انداز کے اعتبار سے ایک انوکھے انداز کا شاعر تھا۔ ناصر کاظمی کا ہر انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ جب اس نے شادی کی تو سہاگ رات کو اپنی بیگم کو بتایا کہ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم میری دوسری بیوی ہو۔ یہ سن کر دلہن کا چہرہ اتر گیا۔ وہ پریشان ہوگئی کیونکہ کوئی بھی عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی بننا نہیں چاہتی۔
نئی دلہن کی پریشانی دیکھ کر ناصر نے پوچھا۔ ”کیا تم اپنی سوکن کا نام نہیں پوچھوگی۔“
دلہن غریب کیا جواب دیتی۔ خاموشی سے سر جھکا لیا۔
دولھا نے جیب سے ایک کتاب نکال کر پیش کی اور کہا۔ ”یہ ایک غریب شاعر کی طرف سے منہ دکھائی ہے۔ میں نے لڑکپن ہی میں شاعری سے شادی کرلی تھی۔ دراصل یہ میری پہلی بیوی کی طرف سے دوسری بیوی کے لیے ایک تحفہ ہے۔ امید ہے تم اسے پسند کروگی۔“
یہ سن کر دلہن کے دم میں دم آیا۔ اس کے بعد ان دونوں کی زندگی ایک مثالی شادی کہلائی۔ ناصر کو راتوں میں شہر کی سڑکوں پر دوستوں کے ساتھ گھومنے کی عادت تھی۔ ناصر کاظمی بچپن ہی سے ایک شاعرانہ مزاج لے کر آیا تھا۔ اسے پھولوں اور کبوتروں سے عشق تھا۔ ناصر کاظمی ایک عجیب وغریب مزاج کا آدمی تھا۔ نوکری سے دور بھاگتا تھا، اگر ہمدرد، دوست یار رشتے دار کہیں ملازمت دلا بھی دیتے تو ناصر کاظمی دوسروں کی طرح دفتری پابندیوں اور نظم وضبط کا قائل نہ تھا۔ ایک بار ریڈیو پاکستان میں اسے ریڈیو آرٹسٹ مقرر کردیا گیا مگر وہ کبھی وقت پر دفتر نہیں آیا۔
ایک بار بارہ بجے دفتر پہنچا تو اسٹیشن منیجر سے آمنا سامنا ہوگیا۔ منیجر نے پوچھا۔ ”ناصر صاحب، آپ نے گھڑی دیکھی ہے۔ کیا بج رہا ہے؟“
”جی ہاں، سامنے دیوار پر گھڑی لگی ہوئی اور بارہ بجے کا وقت بتارہی ہے۔“
”لیکن آپ کے ریڈیو اسٹیشن پہنچنے کا وقت تو نو بجے ہے۔“
”جی وہ تو میں جانتا ہوں لیکن آج انناس کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اتنے اچھے اور میٹھے انناس چھوڑ کر کون آتا۔“ یہ کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اسٹیشن منیجر دیکھتا رہ گیا۔ ناصر کاظمی کا شاعرانہ مقام اتنا بلند تھا کہ لوگ اس کو ٹوکتے ہوئے گھبراتے تھے۔
ناصر کاظمی کا اصلی نام ناصر رضا تھا مگر جب باقاعدگی سے شاعری شروع کی تو سوچا کہ دوسرے شاعروں کی طرح اس کا بھی ایک تخلص ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا بہت چرچا تھا۔ خصوصاً نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول تھے۔ اس طرح ناصر رضا ناصر کاظمی بن گیا۔
ناصر کاظمی انبالہ میں پیدا ہوا۔ اس کے والد فوج میں صوبیدار میجر تھے جن کا نام محمد سلطان کاظمی تھا۔ ناصر نے ابتدائی تعلیم انبالہ میں حاصل کی پھر مسلم ہائی اسکول انبالہ، اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا۔ اس کے اشعار کا پہلا مجموعہ ”برگ نے“ 1952 میں شائع ہوا تھا۔ یہ وہی کتاب تھی جو کہ اس نے منہ دکھائی میں اپنی دلہن کو پیش کی تھی۔
ناصر کاظمی نے مختلف رسائل میں مدیر کے طور پر کام کیا مگر جلد ہی اکتا کر چھوڑ دیا۔ کئی انگریزی کتابوں کے اردو میں بہت اچھے ترجمے کیے۔ اس کی تصانیف درج ذیل ہیں۔
برگ نے (غزلیں) دیوان (غزلیں) پہلی بارش (غزلیں) نشاط وخواب (نظمیں) سُر چھایا (منظوم ڈراما) خشک چشمے کے کنارے (نثری مجموعہ) انتخاب میر، انتخاب نظیر، انتخاب انشاء، ناصر کاظمی کی ڈائری
ناصر کاظمی کی شاعری میں ایک تشنگی اور والہانہ کیفیت کے ساتھ ساتھ بے تکلفی کا عنصر بھی شامل تھا۔
ناصر کاظمی کے دادا سید شریف الحسن کاظمی خاندانی رئیس تھے۔ کئی چوڑی زمینوں کے مالک تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا مگر وہ اپنے دوستوں کی طرح ملازمت کے خواہش مند تھے۔ بالآخر انہوں نے پولیس میں انسپکٹر کی ملازمت کرلی۔ اس زمانے میں پولیس کے سپاہی کو دیکھ کر لوگ ڈر جاتے تھے۔ وہ تو انسپکٹر تھے۔ اس لیے بہت بارعب افسر تھے۔ دیکھا دیکھی ان کے والد نے بھی ملازمت کرلی مگر انہیں فوج میں جانے کا شوق تھا اس لیے انہوں نے فوج میں ملازمت کرلی۔ حالانکہ ملازمت کے محتاج نہ تھے۔ ناصر کاظمی کو گپ لگانے اور جھوٹی کہانیاں گھڑنے کی عادت تھی۔ یہ عادت ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔
1954 میں سیلاب آیا اور دریائے راوی کا پانی راج گڑھ تک آ گیا۔ صوفی تبسم ان دنوں راج گڑھ میں رہا کرتے تھے۔ پانی اترا تو سب ان کی خیریت پوچھنے کے لیے آئے مگر ناصر کاظمی نہ جاسکا۔
چند روز بعد صوفی تبسم ریڈیو اسٹیشن گئے تو ناصر کاظمی سے ملاقات ہوئی۔
صوفی تبسم نے شکوہ کیا کہ ناصر تم میری خیر خبر لینے نہیں آئے۔ ناظر کاظمی نے فوراً ایک کہانی گھڑ لی۔ انہوں نے عذر پیش کیا، وہ ملاحظہ کیجیے۔
”صوفی صاحب، میں اپنے ایک دوست کی جیپ میں آپ کے لیے آٹے کی دو بوریاں، چینی اور چاول لے کر آرہا تھا مگر ریت کے پاس گھوڑا اڑ گیا۔ آگے چل کر ہی نہ دے۔ کوچوان نے اس کو مار مار کر چلانے کی کوشش کی مگر وہ عجیب گھوڑا تھا۔ مار کھا کر بھی اس نے قدم آگے نہیں بڑھایا۔
صوفی صاحب اس داستان کو سن کر خوش ہوگئے یہ نہیں سوچا کہ جیپ اور گھوڑے کے اڑ جانے کا کیا تعلق تھا۔ یہ ناصر کی عادت بن چکی تھی۔ نئے لوگ ان کی باتوں پر یقین کرلیتے تھے۔
ناصر کاظمی کے والد کا تبادلہ نوشہرہ ہوا تو ناصر کو بہت مزہ آیا۔ ان کو ایک بہت بڑا گھر دیا گیا تھا۔ گھر کے نزدیک سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ ریل کی چھک چھک اور انجن کی سیٹی کی آواز اس کو بہت اچھی لگتی۔ اس کا ایک اور شوق گھر کی چھت پر چڑھ کر چاندنی کو دیکھنا تھا۔ جھوٹ بول کر حیران کرنا ناصر کاظمی کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

کافی ہاؤس میں فراق صاحب کے ساتھ ناصر کاظمی، محمد طفیل اور انتظار حسین

ایک بار انہوں نے باقر رضوی کو ایک قصہ سنایا۔
”باقر، تم نے مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی کی عمارت کے سامنے بھنگیوں کی توپ تو دیکھی ہے۔“
”ہاں، وہاں سے گزرتے ہوئے ہر روز دیکھتا ہوں۔“
”جب میں رات کو دو بجے اپنے گھر جاتا ہوں تو مجھے توپ کے پاس تنہا سڑک پر ایک بڑھیا نظر آتی ہے۔“
”کیا ہر بار؟“
”ہاں، ہر بار، میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا کہ یہ بڑھیا اتنی رات گئے یہاں کیا کررہی ہے۔ وہ بڑھیا کالے رنگ کی ہوتی ہے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ”اماں

جی 'اپنا چہرہ تو دکھاؤ۔"

"اس نے چہرے سے چادر ہٹائی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پتا ہے وہ کون تھی؟"

"کون تھی؟"

"وہ میری ماں تھی۔"

"واقعی؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ میں تو خود حیران رہ گیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد میں نے رات کو اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا۔"

ناصر کاظمی بچپن ہی میں عجیب و غریب مزاج کا مالک تھا اور عجیب و غریب شرارتیں کرتا تھا۔

ایک بار جب وہ چھ سال کا تھا دیوالی کا تہوار آ گیا۔ دیوالی میں پٹاخے چلائے جاتے ہیں۔ ناصر نے بھی کئی پٹاخے خریدے اور کسی طرح کمشنر کی کوٹھی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ اس نے پٹاخوں میں آگ لگائی اور جلتے ہوئے پٹاخے کمشنر کی کوٹھی کے احاطے میں پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔

کانگریس نے بھی عدم تعاون کا اعلان کر دیا تھا۔ مسلم لیگ نے بھی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس زمانے میں سبھاش چندر بوس نے بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ آزادی ہند کی فوج ٹرینوں کے نیچے بم رکھ کر فوجی گاڑیوں کو اڑا دیتی تھی۔ سرکاری املاک کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ انگریزی حکومت یہ سمجھی کہ سبھاش چندر بوس کی باغیانہ تحریک نوشہرہ تک پہنچ گئی ہے۔ سبھاش چندر تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ انگریز کمشنر نے ان پٹاخوں کا الزام بھی سبھاش چندر بوس کے کھاتے میں ڈال دیا۔

شہر کی ہوا میں ہلچل مچ گئی لیکن صرف ایک بچہ ایسا تھا جس کو حقیقت کا علم تھا۔

ناصر کاظمی کو کبوتر پالنے کا بھی شوق تھا۔ جب اس شوق کا اظہار اپنی ماں سے کیا تو ماں نے کہا "دیکھو بیٹے ' کبوتر بھی سید ہوتے ہیں اور تم بھی سید ہو۔ کیا تمہیں یہ اچھا لگے گا کہ تم سیدوں کو پنجروں میں بند رکھو اور ان پر ظلم کرو۔"

لیکن ناصر کو کبوتروں سے عشق تھا۔ اس کو فطرت کی ہر چیز سے عشق تھا۔ وہ آسمان پر پرندوں اور کبوتروں کو پرواز کرتے دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ کیا میں بھی ان پرندوں کی طرح پرواز کر سکتا ہوں۔

اپنا شوق پورا کرنے کا اس نے ایک نرالا طریقہ نکالا۔ وہ اپنا جیب خرچ اکٹھا کر کے ایک کبوتر خرید کر لایا اور اس کو کھڑکی سے اندر پھینک دیا۔ کبوتر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر ماں نے آس پاس دیکھا تو اس کو ایک کبوتر صحن میں اترا ہوا نظر آیا۔

ناصر نے اندر آ کر کہا "اماں' اماں' دیکھو اللہ میاں نے ہمیں ایک کبوتر بھیج دیا ہے۔ یہ تو اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔ اللہ کی دین کو ہم کیسے ٹھکرائیں گے۔"

ماں سمجھ گئی کہ یہ بیٹے کی شرارت ہے لیکن اس کی ضد کے آگے اس نے ہار مان لی۔ اس کے بعد آئے دن کھڑکی کے راستے کبوتر آتے رہے۔ ماں حیران تھی کہ آخر کبوتر اس کے گھر کیوں آ جاتے ہیں۔ اس دوران میں اس کے گھر میں بہت سے کبوتر جمع ہو گئے۔ وہ صحن میں کبوتروں کے درمیان میں بیٹھ جاتا اور جب چاروں طرف کبوتر اڑتے تو ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اس کو بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کبوتروں کو دانہ کھلاتا تھا۔ کبوتر بھی اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ ہر وقت اس کے پاس منڈلاتے پھرتے۔ کبھی ہاتھوں پر اور کبھی کندھوں اور سروں پر بیٹھ جاتے تھے۔ ناصر کافی دیر تک کبوتروں میں گھرا رہتا اور بہت خوش ہوتا تھا۔ کبوتروں کا شوق اس کو ساری عمر رہا۔ اس نے کبوتروں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ایک بار وہ ریل کے ذریعہ ساہیوال جا رہا تھا۔ اسٹیشن کے نزدیک ہی اس کو ایک کبوتر فروخت کرنے والے کی دکان نظر آئی۔ مختلف کبوتروں کو دیکھ کر وہ بے تاب ہو گیا اور ٹرین سے اتر کر کبوتر والے کے پاس جا کر کبوتر دیکھتا رہا۔ ہر کبوتر کے بارے میں وہ معلومات بھی فراہم کر رہا تھا۔ کبوتر والے نے پوچھا "بابو جی کیا آپ کبوتروں کا کاروبار کرتے ہیں؟"

ناصر نے فوراً گپ لگائی۔ "میں دنیا بھر سے مختلف کبوتر اکٹھے کرتا ہوں۔ باہر سے کبوتر امپورٹ بھی کرتا ہوں اور ایکسپورٹ بھی کرتا ہوں۔ دنیا بھر سے کبوتروں کے شوقین مجھ سے مشورے مانگتے ہیں۔"

دکاندار بہت مرعوب ہوا۔ اس گفتگو میں لاہور کی ٹرین چلی گئی۔

دکاندار نے کہا۔ "بابو جی آپ کی ٹرین تو چلی گئی۔"

ناصر نے بے فکری سے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟ جب ٹرین نہیں ہوتی تھی کیا اس وقت لوگ سفر نہیں کرتے تھے۔"

ناصر کاظمی نے دوسری ٹرین کا انتظار نہیں کیا اور پیدل ہی چل پڑا۔

جب دوستوں کو پتا چلا کہ وہ پیدل ہی لاہور آ گیا ہے تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ناصر نے کہا۔ "تم لوگ مشینوں کے عادی ہو گئے ہو۔ جانتے ہی نہیں ہو کہ پیدل سفر کس قدر پُرلطف ہوتا ہے۔ درخت، سبزہ زار، ہرے بھرے کھیت، میدان، کھلا ہوا بالکل صاف آسمان، یہ نظارہ تو پیدل چلنے والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔" ناصر کاظمی کو پڑھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ گھر میں ہر طرح کی کتابیں موجود تھیں۔ وہ شریر ضرور تھا لیکن پڑھنے میں بہت تیز تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح مطالعے کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ قصہ چہار درویش، الف لیلہٰ، گلستان بوستان، شاہنامہ فردوسی، فسانہ عجائب پڑھ چکا تھا جو اس کے ذہن پر نقش ہو جاتی تھیں۔ میر انیس کے مرثیے اس کو زبانی یاد تھے۔ دوسرے شعرا کا کلام بھی ازبر تھا۔

بڑے شاعروں کی شاعری پڑھ کر ہی اس کو شاعری کا شوق ہوا تھا۔ بچہ تھا لیکن اساتذہ کا کلام اسے ازبر تھا۔ اسے شاعری کے رموز سے بھی واقفیت ہو گئی۔ اس کو احساس ہونے لگا کہ اس میں بھی شاعری کے جراثیم موجود ہیں۔ اس نے جو پہلا شعر کہا وہ یہ تھا۔

قبول ہے جنہیں غم بھی تری خوشی کے لیے
وہ جی رہے ہیں حقیقت میں زندگی کے لیے

اس نے اپنی پہلی غزل مکمل کر کے نانا کو پیش کی۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ اتنا کم عمر بچہ ایسی غزلیں بھی لکھ سکتا ہے۔ انہوں نے نواسے کی بہت حوصلہ افزائی کی۔

جب وہ لاہور پہنچا تو اس ادبی مرکز میں اس کو بڑے بڑے شاعروں اور نثر نگاروں کی صحبت حاصل ہوئی۔ لاہور نے اس کی شاعری کی آبیاری کی۔ لاہور میں اس نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا تو اس کی شاعری میں مزید نکھار پیدا ہو گیا۔ نہ صرف کالج کے مشاعروں میں بلکہ کل ہند مشاعروں میں بھی اسے مدعو کیا جانے لگا۔ اب ادب ذوق حضرات اور ادبی حلقہ اسے پہچاننے لگا تھا۔

1942 میں لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ایک کل ہند مشاعرہ نشر ہوا جس میں ناصر کاظمی کو بھی بطور شاعر مدعو کیا گیا تھا۔ ایک نوجوان طالب علم شاعر کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس مشاعرے میں اس کو پہلی بار ہندوستان کے نامور شعرا کو دیکھنے اور ان کی زبانی ان کا کلام سننے کا موقع ملا تھا پھر بھی اس کے اشعار کو بہت پسند کیا گیا۔

یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اختر شیرانی کی تصوراتی محبوبہ کے برعکس ناصر کاظمی کی حقیقت میں ایک محبوبہ تھی۔ اگرچہ اس نے بذاتِ خود کسی کو اس کا نام نہیں بتایا مگر قریبی یار دوست جان گئے۔ اس کی محبوبہ کا نام حمیرا ہے۔ وہ اسے کہاں اور کیسے ملی تھی۔ ان کے بچھڑنے کا سبب کیا تھا یہ حقیقت ہمیشہ پردۂ راز ہی میں رہی اور اس کے قریب ترین دوست بھی محض اندازے ہی قائم کرتے رہے۔

یہ شعر اس نے حمیرا ہی کے لیے کہا تھا۔

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبح گاہی

یہ اشعار حمیرا کے بچھڑنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ یکایک اس میں ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ ہر وقت مسکرانے اور ہنسنے ہنسانے والا شخص بجھ سا گیا تھا۔ اس کی شاعری میں ہجر کی شکایت اور درد پیدا ہو گیا تھا۔ کافی عرصے حمیرا کی یادوں کو دل سے لگائے بیٹھا رہا۔ ایک قریبی دوست کو اس نے صرف اتنا بتایا کہ حمیرا کی شادی ہو گئی ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس کی زبان پر حمیرا کا نام نہ آیا۔ حمیرا تو چلی گئی لیکن ناصر کاظمی کے کلام پر اپنے اثرات چھوڑ گئی۔

اسی زمانے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ دوسرے شہروں کے مسلمانوں کی طرح ناصر کے گھر والوں کی زندگی بھی انبالے میں خطرے میں پڑ گئی تھی۔ مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ معصوم اور پاک باز عورتوں کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ وہ فوراً گھر والوں کو لاہور لانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر انبالہ پہنچ گیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس سفر کے دوران میں کسی نے اس کا مذہب یا نام نہیں دریافت کیا۔ اس کے گھر والے اپنے آبائی شہر اور مکانوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ بمشکل ناصر کاظمی نے انہیں حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔

انبالے میں ناصر کا خاندان تو تھا لیکن کبوتر بھی تھے جنہیں وہ خاندان ہی کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔

انبالہ میں باوا سنت سنگھ سے ناصر کی بہت گاڑھی چھنتی تھی کیونکہ وہ بھی کبوتر پالنے کے شوقین تھے اور ناصر سے کہا کرتے تھے۔ اگر کبھی اپنے کبوتر فروخت کرو تو میرے سوا کسی کو نہ دینا۔ یہ بات ناصر کو یاد تھی۔ انبالہ پہنچ کر وہ سیدھا باوا سنگھ کی حویلی پہنچا۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں اس کو

تنہا دیکھ کر باوا سنت سنگھ پریشان ہوگئے۔ ناصر نے بتایا کہ ہر طرح خیریت ہے لیکن میرے کبوتروں کا کیا ہوگا۔ انہوں نے اس سے کبوتر خریدنے کا وعدہ کرلیا اور پھر کہا کہ میں تمہیں اپنی حویلی میں رکھ لیتا اور تمہارے خاندان کو بھی اپنوں کی طرح رکھتا۔ لیکن آج کل انسان حیوان بن چکے ہیں۔ پورا شہر میرا دشمن بن جائے گا اور ہوسکتا ہے وہ میری حویلی پر حملہ کرکے تم سب کو نقصان پہنچائیں۔ لیکن کبوتر تو نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان۔ میں تمہارے سارے کبوتر خرید لیتا ہوں' حالات درست ہوئے اور تم واپس انبالہ آئے تو یہ میرے پاس تمہاری امانت ہیں۔

اس زمانے میں بھی ہندو، سکھ اور مسلمانوں میں ہمدرد اور دردمند لوگ تھے۔ باوا سنت سنگھ بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اپنی جیپ میں مسلح محافظوں کے ساتھ ناصر کو اس کے گھر بھیجا اور کہا کہ انہیں حفاظت سے ان کے گھر پہنچادو اور ان کے گھر والوں کی بھی حفاظت کرنا۔

ناصر نے کبوتروں کی کابکیں باوا سنت سنگھ کے آدمیوں کے حوالے کردیں۔ اس کو اطمینان تھا کہ وہ ان کبوتروں کو اپنے بچوں کی طرح رکھیں گے۔ جب اس کا گھر کبوتروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور غٹرغوں کی آوازوں سے محروم ہوگیا تو اس کو یہ گھر ویرانہ لگنے لگا۔ اس وقت اس نے یہ غزل کہی۔

تجھ بن گھر کتنا سونا تھا
دیواروں سے ڈر لگتا تھا

اپنے کمرے میں بند ہوکر وہ بہت دیر تک روتا رہا جیسے کوئی اپنے عزیز کے لیے روتا ہے۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ دروازے بند کرکے کمرے میں بیٹھ کر آنسو بہاتا رہا۔ گھر والے اس کو تسلی دیتے رہے کہ اس کے کبوتر بہت محفوظ ہیں۔ اگر لاہور جاکر رہنا ہوا تو اور کبوتر خرید لینا۔ والد کو اس نے بالآخر انبالہ چھوڑنے پر رضامند کرلیا اور اس طرح وہ انبالہ چھوڑ کر لاہور آگیا۔ وہ دوبارہ پھر کبھی انبالہ نہیں گیا۔

اسی رات سکھوں اور ہندوؤں کے ایک ہجوم نے اس کے محلے کو گھیر لیا۔ مسلمان بھی اس کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا۔ ساری رات یہ جنگ جاری رہی۔ مسلمانوں کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا مگر اگلے دن ہی سارے محلے والوں نے انبالہ چھوڑ کر لاہور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ گھروں کا قیمتی سامان وہیں چھوڑا اور جیسے تیسے جانیں بچا کر اپنے آبائی گھروں کو خیرباد کہہ کر پاکستان کا رخ کیا۔

یہ سب ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ انبالے سے لاہور کا سفر کافی طویل تھا۔ اٹھارہ گھنٹے تک ٹرین کا انتظار کرنا تھا۔ یہ وقت بھی ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے گزرا۔ خدا خدا کرکے ٹرین آئی اور یہ سب کلمے اور آیات پڑھتے ہوئے خیریت سے لاہور پہنچ گئے۔

لاہور ناصر کاظمی کے لیے نیا نہیں تھا۔ لاہور کی سڑکیں' گلی کوچے' ریستوران، پاک ٹی ہاؤس' کافی ہاؤس، چائنیز لنچ ہوم' انارکلی، نیلا گنبد، بھنگیوں کی توپ، عجائب گھر، لاہور کا ریلوے اسٹیشن جہاں رات گئے وہ چائے پینے جاتا تھا۔ ایبٹ روڈ کے سینما گھر اور اور چائنیں، میکلوڈ روڈ کی فلمیں ختم ہوتے وقت کی رونقیں ہر چیز وہی تھی لیکن لاہور کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ فسادات نے جو تباہی اور بربادی پھیلائی تھی اس کے نشانات شہر کے چپے چپے پر نظر آتے تھے۔ لاہور تو وہی تھا لیکن اس کی روح اور جسم زخموں سے چور چور تھا۔ بہت سے پرانے دوست بچھڑ چکے تھے۔ لاہور کی ثقافتی محفلیں بیوہ کے سہاگ کی طرح یا تو غائب ہوگئی تھیں یا اجڑ گئی تھیں۔ اس لاہور میں آکر ناصر کاظمی کو خوشی سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔ لیکن اگر لاہور نہ آتا تو وہ اور اس کے خاندان والے کہاں جاتے۔ بڑی مشکل سے جانیں اور عزتیں بچا کر لاہور کے پُرسکون ماحول میں آگئے تھے جہاں جان اور عزت کے لٹنے کا کوئی ڈر نہ تھا۔

پہلی بار جب وہ لاہور آیا تھا تو بڑے شاہانہ انداز میں آیا تھا۔ ہر طرح کا آرام تھا۔ اب سوال سر چھپانے کے لیے گھر کی تلاش کا تھا۔ لاہور میں بے شمار ہندوستان سے آنے والے بے گھر لوگ گھروں کی تلاش میں تھے۔ کچھ بددیانت لوگوں کی وجہ سے بہت سے گھر اور دکانوں پر ان کا قبضہ ہوگیا تھا۔ ان میں مقامی لوگ بھی شامل تھے۔ کچھ لوگوں نے رشوتیں دے کر بڑے بڑے شاندار گھر حاصل کرلیے تھے حالانکہ وہ ہندوستان میں ٹوٹے پھوٹے گھر چھوڑ کر آئے تھے، ناصر کاظمی ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی عیش و آرام دیکھا تھا مگر تقدیر کے بدلتے دیر لگتی ہے۔ کافی ٹھوکریں کھانے اور گلی کوچوں کے چکر لگانے کے بعد ناصر کاظمی کو لاہور کی مین روڈ پر ایک کوٹھی مل گئی۔ وہ متروکہ جائداد تھی۔ اس نے غنیمت جانا اور اپنے خاندان کے ساتھ اس گھر میں منتقل ہوگیا۔ گھر میں کوئی سازوسامان تھا نہ قالین پردے نہ فرنیچر' کچھ بھی تو ہیں نہ

حقیقی دانشوروں کی غیر موجودگی کے سبب کئی خودساختہ دانشور حضرات وجود میں آگئے ہیں۔ ہر میدان میں اور ہر محاذ پر ایسے خودساختہ دانشور ملتے ہیں۔ خودساختہ دانشور حضرات دراصل دان شور کے زمرے میں آتے ہیں۔ وہ اس بات کو نہیں مانتے۔ سینہ ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہم دانشور ہیں۔ خودساختہ دانشوروں کی پہچان بہت آسان ہے' اپنی بات کو پیش کرنے کا ان کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ گفتار کے وہ غازی ہوتے ہیں اور ان کے کردار کے بارے میں علم نہیں ہوتا۔ چند جملے ان کا تکیہ کلام ہوتے ہیں جیسے میری ناقص رائے میں.... آپ حضرات کے سامنے مجھ جیسے جاہل شخص کا لب کشائی کرنا کہیں گستاخی قرار نہ پائے...... میں طفل مکتب ہوں...... آپ حضرات کی محبت اور سرپرستی نے مجھ جیسے ذرّے کو آفتاب بنادیا۔ اب کوئی دان شوروں سے پوچھے' بھائی صاحب' جب آپ اتنے کمتر' حقیر اور فقیر ہیں تو خاموشی سے کسی کونے میں بیٹھ کیوں نہیں جاتے اور اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا اظہار کیا ضروری ہے؟ سیاست دان' لیڈر اور قائد پیدائشی دان شور ہوتے ہیں۔ انہیں شور شرابا' غل غپاڑا اور دھوم دھڑکا بپا کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ سیاست دان بہت اچھے فن کار ہوتے ہیں لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ سیاست سے اداکاری کے میدان میں قدم رکھنے کا رواج نہیں ہے جبکہ فن کار کے لیے اداکاری سے سیاست میں داخل ہونا آسان ہے۔ سیاست اور اداکاری دونوں پیشے ہی میڈیا کی پہلی ترجیح ہوتے ہیں۔ وہ کچھ بھی کریں اور کہیں بھی جائیں کیمرے کی آنکھ اور صحافیوں کے قلم کی گرفت میں رہتے ہیں۔ دور حاضر میں سیاست اور اداکاری ایسے گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ سیاست میں اداکاری ہورہی ہے یا اداکاری میں سیاست۔ دونوں صورتوں میں بھگتنا عوام کو پڑتا ہے۔

اقتباس: دان شور از عابد معز

میں نہ تھا۔ اپنا سجا سجایا گھر تو وہ انبالہ میں چھوڑ آئے تھے۔ صرف ضروری سامان اور جو تھوڑا بہت زیور گھر میں تھا وہی پوٹلی میں باندھ کر لے آئے تھے۔ یہی ان کا سرمایہ تھا۔ یہی بچا کھچا سامان ان کی زندگی میں رہ گیا تھا۔

ناصر کاظمی نے سبھی کچھ چھوڑ دیا تھا۔ گھربار، فرنیچر، جاگیر لیکن اس کو سب سے زیادہ دکھ کبوتروں سے بچھڑنے کا تھا۔ اس نے ایک ایک کرکے کبوتروں کو جمع کیا تھا۔ وہ خالی وقت میں گھنٹوں ان کبوتروں کے جھرمٹ میں بیٹھا رہتا تھا۔ ان کے ساتھ کھیلتا تھا۔ کبوتر بھی اس سے مانوس ہوچکے تھے۔ جب وہ ان کے پاس جاتا تو اس کو گھیر کر بیٹھ جاتے اور اٹھکیلیاں کرتے تھے۔ کوئی بازو پر بیٹھا ہے' کوئی سر پر، کوئی اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھا ہوا دانہ چونچیں مار کر کھا رہا ہے۔ جب کبوتر کی نازک سی چونچ اس کی ہتھیلی سے دانہ چگتی تو اس کو ایک عجیب قسم کے سُرور کا احساس ہوتا تھا۔ پھر کبوتروں کی غٹرغوں کی آواز اس کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔

اب وہ ساری باتیں خواب و خیال بن چکی تھیں بمشکل سے تو رہنے کو گھر ملا تھا۔ اس میں کبوتروں کی کابکوں کی جگہ کہاں؟

اب نوکری کا سوال تھا۔ وہ صبح نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلا۔ شام کو جب بے نیل ومرام واپس آیا تو ایک اور صدمہ اس کا انتظار کررہا تھا۔ گھر کا تھوڑا بہت سامان گھر کے باہر سڑک پر رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ جس گھر کو اپنا سمجھ بیٹھے تھے وہ ایک بڑے سرکاری افسر نے اپنے نام الاٹ کرالیا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے ایک بار پھر گھر کی تلاش شروع کردی۔ کافی تلاش کے بعد اسے پرانی انارکلی میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ یہ بھی ایک متروکہ گھر تھا مگر اس وقت یہی چھوٹا سا گھر اس کو ایک شاندار محل نظر آرہا تھا۔ پہلے اس کے گھر میں کبوتروں کے کابک تھے اب وہ خود ایک کابک نما گھر میں رہنے پر مجبور تھا۔ وقت وقت کی بات ہے۔ حالات کہاں یکساں رہتے ہیں۔ اونچ نیچ تو انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔

اس کے والد کو لاہور میں ایک نوکری مل گئی مگر تنخواہ بہت کم تھی۔ ان حالات میں ناصر کاظمی کے لیے تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس نے بھی صبر کرلیا۔ جب سبھی کچھ چھن گیا تو تعلیم کا کیا رونا۔ گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کا کیا سوال تھا۔ وہ بہت

خوبصورت خواب لے کر پاکستان آیا تھا لیکن سارے خواب ریزہ ریزہ ہوگئے تھے۔ نہ تعلیم جاری تھی، نہ جیب میں کچھ تھا۔ کچھ پرانے اور کچھ نئے ملنے والوں کے ساتھ وقت گزارنے کے سوا وہ اور کیا کرسکتا تھا۔ وہ جہاں بھی بیٹھتا انبالے کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر بیان کرتا۔ مبالغہ کی عادت اس کے کام آئی۔ جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتا تو اس میں اتنی رنگ آمیزی کرتا کہ وہ ایک خوبصورت داستان معلوم ہوتی۔ یار لوگوں کے ہاتھ میں ایک بہانہ آگیا۔ وہ جان بوجھ کر اس کو انبالے کے قصے سنانے کے لیے چھیڑا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی نے دوسرے شاعروں کے بارے میں خیال آرائی شروع کردی۔

کسی نے کہا کہ جوش ملیح آبادی کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ معمولی بات کو بھی وہ بھاری بھرکم الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

یہ سن کر ناصر کاظمی نے کہا۔ ”جوش صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ ہاتھی پر بیٹھ کر چڑیا کا شکار کھیلنے جاتے ہیں۔“

یہ فقرہ جوش صاحب کے کانوں تک پہنچ گیا۔ وہ مسکرا کر رہ گئے۔ اب ایک معروف شاعر کی حیثیت سے ناصر کاظمی کو شہرت ہوچکی تھی اور اس کو مشاعروں میں بلایا جاتا تھا۔ جہاں معاوضہ بھی مل جاتا تھا۔ ان دنوں مشاعرے کم ہوتے تھے۔ لیکن کچھ نہ کچھ معاوضہ مل ہی جاتا تھا۔ ایک بار وہ مشاعرے میں شرکت کے لیے کوئٹہ جا رہا تھا۔ سخت گرمی تھی شاعروں کی کوشش تھی کہ اسے ائرکنڈیشنڈ بوگی میں جگہ مل جائے۔ باقر رضوی زیادہ پریشان تھے۔

ناصر کاظمی نے باقر رضوی سے کہا۔ ”باقر صاحب، آپ اتنے پریشان کیوں ہورہے ہیں؟“

باقر رضوی نے کہا۔ ”ناصر صاحب سفر بہت لمبا ہے اور گرمی بہت زیادہ۔ اگر ائرکنڈیشنڈ بوگی کا انتظام نہ ہوا تو ہم لوگ تو نیم جان ہوجائیں گے۔ کوئٹہ جا کر مشاعرے میں کیا خاک پڑھیں گے۔“

ناصر کاظمی نے فوراً کہا۔ ”باقر صاحب ایک بات تو بتایئے۔“

”جی پوچھیے۔“

”یہ بتایئے کہ کیا امام حسین کربلا میں ائرکنڈیشنڈ بوگی میں گئے تھے۔“

اس بات کا باقر صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ خاموشی سے کان دبا کر ائرکنڈیشنڈ بوگی چھوڑ کر عام بوگی میں بیٹھ گئے۔

ناصر کاظمی بہت سمجھدار اور پڑھا لکھا تھا۔ تو پھر وہ ایسی مبالغہ آمیز باتیں کیوں کرتا تھا۔ اس کا سبب ایک ماہر نفسیات نے یہ بتایا کہ دراصل وہ اپنی نامکمل حسرتوں اور ناکامیوں کو بھلانے کے لیے دروغ گوئی کرتا تھا۔ اس نے بہت اچھے دن دیکھے تھے مگر اب غربت میں دن گزار رہا تھا۔ اپنی آسودہ خواہشوں کو تسلی دینے کے لیے وہ مبالغہ آمیزی کرتا تھا اور خود اپنی طرف سے بھی بہت سے قصے گھڑ لیتا تھا۔ وہ ایک ایسا بلند خیال رکھنے والا آدمی بن گیا تھا جس کی جیب خالی تھی۔ آرام دہ زندگی گزارنے کی حسرت میں وہ خواب بُنتا رہتا تھا۔ اگر اس کا کوئی جھوٹ پکڑا جاتا تو وہ خود بھی دوسروں کی ہنسی میں شامل ہوجاتا۔ لیکن حالات کے نشیب فراز اور مایوسیوں نے اس کی شاعری میں گہرائی اور حزن خوبصورتی پیدا کردی تھی۔ بے شمار پرانی یادیں، دکھ درد، مایوسیاں اور ناکامیاں اس کی شاعری کے لیے ایک مضبوط سہارا بن گئی تھیں۔ اس کی شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہورہی تھی جس کی وجہ سے اس کی شاعری کی پہچان ہوگئی تھی اور وہ اپنے دور کا ایک معروف اور قابلِ ذکر شاعر بن گیا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں ایک سے ایک بڑا شاعر موجود تھا لیکن ناصر کاظمی کے ایک منفرد انداز کی وجہ سے ان سب کے ہوتے ہوئے بھی اس کی شاعرانہ عظمت میں اضافہ ہورہا تھا۔ اس کے اشعار میں بلند خیالی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے خیالات میں بہت کشادگی اور بلندی پیدا ہوگئی تھی۔ ناصر کاظمی دیکھتے ہی دیکھتے ایک سکہ بند شاعر کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا تھا۔ کئی نووارد شعرا اس کے طرزِ کلام سے متاثر ہوکر اس کی پیروی کرنے لگے تھے۔

اس زمانے میں منیر نیازی بھی ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ دونوں کے انداز بیان میں سادگی اور نیاپن تھا۔ دونوں اپنے ماضی کی یادوں کو بھول نہیں پائے تھے۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے تو روایت پسند معروف شاعروں کے مقابلے میں منیر نیازی اور ناصر کاظمی کو ترجیح دوں گا۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک ہی لب و لہجہ اور نیا لباس دیا تھا۔

ناصر کاظمی کو بھی رفتہ رفتہ یہ شعور اور احساس ہوگیا کہ جس وطن کی خاطر اس نے اور لاکھوں مسلمانوں نے جان، مال اور عزت کی قربانیاں دی تھیں اس پر خودغرض، مفاد پرست، طالع آزما لوگ قابض ہوگئے ہیں۔ آبادی کے

ایک انتہائی مختصر حصے نے ہر چیز پر قبضہ جمالیا ہے۔ یہ وہ پاکستان نہیں جس کا خواب ناصر کاظمی اور اس جیسے دوسرے نوجوانوں نے دیکھا تھا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے اس کو اپنا ماضی زیادہ شدت سے یاد آنے لگا تھا۔ ماں باپ کے سائے سے وہ محروم ہوچکا تھا۔ وہ ایک بے چین اور بے قرار روح کی طرح راتوں کو لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا رہتا تھا۔ گھر میں ماں باپ نہ تھے نہ اس وقت تک اس کی شادی ہوئی تھی۔ البتہ اس نے ایک ایک کرکے کسی طرح کبوتر حاصل کرلیے تھے۔ اب یہی اس کے دل بہلاوے کا ذریعہ تھے ورنہ شاید ذہنی الجھنیں اور زندگی کی تلخیاں اسے پاگل کردیتیں۔

اس دوران مختلف رسائل کی ادارت بھی کی مگر جلد ہی اکتا گیا۔ دفتر میں رونق اور چہل ہوتی تھی مگر وہ اپنی تنہائی میں گم رہتا تھا۔ بقول شاعر

کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ چکا ہو

اس کے بے تکلف احباب کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا اور ان کی محفلیں ہی اس کے لیے دل بہلاوے کا سبب تھیں۔ اس کے قریبی دوستوں میں انتظار حسین، شاہد حمید، مظفر علی سید، صلاح الدین شیخ شامل تھے۔ یوں تو ہماری سرسری ملاقات ناصر کاظمی سے کئی بار ہوئی لیکن جب روزنامہ ”آفاق“ کا آغاز ہوا تو یہاں بہت سے ذہین اور منچلے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ انتظار حسین بھی ان میں شامل تھے اور ہمارے کمرے میں ہی ان کی بھی میز تھی۔ یہاں ناصر کاظمی سے زیادہ بات چیت اور ملاقاتوں کا بہانہ ملا۔

دوست احباب اس کو شادی کرنے پر مجبور کررہے تھے تاکہ وہ تنہائیوں کے زہر سے چھٹکارا پاسکے۔ ”ہمایوں“ کے مالک و مدیر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کے سپرد ادارت کردی۔ منٹگمری میں ایک جگہ اس کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی مگر لڑکی والوں کا مطالبہ تھا کہ وہ پہلے کوئی ملازمت کرے۔ ہمایوں کی ادارت نے یہ مشکل بھی آسان کردی۔ اس کی شہرت سارے پاکستان میں اور ملک سے باہر تک پہنچ گئی تھی۔ کمی صرف نوکری کی تھی سو وہ بھی مل گئی۔ شادی کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ اس لیے بھی کہ ناصر کی بیگم نے اس کی پرانی عادتوں پر کبھی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوشی سے اسے قبول کیا۔

ناصر کاظمی کی آواز ان کے دبلے پتلے جسم کے مقابلے میں بھاری اور پُراثر تھی۔ ہماری اور ناصر کاظمی کی ملاقاتیں آفاق کے دفتر تک ہی محدود رہیں کیونکہ کسی اور جگہ جانے کی ہمیں فرصت نہ تھی۔ ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس میں اکثر ملنا ہوتا تھا۔ ناصر کاظمی کے کلام کے نمونے کے طور پر کچھ غزلیں اور نظمیں ملاحظہ کیجیے:

تم آگئے ہو تو کیوں انتظار شام کریں
کہو تو کیوں نہ ابھی سے کچھ اہتمام کریں
خلوص و وفا لوگ کرچکے ہیں بہت
میرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں

......☆......☆......

خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے مجھ کو
تو پہلے خاک نشینوں کا انتظام کریں

......☆......☆......

کہاں لے آئی تو مجھے تقدیر
میں کہاں آگیا ہوں میرے خدا

......☆......☆......

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

......☆......☆......

پھر ساون رُت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے
پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے
پھر کاگا بولا گھر کے سونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے

......☆......☆......

ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بہتر ہے
کل جو تھا وہ آج نہیں جو آج ہے کل مٹ جائے گا
روکھی سوکھی جو مل جائے شکر کرو تو بہتر ہے
کپڑے بدل کر بال بنا کر کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہو تو بہتر ہے

......☆......☆......

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں سے
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر

غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
یاد کے بے نشاں جزیروں میں
تیری آواز آرہی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

......☆......☆......

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا
دن گزارا تھا بڑی مشکل سے
پھر ترا وعدۂ شب یاد آیا
حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا
بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

......☆......☆......

حُسن کو دل میں چھپا کر دیکھو
دھیان کی شمع جلا کر رکھو
وہ دلنواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
میرا علاج میرے چارہ گر کے پاس نہیں
کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب ان دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں

......☆......☆......

ہم بھی مسافر تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا
اِک اجڑے سے اسٹیشن پہ
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا

......☆......☆......

ابوالحسن نغمی نے بھی کافی عرصے ریڈیو پاکستان لاہور میں کام کیا۔آج کل عرصہ دراز سے وہ امریکا میں ہیں لیکن لاہور کو اور خصوصاً ریڈیو اسٹیشن کے ساتھیوں کو نہیں بھولے۔ امریکا میں رہ کر بھی وہ خالص پاکستانی ہیں۔ کبھی کبھی لاہور کا پھیرا لگا لیتے ہیں تو ملاقات ہو جاتی ہے۔1999 میں جب ہم امریکا گئے تو ان ہی کے گھر ٹھہرے تھے اور وہ سارے کام چھوڑ کر ہمیں واشنگٹن اور ورجینیا دکھاتے رہے تھے۔ بہت محبت کرنے والے اور وضعدار آدمی ہیں۔

انہوں نے لکھا ہے کہ جب ناصر کاظمی بہت بیمار تھے اور میو اسپتال میں کسمپرسی کے عالم میں پڑے تھے تو ریڈیو کے اسٹاف نے ان کے میڈیکل کے بلوں کی ادائگی کے بارے میں کہا تھا۔ وہ اسکرپٹ رائٹر تھے مگر میڈیکل بل ادا کرنے والے آمادہ نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسٹاف آرٹسٹوں کے میڈیکل بل ادا نہیں کیے جاتے۔ اس سلسلے میں نغمی صاحب اور اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر کے درمیان جو مکالمے ہوئے ملاحظہ کیجیے کہ ہمارے ملک میں فن کاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

جب میڈیکل بل ادا کرنے سے انکار ہوا تو نغمی صاحب نے کہا۔

"ناصر کاظمی اردو کے مایہ ناز شاعر ہیں۔"

"ہوں گے۔"

"ناصر کاظمی جیسے فن کار روز روز پیدا نہیں ہوتے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔"

"ناصر کے علاج پر اگر توجہ نہ دی گئی تو وہ مر جائیں گے۔"

"مرتے ہیں تو مر جانے دو۔"

ریڈیو پاکستان میں ناصر کاظمی کی جتنی تنخواہ تھی اتنی ہی اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر کی تھی مگر ان کے پاس اختیارات تھے اور ہمارے ملک میں چھوٹے سے اختیار والے بھی انسانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں۔

ایک اور اسٹاف ریجنل ڈائریکٹر سے نغمی صاحب کے مکالمے ملاحظہ کیجیے۔

انہوں نے بیزاری سے کہا "وہ ریڈیو میں کرتے ہی کیا ہیں۔ ان کے آنے جانے کے اوقات ہیں مگر کیا کبھی وہ وقت پہ دفتر آئے۔ کیا انہوں نے اسٹاف آرٹسٹوں کے رجسٹر پہ کبھی دستخط کیے ہیں۔ ریڈیو میں ان کا کیا کنٹری بیوشن ہے۔"

نغمی صاحب "کیا ریڈیو پاکستان کا یہ اعزاز نہیں کہ ناصر کاظمی جیسا عظیم غزل گو ان کا ملازم ہے؟ کسی بھی ریجنل اسسٹنٹ کے مرنے پر ڈپٹی کمشنر تک افسوس نہیں کرے گا لیکن ناصر کاظمی مرے گا تو ملک کا وزیر اعظم تعزیتی بیان جاری کرے گا۔ ملک کا ہر ریڈیو اسٹیشن اور اخبار ان کی خبر کو لوگوں تک پھیلائے گا۔"

نغمی صاحب اسٹاف یونین کے جنرل سیکریٹری تھے انہوں نے لاہور میں یہ مطالبہ منوانے کے لیے جلوس

نکالے نعرے لگائے۔

یہ لوگ اسپتال پہنچے تو بیک وقت اتنے بہت سے لوگوں کو ناصر کاظمی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارا جلوس میو اسپتال پہنچا تو بی آئی ڈی کے ایک کارکن نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح ریڈیو کے اسٹاف کو بھی میڈیکل الاؤنس دیا جائے۔"

انہوں نے فوراً اپنی نوٹ بک میں یہ معلومات درج کرلیں۔

ناصر کاظمی سے ملاقات کے لیے صرف دو تین افراد ہی ایک وقت میں جاسکتے تھے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ناصر کاظمی نے آنکھیں کھول دیں۔

فریدہ خانم ان کی یہ حالت دیکھ کر اشکبار ہوگئیں۔ فریدہ خانم نے ناصر کاظمی کی جو غزل گائی تھی اس کا ایک مصرعہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے

میں نے انہیں آرٹسٹوں کے جلوس کے بارے میں بتایا اور کہا کہ عنقریب ایک ہنگامہ ہونے والا ہے۔

وہ بولے "نغمی صاحب ان چھوٹے چھوٹے ہنگاموں سے کام نہیں چلے گا۔ عنقریب ایک بہت بڑا ہنگامہ ہونے والا ہے۔"

ان کا اشارہ واضح طور پر اپنی موت کی طرف تھا۔ اس ہنگامے کے بعد پاکستان ٹیلی وژن نے ان کا انٹرویو لیا۔

اس انٹرویو میں ناصر کاظمی نے کہا تھا "شاعری ایک ہمہ وقتی (فل ٹائم) کام ہے... میر تقی میر، غالب، وارث شاہ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟"

ناصر کاظمی کی آواز اثر انگیز، مردانہ اور گمبھیر تھی۔ ان کی آواز میں قدرتی طور پر مقناطیسیت تھی۔ ریڈیو والوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ناصر کاظمی نے جوش ملیح آبادی سے ایک بہت اچھا انٹرویو کیا تھا لیکن اس کے بعد ان کی اس خوبی سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

ناصر کاظمی کرشن نگر میں رہتے تھے مگر پھر یہ گھر مقدمہ بازیوں کی وجہ سے ناصر کو چھوڑنا پڑا۔ ناصر کاظمی نے اس گھر میں بے شمار پودے اور پھول لگائے تھے۔ گھر خالی کرنے کے بعد انہوں نے نئے مالک سے گھر میں آکر پودوں کو پانی

گلوکارہ
مہ جبین
قزلباش

دینے اور دیکھ بھال کرنے کی اجازت لے لی تھی۔ وہ بلا ناغہ ہر روز وہاں آتے، پودوں میں پانی دیتے۔ ان کی کاٹ چھانٹ کرتے۔ سرگوشیوں میں پودوں سے باتیں کرتے اور انہیں خدا حافظ کہہ کر چلے جاتے تھے۔

ناصر کاظمی ایک پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ کتابی چہرہ، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ کوٹ پتلون اور ٹائی پہنتے تھے۔

ایک صبح ریڈیو سے ان کی وفات کی خبر نشر ہو رہی تھی۔ میکلوڈ روڈ کے پاس ایک قبر میں لٹا کر انہیں منوں مٹی تلے دفن کردیا گیا۔ ریڈیو پاکستان کے تمام اسٹیشنوں سے یہ خبر نشر کی گئی۔ تمام اخباروں نے سیاہ حاشیے کے ساتھ یہ خبر شائع کی۔ ان کا یہ شعر اس روز بہت یاد آیا۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

قبرستان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے فاتحہ پڑھی۔ ناصر کاظمی کی یہ غزل کانوں میں گونج رہی تھی۔

کون اس راہ سے گزرتا ہے
دل یونہی انتظار کرتا ہے
دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اللہ مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا۔

☆☆☆

آخر میں پشاور سے شوکت رحمٰن خٹک کا خط۔ وہ اس بار ایک پشتو گلوکارہ کے بارے میں معلومات فراہم کررہے ہیں جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ پشاور کے خطے سے جنم لینے والے فنکاروں میں ایک معتبر نام گلوکارہ مہ جبین قزلباش کا بھی ہے۔ وہ معروف فلمی اداکارہ سیما کی بھانجی

ہیں۔ جنھوں نے انور کمال پاشا کی ایک فلم میں ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ 1978ء میں جب میرا قیام مغربی جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں تھا۔ ایک دن میں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا، یہ ریسٹورنٹ ایک پاکستانی نے ایشیائی لوگوں کے لیے اولمپیا کے نام سے بنایا تھا۔ یہاں صرف پاک و ہند کی موسیقی اردو، پشتو، فارسی کے نغمات ٹی وی پر دیکھنے اور سننے کو ملتے تھے۔ یکا یک ڈائننگ ہال میں بنے ہوئے اسٹیج پر رکھے ہوئے بڑے سائز کے ٹی وی پر مہ جبین قزلباش کی تصویر اور آواز ابھری اور ہال میں رکھے ہوئے اسپیکروں سے مہ جبین کی آواز نے ایک جادو کی سماں باندھ دیا۔ دیارِ غیر میں رہنے والے لوگوں کے دل ویسے بھی بہت کمزور ہوتے ہیں اور پھر پردیس میں اپنی زبان کا گانا سن کر آنکھوں سے اشکوں کی لڑیاں برسنی شروع ہوجاتی ہیں اور یہی کیفیت ہم دوستوں کی بھی تھی۔ یہ ایک پشتو طربیہ فوک گانا تھا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ یا اللہ صبح کردے۔ کل میں نے جانان کے دیدار کے لیے جانا ہے۔

یا اللہ صبح کردے۔

شہرت، ناموری، مقبولیت اور کمال فن بسا اوقات فنکاروں میں رعونت، بڑا پن اور تکبر پیدا کردیتی ہے۔ مہ جبین قزلباش ان چیزوں سے مبرا ہیں۔ ان کی شیریں آواز ایک میٹھے رس کی طرح کروڑوں دلوں میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کردیتی ہے، انہوں نے اپنے فن کے ذریعے مقبولیت کی معراج حاصل کی۔ لوگ ان کے لیے دل اور آنکھیں فرشِ راہ رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی زندہ دل، خوش شکل اور خوش اخلاق فن کارہ ہیں۔ ان کی شخصیت ان کے فن کی طرح میٹھی اور پُرکشش ہے۔ دنیا میں تین جادو مشہور ہیں۔ دولت، حسن اور آواز۔ جوانی ڈھل جانے کے بعد حسن تو ختم ہوجاتا ہے۔ دولت سے انسان سب کچھ خرید سکتا ہے مگر آواز نہیں۔ آواز کا جادو ان دونوں پر حاوی ہے۔ مہ جبین پشتو ادب و ثقافت کا ایک بیش بہا قیمتی خزانہ ہیں۔ پشتو نہ جاننے والے بھی ان کی آواز کی شیرینی اور مٹھاس سمجھتے ہیں۔ انہیں بچپن سے ہی موسیقی کا جنون تھا۔ ان کے والدین انہیں فلموں کی بڑی اداکارہ بنانا چاہتے تھے۔ مہ جبین سے قبل ان کی خالہ سیما نے فلمی دنیا میں بڑا نام کمایا۔ ڈائرکٹر انور کمال پاشا نے اپنے عروج کے دنوں میں آغا جی اے گل کے لیے فلم ''گمنام'' بنائی تو سیما سدھیر کے مدمقابل اس فلم میں ہیروئن تھیں۔ اس فلم میں صبیحہ خانم نے معاون ہیروئن ''نگی'' کا کردار ادا کیا تھا۔ سیف الدین سیف کا گانا ''پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے۔'' صبیحہ خانم پر فلمایا گیا تھا۔

خوبصورت نقش و نگار اور غلافی آنکھوں والی سیما کی یہ پہلی اور آخری فلم تھی۔ ''گمنام'' میں سیما پر کوثر پروین کی آواز میں یہ گانا فلمبند ہوا تھا۔

''آنکھیں ملا کے پیار سے دل کو مٹا دیا۔ اِک بے وفا نے ہم کو ہنسا کر رلا دیا۔''

گمنام کی نمائش کے بعد ٹالکم پاؤڈروں، نیل پالش اور کریموں پر سیما کی تصویریں چھپنے لگیں۔ دکانوں کے سائن بورڈوں پر ''گمنام'' سے لی گئی سیما کی تصویریں نمایاں ہوئیں۔ غرضیکہ سیما کے حسن و جمال کا بہت چرچا ہوا۔ پاکستان فلم انڈسٹری میں ایک ہی فلم سے کسی دوسری اداکارہ کو اتنی مقبولیت شاید ہی ملی ہو جتنی شہرت ان کے حصے میں آئی۔ سیما اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین!

سیما کے فنی ورثے کو ان کی بھانجی مہ جبین نے آگے بڑھایا۔ پاکستان کی پہلی پشتو فلم ''یوسف خان شیر بانو'' کی کامیابی کے بعد پشتو فلمیں بڑی تیزی سے بننی شروع ہوئیں۔ پشاور کی ایک پارٹی نے ڈی خیبر فلمز کے نام سے ''ماموئی'' پشتو فلم بنانے کا اعلان کیا تو اس کے لیے مہ جبین کو ہیروئن منتخب کیا گیا۔ اس فلم کے ڈائریکٹر کامران تھے جنھوں نے فلم ''چنگیز خان'' میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ سوات میں آؤٹ ڈور پر جاتے ہوئے ''ابدارہ'' گاؤں میں ''ماموئی'' کے فلمساز اور ان کے قریبی رشتے دار کو ذاتی تنازعہ کی بنا پر ایک شخص نے قتل کردیا جس کے بعد فلم بنانے کا سلسلہ التوا میں پڑ گیا۔ بعد ازاں اسکاٹ لینڈ سے آنے والے فخر عالم نے اس فلم کو مکمل کرنے کا پروگرام بنایا۔ فلم میں چند تبدیلیاں کی گئیں۔ ہیرو کے لیے فخر الدین درانی کی جگہ ایمل خان کو منتخب کیا گیا لیکن مہ جبین کو فلم کی ہیروئن برقرار رکھا گیا۔ فردوس جمال کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس نے چودہ سال کی عمر میں 80 سالہ بوڑھے کا کردار ایسا ادا کیا کہ بعد میں ڈراموں کی اولین ضرورت بن گئے۔

مہ جبین کا اصل نام ثریا ہے۔ وہ قزلباش خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ چودہ سال کی عمر میں فلموں کی ہیروئن بن گئی تھیں۔ ''ماموئی'' کے ہیرو ایمل خان کا اصلی نام

اللہ اورکزئی تھا۔ پشاور کے ایک معتبر خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ فلموں کے شوق کی خاطر ان کے چچا نے انہیں فلم ماموینی، میں ہیرو کا کردار دلایا۔ ایمل خان کے نام سے فلموں میں آنے والے اس خوبرو نوجوان نے بعد میں پشتو کی کئی فلموں دیدن، رحمدادخان، کے علاوہ کئی فلموں میں ہیرو کے طور پر کام کیا۔ بعد میں وہ مہ جبین قزلباش کے جیون ساتھی بھی بنے۔ مہ جبین سے ان کی اولاد بھی ہوئی لیکن زندگی نے ایمل خان کو زیادہ مہلت نہیں دی۔ ان کی بے وقت موت نے مہ جبین کو تنہا کردیا لیکن انہوں نے ایک آہنی چٹان کی طرح بچوں کی خاطر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ فلم ماموینی 1970 کے لگ بھگ بنی تھی۔ بدقسمتی سے یہ فلم فنی کمزوریوں کی وجہ سے بری طرح فلاپ ہوگئی۔ مہ جبین کے لیے یہ بہت کٹھن وقت تھا۔ انہوں نے بطور گلوکارہ پشاور ریڈیو سے گلوکاری کا آغاز کیا تھا۔ پشاور ٹی وی سینٹر کے قیام کے بعد انہوں نے ٹیلی ویژن سے لاتعداد پشتو، ہندکو اور اردو ڈراموں میں ہیروئن کی حیثیت سے کام کیا۔ مہ جبین نے ریڈیو کے علاوہ ٹی وی پر بھی گانے گائے۔ ان کی پوری توجہ موسیقی کی جانب تھی۔ ڈراموں کے عروج کے دنوں میں ہی انہوں نے اداکاری کو خیرباد کہہ دیا اور صرف گلوکاری کی طرف توجہ مبذول کردی۔ ان کا موازنہ گلنار بیگم، کشور سلطانہ سے کیا جانے لگا۔

مہ جبین کے دور میں کئی گلوکارائیں میدان میں آئیں اور چلی گئیں۔ انہیں وقتی طور پر شہرت بھی ملی مگر مہ جبین ایک چٹان کی طرح اپنے مقام پر کھڑی رہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ٹاپ پر پہنچنا بہت آسان ہے لیکن وہاں پر پہنچ کر اسے برقرار رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انہوں نے کسی بھی طرح اپنی مقبولیت کم نہیں ہونے دی۔ اپنے فن کو لوگوں سے تسلیم کروایا۔

مہ جبین کو جنون کی حد تک موسیقی سے لگاؤ ہے۔ انہوں نے رفیق شنواری، ایس ٹی سنی اور جاوید اختر سے بہت کچھ سیکھا۔ پٹیالہ گھرانے کے استاد فتح علی خان کی شاگردی اختیار کی، وہ بڑے فخر سے کہتی ہیں۔ ”میں نے ان نامور شخصیات سے گانا سیکھا جو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ان ہی کی بدولت آج موجودہ مقام پر ہوں۔“ مہ جبین کی آواز کے مداحوں نے انہیں ”بلبلِ سرحد“ کا نام دیا۔ واقعی وہ اس اعزاز کی مستحق ہیں۔

1971 کی جنگ میں ان کے ترانوں کو بہت زیادہ شہرت ملی۔ ڈاکٹر اعظم کے ایک ترانے نے ان کو ملک گیر شہرت دلائی۔ مہ جبین نے حمزہ شنواری، اجمل خٹک، شمس خلیق، رحمان بابا اور خوشحال خان کا کلام بھی گایا۔ انہوں نے پشتو فلموں کی ممتاز یاسمین خان، ثریا خان، مسرت شاہین اور شہناز کے لیے پلے بیک گانے گائے۔ 2007 میں حکومت پاکستان نے انہیں حسن کارکردگی کا انعام دیا۔ مہ جبین نے امریکا، یورپ اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ فلم، اسٹیج ریڈیو اور ٹی وی کی گلوکارہ ہیں۔ اتنا بڑا اعزاز پشتو کی کسی اور گلوکارہ کو نہیں ملا۔ مہ جبین نے اپنے فنی سفر میں ہمیشہ فحش گانوں سے نفرت کی جو ان کی شہرت کے لیے نقصان کا باعث ہوسکتی تھی۔ انہوں نے موسیقی کے کئی خوبصورت البم بنائے۔ لاتعداد ایوارڈ حاصل کیے۔ وہ بڑے فخر سے کہتی ہیں کہ عوام کی چاہت میرے لیے سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔ میں نے آج تک کوئی ایسا گانا نہیں گایا جس پر پشیمانی ہو۔ میں نے گلوکار خیال محمد کے ساتھ گانے زیادہ گائے ہیں۔ فلمی کیریئر کے حوالے سے مہ جبین نے کہا کہ یہ عوام کا دیا ہوا تحفہ ہے اس کی لاج رکھنا میری زندگی کا اولین مقصد ہے۔ میرے گانے بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ پشتو، ہندکو، اردو، فارسی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔ خیبر سے کراچی تک ”پشاور سے میری خاطر دوالا نا، او دلبر جانہ“ گانے کو بہت زیادہ شہرت ملی۔ مہ جبین نے اب تک 11 ہزار سے زائد گانے ریکارڈ کرائے ہیں۔ دیگر زبانوں میں گانے گاکر بھی اپنی الگ پہچان بنائی ہیں۔ ان کی زندگی ہنگاموں سے خالی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی مہ جبین ہمارے وطن کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین۔ مشہور موسیقار خورشید انور صاحب نے جب مہ جبین کا فارسی گانا ٹی وی پر سنا تو بہت متاثر ہوئے، وہ انہیں اپنی ایک فلم میں بطور گلوکارہ سائن کرنا چاہتے تھے مگر زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ ان کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔

مہ جبین ایک خداداد صلاحیت رکھتی ہیں۔ پشاور ان کی جنم بھومی ہے۔ پشاور کے اکثر فنکاروں نے دنیا بھر میں نام پیدا کیا مگر مہ جبین قزلباش نے اپنے شہر پشاور میں اور دور افتادہ ممالک میں اپنی آواز کی پہچان کرائی۔

ابن کبیر

انتقام کی آگ بھڑک اٹھے تو پھر بُجھائے نہیں بُجھتی۔ وہ بھی انتقام کی آگ ہی میں جھلس رہا تھا لیکن عقلمند تھا۔ ایک ایسا راستہ اختیار کیا کہ سب حیران رہ گئے۔

مغرب سے درآمد ایک جرم کا قصّہ

صبح سے برف گر رہی تھی۔ جیری موریٹن لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا۔ آتش دان روشن تھا۔ آگ کی زرد روشنی چہرے پر پڑ رہی تھی۔

گزشتہ ڈیڑھ ماہ کے دوران یہ تیسرا موقع تھا، جب اُسے دھمکی آمیز ای میل موصول ہوئی اور اس بار لہجہ پہلے سے سخت تھا۔

اس نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وسیع و عریض مکان میں خاموشی تھی۔ کھڑکی کے شیشے دھندلا گئے تھے۔ کہیں دور

باورچی خانے میں خانساماں کھٹ پٹ کررہا تھا۔

پہلی ای میل موسم سرما کے آغاز میں موصول ہوئی۔ پیغام ایک جملے پر مشتمل تھا۔ ”تمہیں اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

جیری نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ انٹرنیٹ پر جعل سازی عام ہے۔ لوگوں کو نئے نئے طریقوں سے بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ اجنبی ایڈریس سے بھیجے جانے والے اُس پیغام کو اس نے کسی ٹھگ کی بھونڈی کوشش گردانتے ہوئے نظرانداز کردیا تھا۔

جس روز دوسری ای میل ملی، قصبہ برفانی طوفان کی لپیٹ میں تھا۔ اُس نے پولیس سارجنٹ سے رابطہ کرنا مناسب جانا۔

بومینس ٹاؤن ریاست پینسلوانیا کا ایک خاموش پہاڑی قصبہ تھا۔ وہ فلاڈلفیا سے 103 کلومیٹر دور تھا۔ وہاں زندگی پُرسکون تھی۔ اور یہی شے جیری کو وہاں لائی تھی۔ ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ جھیل کے نزدیک اس نے شان دار کوٹھی خریدی تھی۔ تین برس بعد ہی اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اسے ٹاؤن کے اکلوتے قبرستان میں دفنایا گیا۔ اس کا بیٹا میگا نیویارک میں وکالت کرتا تھا۔ باپ بیٹے میں شدید اختلافات تھے۔ ڈیڑھ برس سے اُن کے درمیان بات چیت بند تھی۔ رشتے میں آنے والی دراڑ اسے مطالعے کے مزید قریب لے گئی۔ شطرنج کا وہ زبردست کھلاڑی تھا۔ یہاں آتے ہی قصبے کے شطرنج کلب کا رکن بن گیا۔ چھ سات گالف کے شائق بھی مل گئے۔ وہ ہر اتوار کو اُن کے ساتھ گالف کھیلتا۔

قصبے والے جیری سے متعلق زیادہ نہیں جانتے تھے۔ بس اتنا پتا تھا کہ شطرنج اور گالف کا یہ دلدادہ نیوجرسی میں بزنس کرتا تھا، اب کاروبار سمیٹ کر یہاں آن بسا۔ کتابوں کا رسیا ہے اور کتابیں بومینس ٹاؤن کے بک اسٹور سے خریدنے کے بجائے فلاڈلفیا سے بذریعہ ڈاک منگواتا ہے۔

وہ اکثر کہتے۔ ”بڑے میاں اپنی کوٹھی میں مزے کر رہے ہیں۔ بس باغبانی اور کتابیں۔ کیا زندگی پائی ہے بھائی!“

سارجنٹ کی بھی یہی رائے تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ جیری کو کوئی دھمکیاں دے رہا ہے، وہ حیران رہ گیا۔ ”میں ابھی اپنے دو اہل کار روانہ کرتا ہوں۔“

برف کا طوفان اتنا شدید تھا کہ دونوں اہل کار گئی گھنٹے بعد جیری کی حویلی پہنچ سکے۔ بوڑھے نے یہ بتا کر انہیں مایوس کردیا کہ وہ اس احمقانہ پیغام کو ضائع کرچکا ہے۔

ایک اہل کار نے تجویز دی کہ کسی کمپیوٹر ایکسپرٹ سے وہ ای میل بازیافت کرلی جائے، کیوں کہ اس کے ذریعے دھمکانے والے بدمعاش تک پہنچا جاسکتا ہے، تو بوڑھا ہنس کر ٹال گیا۔

”چھوڑیں جی، ہوگا کوئی دیوانہ۔ اب مجھ سے کسی کی کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”کیا آپ وہسکی پینا پسند فرمائیں گے؟“

کڑاکے کی سردی تھی اور دونوں اہل کار طوفان سے گزر کر یہاں پہنچے تھے۔ اس لیے انہوں نے جیری کی پیشکش بلا قبول کرلی۔

☆☆☆

”ماضی تمہارے تعاقب میں ہے۔ وہ جلد تمہاری جان لے لے گا۔“

جیری نے پانچویں بار یہ سطر پڑھی۔ اسے الجھن محسوس ہوئی۔ گزشتہ پیغامات تو اس نے ہنستے مسکراتے ہضم کرلیے تھے، مگر اس بار دھمکی دینے والے نے اُس کے ماضی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ شخص اسے بہ خوبی جانتا ہے۔

اُس نے ای میل ایڈریس دیکھا۔ پھر دراز سے ایک کاغذ نکالا۔ اس پر وہ ایڈریس درج تھے، جن سے گزشتہ پیغامات بھیجے گئے۔ تینوں پتے مختلف تھے۔

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر ریسیور اٹھایا۔ وہ نمبر ڈائل کرنے کو تھا مگر پھر اچانک رک گیا۔

گزشتہ سات برس میں ماسوائے اپنے بیٹے کے اس نے کسی ایسے شخص کو ٹیلی فون نہیں کیا تھا جس کا تعلق اس کے بیتے ہوئے کل سے تھا مگر ٹھیک اس لمحے وہ ایسا کرنے پر تیار ہوگیا۔ وہ اپنے ایک پرانے ساتھی مائیکل کو فون کرنے لگا تھا۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ای میل روانہ کی، جس میں وہ تینوں ایڈریس درج تھے، جن سے اسے دھمکی آمیز پیغامات ملے۔ وہ چاہتا تھا کہ مائیکل ان کا کھوج لگائے۔ اُسے یقین تھا کہ جلد ہی گتھی سلجھ جائے گی۔ مائیکل اپنے قریبی حلقوں میں ٹیکنالوجی کنگ کے نام سے معروف تھا۔

اُس نے ایک جام بنایا۔ پھر اچانک کچھ یاد آیا تو وہ فون تک گیا۔

”ہیلو... فلاڈلفیا بک اسٹور؟ جیری مورسن بات کر رہا ہوں۔ میں نے سڈنی شیلڈن کا ایک ناول آرڈر کیا تھا؟“

بوڑھے کے ہاتھ میں جام تھا۔ بومینس ٹاؤن میں برف گر رہی تھی۔ میلوں دور بیٹھے مائیکل کی انگلیاں کی بورڈ پر حرکت کررہی تھیں۔

☆☆☆

”آہ، کتنے برس بعد رابطہ ہوا۔ کسی نے بتایا تھا کہ حالیہ دنوں میں آپ نے کچھ پرانے دوستوں سے رابطہ کیا ہے۔ خیر، آپ نے آئی ڈیز کے بارے میں پوچھا ہے۔ میں نے چھان بین کی ہے۔ یہ تینوں آئی ڈی تین الگ الگ آدمیوں نے بنائی تھیں جو ملک کی مختلف ریاستوں میں بستے تھے۔ مزید معلومات حاصل کیں تو ایک حیران کن انکشاف ہوا۔ وہ تینوں ہی کچھ برس قبل ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہوچکے ہیں۔“

بوڑھے نے جام کا گھونٹ لیا۔ چہرے پر تناؤ تھا۔ اس نے مزید پڑھا۔

”گو آپ نے اس چھان بین کی وجہ بیان نہیں کی مگر مجھے یقین ہے کہ معاملہ سنجیدہ ہی ہوگا۔ میرے خیال میں آپ کا سامنا ایک شاطر آدمی سے ہے جو تین بدقسمت انسانوں کی آئی ڈی استعمال کررہا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بس ایک فون کردیجیے گا۔ نیازمند حاضر ہوجائے گا۔ اور سنائیں، ان دنوں کون سی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ بک اسٹور سے خریدتے ہیں یا بذریعہ ڈاک منگواتے ہیں؟ ویسے آج کل آپ کہاں مقیم ہیں؟“

بوڑھا مسکرایا۔ ”تم بالکل نہیں بدلے مائیکل۔“

اُس نے اپنے پرانے بااعتماد ساتھی کو یاد کیا جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ جاننے کے لیے مضطرب رہتا تھا اور اس لمحے اُسے یہ بات پریشان کررہی تھی کہ جیری مورسن کہاں ہے۔

بوڑھے نے جام کا ایک اور گھونٹ لیا۔ مائیکل کے حوالے سے وہ مطمئن تھا۔ اگرچہ وہ کمپیوٹر ایکسپرٹ تھا مگر اس کے ساتھ رہ کر جیری بھی بہت کچھ سیکھ گیا تھا۔ اگر کوئی ای میل آئی ڈی کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا، تو بجائے پینسلوانیا کے اس خاموش قصبے کے وہ الونائی کے کسی بھرے پُرے شہر جا نکلتا۔ وہاں کسی تاریک عمارت کے چھوٹے سے فلیٹ میں اسے وہ شخص تو مل جاتا جس نے یہ ای میل اکاؤنٹ بنایا تھا مگر اس شخص کو ڈھونڈ نکالنا دشوار تھا جو آج اسے استعمال کررہا تھا۔

جیری کی احتیاط پسندی قابلِ فہم تھی۔ یہ اکاؤنٹ ہی وہ اکلوتا ذریعہ تھا جس کے ذریعے وہ اپنے ماضی سے جڑا ہوا تھا ورنہ تو وہ ہر رابطہ منقطع کرچکا تھا۔

☆☆☆

فون بجا۔

دوسری طرف فلاڈلفیا بک اسٹور کا منیجر تھا۔ ”مسٹر جیری مورسن؟ آپ نے سڈنی شیلڈن کا جو ناول آرڈر کیا تھا، وہ آج روانہ کردیا جائے گا۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں برف گر رہی ہے۔“

”درست سنا ہے۔“ اس نے گردن ہلائی۔ ”موسم خاصا خراب ہے۔“

”اگر طوفان رکاوٹ نہیں بنا تو امید ہے کہ پرسوں تک کتاب آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ ویسے جناب... ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟“

”جی ضرور۔“ بوڑھے نے کہا۔

”یہ کتاب تو آپ کو بومینس ٹاؤن میں بھی بہ آسانی مل جائے گی۔ پھر ڈاک خرچ اور انتظار کا جھنجھٹ کیوں؟“

”کیونکہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ بک اسٹور سے کتاب خریدنا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ ہمیشہ ڈاک ہی کے ذریعے منگوائی۔ پرانی عادت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں جناب، ہمیں کیوں اعتراض ہوگا۔“ منیجر نے خوش دلی سے کہا۔ ”ڈاک کے ذریعے کتاب منگوانے کی عادت ضرور بچپن میں پڑی ہوگی۔ میرے والد کا بھی یہی معاملہ تھا۔“

”کیا آپ جانتے ہیں۔“ وہ ماضی میں چلا گیا۔ ”جو کتاب میں نے آرڈر کی ہے، وہ سڈنی شیلڈن کا پہلا ناول ہے۔ اس تحریر نے مجھے گرویدہ بنا لیا تھا۔ میں نے اپنی ذاتی کاپی پر اس کا آٹوگراف بھی لیا۔ افسوس وہ کاپی مجھ سے ضائع ہوگئی۔ خیر، میں کتاب کا منتظر رہوں گا شکریہ۔“

جیری کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ طوفان کی شدت اب کم ہوچکی تھی۔ باہر تاریکی پھیل رہی تھی۔ اُسے فلاڈلفیا میں واقع اپنا لگژری اپارٹمنٹ یاد آیا، جس کا ایک حصہ کتابوں کے لیے وقف تھا۔ چار ہزار کتابیں سلیقے سے شیلف میں سجی تھیں۔ بچپن میں یہ لت پڑی۔ پہلے اگاتھا کرسٹی کے ناولوں نے گرویدہ بنایا، پھر سڈنی شیلڈن کے سحر میں آگیا۔ اُس کے تمام ناول اس کے پاس تھے، مگر ایک روز اچانک... اسے اپنی لائبریری، اپنا فلیٹ، اپنا شہر ہر شے چھوڑنی پڑی۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو مصائب اسے جکڑ لیتے۔

کچھ عرصے وہ ایک بدبودار سرائے میں رہا۔ اس کے تمام بینک اکاؤنٹ منجمد ہوگئے تھے۔ البتہ ایک اکاؤنٹ کا دشمنوں کو علم نہیں تھا۔ وہ اُس کی بہن کے نام پر تھا۔ اپنی کمائی کا بڑا حصہ اسی میں رکھا کرتا۔ بینک منیجر جیری کا دوست تھا۔ اس نے خاموشی سے آدھی رقم نکلوائی۔ بیوی کا ہاتھ تھاما اور اس سرسبز اور خاموش قصبے میں پہنچ گیا جہاں نئی زندگی منتظر تھی۔

ہوا کا زوردار جھکڑ کھڑکی سے ٹکرایا۔ جیری لمحۂ حال میں لوٹ آیا۔ ہال میں آہٹ ہوئی۔ خانساماں دروازے پر کھڑا تھا۔ ”لنچ تیار ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ وہ دھمکی آمیز پیغامات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”کون ہوسکتا ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔ ”مجھے سارجنٹ سے رابطہ کرنا چاہیے۔“

یہ خیال اس نے فوراً ہی رد کر دیا۔ ”نہیں۔ اگر اس نے میرے ماضی سے متعلق جاننا چاہا تو میں کیا جواب دوں گا۔ مجھے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی مدد لینی چاہیے۔“

اچانک اُس نے اپنے خانساماں سے سوال کیا۔ ”تم کسی سراغ رساں کو جانتے ہو؟“

”جی میں؟“ وہ چونکا۔ ”جی میں تو نہیں۔ البتہ شاید ہمارا گارڈ ڈگلس جانتا ہو۔ پہلے وہ ایسی ہی کسی کمپنی میں چوکیدار تھا۔“

”ہوں۔ اُسے بھیجو۔“

☆☆☆

فلاڈلفیا پر سرد شام اتر رہی تھی۔

ڈبلیو ایچ کنسلٹنٹ فرم میں فون بجا۔ یہ ایک کشادہ دفتر تھا، جو مرکزی شاہراہ پر واقع کثیرالمنزلہ عمارت کی بارہویں منزل پر تھا۔

”ڈبلیو ایچ کنسلٹنٹ فرم۔ میں آپ کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

فون اٹھانے والے ولسن ہیگل کو ایک بوڑھی مگر پُراعتماد آواز سنائی دی۔ ”مجھے ایک ذاتی معاملے میں آپ کی مدد درکار ہے۔“

”ہم اسی لیے یہاں بیٹھے ہیں جناب۔ فرمائیں کیا واقعہ ہوا ہے؟“

”مجھے ایک سراغ رساں درکار ہے۔ ایک قابل سراغ رساں۔“

”بے فکر رہیں۔ شہر کے بہترین سراغ رساں ہمارے رابطے میں ہیں۔ اپنا پتا بتائیں... کیا فرمایا جناب بومینس ٹاؤن؟“

اُس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے کمپیوٹر اسکرین پر بومینس ٹاؤن کا نقشہ چمک رہا تھا۔

”یہ تو یہاں سے سو کلومیٹر دور ہے۔“ اسکرین پر موسم کی اپ ڈیٹس بھی آرہی تھیں۔ ”اور شاید ابھی وہاں برف گر رہی ہے۔ اچھا معاملہ کیا ہے؟ اوہ کوئی آپ کو دھمکیاں دے رہا ہے... ای میل کے ذریعے۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ اپنا نمبر لکھوائیں۔“

”میں ادائیگی کیش میں کروں گا۔“ جیری کی آواز دور سے آتی معلوم ہوئی۔

”کیش میں؟“ ولسن سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی فرم شہریوں اور نجی اداروں کو سراغ رسانی کی خدمات فراہم کرتی تھی۔ وہ مختلف سراغ رساں اداروں سے رابطے میں رہتا۔ آرڈر پکڑتا۔ کیس کی نوعیت کے مطابق سراغ رساں کا انتخاب کرتا۔ کیس حل کرنے کے بعد وہ اپنی فیس کا پندرہ فی صد ولسن کو دینے کا مجاز ہوتا۔

وہ ایک شاطر اور بارسوخ آدمی تھا۔ گھی اگر سیدھی انگلی سے نہیں نکلتا تو انگلی ٹیڑھی کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ اس سے رابطہ کرنے والے فقط اپنے گھر میں ہونے والی چوری، آفس کے گھپلے یا دھمکی آمیز فون کال کا مسئلہ حل کروانے کے متمنی نہیں ہوتے تھے... کچھ لوگ براہِ راست غیرقانونی سرگرمیوں میں ملوث ہوتے اور اچھے کاروباری آدمی کی طرح ولسن ان سے بھرپور تعاون کرتا۔

”کوئی مسئلہ نہیں جناب۔“ بالآخر اس نے کہا۔ ”کیش بھی چلے گا۔ بس فیس تھوڑی بڑھ جائے گی۔“

”اس کی پروا نہیں۔“ بوڑھے نے کہا اور فون رکھ دیا۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد ولسن نے مورگن کلنٹن کا نمبر ڈائل کیا۔ مورگن کو فیلڈ میں آئے چند ہی برس ہوئے تھے۔ بہ ظاہر وہ ایک لاابالی نوجوان تھا مگر اس کی کارکردگی شاندار تھی۔ البتہ جیری مورین کا کیس اُسے سونپنے کا سبب اُس کی قابلیت نہیں تھی۔

مورگن کا تعلق کاربن کاؤنٹی سے تھا اور بومینس ٹاؤن اُسی کاؤنٹی کا حصہ تھا۔ دو مہینے قبل اُسے مورگن کا پیغام موصول ہوا کہ اگر کاربن کاؤنٹی کا کوئی کیس آئے تو اُسے ہی سونپا جائے۔ اسی بہانے وہ اپنے آبائی علاقے کا چکر لگا لے گا۔

”ہیلو مورگن کلنٹن بول رہا ہوں۔“ نوجوان کی پُراعتماد آواز اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”تمہارے لیے خوشخبری ہے لڑکے۔“ ولسن چہکا۔ ”تمہاری کاؤنٹی سے ایک کیس آیا ہے۔ تم نے کہا تھا ناں؟“

”بہت خوب! ہاں، آپ سمیت میں نے چند دوستوں سے اِس معاملے میں درخواست کی تھی۔ ویسے کیس کیا ہے؟“

”بے فکر رہو، یہ کل ہونے والی بینک ڈکیتی کا معاملہ نہیں۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”معمولی کیس ہے۔ ایک صاحب ہیں جیری مورین۔ اُنہیں کوئی دھمکیاں دے رہا ہے۔ بڑے میاں سے تگڑی فیس لینا اور کچھ دن کاؤنٹی میں آرام کرنا۔“

”اس سے اچھی بات بھلا کیا ہوسکتی ہے۔ مجھے اُن کا ایڈریس بتائیں۔“ مورگن نے کہا۔

ایڈریس سمجھانے کے بعد ولسن نے کہا۔ ”بڑے میاں جلدی میں لگتے ہیں، مگر تم کل صبح ہی روانہ ہونا۔ محکمۂ موسمیات کے مطابق آج رات بومینس ٹاؤن میں برف کا طوفان آنے والا ہے۔“

”کل کا دن ہی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی مجھے برف باری سے نفرت ہے۔“ مورگن نے دھیرے سے کہا۔

ولسن سے بات کرنے کے بعد اُس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ ”ہیلو میں مورگن کلنٹن بات کر رہا ہوں۔ مجھے ایک گاڑی چاہیے...“

☆☆☆

وہ پُراسرار رات تھی۔

برف سے ڈھکے درختوں کے جھنڈ میں تاریکی حرکت کر رہی تھی۔ تیز ہوا جب درختوں کے بیچ سے گزرتی تو ایک چیخ میں تبدیل ہو جاتی۔

ڈنر کے بعد جیری آرام کرسی پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ مکان میں بالکل تنہا تھا۔ خانساماں اپنے گھر جا چکا تھا۔

ایک آہٹ ہوئی... وہ تیزی سے پلٹا۔ دور تاریکی میں کوئی کھڑا تھا۔

”کون ہے؟“ وہ چلّایا۔ ”اوہ ڈگلس، گدھے یوں خاموش کیوں کھڑے ہو؟“

”جناب، وہ میرے ایک دوست کی طبیعت خراب ہے۔ مجھے اس کی عیادت کے لیے جانا ہے۔“ وہ منمنایا۔

”تمہارے دوست کی طبیعت ہفتے کی رات ہی کیوں خراب ہوتی ہے؟“ بوڑھا مسکرایا۔ ”کسی لڑکی کا چکر تو نہیں؟“

''لڑکی... اوہ نہیں۔ وہ تو...'' ڈگلس بوکھلا گیا۔
''تم اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس نے دوٹوک الفاظ میں سوال کیا۔
ڈگلس خاموش کھڑا رہا۔ بوڑھے نے جیب سے کچھ پیسے نکالے۔ ''یہ لو۔ آج کی رات اپنے دوست کی عیادت میں صرف کرو۔ اور گھٹیا شراب پینے سے خود کو باز رکھنا۔''
''جی شکریہ۔'' ڈگلس نے جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں جلد لوٹ آؤں گا۔''
''اس کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے کوٹ کی جیب تھپتھپائی۔ اس میں ایک پسٹل تھی۔ آخری بار اس پسٹل کا استعمال بوڑھے نے نو برس قبل کیا تھا۔
اگلے آدھے گھنٹے تک وہ کتاب میں ڈوبا رہا۔ اس اثنا میں طوفان میں شدت آگئی۔ برفانی جھکڑ چلنے لگا۔
کتاب ختم کرتے ہی اسے کچھ یاد آیا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو فون کیا۔ دوسری طرف سے ریکارڈنگ سنائی دی۔
''میں میکائیور اپڈ یک بات کر رہا ہوں۔ اس وقت میں گھر پر نہیں۔ برائے مہربانی اپنا پیغام ریکارڈ کروا دیں۔''
''اپڈیک۔'' بوڑھا دھیرے سے بڑبڑایا۔ پھر اُس نے بلند آواز میں کہا۔ ''تم اپنے باپ کا نام اپنے ساتھ لگانا پسند نہیں کرتے۔ اور یہ قابلِ فہم ہے۔ البتہ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی ماں کا نام چنا۔ تمہاری طرح میں بھی اُسے بہت یاد کرتا ہوں۔ اس کے بغیر زندگی کتنی اجاڑ اور ادھوری ہے۔ میں نے تمہیں سالگرہ مبارک کہنے کے لیے فون کیا تھا پیارے۔ اچھا الوداع۔''
آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ بہت مغموم تھا۔ جیسے ہی بوڑھے نے فون رکھا، دروازے کی گھنٹی بجی۔
اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ہاتھ جیب تک گیا۔ پسٹل برف کی طرح سرد تھی۔

☆☆☆

''کون ہے؟'' بوڑھے کی آواز مکان میں گونجی۔
کوئی جواب نہیں آیا۔ اُس نے پن ہول سے جھانکا۔ باہر فقط تاریکی اور برف تھی۔ اسے بے چینی محسوس ہوئی۔ پسٹل پر گرفت مضبوط ہوگئی۔
اچانک ایک دھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹا... وہاں کوئی نہیں تھا۔
''شاید ہوا کا جھکڑ تھا۔'' جیری بڑبڑایا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے پر اسے باغ برف سے ڈھکا نظر آیا۔ سڑک پر گاڑی کے پہیوں کے نشان تھے۔ یکدم ڈوربیل چلّائی۔ وہ تیزی سے دروازے تک گیا۔
''کون ہے؟'' اسے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی۔ پن ہول سے جھانکنے پر اسے ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پہ ہیٹ تھا۔ تاریکی کے باعث چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔
''میں ایک سراغ رساں ہوں۔ ڈبلیو ایچ کنسلٹنٹ فرم کی طرف سے۔'' آدمی نے اونچی آواز میں کہا۔
اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔ اب وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ نیلی آنکھوں والا ایک نوجوان تھا۔
''مسٹر جیری مورسن۔'' اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''میں میکائیور کینڈی۔''
''اوہ... میکائیور... اچھا!'' بوڑھے کا دھیان اپنے بیٹے کی طرف چلا گیا۔
''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔''
''ضرور ضرور۔ دراصل میں آپ کی اتنی جلدی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔'' وہ سنبھل چکا تھا۔
اُس نے دو جام بنائے۔ آتش دان میں کچھ لکڑیاں ڈالیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔
''مجھے مسٹر ولسن نے بتایا کہ آپ کو دھمکی آمیز ای میل موصول ہوئی ہیں۔'' اس نے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔
''درست۔'' بوڑھے نے گھونٹ لیا۔ ''مگر اس سے پہلے کہ میں اپنا مسئلہ بیان کروں، میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''
''ضرور۔'' نوجوان نے ہاتھ رگڑے۔ ''میرا تعلق نیوجرسی سے ہے۔ میں گزشتہ چار برس سے اس فیلڈ میں ہوں۔ پہلے میں وکیل بننا چاہتا تھا مگر ڈیڈ کی ناگہانی موت کی وجہ سے یہ خواب ادھورا رہ گیا۔ سراغ رسانی سے دلچسپی اس جانب لے آئی۔''
''کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''گزارہ ہو جاتا ہے جناب۔'' نوجوان مسکرایا۔ ''پھر اچھی بات یہ ہے کہ مجھے یہ کام پسند ہے۔''
''تمہارے والد کا انتقال کیسے ہوا؟''
''ایک ٹریفک حادثے میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔'' نوجوان کی آنکھوں میں ماضی کی پرچھائیں تھی۔ ''اگر زندہ ہوتے تو اِس وقت آپ کی عمر کے ہوتے۔''

دان شور

بہت دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں اپنے ایک سب ایڈیٹر دوست کے ساتھ اخبار کے دفتر میں بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ ایک صاحب غصے میں بھرے تشریف لائے۔ صورت سے پڑھے لکھے معلوم ہو رہے تھے۔ چہرے سے شرافت اور ذہانت ٹپک رہی تھی۔ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں پائپ تو دوسرے ہاتھ میں ایک خوبصورت بریف کیس تھا جو غالباً کتابوں اور کاغذوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک عینک آنکھوں پر لگی تھی تو دوسری عینک گلے میں لٹک رہی تھی۔
موصوف میرے دوست سے مخاطب ہوئے ''آپ نے آج کے اخبار میں میرا مکمل بیان شائع نہیں کیا ہے۔''
سب ایڈیٹر نے عذر پیش کیا ''جناب جگہ کی تنگی کے باعث آپ کا بیان مکمل شائع نہ ہوسکا ہوگا۔''
''جگہ کی تنگی دوسروں کے لیے ہوسکتی ہے میرے لیے نہیں۔'' موصوف نے اسی غصے میں کہا۔
''میں نے آپ کو پہچانا نہیں جناب والا کی تعریف!'' میرے دوست نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔
''آپ مجھے نہیں جانتے؟'' موصوف نے حیرت کا اظہار کیا اور سینہ پھلا کر فخر سے کہا ''میں اس شہر کا ایک بہت بڑا دان شور ہوں۔''
''دان شور!'' ہم دونوں نے ایک ساتھ دہرایا۔
''جی میں دان شور ہوں۔ کسی مسئلے پر اور کسی بھی اہم واقعے پر میری رائے لی جاتی ہے۔ میرے بیانات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔'' موصوف نے ہمیں سمجھایا۔
موصوف کے سمجھانے کے باوجود ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ دان شور ہے کیا بلا؟ میں نے اپنی کم علمی کا اظہار کیا۔
''معاف فرمایئے دان شور اب بھی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔''
موصوف نے حقارت سے ہمیں دیکھا اور سب ایڈیٹر سے گویا ہوئے ''معلوم نہیں کس نے تمہیں اس کرسی پر بٹھایا ہے۔ دان شور کے معنی نہیں جانتے اور سب ایڈیٹر بنے بیٹھے ہو۔ دان شور کو انگریزی میں (INTELLECTUAL) کہتے ہیں۔''
''دان شور!'' یعنی ان کی مراد دانشور سے ہے۔'' میں نے سوچا۔

اقتباس: دان شور از عابد معز

''سن کر دکھ ہوا۔'' بوڑھے نے دھیرے سے کہا۔
''ویسے میرا بیٹا بھی وکیل ہے۔''
''شان دار! کیا وہ آپ کے ساتھ رہتا ہے؟''
''نہیں، وہ پیرس میں ہے۔'' بوڑھا مغموم ہوگیا۔ ''آج اُس کی سالگرہ ہے۔''
''اگر ان سے بات ہو تو میری طرف سے انہیں سالگرہ مبارک ضرور کہیے گا۔''
''ضرور۔'' جیری مسکرایا۔ اُسے یہ نوجوان اچھا لگا۔
''اب کام کی بات کرتے ہیں۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
جیری نے اسے دھمکی آمیز پیغامات سے متعلق بتایا۔ اپنے دوست مائیکل کا تذکرہ کیے بغیر اُس سے حاصل ہونے والی معلومات سے لڑکے کو آگاہ کیا۔
''تینوں پیغامات کے لیے الگ الگ آئی ڈی استعمال کی گئیں اور جن افراد نے یہ اکاؤنٹ بنائے تھے، وہ تینوں ہی ہلاک ہو چکے ہیں۔''
''دل چسپ۔ یعنی ہمارا سامنا ایک چالاک آدمی سے ہے۔'' وہ گہری سوچ میں غلطاں تھا۔
''میرا اندازہ ہے کہ اس شخص کا تعلق بوینس ٹاؤن سے نہیں۔'' نوجوان نے وقفہ لیا۔ ''یہ شخص اُن افراد میں سے نہیں ہے، جن کے ساتھ آپ شطرنج یا گالف کھیلتے ہیں۔ درحقیقت اس کا تعلق آپ کے ماضی سے ہے۔''
''تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' جیری نے پہلو بدلا۔
''کیوں کہ اپنی دھمکیوں میں وہ آپ کے ماضی کا ذکر کر رہا ہے اور جہاں تک اس ٹاؤن کے مکینوں کا تعلق ہے، وہ

آپ کی گزشتہ زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، ماسوائے اِس کے کہ آپ نیوجرسی میں تجارت کرتے تھے۔“ اس نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔”آپ کے ٹیلی فون ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں سوائے اپنے بیٹے کے آپ نے کسی ایسے شخص سے رابطہ نہیں کیا، جس کا تعلق آپ کے ماضی سے ہو۔“

تیز ہوا میں ایک چیخ سنائی دی۔ جیری کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔”تم نے میرے فون ریکارڈ نکلوا لیے۔ یہ غیر قانونی ہے۔“

”جناب، میں ایک سراغ رساں ہوں۔ کسی معاملے کا قانونی اور غیر قانونی ہونا میرا موضوع نہیں، میرا مقصد تو فقط آپ کا مسئلہ حل کرنا ہے۔“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ”ساتھ ہی میں ایک ایمان دار شخص ہوں۔ یہ میرے والد کی تربیت کا اثر ہے۔ ورنہ کون اِس طوفانی رات سو کلومیٹر کا فاصلے طے کر کے اس خاموش قصبے آتا۔ بار میں بیٹھ کر آپ کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا، ٹیلی فون ریکارڈ نکلواتا۔“

جیری گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔”تم مجھے متاثر کرنے میں کامیاب رہے نوجوان۔“

”شکریہ۔ تو اب ضرور کھل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔”اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ تجارت کی الف بے سے بھی آگاہ نہیں۔ نیوجرسی کے بارے میں، آپ خاک نہیں جانتے۔ آپ کا تعلق تو فلاڈلفیا سے ہے۔“

جھکڑ پوری قوت سے دیوار سے ٹکرایا۔ جیری کرسی سے اچھل پڑا۔ غیر شعوری طور پر ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔

”تم...“ وہ بوکھلایا ہوا تھا۔

”شانت رہیں جناب۔“ نوجوان نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔”مجھے دکھ ہے کہ میں نے آپ کو یوں چونکا دیا۔ برائے مہربانی مجھے وضاحت کرنے دیں۔“

بوڑھے کی آنکھوں میں شبہات تھے۔ وہ گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ حیران ہونے کی باری اب نوجوان کی تھی۔

”میں نے باہر برف پر ٹائر کے نشانات دیکھے تھے مگر دروازہ کھولنے پر مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ تم پیدل تو یہاں نہیں آئے ہو گے؟“

”بلاشبہ میں پیدل نہیں آیا۔“ وہ بالکل مطمئن تھا۔ ”میں نے اپنی گاڑی درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کی ہے۔ اتنی برف باری میں اسے کھلے آسمان تلے چھوڑنا نری حماقت ہوتی۔“

”کیا واقعی؟“ بوڑھا اٹھ کر کھڑکی تک گیا۔ برف کی دیوار کے پیچھے... جھنڈ میں اُسے ایک گاڑی کا ہیولا نظر آیا۔ وہ واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

”تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ میرا تعلق نیوجرسی سے نہیں فلاڈلفیا سے ہے۔“

وہ مسکرایا۔”ایک اچھا سراغ رساں چیزوں کا باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے جناب۔ میرے نزدیک آپ کے ماضی میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ جو آدمی اپنا ماضی چھپانا چاہتا ہے، وہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ آپ نے اپنا تعلق نیوجرسی سے ٹھہرایا۔ اِس کا سیدھا سادہ مطلب ہے کہ آپ کا تعلق امریکا کے کسی اور شہر سے تو ہو سکتا ہے، مگر نیوجرسی سے قطعی نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ سے ایک چوک ہوئی۔ نیوجرسی میں شطرنج اور گالف کبھی مقبول کھیل نہیں رہے۔ آپ کا تعلق فلاڈلفیا سے ہے... اِس کے دو ثبوت ہیں۔“

جیری توجہ سے سن رہا تھا۔

”پہلا ثبوت تو فلاڈلفیا بک اسٹور کی جانے والی فون کالز ہیں۔“ اس نے کاغذ کا پرزہ لہرایا۔”اور دوسرا ثبوت آپ کا گالف کیپ ہے، جس پر فلاڈلفیا کے ایک کلب کا لوگو بنا ہے۔ اب آپ یہ تو نہیں پوچھیں گے کہ میں نے وہ کیپ کب دیکھا۔“

بوڑھا اب پُرسکون تھا۔”جس کھونٹی پر تم نے اپنا کوٹ لٹکایا، وہیں میرا کیپ ٹنگا تھا۔ درست؟“

”بالکل درست!“ وہ مسکرایا۔”تو چلیں، آپ کے ماضی میں چلتے ہیں تاکہ ہم اس بدمعاش تک پہنچ سکیں۔“

☆☆☆

”میں ایک قاتل ہوں۔“ اس نے کہا، پھر باہر کی طرف دیکھا۔ برف باری تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کی خوفناک آوازوں میں تسلسل آ گیا۔ جیری نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا تھا۔”ایک گینگسٹر۔ تم درست ہو۔ میں نے ساری زندگی فلاڈلفیا ہی میں گزاری۔ کیا تم نے بگ کلر کا نام سنا ہے؟“

”بگ کلر!“ نوجوان نے نام دہرایا۔”فلاڈلفیا میں دہشت کی علامت۔ شراب کا سب سے بڑا بیوپاری۔ جوئے کے اڈے چلانے والا۔ اغوا اور قتل کے کئی معاملوں میں

ماں

چھوٹا سا لفظ ہے ماں، نہ معلوم کتنی تقریریں اس لفظ پر کر چکا ہوں، کوئی گنتی نہیں لیکن جب کبھی بھی یہ لفظ زبان پر آیا، اس لفظ کی طہارت، پاکیزگی، معنی، مفہوم، کتنی آیات، کتنے واقعات، کتنے معجزات اس ایک لفظ میں ہیں۔ ایک عظیم دفتر ہے جس رخ سے چاہیں بات کریں۔ اس ایک لفظ کو اگر ہم قرآن کی آیات کی روشنی میں دیکھیں، توریت، انجیل، زبور میں دیکھیں عظمت کے ساتھ موجود ہے لیکن ظاہر ہے قرآن سے بڑی کتاب تو دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ قرآن میں ماں کے بارے میں کوئی تفصیل کوئی پورا واقعہ نہیں ملے گا مگر آیت مفصل ہوگی، قرآن میں ایک دو آیتیں ہی ماں کے موضوع پر موجود ہیں لیکن یہ مختصر سا ذکر بھی قرآن میں حیران کر دیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے واقعے میں جامعیت ہے، ماں کی مکمل تصویر ہے۔ اللہ اپنے حبیب پر آیتیں اتار رہا ہے۔ سورہ قصص میں ارشاد ہے ”ہم نے مادرِ موسیٰ پر وحی کی۔“ ماں کتنی عظیم ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء پر وحی کرنے والا ماں پر بھی وحی کرتا ہے، ماں کا مقام دیکھیں۔

اقتباس: ”ماں“ از علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی

ملوث۔ اتنا شاطر کہ کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔ انتہائی بارسوخ۔“

”اپنی تعریف سن کر اچھا لگا۔“ بوڑھا مسکرایا۔”ہاں میں ہی بگ کلر ہوں، جس کا نام سنتے ہی دشمن تھرتھر کانپنے لگتے تھے۔“

نوجوان نے پہلو بدلا۔”پھر ایسا کیا ہوا کہ بگ کلر اچانک روپوش ہو گیا؟“

”اس کا سبب ایک پولیس افسر تھا۔“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ ”میں ایک نفاست پسند، تہذیب یافتہ اور کتاب دوست گینگسٹر ہوں۔ میرے کام کرنے کا طریقہ بہت صاف ستھرا تھا۔ پولیس کبھی مجھ تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کے لیے میں نے رشوت کا بھی سہارا لیا۔ مگر پھر ایک پولیس افسر نے مجھے جیل پہنچانے کی ٹھان لی۔ مجھے کہنے دو کہ وہ بہت ذہین اور باصلاحیت تھا۔ جب وہ قانونی طریقے سے مجھ تک نہیں پہنچ سکا تو اس نے میری ہی تکنیک اپنائی۔ رشوت کا سہارا لیا۔ میرے ہی آدمیوں کو خرید لیا۔ تمام ثبوت حاصل کر لیے اور...“

”اور آپ نے اُسے ٹھکانے لگا دیا۔“ نوجوان نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔”کیا آپ اور جام لینا پسند کریں گے۔ ماضی کے تذکرے کے دوران سرخ وائن بہترین ہے۔“

بوڑھا مسکرایا۔”میرے پیارے میگا ئیور، تم کتنے ذہین ہو۔ آہ، سرخ وائن مجھے پسند ہے۔“

نوجوان بار تک گیا اور جام بنانے لگا۔ کھڑکی سے اس نے جھنڈ پر نظر ڈالی۔ پھر اپنی نشست پر واپس آ گیا۔

”شکریہ لڑکے۔“ جیری نے کہا۔”تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ اس ڈھیٹ شخص نے ثبوت حاصل کر لیے۔ جب مجھے پتا چلا تو میں آگ بگولا ہو گیا۔“

اس نے بڑا سا گھونٹ لیا۔”اور میرا غصہ قابلِ فہم تھا۔ وہ مجھے برباد کرنا چاہتا تھا۔ ذرا تم ہی بتاؤ، کیا جرائم کی دنیا میں جگہ بنانا آسان ہے؟ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ باپ اوائل عمری میں ہمیں چھوڑ کر چلا گیا، بیماری کے آسیب نے میری ماں کو نگل لیا، میں نے سڑکوں پر زندگی گزاری۔ جرم کی دنیا میں نام بنانے میں بہت وقت اور محنت لگی ہے۔ میں آسمان پر پہنچ گیا تھا، مگر وہ بدبخت شخص مجھے پھر سے سڑک پر لانا چاہتا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے راستے سے ہٹا دوں۔“

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔”لیکن اِس بار بھی میں نے ایک صاف ستھرا طریقہ اختیار کیا۔ ایک سادہ سا کار حادثہ، بس!“

”مگر اسے راستے سے ہٹانے کے باوجود آپ کو فلاڈلفیا چھوڑنا پڑا۔“ سراغ رساں نے کہا۔”ویسے اس افسر کا نام کیا تھا؟“

”اس کا نام؟“ جیری نے ذہن پر زور ڈالا۔”شاید ڈیل جیکسن یا شاید نورمن جیکسن۔ مجھے یاد نہیں۔“ اس نے گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔

”مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کا اعتماد تھا۔ آج اُس کے بارے میں سوچ کر ہی مجھے بھاری پن محسوس ہو رہا ہے۔ بے شک میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا مگر وہ تمام ثبوت پہلے ہی میئر کے حوالے کر چکا تھا۔ بہت ہی

ڈھیٹ تھا۔" جیری نے سر جھٹکا۔

"اس کی موت نے پولیس ڈپارٹمنٹ کو آگ بگولا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ افسران بھی میرے خلاف ہوگئے جنہیں میں ہر ماہ ٹھیک ٹھاک رقم دیا کرتا تھا۔ راتوں رات میرے نام کا وارنٹ نکل آیا۔ مجھے سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا۔ اپنی من پسند کتابوں سے محرومی کتنا بڑا صدمہ ہے، اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بالکل بھی اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

وہ انتہائی غمگین تھا۔ سراغ رساں کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کیا طوفان تھم گیا؟" اُس نے سوال کیا۔

"نہیں، البتہ شدت گھٹ رہی ہے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"اچھا ہے، سردی کچھ کم ہوجائے گی۔" جیری نے ہاتھ رگڑے اور مفلر گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ "تو میں بتا رہا تھا کہ میرا سب کچھ تباہ ہوگیا۔ گینگ بکھر گیا۔ ساتھی روپوش ہوگئے۔ میرا بیٹا میری غیر قانونی سرگرمیوں سے لاعلم تھا۔ جب اسے پتا چلا، وہ مجھے چھوڑ کر پیرس چلا گیا۔ آہ، میرا پیارا بیٹا۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ خود کو بے حد کمزور محسوس کر رہا تھا۔ نوجوان خاموش کھڑا رہا۔

"ارے، کیا میں نے بتایا تھا... تم اس کے ہم نام ہو۔" اس نے آنسو پونچھے۔ "ذرا مجھے ایک جام اور بنا دو۔"

نوجوان نے اس کا گلاس بھر دیا مگر اپنے لیے جام نہیں بنایا۔

گلاس اٹھاتے ہوئے بوڑھے کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

"انہوں نے میرے تمام اکاؤنٹ منجمد کر دیے۔ مگر ایک اکاؤنٹ کا انہیں علم نہیں تھا۔ اس میں موجود رقم سے میں نے ایک گمنام زندگی شروع کی۔ ماضی کی ہر یاد کو مٹا دیا، ماسوائے ایک ای میل آئی ڈی کے، جو میں نے الوتائی کے ایک کمپیوٹر ہیکر کی مدد سے بنوائی تھی۔"

"تو اسی کے ذریعے آپ اپنے خفیہ اکاؤنٹ کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔" سراغ رساں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر یہ فقط اس کام تک محدود نہیں۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "اس کے ذریعے میں اپنے چند انتہائی قریبی ساتھیوں سے رابطے میں رہا۔ وہ مختلف شہروں میں بکھر گئے تھے اور چھوٹے موٹے جرائم کر کے گزارہ کر رہے تھے۔"

جیری نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ تپ رہا تھا۔ شاید اسے بخار ہوگیا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "میں نے اپنا ٹھکانا خفیہ رکھتے ہوئے انہیں دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ سست رفتار عمل تھا، مگر نتیجہ مثبت رہا۔ فلاڈلفیا میں کل ایک بڑی بینک ڈکیتی ہوئی ہے۔ وہ میرا ہی منصوبہ تھا۔ میرا اگلا ٹارگٹ پینسلوانیا میں منشیات کا دھندا شروع کرنا ہے۔ میکسیکو کے چند ڈیلرز سے رابطہ ہوا ہے۔ سب ٹھیک سمت میں جا رہا ہے۔ میں جلد اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں گا۔ ہر چیز منصوبے کے مطابق رہی مگر اچانک... مجھے دھمکی آمیز پیغامات موصول ہونے لگے۔ نہ جانے اُس خبیث کو میری آئی ڈی کیسے ملی؟"

منظر پر بجلی سے دھند چھا گئی۔ کمرے میں ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔

نوجوان پلٹا۔ "آپ نے افسر کا نام کیا بتایا تھا؟"

"ڈیل... ڈیل ملٹن شاید۔" بوڑھا کھانسا۔

"نہیں۔ اُس کا نام ڈیل ملٹن نہیں تھا۔" نوجوان اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگا۔ "اُس کا نام تھا ڈیل کلنٹن اور اس کی ایک بدقسمت بیوی تھی جسے شوہر کی ناگہانی موت نے توڑ ڈالا۔ وہ ذہنی مریضہ بن گئی۔"

جیری نے نوجوان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے شناسا لگا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔

"شاید اُس کا ایک بیٹا بھی ہو جو وکیل بننا چاہتا ہو۔ مگر باپ کی موت نے اس کے خواب نگل لیے۔ ممکن ہے کہ وہی آپ کو دھمکی آمیز پیغامات بھیج رہا ہو۔"

"تت... تم کون ہو؟" جیری نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا گیا۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر اس کی جیب سے پسٹل نکال لی۔ "میں آپ کے بیٹے کا ہم نام نہیں مسٹر جیری! میرا نام میگا ئیور نہیں، مورگن کلنٹن ہے اور میرا باپ ایک ایماندار افسر تھا۔"

"تمہاری نیلی آنکھیں دیکھ کر مجھے سمجھ جانا چاہیے تھا۔" جیری اس پر جھپٹا مگر اگلے ہی لمحے زمین پر آ رہا۔ نقاہت کی بدروح اس کے بدن میں گھس گئی تھی۔

نوجوان نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ وہ درد سے کراہا۔

"تم... تم مجھ تک پہنچے کیسے؟" لہجے میں درد اور تعجب تھا۔

"یہ اچھا سوال ہے۔" نوجوان نے ایک اور ٹھوکر رسید کی۔ جیری دوہرا ہوگیا۔

"آپ نے اپنی شناخت خفیہ رکھنے کے لیے مضبوط انتظام کیا تھا۔ چھوٹا سا قصبہ۔ جعلی نام۔ ماضی سے ہر ناتا توڑ لیا تھا مگر کچھ عادتوں سے جان نہیں چھڑا پائے۔ شاید آپ نے انہیں بے ضرر سمجھا۔"

نوجوان آتش دان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "میں نے آپ کے فلاڈلفیا اپارٹمنٹ سے ملنے والی ہر ایک کتاب کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی سراغ ضرور فراہم کریں گی اور ایسا ہی ہوا۔" وہ پلٹا۔ "وہاں سڈنی شیلڈن کی کئی کتابیں تھیں اور اُن میں سے ایک کتاب پر اس کا آٹوگراف تھا۔"

جیری نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک اور ٹھوکر رسید ہوئی۔

"پولیس ریکارڈ سے مجھے پتا چلا کہ آپ کتابیں ہمیشہ ڈاک کے ذریعے منگواتے تھے۔ میں نے فلاڈلفیا کے تمام بک اسٹورز سے گزشتہ چند برسوں میں بھیجی جانے والی کتب کا ریکارڈ حاصل کرلیا۔"

جیری سرکتا ہوا دیوار تک گیا اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "بکواس! تم حقیقت بیان نہیں کر رہے۔ ان آٹھ برسوں میں سیکڑوں بک اسٹورز کو لاکھوں آرڈرز موصول ہوئے ہوں گے۔ سچ بتاؤ، تم مجھ تک کیسے پہنچے؟"

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس نے سگار سلگایا۔ "درست کہا۔ فہرستیں لاکھوں کتب پر مشتمل تھیں۔ سڈنی شیلڈن کی کتابیں بھی ہزاروں میں تھیں۔ لوگ اُس کے دیوانے ہیں۔ اور آپ واقعی شاطر ہیں۔ آپ نے فلاڈلفیا کے کسی ایک اسٹور سے تمام کتابیں نہیں خریدیں مگر قدرت مجھ پر مہربان تھی جناب۔ مجھے ان طویل فہرستوں میں ایک مماثلت نظر آئی۔ چار مختلف اسٹورز کو آرڈر کیے جانے والے سڈنی کے پندرہ ناول... ایک چھوٹے سے قصبے روانہ کیے گئے تھے یعنی بومینس ٹاؤن۔"

جیری پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ "اور میرا... ای میل ایڈریس؟"

"آں... یہ معاملہ دلچسپ ہے۔" نوجوان نے تالی بجائی۔ "یہ محض اتفاق تھا کہ میں الوتائی کے اس کمپیوٹر ہیکر تک پہنچ گیا جس سے آپ نے اکاؤنٹ بنوایا تھا۔ ایک کیس کے دوران میری اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ کیس ای میل آئی ڈیز ہی سے متعلق تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے تذکرہ کیا کہ کچھ لوگ اپنے من پسند ناولز پر آئی ڈی بنواتے ہیں۔ اُس نے چند نام گنوائے اور اُن میں سے ایک آئی ڈی... درحقیقت سڈنی شیلڈن کے پہلے ناول کا عنوان تھا۔" اُس نے سگار کا کش لیا۔

"پہلی دھمکی آمیز میل بھیجنے سے قبل میں متذبذب تھا مگر جب جواب موصول نہیں ہوا۔ پولیس بھی پوچھ گچھ کے لیے نہیں آئی۔ آپ خاموش رہے۔ میں سمجھ گیا کہ بالآخر اپنے باپ کے قاتل تک پہنچ گیا ہوں۔ سات ہفتے قبل پہلی بار اس اجاڑ قصبے میں آیا۔ بار میں میری ملاقات آپ کے چوکیدار ڈگلس سے ہوئی۔ وہ پہلے ڈبلیو ایچ فرم میں کام کرتا تھا۔ میرا کام آسان ہوگیا۔ میں نے فرم کے مالک کے نام ایک پیغام روانہ کیا کہ اگر کاربن کاؤنٹی کا کوئی کیس آئے تو مجھے ہی سونپا جائے۔ کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ میری توقع کے عین مطابق آپ نے پولیس کی مدد نہیں لی۔ جاسوسی ناولوں کے اثر نے کسی سراغ رساں ادارے سے رابطے کی راہ سجھائی۔ اور یوں میں... آفیسر ڈیل کلنٹن کا بیٹا، اس طوفانی رات یہاں آپ سے ملنے چلا آیا۔ ایک بات اور بتاتا چلوں۔" اس کا لہجہ ڈرامائی تھا۔ "جنہیں آپ دوست سمجھ رہے ہیں، درحقیقت اُن میں سے ایک شخص آپ کا جانی دشمن ہے۔"

"کیا تم..." جیری کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "مجھے قتل کر دو گے؟"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "میں کوئی قاتل نہیں جناب۔ میں نے فقط آپ کے جام میں ایک نشہ آور دوا ملائی ہے، جس کی زیادہ مقدار جسم پر فالج جیسے اثرات مرتب کرتی ہے اور دوا اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ آپ ہلنے جلنے سے قاصر ہوگئے ہیں۔ اب میں آتش دان بجھا دوں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا اور ٹھنڈ... اگلے چند گھنٹوں میں، بالکل خاموشی سے آپ کی جان لے لے گی۔"

بوڑھا دیوار سے ٹیک لگائے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ "تم بچ نہیں سکو گے... پولیس بالآخر تم تک پہنچ جائے گی۔"

"کیا واقعی؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "مسٹر جیری، بومینس ٹاؤن میں گزشتہ کئی دہائیوں سے کوئی قتل نہیں ہوا۔ یہاں کی پولیس اس نوع کے معاملات کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی۔ آپ کی موت کو حادثہ قرار دیا جائے گا۔ لوگ کہیں گے، برفانی طوفان نے ایک بوڑھے کی جان لے لی اور ویسے بھی..." وہ آگے کو جھکا۔ "آپ کے قاتل کو تلاش کرنے سے زیادہ پُرتجسس عمل اُن کے لیے آپ کا ماضی بازیافت کرنا

ہوگا۔"

"لوگوں نے تمہیں... یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم ڈگلس سے مل..." بوڑھے کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

نوجوان مسکرایا۔ "آپ نے جاسوسی ناول تو بہت پڑھے مگر سراغ رساں کے طریقوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ پچھلی بار جب میں قصبے میں آیا تو ہلکے میک اپ میں تھا اور جہاں تک آج رات کا تعلق ہے... میں بار میں گیا ہی نہیں۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں سیدھا یہاں چلا آیا۔ گاڑی جھنڈ میں کھڑی کی۔ جہاں تک پہیوں کے نشانات کا معاملہ ہے، برف باری کچھ دیر اور جاری رہے گی، نشانات جلد مٹ جائیں گے۔"

وہ کھڑا ہوگیا۔ سگار بجھا کر اُسے احتیاط سے ایک تھیلی میں ڈالا۔ راکھ صاف کی۔ رومال سے گلاس اور صوفے سے انگلیوں کے نشان مٹائے۔ بوڑھا بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔ آتش دان دھیرے دھیرے سرد پڑنے لگا تھا۔ سردی اس کے جسم میں داخل ہورہی تھی۔

نوجوان نے کوٹ پہنا۔ "الوداع جناب! امید ہے کہ پھر کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔"

جوں ہی وہ دروازے پر پہنچا، فون کی گھنٹی بجی۔ نوجوان رک گیا۔ بوڑھے نے فون کی طرف دیکھا۔ اس نے فون تک پہنچنے کی کوشش کی مگر جسم منجمد ہوگیا تھا۔

گھنٹی بجتی رہی۔

"اگر آپ کے بیٹے کا فون ہو..." نوجوان نے کہا۔ "تو اُسے میری طرف سے سالگرہ مبارک ضرور کہیے گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔

☆☆☆

جیپ برفانی طوفان کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ کاربن کاؤنٹی کی حدود سے نکلتے ہی طوفان کی شدت ٹوٹ گئی۔ فلاڈلفیا کے نزدیک فقط خنکی رہ گئی۔

اُس نے شمالی ہائی وے پر واقع ایک گیراج کے سامنے گاڑی روکی۔ گیراج کا مالک ایک شرابی تھا۔ اسے گاڑی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد سو ڈالر اضافی دیے۔

مورگن نے اُسے آنکھ ماری۔ آدمی مسکرایا۔ "میں تمہاری گرل فرینڈ کو نہیں بتاؤں گا کہ آج رات تم کسی اور لڑکی کے ساتھ موج مستی کررہے تھے۔"

وہ پیدل ہی ہائی وے پر آگیا۔ اسے سڑک پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ اس نے اشارہ کیا۔ گاڑی قریب آکر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سیاہ فام بوڑھا بیٹھا تھا۔

"ڈیئر مسٹر مائیکل، کیا مجھے گھر تک کی لفٹ مل جائے گی؟"

بوڑھا ہنسا۔ "ضرور لڑکے۔ تمہارے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔"

"ویسے انی میل آئی ڈی والا قصہ آپ نے خوب گھڑا۔" نوجوان نے کہا۔ "تین الگ الگ آدمی اور تینوں ایک ہی فضائی حادثے میں مارے گئے۔"

"اسے پُراسراریت پسند تھی۔" مائیکل کی نظریں تاریک سڑک پر جمی تھیں۔ "اور میں نے اچھے شکاری کی طرح کانٹے پر وہی کھاجا لگایا جو مچھلی کو بھاتا تھا۔"

رات کے دوسرے پہر وہ اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔ اس نے نائٹ سوٹ پہنا اور خود کو بستر کے حوالے کردیا۔

صبح فون کی گھنٹی سے آنکھ کھلی۔ دوسری طرف ولسن تھا۔

"لڑکے میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے تمہیں کل رات بوسینس ٹاؤن جانے سے باز رکھا۔ وہاں تو برف کے طوفان نے زندگی معطل کررکھی ہے۔"

"کیا واقعی؟" وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔

"اچھا سنو، ایک بری خبر ہے۔" ولسن نے کہا۔ "جن بڑے میاں نے اپنے کیس کے سلسلے میں رابطہ کیا تھا، وہ آج صبح اپنے مکان میں مردہ پائے گئے۔ سردی سے ان کا جسم اکڑ گیا تھا۔ ابھی ابھی خبروں میں دیکھا۔ شاید انہیں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ہاں پیارے، بڑے میاں تگڑی اسامی تھے۔"

"اب اس گاڑی کا کیا ہوگا جسے میں نے بوسینس ٹاؤن جانے کے لیے بک کیا تھا؟" مورگن نے منہ بنایا۔

"پیارے، یہ نقصان تو تمہیں برداشت کرنا پڑے گا۔" ولسن نے قہقہہ لگایا۔ "شکر کرو برف کے طوفان سے بچ گئے۔"

فون رکھ کر مورگن کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ سرما کا روشن سورج فلاڈلفیا پر چمک رہا تھا۔

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے خوشہ خاص

کمرا معقول تھا۔ ویسے بھی ایک پاؤنڈ کا حیدرآبادی ڈسکاؤنٹ بھی مل چکا تھا۔ زیادہ قیل و قال کرنا مناسب نہ تھا۔ اپنا سوٹ کیس کمرے میں رکھ کر میں ہاتھ دھونے چلا گیا۔ ایسے ہوٹلوں میں غسل خانہ مشترکہ ہوتا ہے۔ ہر منزل پر ایک غسل خانہ۔ صبح کے وقت اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو بھوک لگ رہی تھی۔ شام ہوچلی تھی۔ ویسے بھی کینیڈا میں جلدی کھانا کھانے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اس پر ستم یہ تھا کہ رات کا کھانا کرائے میں شامل نہ تھا۔ صرف اگلے دن صبح کا ناشتا شامل تھا۔ پھر لندن بھی دیکھنا تھا۔ ان تمام عوامل کا تقاضا یہ تھا کہ میں دروازے کا رخ کروں۔ میں نے یہی کیا۔

ہوٹل سے باہر نکلنے لگا تو ہوٹل کے مالک سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ پوچھنے لگے۔ "ہو پاشا، کہاں کا صد (قصد) ہے۔"

"بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کھانا کھاؤں گا پھر لندن شہر گھوموں گا۔" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے بتایا کہ آگے جا کر اگر میں سیدھے ہاتھ پر مڑ کر تھوڑا آگے جاؤں تو فاسٹ فوڈ کی دکانیں نظر آئیں گی خاص طور سے ہیمبرگر کی۔ میں نے وکٹوریہ سے آتے ہوئے بھی ہیمبرگر کی دکانیں دیکھی تھیں۔ ہیمبرگر کا سہرا میکڈونلڈ کے سر جاتا ہے۔ یہ انگلستان کی خاص غذا نہیں ہے۔ اسی طرح جس طرح پیزا امریکا کی نہیں بلکہ اٹلی کی خاص غذا ہے۔ ویسے بھی طالب علمی کے زمانے میں پاکستان میں جو "بن کباب" ملا کرتے تھے وہ آج کل کے ہیمبرگر سے کئی گنا زیادہ لذیذ ہوا کرتے تھے۔ خاص طور سے کراچی میں دہلی سوسائٹی

میں DMS اسکول کے نزدیک ایک سیخ کباب کی دکان تھی جہاں کے کباب انتہائی لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ مصالحے کی تیزی اور مرچوں کے استعمال میں بھی اپنا جواب آپ تھے۔ اس سیخ پر بنے ہوئے کباب کو بن میں رکھ کر ادرک کی وافر مقدار کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ آنسو پونچھتے جائیں اور بن کباب کے مزے لوٹتے جائیں۔ میں نے انگلستان میں اکثر گوروں کو بالکل اسی انداز میں پاکستانی ریسٹورنٹ میں پاکستانی کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ آنسو پونچھ رہے ہیں اور پاکستانی کھانے کے چٹخارے لے رہے ہیں۔

انگلستان کی خاص غذا شیپرڈ پائی یا مشہور زمانہ فش اینڈ چپس ہیں۔ میں نے فش اینڈ چپس پر اکتفا کیا۔ بٹر میں لپٹی ہوئی کاڈ فش بے مزہ لگی۔ مجھے اپنے یہاں کی تلی ہوئی پام فرٹ مچھلی کی یاد آگئی۔ اس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

پام فرٹ کے ذائقے کی یادوں میں زیادہ دیر کھوئے رہنا مناسب نہ تھا کہ شہر لندن بھی دیکھنا تھا۔ خاص طور سے پکاڈلی اسٹریٹ کہ اس کا ذکر بچپن سے ہی سنتے چلے آرہے تھے۔

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک بڑے میاں پھول فروخت کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان سے پکاڈلی کا راستہ معلوم کیا جائے۔

میں نے ان کے پاس پہنچ کر ان کو مخاطب کیا۔ ''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ پکاڈلی یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

بڑے میاں نے مجھے کچھ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا۔ ''کون سی جگہ؟''

''پکاڈلی'' میں نے دہرایا۔

کہنے لگے ''ینگ مین۔'' اس زمانہ میں ینگ مین ہی ہوا کرتا تھا۔ ''میری ساری زندگی اس شہر میں گزری ہے۔ اس شہر میں اس نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

میں نے اصرار کیا۔ ''ہے کیسے نہیں۔ ضرور ہے اور ساری دنیا میں مشہور ہے۔''

وہ ناراض ہوگئے۔ ''تم شاید لندن پہلی دفعہ آئے ہو لیکن میں اسی شہر میں پیدا ہوا، پلا بڑھا۔ جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر طے کیا۔ اس شہر کا چپہ چپہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ میں تم سے شرط لگانے کو تیار ہوں کہ لندن شہر میں پکاڈلی نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

اس کے باوجود جب میں مُصر رہا کہ پکاڈلی یہیں کہیں نزدیک ہی ہے تو وہ طیش میں آگئے..... اب اپنی بات کو درست ثابت کرنا ان کی انا کا مسئلہ بن چکا تھا۔

سامنے سے ایک صاحب آرہے تھے بالکل روایتی ''برٹش جنٹلمین''، گہرے نیلے رنگ، نیوی بلیو سوٹ۔ لال رنگ کی واسکٹ اور بوٹائی، سر پر فلیٹ ہیٹ، ہاتھ میں چھڑی، منہ میں سگار۔ پھول والے نے ان کو روک کر مخاطب کیا ''یہ پاگل نوجوان لندن میں کسی ایسی جگہ جانا چاہتا ہے جس جگہ کا لندن میں کوئی وجود نہیں ہے۔ مگر یہ مُصر ہے۔ آپ ذرا اسے سمجھائیں۔''

ان صاحب نے مجھے بڑی شفقت سے مخاطب کیا۔ ''نوجوان تم کہاں جانا چاہتے ہو۔''

''پکاڈلی'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔

''لندن میں اس نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔'' انہوں نے کافی غور کے بعد جواب دیا۔ پھول والے نے میری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ پھر اچانک ان صاحب کی آنکھوں میں چمک آئی۔ ''اوہ! اب میں سمجھا..... تم ''پکے ڈلی'' جانا چاہتے ہو۔'' پھر انہوں نے اپنی چھڑی اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ ''اس سڑک پر چلے جاؤ۔ وہاں سے تیسری سڑک پر بائیں ہاتھ مڑ جانا اور سیدھے چلے جانا تم ''پکے ڈلی'' پہنچ جاؤ گے۔ اگر گم جاؤ تو کسی سے معلوم کر لینا مگر پکاڈلی مت کہنا ''پکے ڈلی'' کہنا۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ''پکے ڈلی'' کے لیے اپنا راستہ پکڑا۔ تلفظ اور لہجے کا یہ مشکل مرحلہ میرے ساتھ پہلے بھی بارہا گزر چکا تھا اور آئندہ آنے والے برسوں میں بھی گزرے گا۔ امریکا میں جب لوگ میری بات کو نہیں سمجھ سکتے تو کہا کرتے تھے ''یہ تمہارا برطانوی ایکسنٹ'' پھر جب میں برطانیہ آگیا تو مجھے سننا پڑا۔ ''توبہ! تمہارا یہ امریکی ایکسنٹ'' حقیقت یہ ہے کہ یہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ دراصل ہم پاکستان میں اتنی زیادہ انگریزی بولتے ہیں کہ ہمارا خود کا ایک ایکسنٹ بن چکا ہے جو برطانوی اور امریکی ایکسنٹ دونوں سے جدا ہے۔

ایکسنٹ کے علاوہ میرے بولنے میں دو خرابیاں اور بھی ہیں۔ ان خرابیوں کی طرف میری توجہ میرے ایک ساتھی اسٹین والش نے دلوائی۔ اسٹین اور میں کینیڈا میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ اسٹین خود تو برطانوی نژاد کینیڈین تھا مگر اس

دسویں صدی میں میٹریا میڈیکا لکھنے کا سہرا ابو منصور موفق کے سر بندھتا ہے۔ اس میٹریا میڈیکا میں 1505 ادویات تجویز کی گئی تھیں۔ جن میں 386 نباتات سے 75 معدنیات سے اور 44 حیوانات سے حاصل کی گئی تھیں۔ موفق ادویہ کے مختلف عوامل کا فرق بھی جانتا تھا۔ اسے سوڈیم کاربونیٹ اور پوٹاشیم کاربونیٹ کا فرق معلوم تھا۔ وہ آرسینس آکسائیڈ، کیوپرک آکسائیڈ، سلیسک آکسائیڈ، اینٹمنی، تانبے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات اور ان بجھے چونے کی جلد پر بال دور کرنے کی خاصیت کا بخوبی علم رکھتا تھا۔ حالیہ چیز پلاسٹر آف پیرس کی ترکیب استعمال کا اسے بخوبی علم تھا۔

یورپ کا اوروس، جس کا فلسفہ آج بھی پوری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ مشہور مسلمان فلسفی طبیب اور ہیئت دان ابوالولید محمد ابن رشد تھا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب ''الکلیات فی الطب'' میں تحقیق و تجربے کے بعد یہ ثابت کیا کہ اگر کسی شخص کو چیچک نکل آئے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس مرض سے محفوظ ہوگیا۔

اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

کی بیوی پاکستانی تھی جس کا نام زرینہ غنی تھا۔ انگریز حرف ''غ'' نہیں ادا کر سکتے ہیں وہ اس کو زیادہ تر حرف ایچ کی طرح ادا کرتے ہیں۔

نتیجتاً اسٹین بیوی کو غنی کے بجائے ''ہنی'' کہہ کر پکارتا تھا۔ جب میاں بیوی کی چار چوٹ کی لڑائی ہو تب بھی بیوی ہمیشہ خوش ہو جاتی لڑنا بھول جاتی۔

اسٹین کو میرے ساتھ کافی وقت گزارنا پڑتا تھا۔ وہ میری بات مشکل سے سمجھ پاتا تھا۔ جھنجلا جاتا تھا۔ ایک دن اسی جھنجلاہٹ کے عالم میں مجھ کو مخاطب کیا۔ ''میں تمہاری بات کبھی نہیں سمجھ سکتا۔''

''کیوں نہیں سمجھ سکتے۔'' میں نے بھی اسی انداز سے اس کو جواب دیا۔

''اس لیے نہیں سمجھ سکتا کہ ایکسنٹ تو تقریباً ہر پاکستانی کا ہوتا ہے۔ مگر تمہارے ساتھ دو بڑے مسئلے اور بھی ہیں۔''

پھر اس نے دونوں مسائل کی وضاحت کی۔ ''ایک تو یہ کہ تم ہونٹ پوری طرح نہیں کھولتے ہو اور دوسرا یہ کہ تم جلدی جلدی اور بہت تیز تیز بولتے ہو۔''

ہم دونوں میں مصالحت اس وعدہ پر ہوئی کہ آئندہ میں آہستہ بولنے کی کوشش کیا کروں گا۔ معاملات کچھ تو سدھر گئے مگر پوری طرح نہیں۔ بے چارہ اسٹین۔

آہستہ بولنا یہاں بھی کام آیا اور میں نے اب جس سے بھی پوچھا اس نے صحیح سمت اشارہ کیا۔

میں مزید بھٹکے بغیر ''پکے ڈلی'' پہنچ چکا تھا۔ اس کی مشہوری بے سبب نہیں تھی۔ زندگی سے بھرپور اور چہل پہل والی جگہ تھی۔ میں کئی گھنٹے گھومتا رہا۔ پھر ہوٹل آکر سو گیا۔ صبح اٹھا تو بیڈ کی قیمت تو وصول ہو چکی۔ لیکن بریک فاسٹ کی قیمت ابھی وصول طلب تھی۔ نہا دھو کر ناشتے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

انگریز ناشتا تگڑا کرتے ہیں۔ ناشتے کے کمرے میں ہر طرح کے لوازمات موجود تھے۔ انڈے، دودھ، ڈبل روٹی، بن، رول پورج، سیریل، مکھن، جیم، جیلی وغیرہ وغیرہ۔ انگریزوں کے مقابلے میں یورپ کے لوگوں کا ناشتا بہت ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ ایک رول اور ایک کپ تلخ کافی اور وہ بھی اکثر بغیر دودھ کے۔ فرانس میں جو رول ناشتے میں کھایا جاتا ہے اس کے کھانے کے لیے خاصا تجربہ چاہیے ورنہ مسوڑھے چھل جاتے ہیں۔ یہ رول اوپر سے بہت سخت ہوتا ہے، محبوبہ کے مزاج کی طرح۔ لیکن اندر سے بہت نرم ہوتا ہے، عاشق کے دل کی طرح۔ یورپ میں کافی بنانے کا انداز بھی جدا ہے۔ ہمارے یہاں ایک تو کافی پینے والے لوگ بہت کم ہیں اور جب ان کو کافی پینا ہوتی یہ انسٹنٹ کافی استعمال کرتے ہیں۔ ایک چمچہ کافی، پیالی میں ڈال کر گرم پانی ملایا اور کافی تیار۔ امریکا اور یورپ میں کافی بنانا محنت طلب کام ہے۔ پہلے کافی کے بیج کو پیس کر اس کا پاؤڈر بنایا جاتا ہے پھر اس کو پرکولیٹر میں پانی ڈال کر تیار کیا جاتا ہے۔ کافی کے بعض شوقین اپنی مخصوص قسم کی کافی بھی بناتے ہیں۔ جس طرح چائے کی پتی کی کئی اقسام ہوتی ہیں اس طرح کافی کے بیج بھی کثیر الاقسام ہیں۔ ہر ایک قسم کے بیج کی اپنی اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ لوگ مختلف اقسام کے بیجوں کو ایک خاص مقدار میں اپنی پسند کے مطابق ملا کر ان کو پیس لیتے ہیں۔ ان کا کافی کا ذاتی برانڈ تیار۔

ناشتے سے فارغ ہو کر برمنگھم کے لیے نکل پڑا۔ وہاں

کی ٹرین کو تلاش کرتے کرتے لندن کے ایوسٹن اسٹیشن پہنچ گیا۔ برمنگھم کے لیے ٹرین لندن کے ایوسٹن سے ہی چلا کرتی تھی۔ گو کہ چند ایک ٹرینیں ''میری لے بون'' سے بھی چلا کرتی تھیں۔ لندن سے برمنگھم کا فاصلہ لگ بھگ ایک سو میل ہے۔ رخ لندن سے شمال مغرب کی طرف۔ لندن سے برمنگھم کے درمیان سفر کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا ہے۔

ٹکٹ کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے معلوم کیا ''برمنگھم کی ٹرین کس وقت جائے گی؟''

اس نے پیچھے مڑ کر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کو ایک نظر دیکھا اور کہا۔ ''آٹھ منٹ بعد۔''

''جلدی سے ایک ٹکٹ دے دیں۔'' میں نے جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''ڈے ریٹرن یا ون وے؟'' اس نے پوچھا۔

برطانیہ کی ٹرینوں میں ایک طرح کے ٹکٹ ملتے ہیں جو ڈے ریٹرن کہلاتے ہیں۔ یہ آنے کے ٹکٹ ہوتے ہیں جو صرف اسی دن استعمال کیے جا سکتے ہیں جس دن ان کا اجرا ہو۔ یہ ٹکٹ دوسرے ٹکٹوں سے نسبتاً کافی سستے ہوتے ہیں۔

''ون وے'' میں نے جواب دیا اور ٹکٹ لینے کے بعد اپنے سوٹ کیس کو تقریباً گھسیٹتا ہوا لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ پلیٹ فارم پر پہنچا ہی تھا کہ گارڈ نے سیٹی بجائی اور نعرہ لگایا ''آل ابورڈ'' میں نے ہانپتے ہوئے اپنے سوٹ کیس کو ڈبے کے اندر دھکیلا اور خود بھی سوار ہو گیا۔ ڈبے کا دروازہ میرے پیچھے بند ہو چکا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ حرکت میں آ چکی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد برمنگھم۔

لندن برطانیہ کا سب سے بڑا شہر مانا جاتا ہے۔ اس میں کوئی دو آرا نہیں ہیں۔ کسی کو اس امر سے اختلاف نہیں ہے۔ لیکن جب بات دوسرے نمبر پر آنے والے بڑے شہر کی ہوتی ہے تو اختلافات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ کسی شہر کی بڑائی متعین کرنے کے لیے مختلف کوائف کے بل بوتے پر اس شہر کو جانچا جاتا ہے۔ ان کوائف میں آبادی، معیشت اور ثقافت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے وقت سے لے کر 2000 تک برمنگھم کو برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن 1996 کے بعد سے لوگوں میں اختلاف ہے کہ برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر برمنگھم ہے یا مانچسٹر۔

1996 میں آئرش ریپبلکن آرمی IRA نے مانچسٹر کے مرکز ''کارپوریشن اسٹریٹ'' پر ایک زبردست بم دھماکا کیا۔ ان کا مقصد مانچسٹر کو معاشی طور پر مفلوج کرنا تھا۔ اس دھماکے میں کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا مگر شہر کا معاشی ڈھانچا تباہ ہو گیا۔ نقصان کا اندازہ سات سو ملین پاؤنڈ کے لگ بھگ ہے۔ اس تباہی کے بعد مانچسٹر میں تعمیرِ نو کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں مانچسٹر کی معیشت پہلے کے مقابلے میں اور بھی بہتر ہو گئی۔ بہت سے لوگوں نے اس بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے کے لیے مانچسٹر کا رخ کیا۔ آج مانچسٹر کی معیشت برمنگھم سے بہتر ہے اور 2011 کی مردم شماری کے مطابق مانچسٹر کی آبادی برمنگھم کی آبادی سے کوئی ایک لاکھ نفوس زیادہ ہے۔ اب ان دونوں شہروں میں جھگڑا ہے کہ برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر کون سا ہے۔ اس جھگڑے میں بعض دوسرے شہر مثلاً لیورپول وغیرہ بھی شامل ہیں۔ لیکن میں برمنگھم اس جھگڑے کو چکانے نہیں آیا تھا۔ صرف تھوڑی بہت پڑھائی کرنے آیا تھا۔ ویسے بھی یہ جھگڑا میرے برطانیہ چھوڑنے کے اڑتیس سال بعد کا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میری ٹرین برمنگھم پہنچ چکی تھی۔

برمنگھم میں تین ریلوے اسٹیشن ہیں۔ نیو اسٹریٹ، مور اسٹریٹ اور اسنو ہل۔

لندن کے میری لے بون اسٹیشن سے چلنے والی گاڑیاں صرف مور اسٹریٹ یا اسنو ہل جاتی ہیں۔ میری ٹرین نیو اسٹریٹ اسٹیشن پر آئی تھی۔ اسٹیشن سے باہر آ کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور یونیورسٹی کا رخ کیا۔

یونیورسٹی کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ 1825 میں برمنگھم میڈیکل کالج قائم ہوا برمنگھم میڈیکل اسکول کے نام سے۔ پھر 1875 میں میسن سائنس کالج قائم ہوا۔ اس کے بعد 1900 میں، بذریعہ شاہی فرمان ان دونوں کو ملا کر یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ نام ''یونیورسٹی آف برمنگھم'' رکھا گیا۔

اس زمانے میں آکسفورڈ اور کیمبرج کا دور تھا۔ ان دونوں یونیورسٹیوں کی عمارتوں کی تعمیر پتھروں کو تراش کر کی گئی تھی۔ اس کے برعکس برمنگھم یونیورسٹی گنبد نما عمارتوں پر مشتمل تھی جو لال اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ لال اینٹوں سے بنائے جانے کی بنا پر یہ ریڈ برک یونیورسٹی کہلائی تاکہ اس کو اور مزید پانچ یونیورسٹیوں کو آکسفورڈ اور کیمبرج سے جدا طور پر پہچانا جا سکے۔ ان یونیورسٹیوں کو وہ درجہ حاصل نہ تھا جو آکسفورڈ اور کیمبرج کو حاصل تھا۔ 1960 کے بعد جب لاتعداد پولی ٹیکنک اور دوسرے ادارے وجود میں آ گئے تو لکھوری اینٹ والی یونیورسٹیوں کو بھی فضیلت حاصل

ہو گئی۔ آج یونیورسٹی آف برمنگھم قومی سطح پر دسویں اور بین الاقوامی سطح پر ساٹھویں نمبر پر مانی جاتی ہے۔ جن مشہور شخصیتوں نے میرے علاوہ...... اس ادارے سے تعلیم حاصل کی ہے ان میں برطانیہ کے سابق وزیرِ اعظم چیمبرلین اور آٹھ نوبل یافتہ اکابر شامل ہیں۔

میرا داخلہ انجینئرنگ پروڈکشن کے ڈپارٹمنٹ میں ہوا تھا۔ میرے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یونیورسٹی نے نہ چاہا کہ اس ڈپارٹمنٹ میں تعلیم حاصل کرنے کا اعزاز مزید طلبہ کو حاصل ہو۔ اس عزت افزائی کے نظریے کے تحت میرے ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس ڈپارٹمنٹ کو مکینیکل انجینئرنگ کے ساتھ ضم کر دیا مگر میں اس کا فائدہ اٹھا چکا تھا۔

یہ تو عام اور غیر اہم معلومات تھیں۔ اہم معلومات یہ ہیں کہ یونیورسٹی کی حدود میں پہنچ کر میں نے ٹیکسی سے اپنا سوٹ کیس اتارا، ٹیکسی والے کو کرایہ اور شکریہ ادا کیا اور سوٹ کیس کو ڈھوتے ہوئے ایڈمشن آفس میں داخل ہوا۔ ایڈمشن آفس میں سوٹ کیس ایک کونے میں رکھ کر میں کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی خاتون نے مسکراہٹ بکھیری ''میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

''جی میں یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''کس ڈپارٹمنٹ میں؟''

''انجینئرنگ پروڈکشن میں۔''

انہوں نے اپنی دراز کھول کر ایک ٹائپ شدہ لسٹ نکالی۔ ''آپ کا نام۔''

میں نے اپنا پورا نام بتا دیا۔ ''اس میں سے آپ کا سر نیم کون سا ہے۔''

ہمارے یہاں جب کوئی لسٹ بنتی ہے یا ٹیلی فون ڈائریکٹری چھپتی ہے تو وہ ہمارے پہلے نام سے شروع کی جاتی ہے۔ مغرب کا حساب دوسرا ہے۔ وہ لوگ پہلے ''سر نیم'' لکھتے ہیں اس کے بعد پہلا نام۔ ''رزاقی'' میں نے بتایا۔ یہاں میں پھنس گیا۔ لکھنو سے تعلق رکھنے کی وجہ سے میرا ''ق'' حلق کی گہرائیوں سے ادا ہوا تھا۔ اور پھر سونے پہ سہاگا میرا تلفظ۔ وہ کافی دیر تک میرا نام سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ تھک ہار کر میں نے اپنا نام کاغذ پر لکھ کر ان کو تھمایا تو معاملہ آگے بڑھا۔ انہوں نے مجھے خوشخبری سنائی کہ میرا نام لسٹ میں موجود ہے اور یہ کہ میں فیس کے پیسے جمع کروا دوں۔ یہاں ایک دفعہ پھر میرے ساتھ زیادتی کی گئی۔ لیکن یہ زیادتی یونیورسٹی نے نہیں بلکہ حکومتِ پاکستان نے کی تھی۔

فیس کا سلسلہ یہ تھا کہ برطانوی اور دولت مشترکہ کے ملکوں کے لیے سال بھر کی فیس صرف پچاس پاؤنڈ تھی۔ اس کے برخلاف باقی تمام ممالک کے طلبہ کو فیس کے ضمن میں ڈھائی سو پاؤنڈ دینے پڑتے تھے۔ ڈھائی سو پاؤنڈ اس زمانے میں خاصی بڑی رقم گردانی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب چند مہینے بعد میں نے اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں چار پانچ سال پرانی آسٹن منی گاڑی خریدی تو اس کی قیمت صرف دو سو پاؤنڈ تھی۔ پاکستان 1972ء میں عارضی طور پر دولت مشترکہ سے علیحدہ ہوا تھا جس کی قیمت مجھے ادا کرنی پڑی۔ اب حکومت پاکستان پر واجب ہے کہ وہ میرے دو سو پاؤنڈ کا نقصان پورا کرنے کے لیے مجھے چار سال پرانی آسٹن منی دان میں دے۔ آسٹن منی آج کل پینتیس ہزار ڈالر کی بک رہی ہے۔

یونیورسٹی میں داخلے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد خاتون نے مجھے ہاؤسنگ جانے کا حکم دیا تاکہ میرے رہنے کا بندوبست ہو سکے۔

ہاؤسنگ کے شعبہ میں پہنچا تو وہاں پر موجود صاحبزادی نے کھڑے ہو کر ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ میرا اور میرے سوٹ کیس کا استقبال کیا۔ مگر مسکراہٹ کی اس دل آویزی کے ساتھ ساتھ اس میں سفاکی بھی چھپی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا کہ فی الحال یونیورسٹی کے کسی بھی ہوسٹل میں میرے لیے جگہ خالی نہیں ہے۔ پھر میرے ہاتھ میں ایک لسٹ تھماتے ہوئے گویا ہوئیں۔

یہ یونیورسٹی کے نزدیک ان جگہوں کی لسٹ ہے جہاں آپ کو بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کی سہولت مل سکتی ہے۔ آپ چند دن ان میں سے کسی جگہ گزاریں۔ جیسے ہی کسی ہوسٹل میں جگہ کا بندوبست ہوگا ہم آپ کو مطلع کر دیں گے۔''

رخصت کرنے سے پہلے انہوں نے مجھے ایک اور دل آویز مسکراہٹ سے نوازا لیکن ان کی مسکراہٹ کی دل آویزی میرے دکھ کا مداوا نہ تھی۔ مجھے ایک دفعہ اور اپنے سوٹ کیس کو ڈھونا پڑا۔ میں نے باہر آ کر ٹیکسی روکی اور بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ہوٹل کے لیے روانہ ہو گیا۔

یہ عام قسم کا بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ہوٹل نہیں تھا۔ ایک ذاتی رہائش تھی جس کے مکینوں نے فالتو آمدنی کی خاطر اس

کے دو کمرے ہوٹل کے لیے وقف کردیے تھے۔ کرایہ دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دوبارہ آنکھیں مل کر دیکھا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ کرایہ وہی کا وہی رہا صرف ڈیڑھ پاؤنڈ۔ ناشتا سمیت۔ میں نے فوراً ہامی بھرلی۔ خاتونِ خانہ مجھے کمرے تک چھوڑنے آئیں۔ دیوار پر لگے ہوئے ایک میٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

''جب آپ کو گرم ہوا کی ضرورت محسوس ہو تو اس میٹر میں سکے ڈال دیں۔ گرم ہوا کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ جتنی دیر سکہ چلتا رہے گا گرم ہوا بھی چلتی رہے گی۔ ادھر سکے کی مدت ختم ادھر گرم ہوا کا سلسلہ بند۔'' وہ دروازے سے باہر جانے لگیں پھر رک کر کہنے لگیں۔ ''پانچ پینس کا سکہ سونے سے پہلے ڈال دینا۔ پانچ پینس صبح پانچ چھ بجے ڈال دینا۔ کام چل جائے گا۔''

ستمبر کا مہینا تھا مگر برمنگھم میں سردی شروع ہوچکی تھی۔ داخلہ اور عارضی رہائش کا بندوبست ہوچکا تھا۔ اب صرف اپنے ڈپارٹمنٹ جاکر کورس اور پڑھائی کی تفصیل معلوم کرنا باقی تھا۔ یہ کام کل کیا جائے گا۔ فی الحال باہر چل کر شہر گھوما جائے۔ رات کا کھانا کھایا جائے۔ شہر سے واپس آکر میں نے میٹر میں پانچ پینس کا سکہ ڈالا اور لمبی تانی۔

خواب میں، میں ٹورنٹو واپس پہنچ چکا تھا۔ دسمبر کا مہینا تھا، سخت برفباری ہورہی تھی۔ میں باہر سڑک پر اس برفباری میں گھر چکا تھا۔ سردی کی شدت سے میرا سارا بدن کپکپا رہا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میٹر میں ڈالے ہوئے پانچ پینس کی مدت کب کی ختم ہوچکی تھی۔ گرم ہوا کا سلسلہ کب کا منقطع ہوچکا تھا۔ کمرے میں ٹھنڈک کا راج تھا۔ میرا سارا بدن کپکپا رہا تھا۔ میں ہمت کرکے بستر سے باہر نکلا۔ میٹر میں پانچ پینس کا سکہ ڈالا۔ گرم ہوا کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوچکا تھا۔ میں واپس بستر میں دبک گیا۔ صبح ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے ڈپارٹمنٹ جانے کے لیے چل پڑا۔

برطانیہ کا تعلیمی نظام امریکا کے تعلیمی نظام سے قدرے مختلف ہے۔ ہمارے اپنے تعلیمی نظام کی بنیاد بھی برطانوی تعلیمی نظام پر مبنی ہے۔

برمنگھم میں امریکا کی طرح میجر اور مائنر مضامین کا تخیل نہیں ہے۔ یہاں پر مجھے ذاتی طور پر کسی کورس کا انتخاب نہیں کرنا تھا (جس طرح میں نے آیوا کی یونیورسٹی میں کیا تھا اور اس انتخاب کے سلسلے میں اپنے ایڈوائزر کو فلک شگاف قہقہہ لگانے اور آنسو پونچھنے کا دلچسپ موقع فراہم کیا تھا) برمنگھم میں M.S C کے کورس کے سارے مضامین یونیورسٹی خود طے کرتی تھی سوائے چند ایک کے کہ پانچ ایسے اختیاری مضامین تھے جن میں سے طالبعلم کسی تین کا انتخاب کرسکتا تھا۔ آج جمعہ کا دن تھا پیر کے دن سے باقاعدہ کلاسیں شروع ہوجائیں گی۔

آج کلاس کا پہلا دن تھا۔ ہم جماعتوں کا اور پڑھانے والوں کا تعارف ہوا۔ ترکی، ہندوستان، برطانیہ اور امریکا سمیت سات ملکوں کے کل اٹھارہ طلبا تھے۔ پاکستانی صرف میری واحد ذات تھی۔

کورس کے انچارج پروفیسر ہولیئر تھے۔ ایک امریکی مہمان پروفیسر بھی تھے جو ہر طرف سے "D" سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کا نام تھا ڈی، ڈی، ڈیمنگ۔ طلبا نے ان کو پیار سے ''ڈانلڈ ڈک ڈیمنگز'' پکارنا شروع کردیا تھا۔

منگل کا دن تھا۔ میں کلاس روم سے باہر نکلا تو ڈپارٹمنٹ کی سیکریٹری سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ''مسٹر رزاقی!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''جی فرمایئے!'' میں نے جواب دیا۔

''میرے پاس ہاؤسنگ کی سیکریٹری کا فون آیا تھا۔ آپ اس سے جاکر مل لیں۔''

''یس میم!'' میں ہاؤسنگ کے دفتر پہنچ گیا۔ اسی دل آویز مسکراہٹ نے میرا استقبال کیا۔ یاخدایا! کیا یہ لڑکی چوبیس گھنٹے صرف مسکراتی رہتی ہے! اگر یہ پاکستان میں ہوتی تو ہر ٹوتھ پیسٹ بنانے والی کمپنی کے اشتہاروں کی جان ہوتی۔ موتی جیسے دانت۔ اس نے مجھے خوشخبری سنائی ''آپ کے لیے گرفن کلوز میں رہائش کا بندوبست ہوگیا۔ آپ کرایہ جمع کرواکر اپنے کمرے کی چابی لے سکتے ہیں۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ روز رات کو اور اس سے بڑھ کر فجر کے وقت گرم ہوا کے لیے پانچ پینس ڈالنے سے نجات مل جائے گی۔

گرفن کلوز اور بذات خود برمنگھم یونیورسٹی بھی ایجبسٹن کے محلّے میں واقع ہیں۔ یہ وہی محلّہ ہے جہاں ایجبسٹن کا مشہور اسٹیڈیم ہے جہاں بیک وقت پچیس ہزار شائقین کرکٹ کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن گرفن کلوز یونیورسٹی کی حدود سے باہر چند کلومیٹر پر واقع ہے۔ وہاں جانے کے لیے بس استعمال کرنا پڑے گی۔ میں نے خاتونِ خانہ کا شکریہ ادا کیا۔ ''بیڈ اینڈ بریک فاسٹ'' کو خیرباد کہا اور اپنے ''چہیتے'' سوٹ کیس سمیت گرفن کلوز میں

دھلیلا کے قلعے کو فتح کرنے کے بعد انتظامات مکمل کرکے محمد بن قاسم 94ھ میں برہمن آباد پہنچا تو جے سنگھ مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ محمد بن قاسم نے جنگ کرنے سے پہلے اہل شہر کو اطلاع بھیجی کہ خراج دے کر اطاعت قبول کرلو بصورتِ دیگر جنگ کے لیے تیار ہوجاؤ۔ جب محمد بن قاسم کو کوئی جواب نہ ملا تو اس نے حملہ کردیا۔ جے سنگھ کی فوج قلعہ بند ہوکر لڑ رہی تھی۔ اس لیے کوئی فیصلہ کن معرکہ نہ ہوسکا۔ اسی اثنا میں جے سنگھ جو شہر سے باہر تھا باقاعدہ کمک کے ساتھ آگیا لیکن مسلم سپاہ نے اسے برہمن آباد میں داخل نہ ہونے دیا۔ چنانچہ اس نے وہیں ٹھہر کر مسلمان فوج کی رسد کے راستے روک لیے اور ہر طرف سے ناکہ بندی کردی۔ اس طرح مسلمانوں کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر راجا موکا کے مشورے سے محمد بن قاسم نے ایک فوج جے سنگھ کے مقابلے کے لیے بھی روانہ کردی۔ جے سنگھ کے پاس قوت کم تھی اس لیے اس نے راستہ چھوڑ دیا اور اپنے بھائی گوپی کو اپنا قائم مقام کرکے کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی فوج اور شہر کے لوگ کچھ عرصے تک تو محمد بن قاسم کا مقابلہ کرتے رہے لیکن جب محاصرے نے بہت طول پکڑا تو وہ گھبرا گئے اور چپکے چپکے محمد بن قاسم سے جا ملے اور طے پایا کہ محمد بن قاسم کی طرف سے جب ان پر حملہ ہوگا وہ معمولی سی مزاحمت کریں گے اور اس کے بعد شہر کا دروازہ کھول دیں گے اور یہی ہوا۔

اقتباس: فاتح ہند از رؤف سندھیانی

وارد ہوا۔

یونیورسٹی کی گرفن کلوز کی رہائش حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس میں رہائش کا سلسلہ اس سال پہلی دفعہ شروع ہورہا تھا۔ جگہ کافی کھلی کھلی تھی۔ بیسیوں تین منزلہ عمارتیں تھیں۔ ہر منزل پر تین فلیٹ، ہر فلیٹ میں پانچ کمرے، ایک غسلخانہ اور ایک کھانے کا بڑا کمرا جس میں کھانا پکانے کا انتظام بھی موجود تھا۔

تعمیر ہونے کی وجہ سے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس میں مرکزی گرمائش (سینٹرل ہیٹنگ) کا بندوبست تھا۔ گرم ہوا کے لیے پانچ پینس کے سکے ڈالنے سے نجات ملی۔

ہر فلیٹ میں پانچ طالب علم ہوتے تھے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ تمام پانچ کے پانچ طالبعلم یا تو انڈر گریجویٹ طالبعلم ہوں یا تمام گریجویٹ طالبعلم۔

میرے فلیٹ میں میرے ساتھ ایک اسکاچ، ایک انگلش، ایک آئرش اور ایک ایرانی طالبعلم پیوان خسرو شاہی رہائش پذیر تھے۔ ہم برطانیہ کے تمام باشندوں کو انگریز کہہ کر بلاتے ہیں حالانکہ جغرافیائی اعتبار سے برطانیہ کے چار حصے ہیں۔ انگلینڈ، ویلز، اسکاٹ لینڈ اور شمالی آئرلینڈ۔ ان چاروں جغرافیائی اکائیوں میں رہنے والوں کے آپس کے تعلقات اتنے ہی خوشگوار ہیں جتنے کہ ہمارے اپنے چاروں صوبوں میں رہنے والوں کے ہیں۔ ایک زمانے میں اسکاٹ لینڈ کا اپنا پاؤنڈ کا سکہ ہوتا تھا۔ چند سال قبل تک یہ اپنے نوٹ بھی الگ چھاپا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے اب بھی چھاپتے ہوں۔ چھاپتے ہوں یا نہ چھاپتے ہوں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے غرض تھی تو صرف اپنی پڑھائی سے تھی جو کہ معمول کے مطابق شروع ہوچکی تھی۔ خدا کرے جلد ختم ہو۔

میرے کورس میں بے شمار مضامین تھے۔ پروڈکشن انجینئرنگ شماریات، فائنانس، بزنس لاء، صنعتی نفسیات، پلانٹ لے آؤٹ، ارگونومکس وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ یونیورسٹی دو سال کا کورس ایک سال میں کروا رہی تھی۔ دن رات پڑھائی میں ہی نکل جاتے۔ صبح آٹھ بجے سے شام تک کلاسیں۔ پھر لائبریری، پھر رات کو گھر واپس آکر پڑھائی۔ تین مہینے میں ہی دماغ کا کچومر بن گیا۔ اس کو آرام کی ضرورت تھی۔ کرسمس کا ہنگامہ شروع ہوچکا تھا۔

کرسمس اب مغربی دنیا میں ایک مذہبی تہوار نہیں رہا ہے۔ اب اس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ناتا صرف واجبی سا ہی رہ گیا ہے۔ کرسمس کا تہوار اب ایک تجارتی موقع پرستی میں تبدیل ہوچکا ہے۔ جس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ لیکن میرا مقصد اس بحث کا آغاز کرنا نہیں ہے۔ میں صرف یہ دہرانا چاہتا ہوں کہ کرسمس کے تہوار کی چھٹیوں نے مجھے اپنے دماغ کو آرام دینے کا موقع فراہم کردیا۔

کرسمس کے موقع پر ہر طرح کے تجارتی پروموشن کی

بھرمار ہوتی ہے۔ ہر طرح کے سیل لگتے ہیں۔ ان ہی پروموشن میں پیکیج ٹور بھی شامل ہوتے ہیں۔ خاص طور سے تعلیمی اداروں میں طلباء کے لیے۔ ہماری یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ گلڈ میں بھی طرح طرح کے پیکیج ٹور کے اشتہار لگے ہوئے تھے۔ پیکیج کے علاوہ اسٹوڈنٹ ڈسکاؤنٹ پر ٹکٹ بھی خریدے جاسکتے تھے۔ ہر طرح کے پیکیج دیکھنے کے بعد میں نے اسپین جانے کا فیصلہ کیا اور میڈرڈ کے لیے اسٹوڈنٹ ڈسکاؤنٹ والا ٹکٹ خرید لیا۔ ان ٹکٹوں میں عمر کی بھی قید ہوتی ہے۔ اس سال میرے لیے اس ٹکٹ سے فائدہ اٹھانے کا آخری موقع تھا۔ اگلے سال میں عمر کی اس حد کو پار کر چکا ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میرے رب نے اپنی رحمت سے میرے لیے ایسا بندوبست فرما دیا ہے کہ چند سال بعد میں دنیا کے کروڑ لاکھوں میل کا سرکاری اور ذاتی سفر بالکل مفت یا صرف دس فیصد کرایہ ادا کرکے کروں گا۔ کلام پاک کی یہ بات بھی حق ثابت ہو چکی تھی کہ ”جو تم نہیں جانتے وہ جانتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے۔“

میڈرڈ ائر پورٹ پر کسٹم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں ہوٹل بک کرنے والے دفتر گیا تو پتا چلا کہ وہ لوگ صرف بڑے ہوٹلوں کی بکنگ کرتے ہیں جن کا خرچہ ایک طالبعلم کی پہنچ سے باہر ہے۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے آدمی نے مشورہ دیا کہ میں مرکز شہر چلا جاؤں وہاں میرے مطلب کے کئی ہوٹل ہیں۔ کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی کیونکہ کرسمس کا رش ہے۔ مرکز شہر پہنچ کر تین چار جگہ جھانکنے کے بعد ایک مناسب کمرا مل گیا۔ کھانے کا بندوبست بھی تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں شہر گھومنے نکل گیا۔ واپس آکر سو گیا کہ رات میں اسپین کا مشہور زمانہ فلیمنسکو ڈانس دیکھنے جانا تھا۔ فلیمنسکو ڈانس میں چار عناصر شامل ہوتے ہیں۔ گانا، گٹار، رقص اور تالیاں۔ اس کا اجرا اندلس کے علاقے سے ہوا تھا جو اسپین کے جنوب میں واقع ہے۔ فلیمنسکو رومانی خانہ بدوشوں کے طرز رقص اور موسیقی سے بھی متاثر ہے۔

رقص گاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی جس میں تقریباً سب کے سب سیاح تھے۔ زیادہ تر امریکی۔ اسٹیج کا پردہ اٹھا تو ایک مرد اور ایک عورت اٹھارہ کے ہندسے کی شکل میں کھڑے دکھائی دیے۔ مرد نے پینٹ شرٹ کے اوپر سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر کالے رنگ کی فلیٹ ہیٹ اور پیروں میں کالے ہی رنگ کے نہایت عمدہ قسم کے چمڑے کے چمکتے ہوئے جوتے جن کے تلوے اور ایڑیاں خاص طریقے سے بنائی جاتی ہیں کہ ان سے ٹیپ ڈانس کے صوتی اثرات پیدا کیے جاسکیں۔ وہ ڈانسر ہاتھ سینے پر باندھے سینہ تانے، منہ ایک طرف کیے اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رقاصہ نے فلیمنسکو رقص کا مخصوص لباس زیب تن کر رکھا تھا جس کا گھیر نیچے آتے آتے اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ بالکل آٹھ کا ہندسہ دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے، چہرے پر انتہائی کرب ناک قسم کا تاثر......ایکسپریشن۔

اس رقص کو الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے۔ صرف اتنا بتانا ضروری ہے کہ خاص خاص موقعوں پر رقاص اپنے جوتوں کی ایڑیوں اور تلووں کو ایک خاص انداز سے فرش پر بجا کر ٹیپ ڈانس کا وہ سماں باندھتا ہے کہ آدمی مسحور ہو جائے۔ جب یہ ٹیپ ڈانس اپنے عروج پر پہنچتا تو لوگوں کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ زوردار تالیاں بجا کر رقاص اور رقاصہ کو خراج تحسین نہ پیش کریں۔ رقاصہ بھی ٹیپ ڈانس میں شامل ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ہاتھوں میں بندھے ہوئے سیپیوں کی شکل کے باجوں سے ٹیپ کی موسیقی کا اثر پیدا کرتی۔ یہ سلسلہ آدھی رات کے بعد تک جاری رہا۔

اندلس کا فلیمنسکو ڈانس تو دیکھ لیا تھا لیکن اندلس کی سرزمین دیکھنا ہنوز باقی تھا۔ اسپین آنے کے لیے کسی پیکیج ٹور کے بجائے صرف ڈسکاؤنٹ ٹکٹ لینے کا محرک بھی اندلس کی سرزمین کا دیدار ہی تھا لیکن جتنے پیکیج ٹور تھے ان میں سے کسی ایک میں بھی اندلس کا علاقہ شامل نہیں تھا۔ میڈرڈ سے اندلس کے لیے مجھے ٹرین سے سفر کرنا ہوگا۔

اندلس کے تین بڑے شہر گرینیڈا (غرناطہ) کورڈوبا (قرطبہ) اور سیویل ایک تکون کی شکل میں نقشے پر ابھرتے ہیں۔ میڈرڈ کے تقریباً سیدھ میں جنوب کے رخ غرناطہ مغرب میں سیویل واقع ہیں۔

قرطبہ میں جتنی بھی قابل دید جگہیں ہیں ان میں شاید سب سے زیادہ مشہور اور دیدنی مسجد قرطبہ ہے۔ یہ عمارت 600ء میں بطور سینٹ ونسنٹ چرچ بنائی گئی تھی۔ پھر مسلمانوں کے دور حکومت میں اس جگہ کو چرچ اور مسجد کے لیے آدھا آدھا تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے بعد 784ء میں خلیفہ عبدالرحمٰن اول نے چرچ والا حصہ خرید کر اس پوری جگہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ مسجد کا کام تقریباً دو سو سال چلتا رہا اور 987ء میں مکمل قرار پایا۔ 1236ء میں مسلمانوں کی شکست کے بعد یہ جگہ واپس عیسائیوں کے پاس چلی گئی۔

قرطبہ کے بعد غرناطہ کا قصد تھا۔ غرناطہ کا الحمرا ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے ایک پورا باب درکار ہوگا۔ غرناطہ سے سیویل پھر وہاں سے واپس میڈرڈ۔ میڈرڈ جانے کے لیے سیویل سے جو ٹرین چلتی ہے وہ براستہ قرطبہ جاتی ہے۔ ان دنوں اس سفر کے لیے چھ گھنٹے لگتے تھے لیکن اب اس لائین پر تیز رفتار ٹرین AVE چلنے لگی ہے جس کی وجہ سے اب یہ فاصلہ ڈھائی گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ اگر اسپین کی حکومت اپنی ریل کے نظام ہمارے وزیر ریلوے کے حوالے کر دے تو وہ یقیناً وقت کی بچت کے ناسور سے اسپین والوں کو نجات دلوا دیں گے۔

اسپین کا سفر بغیر بل فائیٹ دیکھے نامکمل تصور کیا جاتا ہے۔ میں اپنے سفر کو نامکمل نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میڈرڈ پہنچ کر میں نے بل فائیٹ کا نظارہ کیا اور اگلے روز واپس لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔

اسپین سے واپس آکر روز کا پرانا معمول شروع ہو چکا تھا۔ ہر روز صبح سویرے اٹھ کر تیار ہونا۔ بس پکڑنا اور یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو جانا لیکن ایک صبح جب ہم لوگوں نے یونیورسٹی جانے کے لیے اپنے فلیٹ کا بیرونی دروازہ کھولا تو دروازہ پار کرنا ناممکن معلوم ہوا۔ دروازے کے سامنے کوئی دو ڈھائی سو دودھ کی خالی بوتلیں سیڑھیوں تک رکھی ہوئی تھیں۔ ان بوتلوں کو ہٹا کر راستہ بنانے میں پندرہ بیس منٹ نکل گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

چند دن بعد شام کے وقت فلیٹ کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے پانچ انگریز لڑکیوں کو کھڑے ہوئے پایا۔ ان میں سے ایک کے علاوہ تین قبول صورت تھیں اور پانچویں کا شمار حسینوں میں کیا جاسکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا ان سب نے باجماعت باآواز بلند اعلان کیا ”ہم معافی مانگنے آئے ہیں۔“

زندگی میں پہلا اتفاق تھا کہ پانچ خوبرو انگریز لڑکیاں مجھ سے معافی مانگ رہی تھیں۔ میں نے خطا معلوم کیے بغیر ہی ان سب کو دل و جان سے کئی کئی مرتبہ معاف کر دیا۔ میرے پیچھے میرا آرٹش ساتھی اہین اور اسکاٹش ساتھی بھی جیری آ گئے تھے۔ وہ میری طرح رقیق القلب واقع نہ تھے۔ انہوں نے ان لڑکیوں سے معافی کی وجہ جاننی چاہی۔ لڑکیوں نے جواب میں اندر آنے کی اجازت چاہی۔ یہ ان کی دوسری مہربانی تھی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم اپنے باورچی خانہ نما کھانے کے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد ان میں سے ایک لڑکی نے انکشاف کیا۔ ”آپ لوگوں کے فلیٹ کے دروازے کے آگے دودھ کی خالی بوتلیں ہم لوگوں نے رکھی تھیں۔“

انگلستان میں ایک رواج تھا، شاید اب بھی ہو کہ وہاں پر دودھ بیچنے والے دودھ کی ایک لٹر کی سر بند بوتلیں گھر گھر پہنچاتے تھے۔ یہ سہولت گرفن کلوز میں بھی موجود تھی۔ ہر فلیٹ کے لوگوں کو جتنی دودھ کی بوتلیں چاہئے ہوتی تھیں ہر صبح دودھ والا انہیں گاڑی میں لاد کر مقررہ بوتلیں فلیٹ کے دروازہ کے آگے رکھ جاتا تھا۔ استعمال کے بعد خالی بوتلیں رات کے وقت دروازے کے باہر رکھ دی جاتی تھیں جن کو وہ دودھ والا واپس لے جاتا تھا۔

اعتراف جرم کے بعد ان لڑکیوں نے اپنے اس کارنامے کا محرک بیان کیا ”دراصل ہمارے حصے کی جو دودھ کی بوتلیں تھیں ان میں چار دن پہلے کسی نے نیلا رنگ گھول دیا تھا۔ ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ آپ لوگوں کی شرارت ہے۔ مگر یہ حرکت سامنے والے فلیٹ کے لڑکوں نے کی تھی۔ ہم اپنی حرکت پر شرمندہ ہیں۔“

شرمندگی کی کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ میرا ارادہ ہوا کہ میں ان لڑکوں کے فلیٹ میں جا کر ان کا شکریہ ادا کردوں کہ ان کی بدولت یہ پانچوں لڑکیاں ہر فلیٹ کے سامنے سے دودھ کی خالی بوتلیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی رہیں اور ان خالی بوتلوں کو ہمارے فلیٹ کے دروازے کے آگے جماتی رہیں اور پھر اس کمر توڑ محنت کے بعد ہم لوگوں کو اپنی معافی سے بھی مستفیض کیا۔

خدا خدا کرکے جون کا مہینا آیا۔ امتحان ہو گئے۔ دن رات کی تھکا دینے والی پڑھائی سے نجات ملی۔ اب صرف پروجیکٹ پر کام کرنا باقی تھا۔ اس کی رپورٹ اگلے تین مہینے میں مکمل کرکے داخل کرنی تھی۔

برمنگھم کے آس پاس تقریباً پچیس میل کے علاقے میں جتنی صنعتیں ہیں، شاید برطانیہ کے کسی دوسرے حصے میں نہ ہوں۔ مغربی دنیا میں صنعت اور یونیورسٹیاں ایک دوسرے کی بہت معاونت کرتی ہیں۔ صنعت پیسا فراہم کرتی ہے جسے استعمال کرکے یونیورسٹی ریسرچ اور عملی پروجیکٹ پر کام کرتی ہے اور پھر اسے صنعت اپنے استعمال میں لاکر منافع کماتی ہے۔ برمنگھم کے آس پاس کی صنعتیں برمنگھم

یونیورسٹی کی ریسرچ اور پروجیکٹ سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں اور یونیورسٹی ان کے پیسے سے۔

پروڈکشن انجینئرنگ کے شعبے کا زور عملی جہتوں میں تھا۔ اس لیے برمنگھم یونیورسٹی کے اس شعبہ کا زیادہ تر کام ریسرچ کی بجائے پروجیکٹ کی شکل میں ہوتا تھا۔ ہر سال کئی پروجیکٹ دیے جاتے تھے اور طالب علموں کو موقع ملتا تھا کہ وہ اپنی پسند کے پروجیکٹ پر کام کریں۔ میں نے جو پروجیکٹ چنا تھا اس کے انچارج ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ڈاکٹر جے۔ جی۔ کوکس تھے۔ اس پروجیکٹ میں پروڈکشن انجینئرنگ اور کوسٹنگ کا سنگم تھا۔ اس پروجیکٹ سے غیر متعلق ایک واقعے کا ذکر ضروری ہے۔

جہاز رانی کی صنعت سے متعلق لندن سے ایک رسالہ نکلتا ہے جس کا نام ہے فلائیٹ انٹرنیشنل جو اس صنعت سے تعلق رکھنے والوں میں بہت مقبول ہے اور پیار سے صرف ”فلائیٹ“ پکارا جاتا ہے۔ چور چوری سے جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں۔ گو کہ پچھلے تین سال سے میرا جہاز رانی سے کوئی براہ راست واسطہ نہیں تھا لیکن میں ”فلائیٹ“ کا مطالعہ پابندی سے کرتا تھا کہ اس میں صنعت سے متعلق ہر طرح کی معلومات ہوتی تھیں۔

”فلائیٹ“ کی ایک اور خصوصیت تھی۔ زیادہ تر لوگ اس کا مطالعہ اس کے پچھلے تین چار صفحوں سے شروع کرتے تھے۔ اس طرز مطالعہ کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ یہ کہ ان صفحوں پر نوکریوں کے اشتہار ہوا کرتے تھے۔ مجھے مطالعہ کے اس طریق کار سے پورا پورا اتفاق تھا۔

میں نے فلائیٹ کا تازہ شمارہ لے کر اس کو حسب معمول آخری صفحہ سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک ہی صفحہ کھولا تھا کہ مطمع نظر ..... سامنے تھا۔ زمبیا کی ایرلائن کو ایسے ایویانکس انجینئر کی فوری ضرورت تھی جس کے پاس بوئنگ B-707 کا تجربہ ہو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اسی دن درخواست لکھ کر رسالے میں دیے گئے پتے پر روانہ کردی۔ تین دن کے بعد جواب بھی موصول ہوگیا۔ انٹرویو کے لیے لندن جانا تھا۔

دس ماہ قبل جب میں نے پڑھائی شروع کرنے کی غرض سے لندن سے برمنگھم کا سفر کیا تھا تو میں نے ریل گاڑی کو ترجیح دی تھی۔ لیکن آج انٹرویو کے لیے برمنگھم سے لندن جانے کے لیے ریل گاڑی سے سفر کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہ میری شان کے خلاف تھا۔ اس لیے کہ اب میں ایک استعمال شدہ آسٹن منی کا مالک بن چکا تھا۔ یہ گاڑی بھی ایک طرح سے میرے پروجیکٹ کے طفیل میرے ہاتھ لگی تھی۔

میرا پروجیکٹ برمنگھم سے تقریباً تیس میل آگے ایک کمپنی ولکن اینڈ مچل کے ساتھ تھا جو بھاری قسم کے مکینیکل اور ہائیڈرالک پریس بناتے تھے جن پر چھوٹے بڑے ہر قسم کے پرزے ڈھالے جاسکتے ہیں۔

مجھے وہاں ہفتے میں صرف تین یا چار دن جانا پڑتا تھا باقی دنوں میں یونیورسٹی میں کام مکمل کیا کرتا تھا۔ آنے جانے کا مسئلہ تھا۔ پہلے مجھے گرفن کلوز سے بس کے ذریعہ مرکز شہر جانا پڑتا پھر وہاں سے دوسری بس کے ذریعے ولکن اینڈ مچل کی فیکٹری۔ میرا زیادہ تر کام ان کے پروڈکشن منیجر کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ جب اس کو میرے آنے جانے کے مسئلے کا پتا چلا تو ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں ٹرانسپورٹ کے مسئلہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں مگر تم کو پہلے اپنی مدد آپ کرنا پڑے گا۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے تفصیل معلوم کرنا چاہا۔

”اگر تم اپنی گاڑی کا بندوبست کرسکو تو میں تمہیں ہر مہینے بیس پاؤنڈ پیٹرول منی کے طور پر دے سکتا ہوں۔“

ان دنوں بیس پاؤنڈ خاصی معقول رقم ہوا کرتی تھی۔ میں نے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر ایک چار پانچ سال پرانی آسٹن منی مبلغ دوسو پاؤنڈ سکہ رائج الوقت حکومت برطانیہ میں خریدلیا۔ رنگ سرخ، چھت کالی، ہر طرح کی سڑک پر دوڑنے والی۔ میں نے اس کو لندن کے رخ پر موٹروے M-1 پر دوڑادیا۔ کینیڈا چھوڑنے کے بعد آج میں پہلی دفعہ موٹروے پر گاڑی چلا رہا تھا۔

برطانیہ کی موٹروے M-1 کینیڈا کی ہائی وے 401 کے مقابلے کی تھی مگر میری آسٹن منی امریکا کینیڈا کی گاڑیوں کی لگژری کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی گوکہ آسٹن منی چلانے کا اپنا مزہ تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد میں لندن میں تھا۔

انٹرویو کے لیے بیس پچیس امیدوار تھے۔ میرا نمبر بارھواں یا تیرھواں تھا۔ انٹرویو لینے والوں میں ایک زمبیا کے باشندے تھے جن کا تعلق شعبہ موظفین (امپلائمنٹ) سے تھا۔ دوسرے صاحب فرانسیسی تھے، ان کا تعلق انجینئرنگ کے شعبہ سے تھا۔ انہوں نے مجھ سے جلد تین سوال B-707 کی ایویانکس کے بارے میں پوچھے

پھر اپنے زمبین ساتھی سے کچھ کھسر پسر کرنے لگے۔ کھسر پسر اختتام کو پہنچی تو مجھ سے کہنے لگے۔ ”یہ نوکری تمہاری ہوئی۔ تفصیل تم کو میرے ساتھی بتائیں گے۔“ ساتھی نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے تفصیل سے آگاہ کیا۔ تنخواہ ساڑھے چار ہزار پاؤنڈ سالانہ۔ ساتھ میں رہنے کے لیے گھر اور نوکر۔ کار الاؤنس اور اگر کارکردگی ٹھیک رہی تو چھ مہینے بعد تنخواہ میں اضافہ۔ مگر شرط یہ ہے کہ مجھے تین ہفتے کے اندر اندر زمبیا پہنچنا ہوگا۔ مجھے ہاں یا نہ کا جواب تین دن کے اندر اندر دینا ہوگا۔

یہ میرے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف تین سال بعد جہاز کی طرف لوٹنے کا موقع ہاتھ آیا تھا جس کے ساتھ ساتھ ایک لالچ اور بھی تھی، افریقا میں وقت گزارنے کا موقع۔ اب تک میں ایشیا، یورپ اور امریکا کے براعظموں میں رہ چکا تھا۔ گھوم چکا تھا۔ نوکری کرچکا تھا۔ لیکن براعظم افریقا ہنوز سربستہ تھا۔ ڈی ڈارک کونٹینینٹ افریقا میں رہنے کی کشش مقناطیس بن کر مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ دوسری طرف دو مہینے بعد میں اپنا پروجیکٹ مکمل کرکے M.Sc کی ڈگری حاصل کرسکتا تھا۔ وہی MSC کی ڈگری جس کے لیے میں نے پی آئی اے کو خیرباد کہا تھا اور ترک وطن کرکے کینیڈا میں مکینک کی نوکری کی تھی۔ مجھے تین دن میں طے کرنا تھا کہ ان دونوں میں سے کون سی چیز میرے لیے زیادہ پُرکشش ہے۔ رات میں برمنگھم لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح میں اپنے انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں ڈپارٹمنٹ پہنچا تو پروفیسر ہولیسٹر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میرا تذبذب شاید میرے چہرے سے عیاں تھا۔ پروفیسر ہولیسٹر نے پوچھا۔ ”خیریت کیا ہوا؟ کن سوچوں میں کھوئے ہوئے ہو؟“

میں نے سارا ماجرا ان کو سنادیا۔ ان کو فیصلہ سنانے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ ”تمہاری جہازوں سے دلچسپی اپنی جگہ مگر جہاز راں کمپنیوں میں نوکری ملنا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ ایر زمبیا کوئی دنیا کی واحد ایرلائن نہیں ہے۔ ایرلائن کا کام بین الاقوامی کام ہے اس میں کسی ملک کی کوئی قید نہیں ہے۔ تم کو کم ازکم دنیا کی ستر اسی جہاز راں کمپنیوں میں نوکری کرنے کا موقع مل سکتا ہے مگر ایم ایس سی کی ڈگری تم کو صرف ایک جگہ سے مل سکتی ہے۔ اگر تم نے یہ دو مہینے مکمل کرکے اپنی ڈگری نہیں حاصل کی تو تم ساری زندگی پچھتاؤ گے۔“ اس سے زیادہ صحیح مشورہ کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے زمبین ایرلائن کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔

لندن سے واپس آئے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا ہوگا کہ ایک خوشگوار واردات ہوئی۔ ہمارے پڑوس کی لڑکیوں نے ایک دفعہ پھر ہمارے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ اب کے وہ ایک نرالی اور انتہائی دل خوش کن فرمائش کے ساتھ وارد ہوئی تھیں۔

”ہم آپ کے فلیٹ میں رہنا چاہتے ہیں۔“

نیکی اور پوچھ پوچھ! ہمیں تو شادی مرگ ہوجاتا لیکن اس میں کچھ قباحتیں تھیں۔

یونیورسٹی کا اصول یہ تھا کہ انڈر گریجویٹ طلبہ کو سالانہ امتحانوں کے بعد اپنے فلیٹ خالی کرنا پڑتے تھے۔ گریجویٹ طلبہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ اپنے فلیٹ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران بھی استعمال کرسکتے تھے۔ یہ سہولت اس لیے دی گئی تھی کہ گریجویٹ طلبہ کی اکثریت کو گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران اپنی ریسرچ یا اپنے پروجیکٹ پر کام کرنا ہوتا تھا۔

ہمارے پڑوس کی لڑکیاں چونکہ انڈر گریجویٹ کلاسوں میں تھیں۔ ان کو اپنا فلیٹ خالی کرنا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اگر ہمارے فلیٹ میں کوئی کمرے خالی ہوں تو وہ ان کا کرایہ ادا کرکے ان میں منتقل ہوجائیں۔ یہ معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ اس لیے کہ ہاؤسنگ کے شعبہ کو کسی نے یہ پٹی پڑھادی تھی کہ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے دلوں میں تو رہ سکتے ہیں مگر ایک دوسرے کے فلیٹ میں نہیں رہ سکتے حالانکہ فلیٹ دلوں کے مقابلے میں خاصے بڑے ہوتے ہیں۔ ذاتی طور پر ہم لوگوں کو یونیورسٹی کی اس پالیسی سے اختلاف تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس صرف دو کمرے تھے اور لڑکیاں چار تھیں۔ ایک کمرا ہیوان خسروشاہی کا خالی ہوا تھا کہ ہیوان نے یونیورسٹی کے نزدیک ایک کمرا کرائے پر لے لیا تھا اور دوسرا کمرا رچرڈ کا تھا جو اپنے گھر جاچکے تھے کہ ان کو کوئی پروجیکٹ یا ریسرچ نہیں کرنا تھی۔

رچرڈ کا ذکر سرسری طور پر کرنا ان کے کردار کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ ان میں دو بہت بڑی خوبیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کینیڈا کی ورکوانڈسٹری کے کیتھ کی طرح پکے گوراشاہی انگریز، تھے، ان کی نگاہ میں برٹش راج، آج بھی

زندہ تھا۔ زندہ اس لیے تھا کہ وہ ان کے ذہن میں پوری طرح سے محفوظ تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ رچرڈ کی زندگی میں برٹش راج کا سورج کسی طور ڈوب سکے۔ ایک دن کہنے لگے کیمونزم بہت اچھا نظام ہے اس کو ساری دنیا میں ہونا چاہیے۔ صرف انگلستان کے لیے ناموزوں ہے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ اگر کیمونزم باقی ساری دنیا پہ چھا گیا تو ''برٹش راج'' کہاں سانس لے گا۔

ان کی دوسری خوبی وہ تھی جو زیادہ تر انگریزوں میں پائی جاتی ہے۔ کنجوسی۔ ہم لوگ زیادہ تر کھانا یونیورسٹی کے کیفے ٹریا میں ہی کھا لیا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی فلیٹ میں بھی پکا لیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ٹماٹر کم پڑ گئے۔ رچرڈ نے کمال مہربانی سے ایک ٹماٹر عنایت کیا۔ جب ہم لوگ کھانا کھا کر فارغ ہو گئے تو رچرڈ نے مجھے اور اسٹین کو مخاطب کیا۔ ''میں نے تین ٹماٹر نو پینس کے خریدے تھے۔ اس طرح ایک ٹماٹر تین پینس کا پڑا'' پھر وہ اس حساب کتاب کے اصل مقصد کی طرف آئے ''اس ایک ٹماٹر کو ہم تین لوگوں نے کھایا۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک کے حصے میں ایک ایک پینس کا ٹماٹر آیا۔'' پھر رچرڈ نے مطالبہ کیا۔ ''اب تم دونوں مجھے ایک ایک پینس ادا کرو۔'' اور وہ ایک ایک پینس انہوں نے لے کر چھوڑا۔

میں نے چاہا کہ ان کو یاد دلا دوں کہ برٹش راج کی سربراہ کے تاج میں جو کوہ نور ہیرا جڑا ہوا ہے وہ مسروقہ ہے جو ان کے خاندان والوں نے ہم سے چرایا تھا۔

لڑکیاں ہمارے جواب کی منتظر تھیں۔ یونیورسٹی کی پالیسی اور کمروں کی قلت کی توجیہیں ان کو بتا دی گئیں۔ زلفوں کو جھٹک کر ادائے بے نیازی سے بولیں۔ ''یونیورسٹی والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ دو کمرے کافی ہیں۔ ہم اپنی چھٹیاں منانے کے بعد چند ہفتوں میں واپس آ جائیں گے۔ ہمیں صرف ایک مہینا فلیٹ میں رہنا ہے۔ اگلے سال کی تیاری کے لیے۔''

بہار ستمبر کے مہینے میں ہی ہمارے فلیٹ میں اتر آئی تھی۔ تین لڑکیاں چھٹیاں منا کر واپس آ چکی تھیں۔ جب ان میں سے کوئی کوریڈور سے گزرتی تو خوشبو کی لپٹیں ایسے اٹھتیں جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم اور دل چاہتا کہ ''بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے۔''

مگر تصور جاناں کا طلسم جلد ٹوٹ جاتا اور خیالوں میں جاناں کی بجائے ڈاکٹر جے بی کوٹس کا چہرہ مع اپنی تمام تر خشک سالی کے ذہن میں در آتا۔ اس ''خشک'' کا ان کی ''سالی'' سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ساری خشکی خود ان کی اپنی ذات کی مرہون منت تھی۔ خیال رہے کہ ڈاکٹر کوٹس میرے پروجیکٹ کے انچارج تھے۔ ان کی یاد دشمن جاں تھی۔

دشمن جاں اس لحاظ سے کہ ان کے یاد آتے ہی میری تمام تر توجہ جو کہ جاناں پر ہونی چاہیے تھی، پروجیکٹ پر مرکوز ہو جاتی۔

میرے کینیڈا واپسی کے ٹکٹ کی مدت ختم ہونے والی تھی۔ اس کے علاوہ جیب بھی ہلکی ہوتی جا رہی تھی اور میری کوشش تھی کہ اپنا پروجیکٹ اگلے دو ہفتے میں یعنی وقت مقررہ سے دو ہفتہ پہلے ہی ختم کر کے ٹورنٹو جانے والے جہاز پر سوار ہو جاؤں۔ میری کوشش اپنی جگہ مگر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

میں اپنے حساب پروجیکٹ رپورٹ مکمل کر کے ڈاکٹر کوٹس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہانی تو رقت آمیز ہے۔ مختصر احوال یہ ہے کہ انہوں نے میری رپورٹ کو چٹکی سے پکڑا۔ کہ یہ اتنی ہی ضخیم تھی کہ ان کی چٹکی میں آ گئی۔ خشونت سے اس پر سرسری نظر ڈالی پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''آج تک اس ڈپارٹمنٹ میں کسی بھی طالب علم کو اس کی پروجیکٹ رپورٹ کے نقائص کی بنا پر فیل نہیں کیا گیا ہے۔''

یہ تو دل خوش کن اطلاع تھی۔ دھماکا اس اطلاع کے بعد ہوا۔ ''لیکن دنیا میں ہر چیز کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پروجیکٹ رپورٹ کی بناء پر فیل کیے جانے والے پہلے طالبعلم کا اعزاز تم کو حاصل ہو۔'' پھر آخری جملہ ''جاؤ رپورٹ دوبارہ لکھ کر لاؤ۔''

میں نے جو وقت سے دو ہفتے پہلے رپورٹ مکمل کرنے کا خواب دیکھا تھا وہ ڈاکٹر کوٹس کی نظر ہو گیا۔ میں نے رپورٹ تو دوبارہ لکھ لی مگر اس کو ڈاکٹر کوٹس کو بنفس نفیس دینے کی بجائے ان کی سیکریٹری کے حوالے کیا۔ کم از کم وہ مجھے فیل کرنے کا اختیار تو نہیں رکھتی تھی۔ اب میں ٹورنٹو واپس [illegible] جا سکتا تھا۔ براستہ ڈوور وغیرہ۔ اپنے ٹکٹ کی مدت [illegible] ہونے سے قبل عین وقت پر ہی سہی۔

(جاری ہے)

سیل نمبر 14

امجد رئیس

وہ انتہائی خطرناک مجرم تھا، دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ وہ ذہنی کجروی کی وجہ سے قتل جیسا جرم کیا کرتا تھا۔ ایسے خطرناک مجرم کو عدالت نے ثبوت کی عدم موجودگی پر رہا کر دیا تو نتیجہ کیا نکلا؟

مغرب کے بے لگام معاشرے کی ایک جھلک

سیل نمبر 14 کا فولادی دروازہ کھولا جا رہا تھا۔ گارڈز کی انگلیاں پسٹلو پر جمی ہوئی تھیں، وہ نروس دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایکوے ڈور کی انڈیز پہاڑیوں میں موجود ایبا نو جیل کا منظر تھا۔ سیل نمبر 14 میں دنیا کی تاریخ کا بھیانک ترین قیدی بند تھا۔ اسے قیدی نہیں درندہ کہنا چاہیے۔

اس کا پورا نام پیڈرو الونزو لوپز تھا۔ لوپز جنوبی امریکا میں ''انڈیز کا عفریت'' کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کا نام خوف و دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ سیل نمبر 14 کا دروازہ کھل گیا۔ پیڈرو اس قدر قابل نفرت تھا کہ جیل کے قیدیوں یا گارڈز میں سے جس کو بھی موقع ملتا وہ پیڈرو کو یا تو زندہ جلا دیتے یا پھر اس کے اعضا کاٹ کر اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

پیڈرو الونز لوپز، اس وقت تک تین سو دوشیزاؤں کے قتل کا اعتراف کر چکا تھا۔ دنیا میں اس کی شناخت سب سے بڑے "سیکس کلر" کی تھی۔ پیڈرو قید میں نہ ہوتا تو عوام اس کے بدن کا ایک ایک ریشہ نوچ کے لے جاتے...... پیڈرو نے نفرت، خوف، دہشت اور بھیانک ترین جرائم کی تاریخ رقم کی تھی۔

یہ جنسی درندہ پورے تین سال تک دندناتا رہا۔ وہ اوسطاً ایک ہفتے میں دو سے تین دوشیزاؤں کو نشانہ بناتا اور بے حرمتی کرنے کے بعد قتل کر دیتا۔

ایمباٹو کی جیل، انڈیز کے پہاڑوں میں تین ہزار میٹر کی بلندی پر تھی۔ صرف ایمباٹو میں اس نے پولیس کی رہنمائی 53 خفیہ قبروں تک کی۔ اس انسان نما درندے نے یہاں جن لڑکیوں کو اپنی حیوانی ہوس کا نشانہ بنایا...... ان کی عمریں محض آٹھ سے بارہ برس تک تھیں۔

پیڈرو نے اٹھائیس مزید قبروں کی نشاندہی کی لیکن پولیس کو وہاں کچھ نہیں ملا۔ کیونکہ جنگلی آوارہ جانور قبریں کھود چکے تھے۔ کچھ قبروں کے بارے میں اس نے تعمیراتی سائٹس کا حوالہ دیا۔ وہاں لاشیں کنکریٹ کا حصہ بن چکی تھیں۔

☆☆☆

اپنے اعترافی بیان کے مطابق پیڈرو نے صرف ایکوے ڈور میں 110 لڑکیوں کی جان لی...... پڑوسی ملک کولمبیا میں 100 معصوم لڑکیاں اس کی خوفناک درندگی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ پیرو میں اس نے مزید 100 سے زائد لڑکیوں کو چیر پھاڑ ڈالا۔

ایمباٹو جیل کے ڈائریکٹر وکٹر ہیوگولاسی کیٹو کا کہنا تھا "پیڈرو نے جتنے اعترافات کیے ہیں اس کے بعد یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مقتولین کی تعداد درحقیقت نامعلوم ہے اور تین سو سے تجاوز کرتی ہے۔ یہ امر ناقابلِ یقین ہے کہ وہ اتنے طویل عرصے تک اتنے بھیانک خون خرابے کے باوجود کیونکر آزادانہ کارروائیاں کرتا رہا۔ اس جیسے مجرم کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی سزا ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ختم کیا جا سکتا ہے اور بس...... اسے کسی بھی طریقے سے مارا جائے، اس کے جرائم کے مقابلے میں یہ کم سے کم سزا ہوگی۔

"یہ تعداد 300 سے زیادہ اس لیے ہے کہ شروع میں قاتل تعاون کر رہا تھا۔ ہمیں قبروں اور لاشوں تک پہنچا رہا تھا۔ پھر اس کا ذہن بدل گیا۔ اس نے تعاون اچانک ختم کر دیا۔" وکٹر ہیوگولاسی کیٹو نے بتایا۔

پیڈرو کا سیل نمبر 14 دراصل عورتوں کے سیکشن میں تھا۔ محض اس لیے کہ اسے دوسرے قیدی مردوں کے غیظ و غضب سے محفوظ رکھا جا سکے۔ دو مین سیکشن کی قیدی عورتیں اس لیے محفوظ تھیں کہ اول پیڈرو کو بہت بری طرح پابند کیا گیا تھا۔ نیز سیل نمبر 14 پر تین گارڈ ہمہ وقت مسلط رہتے تھے اور تین رات میں آجاتے تھے۔ کھانے کے لیے بھی سیل کھولنے کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ اس وقت مسلح گارڈ کی تعداد بڑھا دی جاتی۔ عورتوں کے سیکشن میں قیدی اس لیے بھی محفوظ تھیں کہ پیڈرو کی جنسی کج روی صرف کم سن لڑکیوں تک محدود تھی۔

☆☆☆

کم سن لڑکیوں کا قاتل جس خاندان سے تعلق رکھتا تھا وہاں فیملی میں 13 بچے تھے۔ پیڈرو کا نمبر ساتواں تھا۔ اس کی ماں کولمبیا کے ایک چھوٹے سے ٹاؤن ٹولیما میں طوائف تھی۔ پیڈرو جب آٹھ برس کا ہوا تو ماں اسے سڑکوں پر آوارگی کے لیے چھوڑ دیتی۔ اس عمر میں بھی وہ جانور تھا اور چھوٹی بہنوں تک سے دست درازی کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتا تھا جس کے باعث اسے گھر سے بے دخل کر دیا گیا۔

وہ ایک مرتبہ سڑک پر بھوکا پیاسا رو رہا تھا تو کسی اجنبی نے اسے بیٹا بنا لیا۔ وہ اجنبی بھی شیطانی خصلت کا مالک تھا۔ بعدازاں اس نے پیڈرو کے ساتھ غیر فطری فعل کیا۔ اس واقعے نے اس کی نفسیات پر ایسی ضرب لگائی جو جوانی میں پیچیدگیوں میں ڈھل کر اسے درندگی کے راستے پر لے گئی۔ مستزاد یہ کہ اس کا خاندانی پس منظر بھی مکروہ تھا۔

لیکن اس کی کج روی نے جو شدت اختیار کی وہ بے انتہا ہولناک تھی۔ نہ صرف اس پر "انڈیز کے عفریت" کا لیبل چسپاں ہو گیا، بلکہ اس کا نام تاریخ کے بدترین و قابلِ نفرت قاتلوں کی فہرست میں درج ہو گیا۔

پیڈرو کے ساتھ بچپن میں جو زیادتی ہوئی، اس سے بند جگہوں پر سونے کا خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا۔

اس نے پولیس کو بتایا... "میں بازاروں کی سیڑھیوں اور عمارتوں کے تھڑوں پر سو جاتا تھا۔"

بوگوٹا میں ایک امریکی فیملی نے لاوارث بچوں کے لیے فلاحی کام شروع کیا تو پیڈرو کو کولمبیا کے یتیموں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو ایک ٹیچر کے ہمراہ اسکول سے رقم چرا کر بھاگ نکلا۔

ٹیچر ایک درمیانی عمر کی عورت تھی اور اپنی شیطانی

خواہشات کی تکمیل چاہتی تھی۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے کار چرائی اور کولمبیا سے نکلتے ہوئے پکڑا گیا۔ پیڈرو کو جیل ہو گئی۔ جیل میں دوسرے دن ہی وہ چار قیدیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ بچپن کی مکروہ کہانی پھر دہرائی گئی...... پیڈرو اب بچہ نہیں تھا۔ اس واقعے نے اسے غضب ناک کر دیا۔ پیڈرو نے وحشیانہ انداز میں چاروں کو نشانہ بنایا۔

اس نے تین قیدیوں کو ٹھکانے لگا دیا اور چوتھا چیختا چلاتا جان بچا کر نکل گیا۔ ذاتی دفاع کی بنیاد پر اس کی سزا میں صرف دو برس کا اضافہ کیا گیا۔

جب پیڈرو جیل سے رہا ہوا تو اس وقت تک وہ تمام برائیوں سے نہ صرف آگاہ ہو چکا تھا بلکہ ان کا ذائقہ بھی چکھ چکا تھا۔ اس کے جیل کے ایام کی تفصیل اس قدر مکروہ ہے کہ اسے ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

☆☆☆

"میری معصومیت آٹھ برس کی عمر میں فنا ہو گئی تھی۔" اس نے پولیس کو بتایا۔

دراصل جب پیڈرو کو لیمین اسکول سے رقم چوری کر کے ٹیچر کے ساتھ فرار ہوا تھا تو جب سے ہی اسے عورتوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ جس کا بدلہ اس نے کم سن و معصوم لڑکیوں سے لیا۔

1978ء تک وہ "پیرو" کی 100 سے زیادہ لڑکیوں کی بے حرمتی کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ ان میں زیادہ لڑکیاں پیرو کے شمالی علاقے میں موجود "آیاکوچو" نامی انڈین قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں یا پھر دیگر انڈین قبائل سے تھیں۔

اس کے جرائم پہلی بار اس وقت روشنی میں آئے جب وہ نو سالہ لڑکی کو ساتھ لے جا رہا تھا اور "آیاکوچو" قبیلے کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ انہوں نے اسے برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا پھر ایک گہرے گڑھے میں قید کر دیا۔ وہ اسے زندہ دفن کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک امریکن مشنری نے اس کی زندگی بچالی۔

امریکنز اسے جیپ میں بٹھا کر پولیس پوسٹ تک لے گئے۔ چند روز میں اسے ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اس وقت پولیس مقتول انڈین لڑکیوں کے معاملے میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ بعدازاں جب مکمل حقائق سامنے آنا شروع ہوئے تو باقاعدہ تفتیش کا آغاز ہوا۔

سرحد پار ایکوے ڈور میں غارت گری کا بازار گرم

فے

وہ زمین جو غیر مسلموں سے لڑے بغیر حاصل ہو۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب قبیلہ بنونضیر کو رسول اکرمؐ کے حکم سے مدینے سے نکال دیا گیا تو ان کی زمینیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور رسول اکرمؐ نے خاص حالات کی بنا پر ان زمینوں کو مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اس طرح خیبر اور فدک کے یہودیوں کے زمین ہاتھ آنے پر اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ شہر کے لوگوں سے جو زمین فے میں ملی ہے وہ رسولؐ خدا، اہلِ بیت، یتیموں، مساکین اور ابن السبیل کا حصہ ہے۔ اس طرح زمین کو مال غنیمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب دوسرے ممالک فتح ہوئے تو صحابہؓ کے مشورے سے ان علاقوں پر بھی فے کا ہی اطلاق کیا گیا، تاکہ اس کی آمدنی عام مسلمانوں کے کام آئے۔ یہ زمین بجائے مسلمانوں کے مقامی لوگوں کو کاشتکاری کے لیے دے دی جاتی تھی۔ آگے چل کر خراج، جزیہ اور اسی طرح کے دوسرے ٹیکس بھی فے، میں شامل کر لیے گئے۔

فیاض علی

1959-1895ء

پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل اور ناول نگار۔ فیض آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ لا کی ڈگری لینے کے بعد فیض آباد میں وکالت شروع کر دی لیکن کچھ عرصے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ 1946ء میں یوپی اسمبلی کے رکن چنے گئے اور آزادی کے بعد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہاں ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران ہی انہوں نے چھ ماہ تک ہائیکورٹ کے جج کی حیثیت میں بھی کام کیا۔ فروری 1950 میں جب پاکستان کے پہلے ایڈووکیٹ جنرل محمد وسیم وفات پا گئے۔ تو یہ عہدہ فیاض علی کو تفویض ہوا۔ 1956ء میں انہیں اٹارنی جنرل مقرر کیا گیا۔

مرسلہ: واثق عطاری، حیدرآباد

ہوا۔ ”مجھے ایکوے ڈور کی لڑکیاں پسند آئیں۔“ اس نے پولیس کو بتایا۔ ”وہ قابلِ بھروسا اور زیادہ معصوم ہوتی ہیں۔ وہ کولمبین لڑکیوں کی مانند اجنبیوں پر شک نہیں کرتیں۔“

”میں لڑکیوں کو منتخب کرتے وقت خاص قسم کی معصومیت کو پہلے دیکھتا تھا۔ ”نشانہ“ بنانے کے بعد میں گلا گھونٹ دیتا۔ انہیں مرتا دیکھنا میرے لیے غیر معمولی ہیجان کا باعث تھا۔ میں مرتی ہوئی لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتا رہتا جب تک آنکھیں بے نور نہ ہو جاتیں۔ لڑکیوں نے مزاحمت کبھی نہیں کی۔ ان کو مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ لڑکی کو دفنانے کے بعد میں اگلے شکار کے لیے نکل جاتا۔ میں نے کبھی اپنے شکار کو رات میں ہلاک نہیں کیا۔ کیونکہ میں دن کی روشنی میں انہیں مرتا دیکھنے میں لطف محسوس کرتا تھا۔“

☆☆☆

تین ممالک کی پولیس آپس میں تعاون کر رہی تھی۔ تاہم انہیں اب بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی ”ماس کلر“ (Mass killer) کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا واسطہ کسی نامعلوم زیرِ زمین ادارے سے ہے جو لڑکیوں کو اغوا کرکے بطور ملازم ٹرانسپورٹ کرتا ہے اور انہیں تجبہ گری پر مجبور کرتا ہے۔

اپریل 1980ء میں ایمباٹو کے قریب ایک دریا نے چار لڑکیوں کی لاشوں کو اگلا۔ عوام نے پولیس سے رابطہ کیا اور قاتل کی تلاش شروع ہوئی۔ تاہم کوئی کامیابی نہیں ملی۔

چند روز بعد کارلینا راموت پوویدا کی بارہ سالہ لڑکی غائب ہوگئی۔ پوویدا، پلازا روز مارکیٹ میں کام کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے جلدی ہی احساس ہوگیا کہ اس کی بیٹی ماریا آس پاس نہیں ہے، وہ دیوانوں کی مانند پلازا میں ماریا کو آوازیں دیتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر پلازا سے باہر گئی، وہ کسی اجنبی کا ہاتھ پکڑے جا رہی تھی۔

پوویدا باہر کی جانب لپکا اور پیڈرو کو جا لیا۔ پیڈرو ناگہانی افتاد سے گھبرا کر گر پڑا تھا۔ پوویدا مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ آناً فاناً لوگ جمع ہوگئے اور پیڈرو کو چھاپ لیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے بلکہ کئی لوگوں کو زخمی کر ڈالا تاہم عوام سخت مشتعل تھی۔ انہوں نے سفاک قاتل کو بے دست و پا کر دیا۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی تھی جو جلد ہی جائے وقوعہ پر پہنچ گئی۔ ماریا، باپ سے لپٹی رو رہی تھی۔

جیل میں جب پیڈرو ٹرائل کا منتظر تھا تو پولیس نے جھانسے سے اعترافی بیانات حاصل کر لیے۔ اس کے سیل میں ایک پادری کو بھی بند کر دیا گیا۔ جس کا نام پاسٹرو کارڈوبا کوڈینو تھا۔ پاسٹرو نے قیدی کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سلاخوں کے پیچھے دونوں کی دوستی ایک مہینے میں پروان چڑھ گئی۔ جو کچھ اس نے پاسٹرو کو بتایا اس کی مدد سے پولیس نے بہ آسانی اعترافی بیانات حاصل کر لیے۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ ایکوے ڈور میں پکڑا گیا، وہیں مقدمہ چلا۔ جہاں عمر قید کا مطلب زیادہ سے زیادہ سولہ سال قید تھی نیز اچھے رویے پر اس میں بھی نرمی کی جاسکتی تھی۔ گویا وہ 1990ء میں آزاد ہو جاتا۔ اگر فردِ جرم کولمبیا میں عائد ہوتی تو پیڈرو زندگی کی قید سے آزاد ہو جاتا۔ کیونکہ وہاں کے قانون کے مطابق اسے سیدھا فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کیا جاتا۔

☆☆☆

BBC کے مطابق ایکوے ڈور کی حکومت نے اسے 1980ء میں گرفتار کیا۔ 1998ء کے اواخر میں رہا کرکے کولمبیا ڈی پورٹ کر دیا۔ ایک انٹرویو میں پیڈرو نے خود کو ”مین آف سنچری“ قرار دیا۔

دوسری ڈاکو منٹری رپورٹ کے مطابق اسے 1994ء اگست کے مہینے میں کولمبیا کے حوالے کیا گیا۔ جہاں اسے پاگل قرار دے کر اسپتال بھیج دیا گیا۔ چند برس بعد اس وحشی کو صحت مند سمجھ کر نفسیاتی اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

طرفہ تماشا، محض 50 ڈالر کی ضمانت پر اس عفریت کو پھر آبادیوں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اسپتال سے فارغ ہو کر وہ غائب ہو گیا۔

2002ء میں پھر قتل کی اطلاع آئی اور کولمبیا کی حکومت نے انٹرپول سے رابطہ کیا۔

آخری اطلاعات تک وہ ایکوے ڈور کی قید میں تھا۔ اسے رہائی کی امید تھی۔ تاہم رہائی کے بعد وہ پیرو اور کولمبیا کی حکومتوں کو مطلوب تھا۔

یاہو کے مطابق کسی کو... پتا نہیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ پیڈرو کو ”کلنگ مشین“ بھی کہا جاتا تھا۔

بہر حال زندہ ہے یا مردہ...... پیمانۂ عمر لبریز ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش 8 اکتوبر 1948ء ہے۔

پیڈرو الونزو لوپز...... تاریخ کے بدترین قاتلوں میں سرِفہرست ہے۔

ترکی نامہ

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی پندرھویں کڑی

مگر ٹیکسی رکی نہیں، ٹیکسی کے نہ رکنے کی وجہ یہ تھی کہ بٹ صاحب گھبراہٹ میں یہ دیکھنا بھول گئے تھے کہ ٹیکسی کے ایک کونے میں ایک بزرگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔

خان صاحب نے کہا ”بٹ صاحب۔ یورپ میں گھوم پھر کر آپ کی آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں؟“

”یہ کیا بات کر دی آپ نے؟“ بٹ صاحب نے غصے میں کہا۔ ”میرے بھائی یورپ میں پھرنے سے اگر آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں تو اس وقت یورپ کی سیاحت کرنے والے سب کے سب اندھے ہو چکے ہوتے یا آنکھوں پر موٹی موٹی عینکیں لگائے پھرتے۔“

”بٹ صاحب۔ جذباتی نہ ہوں۔ بات کو سمجھا کریں بلکہ اس کی گہرائی میں جایا کریں۔“

”آپ تو بات سمجھ گئے ہیں اور اس کی گہرائی میں بھی اتر چکے ہیں۔ آپ ہی یہ معمہ حل کر دیں۔“

”سیدھی سی بات ہے، آپ میموں کو ان کے مختصر لباسوں کو غور سے دیکھتے ہیں کہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے جو کچھ عرصے بعد نظر کی کمزوری کا سبب بن جاتی ہے۔“

”بس بس۔ رہنے دیجیے اپنی پارسائی۔“ بٹ صاحب سچ مچ ناراض ہو گئے تھے۔ ”آپ تو یورپ میں ان چیزوں کو دیکھتے ہی نہیں۔ سڑکوں پر آنکھیں بند کرکے چلتے ہیں۔“

ہم نے بات کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر دخل دینا ضروری سمجھا۔ ”دیکھیے۔ پردیس میں اس طرح لڑنا جھگڑنا مناسب نہیں ہے۔ یہ سارے جھگڑے آپ پاکستان جا کر کر لیجیے گا۔“

”مگر پاکستان میں تو لڑنے جھگڑنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہاں تو ہمارے بہت اچھے تعلقات رہتے ہیں۔“

”کیونکہ وہاں میمیں نہیں ہوتیں۔“ ہم نے بھی فقرہ چست کر دیا۔

مرزا صاحب آگئے تھے۔ بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو پیدل ہی چلنا چاہیے۔ یہ بحث تو شاید رات تک جاری رہے گی۔“

بٹ صاحب نے فوراً سامنے سے گزرنے والی ایک دوسری ٹیکسی کو پکارا۔ ''ڈولماس۔''

یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ ٹیکسی فوراً رک گئی۔

ہم سب نے حیران ہوکر بٹ صاحب کی طرف دیکھا ''بٹ صاحب آپ نے کیا جادو کردیا کہ ٹیکسی والا آپ کی بے معنی پکار سن کر رک گیا؟''

''جاہلو۔ تم کو نہیں معلوم کہ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ ترکی میں ٹیکسی کو ڈولماس ہی کہتے ہیں۔''

''آپ کو اتنی جلدی ترکی زبان میں کس نے ماہر کردیا؟''

بولے ''انسان کسی ملک میں جاتا ہے تو صرف یادگاروں اور عورتوں کو ہی نہیں دیکھتا بلکہ وہاں کا ماحول، طور طریقے اور لوگوں کے رہن سہن اور بول چال پر بھی غور کرتا ہے۔ تحقیق کرتا ہے۔ اور اپنی معلومات اور قابلیت میں اضافہ کرتا ہے۔ آپ لوگوں نے کبھی ابن بطوطہ کا نام سنا ہے؟''

''ابن بطوطہ؟'' خان صاحب نے دہرایا۔

''وہ کوئی طوطا نہیں تھا۔ انسان تھا اور بہت بڑا سیاح تھا۔ اس نے ساری دنیا کی سیاحت کی تھی اور ہر ملک کے بارے میں معلومات کی تھیں جو آج آپ جیسے لوگوں کے کام آتی ہیں۔''

''اچھا تو آپ ابن بطوطہ بننا چاہتے ہیں۔''

''بننا نہیں چاہتے۔ بن گئے ہیں۔ پاکستان واپس جاکر میں بھی ابن بطوطہ کی طرح اپنے تجربات اور مشاہدات لکھوں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ دنیا کیسی ہے اور ہر ملک کے لوگ کیسے ہیں۔''

ٹیکسی ڈرائیور کافی دیر سے منتظر تھا کہ ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی منزل تک جائیں مگر یہاں تو بٹ صاحب خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف تھے۔

بالآخر ٹیکسی ڈرائیور نے ہم سب کو مخاطب کیا ''ہیلو سر۔''

ہم سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے مگر اسے ہماری باتیں پلے نہیں پڑی تب یاد آیا کہ ہم نے ٹیکسی والے کو ترکی زبان میں آواز دے کر روکا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ ہم لوگ ترکی زبان جانتے ہیں۔

بٹ صاحب نے فوراً وضاحت کردی۔ ''برادر من ترکی نمی دانم۔ آپ انگریزی۔ ٹیکسی والے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

بٹ صاحب نے انگریزی میں پوچھا۔ ''یو سپیک انگلش۔''

وہ کوئی خوش مزاج آدمی تھا۔ بولا۔ ''نو دانم''

مرزا مشرف نے اس کو سمجھایا کہ ہم پرانے تاریخی حمام دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس نے فوراً ٹیکسی سے باہر آکر دروازہ کھول دیا اور بہت ڈرامائی انداز میں اشارے سے کہا ''تشریف رکھیے۔''

ہم سب ٹیکسی میں بیٹھ کر تاریخی حماموں کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں ٹیکسی ڈرائیور بار بار دہراتا رہا۔ ''نمی دانم، نمی دانم۔''

''یہ کیا کررہا ہے؟''

''ابھی ایک فقرہ سنا ہے تو اس کو یاد کررہا ہے۔''

چند منٹ ''نمی دانم'' کی گردان کرنے کے بعد شاید اس کو خیال آیا کہ وہ اپنے مسافروں کو اہمیت نہیں دے رہا۔ اس لیے دریافت کیا ''وہیر یو کم؟'' مطلب یہ کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔

خان صاحب نے بتایا۔ ''پاکستان۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے خوش ہوکر ہم لوگوں کو دیکھا۔

''پاکستان؟''

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ اس نے ٹیکسی سڑک کے ایک جانب روک دی اور ٹیکسی سے نکل کر دونوں ہاتھوں پھیلا کر کہا ''خوش آمدید۔ پاکستان کاردیش'' مطلب یہ کہ پاکستان ہمارا دوست ہے۔

''اتنی سی بات کہنے کے لیے ٹیکسی سڑک پر روکنے کی کیا ضرورت تھی؟'' بٹ صاحب نے اعتراض کیا۔

''بٹ صاحب۔ آپ کے جسم کا بالائی حصہ کھوکھلا ہے۔ ارے بھئی وہ اپنی محبت کا اظہار کررہا ہے اور ہم لوگوں سے گلے ملنا چاہتا ہے۔''

بٹ صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ فوراً ٹیکسی سے اتر کر انہوں نے ''مرحبا'' کہہ کر ٹیکسی ڈرائیور کو گلے لگالیا اور باقاعدہ گلے ملنے لگے۔ ہم سب بھی ٹیکسی سے اتر کر باری باری گلے ملے۔ اس نے گلے لگانے کے بعد ہم سب کے گال بھی چومے۔

بٹ صاحب بولے ''کتنا اچھا دستور ہے۔ مگر صرف مردوں کے لیے ہی کیوں؟''

''آپ کا مطلب ہے کہ جو خاتون آپ سے ملے وہ بھی آپ کے گال چومے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔''

خان صاحب نے کہا۔ ''شکر ہے کہ ٹیکسی والا اردو نہیں جانتا ورنہ ہم پاکستانیوں کے بارے میں یہ کیا سوچتا کہ ان کی اتنی گندی ذہنیت ہے۔ تم پاکستان کو بدنام کردو گے۔''

ٹیکسی والا دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اس لیے ہم لوگ بھی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی والا بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اتنا خوش ہوا کہ گنگنانے لگا۔ پھر اچانک پوچھا ''لائیک میوزک؟''

ہم نے سر ہلا کر ہاں کہہ دیا۔ اس نے فوراً ٹیپ چلا دیا۔ ترکی موسیقی تھی، ہمیں تو ہر گانا ایک ہی طرح کا لگتا تھا۔ ترکوں کو شاید ایک ہی دھن پسند تھی یا پھر اس کی باریکیاں وہ ہم سے زیادہ سمجھتے ہوں گے۔ جیسے ہمارے پکے گانے بھی ہم ہی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی غیر ملکی سنے تو اس کو بھی وہ ایک ہی جیسے لگیں گے؟''

استنبول میں ٹیکسی کا طریقہ یہ ہے کہ عموماً چار مسافر بیک وقت ٹیکسی میں سوار ہوجاتے ہیں۔ جن کی منزل ایک ہوتی ہے یا پھر انہیں اسی راستے میں اتر جانا ہے۔ ٹیکسی والا ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ منہ مانگا کرایہ نہیں طلب کرتا۔ میٹر کے مطابق جو رقم بنتی ہے وہی چاروں مسافروں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرکے لاہور کا پرانا دور یاد آگیا۔ اس زمانے میں رکشا ٹیکسی تو تھی نہیں۔ موٹر کاریں بھی برائے نام ہی تھیں اس لیے تانگہ شہر میں واحد سواری کا ذریعہ تھی۔ لکشمی چوک پر تانگوں کا اڈہ تھا جہاں تانگے والے آوازیں لگاتے رہتے تھے۔''

''بھائی لوہاری بھئی۔ دو آنے سواری بھئی۔''

تانگے میں اگر صرف ایک مسافر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ کوئی خوشحال یا امیر آدمی ہے ورنہ تانگے میں چار سواریاں بیٹھا کرتی تھیں۔ تانگہ اگرچہ سواری کا واحد ذریعہ تھا لیکن پھر بھی مال روڈ پر تانگہ چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ تانگہ مال روڈ کو عبور کرسکتا تھا۔ اس لیے عام طور کھاتے پیتے خوشحال لوگ بھی مال روڈ کے پاس آکر تانگے سے اتر جاتے تھے اور جہاں جانا ہوتا تھا وہاں پیدل ہی ٹہلتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ مال روڈ کی فٹ پاتھوں پر پیدل چلنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

ہم لوگوں کو یہ اطلاع مرزا مشرف نے پہلے ہی دے دی تھی لیکن ہم تو چار ہی افراد تھے اس لیے پوری ٹیکسی لیا کرتے تھے۔

ٹیکسی والا ہم سے پوچھ رہا تھا کہ آپ لوگوں کو کہاں جانا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس فقرے کی انگریزی سوچتا رہا پھر دریافت کیا ''وہیر گو؟'' یعنی کہاں جانا ہے۔ جن ملکوں میں انگریزی نہیں بولی جاتی وہاں اسی قسم کی انگریزی سے کام چلایا جاتا ہے۔ ہمیں کئی ملکوں کا تجربہ تھا اس لیے ہم سوال کا مطلب اور مفہوم سمجھ لیا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں ایک بحث شروع ہوگئی۔ ہر ایک کی رائے الگ تھی بالآخر مرزا مشرف کا عاقلانہ مشورہ کام آیا اور ہم سب نے آیوس فوکس آرتھوڈاکس چرچ کا نام بتادیا۔ (نوٹ) اگر ناموں کے تلفظ میں غلطی ہو تو معذرت۔ اس لیے کہ ترکوں کا طرز ادائیگی اور نام مختلف ہوتے ہیں جنہیں یاد رکھنا دشوار ہے) یہ بھی ایک پرانا تاریخی چرچ ہے اور قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ مرزا مشرف اس چرچ کے بارے میں معلومات فراہم کرنا چاہتے تھے لیکن بٹ صاحب نے کہا ''قصہ مختصر یہ کہ یہ ایک پرانا چرچ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔''

''بٹ صاحب۔ نماز صرف مسلمان پڑھتے ہیں۔ عیسائی عبادت کرتے ہیں یا پادری کے سامنے اعترافِ گناہ کرکے اپنے تمام پچھلے گناہ معاف کرالیتے ہیں۔''

بٹ صاحب بولے ''سوری۔ میرا یہی مطلب تھا۔ ویسے خان صاحب عیسائیوں کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ پادری کے سامنے پردے کے پیچھے بیٹھ کر اپنے تمام گناہوں کی تفصیل بیان کردیتے ہیں اور پادری صاحب دعا پڑھنے کے بعد کہتے ہیں۔ آرام سے گھر جاؤ۔ تمہارے سارے پچھلے گناہ معاف ہوگئے۔ اب تم بے فکری سے آئندہ جتنے چاہو گناہ کرسکتے ہو۔ جب گناہوں کا بوجھ بڑھ جائے تو آکر معاف کرالینا۔ فکر کی بات نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مگر مجھے آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ اس طرح تو ہر ایک کو گناہ کرنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اسی لیے تو یہ لوگ مادر پدر آزاد ہوتے ہیں۔ بہرحال یہاں کھڑے ہوکر توبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس چرچ دیکھ لیا۔ اب آگے چلیے۔ چرچ دیکھنا ویسے بھی گناہ ہے۔''

''آپ مفتی کب سے بن گئے۔ بلاوجہ لوگوں کا ایمان خراب کرنے کے لیے۔''

''بھائی۔ مفتی تو آپ بھی نہیں ہیں مگر فتوے مفتیوں کی طرح دیتے ہیں۔''

''اچھا اچھا۔ ناراض نہ ہوں۔ چرچ تو دیکھ لیا۔ اب آگے چلتے ہیں۔''

''آپ شاید بھول گئے ہیں کہ ٹیکسی ہم نے ابھی تک چھوڑی نہیں ہے۔ وہ بے چارہ شریف آدمی ہمارا انتظار کررہا ہوگا بلکہ سوچتا ہوگا کہ کہیں میرا کرایہ لے کر بھاگ ہی نہ جائیں۔

ہم سب دوبارہ ٹیکسی والے کے پاس گئے اور اس سے پوچھا۔ ''ہاؤ مچ؟''

اتنی انگریزی تو وہ جانتا تھا۔ فوراً ٹیکسی سے اتر کر میٹر کی رقم بتائی۔ کرایہ وصول کرنے کے بعد اس نے دوبارہ ہم سب کو گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ ہم سب کے گال چومے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہوگیا۔

ٹیکسی کے رخصت ہونے کے بعد ہم لوگ آگے بڑھے۔ راستے میں ایک اور تاریخی عمارت نظر آئی جس کا نام بہت مشکل تھا اس لیے ہم کو یاد نہیں رہا۔ لیکن اس سے کچھ فاصلے پر انیسویں صدی کی خوبصورت مسجد دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ یہ

مسجد باسفورس کے کنارے واقع ہے۔ کچھ فاصلے پر ساحل پر سیاحوں کا ہجوم دور ہی سے نظر آ گیا۔ یہاں سردی کے ساتھ ساتھ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی مگر سیاحوں کے شوق اور جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ساحل پر ریستوران بھی ہیں۔ ان ریستورانوں میں خاص طور پر ترکی کھانے تیار کیے جاتے ہیں جو سیاحوں کی دلچسپی کا ذریعہ ہیں۔ "جوکم" یہاں کی سوغات ہیں۔ یہ میٹھا گوشت ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو تو پسند ہی نہیں آیا۔

بٹ صاحب نے فقرہ کسا۔ "زندگی میں پہلی بار گوشت کی سویٹ ڈش کھائی ہے۔"

یہاں عجیب بات یہ ہے کہ قہوہ سخت کڑوا ہوتا ہے۔ یہ گاڑھا ہوتا ہے اور چینی اور دودھ کے بغیر پیا جاتا ہے۔ عرب میں بھی یہی رواج ہے۔ اس قدر کڑوا زہر کہ حلق سے اتارنا مشکل ہے۔ لیکن ترک بڑے مزے لے لے کر یہ قہوہ پیتے ہیں۔ فلافل بھی کبابوں کی ایک قسم ہے۔ ترکی میں کئی قسم کے کباب ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کا مزہ الگ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فروٹ کاک ٹیل بھی تیار کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح ٹوٹی فروٹی آئس کریم ہوتی ہے یہ اسی نوعیت کی مٹھائی ہے جس میں مختلف قسم کے پھلوں کو مکس کر دیا جاتا ہے۔ صرف اس میں آئس کریم نہیں ہوتی۔ سمندر پر ہلکے بادل سے محسوس ہو رہے تھے۔ حالانکہ یہ کہر تھا۔ سامنے باسفورس کا پل نظر آ رہا تھا جس کی وجہ سے ماحول کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ باسفورس کا پل استنبول کے مغربی اور مشرقی حصوں کو ملاتا ہے۔ جس پر سے دن میں کئی بار گزر ہوتا ہے لیکن اگر ساحل پر سے دیکھو تو یہ ایک حسین منظر ہے جس میں رعنائی کے ساتھ ساتھ ایک مرعوب کن کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ ہم لوگوں نے ایک ریستوران میں بیٹھ کر یہ سب چیزیں چکھیں۔ بٹ صاحب کے مشورے پر ہر ایک نے ایک نئی ڈش کا آرڈر دیا اور سب چیزوں کا مزہ چکھا۔ ایک نوعمر ترک ویٹر سفید ایمرتی گلے میں ڈالے یہ دریافت کرنے آیا کہ کیا ہم قہوہ پینا پسند کریں گے۔ خان صاحب نے کہا۔ "خدا کے لیے قہوہ نہ پلاؤ۔ بہت مہربانی ہوگی، اردو کا یہ فقرہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو مرزا مشرف نے ترکی زبان میں اس کو بتایا کہ شکریہ۔ ہم قہوہ نہیں پیتے۔

وہ یہ سن کر حیران رہ گیا۔ "آپ لوگ قہوہ نہیں پیتے۔ اس کے بغیر تو نہ کھانا ہضم ہوتا ہے نہ ہی کھانے کا لطف آتا ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "ہمارے حصے کا قہوہ تم پی کر لطف اٹھا لینا۔"

کچھ فاصلے پر یلرز پارک ہے۔ یہ تھوڑی اونچائی پر ہے اور نہ صرف باغ بہت خوبصورت ہے بلکہ یہاں سے دور دور تک کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اس پارک کو دیکھ کر اسلام آباد کا شکر پڑیاں یاد آ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک خوبصورت اور سرسبز پارک ہے اور یہاں سے اسلام آباد کا منظر بہت خوشنما لگتا ہے۔

اس پارک میں ہم نے پہلی بار آوارہ کتوں کو دیکھا۔ آوارہ اس لیے کہ ان کی ڈوری کسی کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی انہوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ہم نے بہت ہش ہش کیا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انہوں نے اور زیادہ دیوانہ وار بھونکنا شروع کر دیا۔

خان صاحب نے کہا۔ "بھائی یہ استنبول کے کتے ہیں۔ ہش ہش کو نہیں سمجھتے۔"

بٹ صاحب کتوں سے بہت ڈرتے ہیں، کہنے لگے "میں تو کسی درخت پر چڑھ جاتا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب فکر نہ کیجیے جو ہم سب کا حال ہوگا وہی آپ کا ہوگا۔ آپ نے سنا تو ہوگا کہ پطرس بخاری نے لکھا ہے کہ بھونکتے ہوئے کتے کاٹتے نہیں ہیں۔"

"جی ہاں۔ اور انہوں نے یہ بھی تو لکھا ہے کہ کچھ پتا نہیں کہ بھونکنے والا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔"

شکر ہے کہ ہم بخیریت ان بھونکتے ہوئے کتوں کو چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ انہوں نے کچھ دور تو ہمارا پیچھا کیا مگر پھر مایوس ہو کر ان کی ٹولی واپس چلی گئی۔ ہم اس بات پر حیران تھے کہ استنبول میں ہم نے کسی جگہ آوارہ کتوں کی ٹولی نہیں دیکھی تھی۔

کتوں سے جان چھوٹی تو یلرز پارک کا منظر دیکھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ اس قدر خوبصورت پھول مختلف ٹکڑیوں میں اور ترتیب کے ساتھ لگائے گئے تھے کہ جی خوش ہو گیا۔ پھولوں کے اپنے بہت سے رنگ تھے کہ لگتا تھا رنگوں کا مقابلہ ہو رہا ہے۔

بٹ صاحب نے ایک جگہ جھک کر مختلف پھولوں کو سونگھا۔

"بٹ صاحب۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"دیکھتے نہیں کہ میں پھولوں کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ انگریزوں کے پھولوں میں تو خوشبو نہیں ہوتی مگر اب معلوم ہوا کہ ترکی کے پھولوں میں بھی خوشبو نہیں ہے۔"

"یہ بھی مغربی اثرات ہیں۔ جب انسانوں نے مغربی لباس اپنا لیا تو پھولوں کو بھی اپنے مغربی بھائیوں کا اثر لینے کا حق ہے۔"

"اب ہم کہاں جائیں گے؟" بٹ صاحب نے مرزا مشرف سے اس طرح دریافت کیا جیسے شاگرد استاد سے کوئی سوال کرتا ہے۔ کسی اور جگہ جانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔

میرا خیال ہے ہم کو نشان تشی اسٹریٹ جانا چاہیے۔"

"وہاں ہم کیا کریں گے؟"

"یہ استنبول کی ایک فیشن ایبل سڑک ہے جہاں بڑے بڑے اسٹور اور نئے نئے فیشن دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بعض جگہ تو وقفے وقفے سے فیشن پریڈ بھی ہوتی رہتی ہے۔ دراصل یہ امیروں کے لیے بہت موزوں جگہ۔"

"مگر ہم تو امیر نہیں ہیں اور نہ ہی فیشن کے دلدادہ ہیں۔"

"ارے چھوڑو۔" بٹ صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔ "فیشن شو تو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے دیکھنے کے لیے ٹکٹ بھی نہیں لینا پڑتا۔"

خان صاحب بولے۔ "بٹ صاحب نے زندگی میں چوتھی مرتبہ عقل کی بات کی ہے۔ ہم نے آج تک فیشن پریڈ اور کیٹ واک ٹی وی کے سوا کہیں نہیں دیکھی۔ یہ تجربہ بھی سہی۔"

بٹ صاحب ناراض تھے۔ پوچھنے لگے۔ "میں کبھی عقل کی بات نہیں کرتا۔ آج میں نے چوتھی بار عقل کی بات کی ہے؟ اب یہ بھی بتا دیجیے کہ تین بار میں نے کب اور کہاں عقل کی بات کی تھی۔"

"وہ میں بھول گیا۔"

ہم نے مشورہ دیا کہ یہ بحث تو ہوٹل پر جا کر بھی ہو سکتی ہے۔ ہم یہاں سیر و سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ مگر آپ گھریلو خواتین کی طرح قدم قدم پر بحث اور جھگڑے کر رہے ہیں۔ اگر یہی طریقہ رہا تو میں تو ہوٹل واپس جا کر آرام کروں گا اور ٹیلی وژن دیکھوں گا۔ آپ لوگ اپنے مسائل سڑکوں پر حل کرتے رہیں۔"

ہماری طویل دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور طے پایا کہ اب جگہ بے جگہ بحث کرنے سے پرہیز کریں گے۔ بٹ صاحب نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ہر آنے جانے والی ٹیکسی کو روکنے کے لیے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ جب ٹیکسی قریب سے گزرتی تو وہ ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کر کے "ڈولماس ڈولماس" پکارتے تھے۔

خان صاحب نے کہا۔ "بٹ صاحب۔ پہلے دیکھ تو لیجیے کہ ٹیکسی خالی بھی ہے یا نہیں اور دوسری طرف جانے والی ٹیکسی کو روکنے کی کوشش نہ کیجیے۔ یہاں یکطرفہ ٹریفک ہے۔"

بٹ صاحب ناراض ہو گئے۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ ٹیکسی کو روکنا بھی ایک مشکل اور ٹیکنیکل کام ہے۔ اب آپ کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔ موسٹ ویلکم۔"

خان صاحب نے بڑے شائستہ انداز سے کہا۔ "شکریہ۔" انہوں نے دو منٹ بعد اشارہ کر کے ایک ٹیکسی کو روک لیا۔

ٹیکسی والا خوش لباس اور خوش شکل نوجوان تھا۔ ٹیکسی روک کر اس نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہا ہو کہ جانا کہاں ہے آپ کو؟

خان صاحب سڑک کا نام بھول گئے تھے۔ بولے "نشانی اسٹریٹ۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے بہت شائستگی سے پوچھا۔ "پلیز ونس مور۔"

اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص انگریزی سے بالکل ہی پیدل نہیں مگر اپنا مطلب سمجھا دیتا ہے۔

مرزا مشرف نے کہا "سوری برادر نشان تشی اسٹریٹ۔"

ڈرائیور نے باہر نکل کر ہر طرف دیکھا۔ "یو نو بیگ؟" مطلب یہ کہ آپ کا سامان کدھر ہے۔ ہم نے اشارہ کر کے بتایا ہم لوگ ہی سامان ہیں۔

اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر ڈرامائی انداز میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم سب لوگوں کے بیٹھنے کے بعد سفر شروع کرنے سے پہلے ہی اس نے دعا پڑھی اور خود اپنے علاوہ ہم سب لوگوں پر بھی پھونک ماری۔

پکا مسلمان لگتا ہے۔ خان صاحب نے فقرہ کسا۔ ٹیکسی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے ہم سب کو مسکرا کر صبح بخیر کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

ہم لوگ جن سڑکوں سے گزرے سب کی سب صاف ستھری تھیں۔ پرانی طرز کی عمارتوں کے پہلو بہ پہلو جدید عمارتیں بھی تھیں۔ فٹ پاتھ اور دکانیں سیاحوں اور مقامی لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر دکان پر ہجوم نظر آ رہا تھا۔ دکانیں مختلف قسم کی اشیاء سے پُر تھیں۔

ایک موڑ کاٹنے کے بعد ہم نشان تشی اسٹریٹ پر تھے۔ یہ سڑک خاصی کشادہ تھی اور یہاں کے شوروم دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ واقعی فیشن کا علاقہ ہے۔ مختلف اقسام کے ملبوسات اور نئے نئے انداز کے کپڑے جوتے اور افزائش حسن کا سامان بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار ہلکی کر دی اور پوچھا۔ "وہیئر اسٹاپ؟" اتنا تو آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کا مطلب کیا تھا۔

خان صاحب نے ہم سب کی طرف دیکھا اور ڈرائیور سے کہا۔ "تمام" بس یہیں روک دیجیے۔ سفر ختم ہو گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جانب ٹیکسی روک دی اور باہر نکل کر کھڑا ہو گیا جوں ہی ہم لوگ باہر نکلے ٹیکسی ڈرائیور نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "پاکستان؟"

ہم سب نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور گلے لگایا۔

''پاکستان کا ردوش'' پاکستان تو ہمارا دوست ہے۔

ہم نے کئی ملکوں کا سفر کیا ہے جن میں مغربی۔ ایشیائی اور مسلم ممالک بھی شامل ہیں لیکن پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے جو محبت ترکی میں دیکھی وہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ عرب ممالک کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پاکستانی ہو یا ہندوستانی، ایشائی ہو یا افریقی وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ جب ہم پہلی بار دوبئی گئے تو وہاں کے اہلکاروں کا کرخت اور درشت رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ اگر آج کے جدید دور میں ان کا یہ طرز عمل ہے تو ظہور اسلام سے قبل ان کا کیا انداز ہوگا۔ ان ہی بدوؤں کو آنحضور کی تعلیمات اور محبت آمیز رویے نے انہیں دنیا بھر کے لیے ایک مثالی انسان بنا دیا۔ رسولؐ اللہ تو اللہ کے آخری نبی تھے۔ ان کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ آنحضورؐ، حدیثوں، نصیحتوں اور ہدایات کی شکل میں جو پیغام چھوڑ گئے ہیں ہمیں نہ صرف انہیں یاد رکھنا چاہیے بلکہ ان پر پوری طرح عمل بھی کرنا چاہیے۔ نماز، روزوں اور دوسری عبادات کے بارے میں تو ہم سنت نبویؐ کی باقاعدگی سے پیروی کرتے ہیں خصوصاً ان باتوں کے سلسلے میں جو ہمیں راس آتی ہیں لیکن کیا ہم عملی زندگی میں بھی آنحضورؐ کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب نہیں میں ہوگا۔

رسول اکرمﷺ کے بعد بے شمار اولیائے کرام اور اللہ کے برگزیدہ بندے دنیا میں آئے اور انہوں نے اپنے بارے میں پیغمبر کی ہدایات پہ نہ صرف عمل کیا بلکہ انہیں دنیا کے دور دراز علاقوں تک پہنچا دیا۔ ایسے نیک بندے اب بھی موجود ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا پیغام دنیا والوں تک پھیلا رہے ہیں۔ ہم آج دنیا میں بھی سوا ارب کے قریب جو مسلمان دیکھتے ہیں انہیں اسلام کی طرف راغب کرنے والی یہی بزرگ ہستیاں تھیں۔ برصغیر کو دیکھ لیجیے مسلمان اس ملک میں بہت کم تعداد میں آئے تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ اسلام ہندوستان میں جبر اور زبردستی سے نہیں پھیلا۔ نہ ہی مسلمان بادشاہوں نے ایک ہزار سالہ حکومت کے دور میں کبھی غیر مسلموں کو مسلمان کرنے کی کوشش کی ورنہ ہندو جو شکست مان چکے تھے ذرا سی کوشش سے مسلمان ہو سکتے تھے اور آج سارا برصغیر مسلمان ہوتا۔ لیکن بادشاہوں کو تو محض اپنی بادشاہت سے غرض تھی۔ انہوں نے ہندوؤں کو ہر طرح کی آزادی دی اور نوازنے میں کوئی کسر تک نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ ممتاز ہندوؤں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور ان کی یہ اولاد ان کے بعد ان کی جانشین بھی۔ جودھابائی اور اکبر کا بیٹا شہنشاہ ہند کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ داراشکوہ تو نہ صرف آدھے سے زیادہ ہندو بن چکا تھا بلکہ ہندو رسم و رواج کو اپنا کر بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، بابا گنج فرید بخش جیسے اولیائے کرام کا جنہوں نے اپنے طرز عمل اور تعلیمات کے ذریعے غیر مسلموں کے دل جیت لیے۔ یہاں تک کہ جو ہندو مسلمان نہ ہوئے وہ بھی ان کے معتقد اور ان کی خوبیوں کے قائل ہیں۔ آج بھی مسلمانوں کی طرح ہندو ان بزرگوں کے مزاروں پر اپنی منتیں پوری کرنے کی التجا لے کر جاتے ہیں۔

ترکی میں بھی اسلام مسلمانوں کے حسن سلوک کی وجہ سے پھیلا۔ ترکوں نے غیر مسلمان پر کبھی ظلم نہیں ڈھائے بلکہ ان کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے۔ یہ عیسائی اور دوسرے غیر مسلم اپنی حکومت کے زمانے میں لوگوں کا قتل عام کرتے تھے۔ ان کے گھر بار اور جواہر لوٹ لیا کرتے تھے، اسی لیے اس زمانے میں عیسائی آبادی بھی مسلمانوں کے حسن اخلاق اور مہربانیوں کے قائل تھے۔

سائنسدان کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے تیز رفتاری سے سفر کرنے والی شے روشنی ہے یا پھر تصور یا خیال جو کہ روشنی سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہے۔ ابھی آپ لندن میں کھڑے ہیں کہ اچانک آپ کا خیال آپ کو امریکا یا ہندوستان لے گیا اور پھر دوسرے لمحے آپ آسٹریلیا پہنچ گئے۔ ہم اپنے بارے میں یہی سوچ کر حیران تھے کہ یہ اچانک استنبول کی فیشن اسٹریٹ پہنچ کر ہم ہندوستان اور اولیائے کرام تک کیسے پہنچ گئے۔

یکایک بٹ صاحب کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ''بھائی کہاں ہے وہ فیشن اسٹریٹ۔ میں فوری طور پر ترکی کے جدید فیشن دیکھنا چاہوں گا۔''

مرزا صاحب نے کہا۔ ''بٹ صاحب ہم اس وقت جہاں کھڑے ہیں یہ استنبول کا سب سے زیادہ فیشن زدہ علاقہ ہے۔ آس پاس نظر دوڑایئے۔ کیسے کیسے خوبصورت شوروم اور ان کے شیشوں کے پیچھے کتنے خوبصورت ملبوسات سجے ہوئے ہیں۔''

بٹ صاحب نے کہا۔ ''مرزا صاحب۔ یہ آپ حسن کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ آپ کو تو میں بہت باذوق سمجھتا تھا مگر آپ تو ذوق لطیف سے بالکل محروم ہیں۔''

خان صاحب بول پڑے۔ ''بٹ صاحب آپ کو معلوم بھی ہے ذوق لطیف کسے کہتے ہیں؟''

بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ اردو کے مشہور شاعر تھے۔ سارے ہندوستان میں ان کی دھوم تھی۔ قوال اور ڈومنیاں ان کی غزلیں گایا کرتیں۔ ان کا مشہور شعر تو میں نے چھٹی جماعت میں پڑھا تھا آج تک مجھے منہ زبانی یاد ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ زبانی یاد ہے۔''

''شعر ہے'' اردو ہے کیا چیز ہم ہی جانتے ہیں ذوق
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے''

خان نے کہا۔ ''بٹ صاحب۔ آج ہم بھی آپ کی قابلیت کو مان گئے۔ اچھے خاصے شعر کا قیمہ بنا دیا اور حامد کی ٹوپی محمود کے سر پر رکھ دینا تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔''

''شکریہ اس تعریف کا۔'' پھر وہ مرزا صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ''مرزا صاحب ہمیں یہاں لا کر ایک احسان کیا ہے تو دوسرا احسان بھی کر دیجیے۔''

''حکم کیجیے۔''

''حکم نہیں۔ یہ میری درخواست ہے۔ اب مجھے جلدی سے کسی اچھے سے فیشن ہاؤس میں لے چلیے جہاں کیٹ واک یا شو پریڈ ہوتی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ اس کے اوقات مقرر ہیں۔ ابھی ان کا وقت نہیں ہوا۔ آپ فی الحال خوبصورت ملبوسات پہنے ہوئے خوبصورت مجسمے دیکھیے۔''

''مرزا صاحب۔ ذرا سوچیے اگر آس پاس فٹ پاتھوں اور دکانوں پر چلتی جاگتی خوبصورت حسینائیں نظر آئیں تو میں ان کے مجسموں کو دیکھ کر اپنا وقت کیسے ضائع کر سکتا ہوں۔ آپ کو سلطان محمود غزنوی کا وہ فقرہ تو یاد ہوگا کہ میں بت شکن ہوں۔ بت پرست نہیں۔ ان مجسموں کو دیکھ کر اپنا ایمان خراب کرنے سے تو بہتر ہے کہ میں چلتی پھرتی جاندار خدا کی قدرت کے نمونے دیکھوں۔''

اس روڈ سے گذر کر ہم ساحل کی طرف چل پڑے۔ ترکی میں اول تو ساحلوں کی کثرت ہے۔ قدم قدم پر جس طرف دیکھیے سمندر نظر آ جاتا ہے۔

اس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ ساحلوں پر پرواز کرنے والے سفید براق پرندے اڑتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ انہیں بجرے اور بحری جہازوں والے دانہ وغیرہ ڈالتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بحری جہاز کے آس پاس ہی پھڑ پھڑاتے ہیں۔ کبھی کوئی چھوٹی مچھلی نظر آ جائے تو اس کو بھی چونچ مار کر اٹھا لیتے ہیں۔

اس عرصے میں ہم ساحل سمندر پر پہنچ چکے تھے۔ چند لکڑی کی بنچیں دیکھ کر ہم بھی ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ سامنے نظر پڑی تو ایسا منظر دیکھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ سامنے نیلے سمندر پر کہر چھائی ہوئی تھی مگر آہستہ آہستہ ہٹ رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں شفق کی رنگین کرنیں تھیں۔ سورج بس غروب ہی ہونے والا تھا۔ ہم اس منظر کو دیکھ کر اس میں کھو گئے۔ ایسا منظر اور ایسا ماحول ہر روز دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم بہت مناسب وقت پر ساحل سمندر پر پہنچ گئے تھے۔ ساحل سمندر کے ریستورانوں کی مچھلیاں تو ہم کھا ہی چکے تھے۔ سوچا کہ اب ہوٹل واپس جانا چاہیے۔

ہم نے کہا کہ بسوں میں تو اس وقت بہت رش ہوگا۔

بٹ صاحب فوراً بول پڑے۔ ''بس نہ سہی ڈولماس یعنی ٹیکسی۔''

خان صاحب بولے۔ ''بٹ صاحب۔ کبھی پیدل بھی چلا کیجیے تاکہ ٹانگیں بیکار نہ ہو جائیں۔''

''آپ کو پتا نہیں ہے کہ میں روزانہ کتنی جاگنگ کرتا ہوں؟''

''کتنی؟ میں نے تو کسی کھلی جگہ جاتے نہیں دیکھا بالکل نہیں کرتا۔ بلکہ ہوٹل کے کمرے میں ہی دس بارہ چکر لگا لیتا ہوں۔''

''یعنی آپ کمرے کے اندر ہی جاگنگ کر لیتے ہیں؟''

''بھئی مطلب تو جاگنگ کرنا ہے۔ فٹ پاتھ پر کر دیا کمرے کے اندر۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ ورزش کرتا ہوں۔ میرا ورزشی جسم دیکھ کر اندازہ لگا لیجیے۔''

''ورزش آپ کہاں کرتے ہیں۔ باورچی خانے میں؟''

''جی نہیں۔ غسل خانے میں۔ ہمارا غسل خانہ کافی بڑا ہے۔ میں نے ورزش کرنے کا سارا سامان باتھ روم میں رکھ لیا۔ وزن اٹھانے کا راڈ۔ باکسنگ کرنے کے لیے بڑا سا تھیلا جس پر گھونسے مار کر بہترین باکسر بن گیا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک سائیکل جو ایک ہی جگہ کھڑی رہتی ہے۔ لیکن میں اس پر پانچ میل سائیکل چلا لیتا ہوں اور ہاں۔ میں نے دو مگدر بھی غسل خانے میں رکھ لیے ہیں۔ دس پندرہ منٹ تک روزانہ مگدر گھماتا ہوں۔''

خان صاحب نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تو پھر آپ غسل کہاں کرتے ہیں۔ اور آپ نے اپنا فلیش کہاں رکھا ہے۔ کیا غسل خانے کے باہر۔''

''خان صاحب۔ یہ باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ نے کبھی ورزش کی ہو تو آپ کو پتا چلے کہ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔''

بٹ صاحب تو ڈولماس ڈولماس کہتے رہے مگر سب نے فیصلہ کیا کہ پیدل ہی سفر کرنا چاہیے۔

راستے میں کئی خوبصورت باغ دیکھے۔ ان میں سے ایک باغ میں ہفتے میں دو دن موسیقی کا مفت پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ باغ میں ایک ترتیب سے کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ وہاں

چہل قدمی کرنے والے ایک بزرگ نے بتایا کہ حکومت نے شہر میں جگہ جگہ ایسے مرکز بنا رکھے ہیں جن سے نوجوانوں میں موسیقی کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی کلاسیکی موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان تقریبات میں انتہائی نظم و ضبط دیکھا جاسکتا ہے۔ ذرا سی بھی بدتمیزی یا گڑبڑ نہیں ہوتی۔

ہم ان کے پاس ہی ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ وہ خاصے باتونی تھے لیکن انگریزی کے معاملے میں اناڑی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دو دن پہلے انہوں نے انگریزی سکھانے والے ایک اسکول میں بھی داخلہ لیا ہے۔

"دو دن میں آپ نے کتنی انگریزی سیکھ لی ہے؟"

وہ مسکرائے "سی اے ٹی کیٹ۔ آر اے ٹی ریٹ۔ مگر ریٹ اور کیٹ بولتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہوجاتی ہے۔ وہ بھی سی اے ٹی ریٹ اور کبھی آر اے ٹی کیٹ کہہ جاتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزی سکھانے کے لیے بلی اور چوہا سے کیوں آغاز کرتے ہیں۔"

"اس لیے کہ انگلستان میں بلیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اور چوہے کم ہوتے ہیں اس لیے کہ بلیاں انہیں ختم کردیتی ہیں۔"

بڑے صاحب سے الوداع۔ خدا حافظ کہہ کر آگے چلے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ باغ کے درمیان میں ایک بہت وسیع جگہ پر ورزش کرنے والی مشینیں نظر آئیں۔ یہ سائیکلیں حرکت نہیں کرتیں۔ اسی جگہ کھڑے کھڑے آپ کئی میل کا سفر کرسکتے ہیں۔ مردوں اور خواتین کی ورزش کے لیے دوسرے آلات بھی موجود تھے۔ یہ سہولت بھی حکومت کی طرف سے فراہم کی گئی ہے۔ ہر شخص یوگا سینٹر اور جمناسٹک تو نہیں جاسکتا کیونکہ اس کی فیس زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے حکومت نے عوام کی سہولت اور تفریح کے لیے یہ بندوبست کیا ہے۔

مرزا نے بتایا کہ استنبول میں میٹروبس کی تعمیر کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہاں سفر کے کئی ذرائع ہیں۔ مرسیڈیز کاریں بھی ٹیکسی کے طور پر چلتی ہیں۔ عام ٹیکسیاں بھی بہت چمکدار اور صاف ستھری ہوتی ہیں۔ ان کی چمک دمک دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ابھی کار ڈیلر کی دکان سے نکلی ہیں یہاں سڑکوں پر مٹی کا کوئی نام ونشان تک نہیں ہے۔ بسیں اپنی مقررہ لین میں چلتی ہیں۔ ہارن کی آواز کبھی سنائی نہیں دی۔

بٹ صاحب نے کہا۔ "میں پاکستان جاتے ہی اپنی کار کا ہارن نکلوادوں گا۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب پاکستان میں ہارن کے بغیر کار چلانا ہی ناممکن ہے۔ ہارن بجانا وہاں ضروری ہے۔ کبھی غلط کار چلانے والے کو ہارن دینا پڑتا ہے کبھی سڑکوں پر مویشیوں کے ریوڑ دیکھ کر ہارن بجانا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہارن نہ بجائیں تو پیدل چلنے والا آپ کو راستہ نہیں دیتا۔ آپ یا تو کسی کو ٹکر ماردیں گے یا کوئی دوسرا آپ کو ٹکر ماردے گا۔"

استنبول میں ہمیں موٹر سائیکلیں گنتی کی ہی نظر آئیں۔ چند موٹر سائیکلسٹ نظر آئے جو ڈیلیوری کا فرض ادا کررہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں لاہور کے موٹر سائیکلوں کے غول یاد آگئے جنہیں خان صاحب موت کے فرشتے کہتے ہیں۔ یہ ٹریفک کے ہر ضابطے سے بے نیاز ہیں اور موٹر سائیکل سڑکوں پر ایسے چلاتے ہیں جیسے موت کے کنویں میں کرتب دکھا رہے ہوں۔

استنبول کی سڑکوں پر ہم گھومتے رہے ہیں۔ ہر جگہ ہم نے اس قوم میں مغربی ملکوں جیسا نظم و ضبط دیکھا۔ ٹریفک کا نظام ایسا ہے کہ سڑک پر کوئی ایک پولیس کا سپاہی نظر نہیں آیا لیکن ٹریفک اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی ٹریفک کانسٹیبل انہیں ہدایات دے رہا ہے۔ لوگ قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ پولیس والے سڑکوں پر بلاوجہ کھڑے گپ شپ کرتے نظر نہیں آتے لیکن وہ پولیس کاروں میں دن رات سڑکوں پر آہستہ رفتار سے گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس کسی قسم کے ہتھیار نہیں ہوتے کیونکہ کوئی پولیس پر حملہ کرنے کا تصور تک نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم رات گئے نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں کو تنہا پیدل گزرتے ہوئے دیکھ کر حیران نہیں ہوئے۔ سڑکیں پختہ اور صاف ستھری، کسی جگہ تجاوزات یا ریڑھے والے وہاں نہیں ہوتے اس لیے ٹریفک تیز رفتاری سے بلا روک ٹوک چلتا رہتا ہے۔ کئی جگہ ہم نے اسکول کے بچوں کو اسکاؤٹس کی وردیوں میں ٹریفک کنٹرول کرتے دیکھا۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی ان کی ہدایات پر عمل نہ کرے۔ اس طرح لڑکپن ہی میں وہ ٹریفک کے اصولوں اور طور طریقوں سے واقف ہوجاتے ہیں۔ ترکی میں نوجوانوں کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا لازمی ہے تاکہ ضرورت کے وقت ساری قوم جنگ میں شریک ہوسکے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ اور جاہل میں کیا فرق ہوتا ہے۔ قوم کو صحت مند رکھنے کے لیے یہ سہولتیں حکومت کی طرف سے فراہم کی گئی ہیں۔ ہر شہر میں اس طرح کے انتظامات موجود ہیں۔

ترکوں کی وطن سے محبت کا اندازہ کرنا ہو تو باربروسہ اسکوائر جاکر وہاں کے مناظر دیکھیے۔ اس چوک کے نزدیک ہی اتاترک میوزیم ہے آپ جانتے ہوں گے کہ ایڈمرل باربروسہ

سلطنت عثمانیہ کے دور میں بہت بڑے اور کامیاب بحری امور کے ماہر تھے۔ ان کا پورا نام ایڈمرل خیرالدین باربروسہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ واحد مسلم مملکت تھی جس نے بحری طاقت کو مضبوط بنانے کی طرف توجہ دی تھی۔ ان کی بحری طاقت اس زمانے میں دوسری حکومتوں کے لیے قابلِ رشک تھی۔ ترکوں میں یہ خوبی تھی کہ جدید ترین اسلحہ خود بھی بناتے تھے اور جہاں سے بھی دفاعی سامان مل سکتا تھا وہ حاصل کرلیتے تھے۔ اتفاق سے ایک ہنگری کا کاری گران کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ توپ خانے کا ماہر تھا۔ اس نے ترکوں کے لیے ایک بڑے سائز کی ایسی توپ بنائی تھی جس کے گولوں سے مضبوط قلعے کی دیوار میں بھی شگاف پڑجاتا تھا۔ اس توپ کی وجہ سے عثمانی فوجوں نے بہت مشکل قلعے فتح کیے کیونکہ اس سائز کی توپ ان کے دشمنوں کے پاس بھی نہ ہوتی۔ ایک زمانے میں سمندروں پر ترکوں کا راج تھا۔ ان کی بری اور بحری طاقت کا مقابلہ دشوار تھا۔ استنبول کی فتح میں سلطان محمد نے دشمن کے مضبوط بحری اقدامات کے باوجود بحری جہازوں سے بھی مدد لی تھی۔ انہوں نے استنبول کی بندرگاہ کے چاروں طرف بحری جہازوں سے ناکہ بندی کردی تھی۔ سلطان محمد نے بڑے بڑے درخت کٹوا کر ان کے چوڑے اور مضبوط تختے بنوائے پھر ان کو چربی سے چکنا کیا گیا۔ سلطان نے راتوں رات بری راستوں سے ان جہازوں کو دھکیل کر عیسائیوں کے مضبوط حصار کے اندر پہنچادیا۔ صبح ہوئی تو دشمن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ترکی کے بحری جہاز ان کی سمندری حد بندی کو عبور کرکے استنبول کے قلعے کی دیواروں کے نزدیک کھڑے ہیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ پائے کہ اتنی بڑی تعداد میں ترکوں کے جہاز ان کے جہازوں کو عبور کرکے فصیل پر گولہ باری کررہے ہیں۔ کیسے؟ یہ سلطان محمد کا ایسا حیرت انگیز کارنامہ تھا جسے دشمن حل نہ کرسکے۔

اس زمانے میں بحری قوت ایک مضبوط ہتھیار تھا۔ سمندروں کے ذریعے ہی ہالینڈ، پرتگال اور انگلستان جیسے چھوٹے ملکوں نے دنیا بھر میں اپنی کالونیاں بنالی تھیں۔

افسوس کہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے کبھی سمندری طاقت بنانے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ جب پرتگال اور انگلستان کے تاجروں نے ہندوستان کی بندرگاہوں کو تجارت کے لیے استعمال کرنے کی اجازت طلب کی تو فراخ دلی سے دے دی گئی۔ بعد میں جب مغل سلطنت کھوکھلی اور کمزور ہوگئی تو ان ہی تاجروں نے ملک پر قبضہ کرلیا اور کئی سو سال تک ہندوستان کو اپنا غلام رکھا۔ یہ مغل بادشاہوں اور درباریوں کی بے پروائی یا کوتاہ بینی کہ ہندوستان جیسے ملک پر برطانیہ جیسے مٹھی برابر ملک نے اپنا غلام بنا رکھا۔ دراصل مغل شہنشاہوں کی نظر اور خیال کبھی اپنے ملک سے باہر نہیں گیا اور ان کے دانشور درباریوں نے بھی کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دلائی۔

ذکر باربروسہ اسکوائر کا تھا۔ باربروسہ دنیا کے بہترین بحری سالاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دشمن اس سے اتنے خوفزدہ رہتے تھے کہ اس کا نام سن کے ہی شکست تسلیم کرلیتے تھے۔ باربروسہ اسکوائر کے نزدیک ہی سنعان پاشا مسجد ہے۔ صرف اس کو دیکھ کر ہی عثمانیہ دور حکومت کی شان و شوکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ترکوں کے قدیم محل، مساجد اور دوسری یادگاریں ان کی عظمت رفتہ کی یاد تازہ کردیتی ہیں۔ جو رعب داب، اور حسن ان عمارتوں میں نظر آتا ہے۔ اس سے قدیم سلطنت عثمانیہ کی سطوت اور شان و شوکت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ترکی میں جا بجا میوزیم نظر آتے ہیں۔ جو قیمتی اور بیش بہا چیزوں سے بھرے ہیں۔ توپ کوپی کا ایک چکر لگا کر ہی عثمانیہ دور کی بے مثال اشیا اور نوادرات اور عمارت کی شان و شوکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میوزیم میں سرکار دو عالم کی یادگاری اور خلافت راشدہ کے عہد کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ اگر محض توپ کوپی میں محفوظ اشیا کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے تو دنیا کا دولت مند ترین انسان بھی ان نوادرات کا ایک مختصر حصہ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

استنبول میں آہستہ آہستہ بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ عام ترک سچے مسلمان تھے اور سیکولر ازم سے نفرت کرتے تھے مگر جب وہاں اسلامی جماعت برسر اقتدار آئی تو بہت بدل گیا لیکن یہ مسلمان حکمراں ہمارے علما کی طرح سنگدل نہیں ہیں۔ انہوں نے ہر شخص کو اپنی مرضی کا لباس پہننے اور اپنا طرز زندگی اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے غلبے کے باوجود حکومت نے ناچ گھروں اور موسیقی پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اس دانش مندی کی وجہ سے ترکی میں ہر مذہب کے لوگ پُرامن زندگی بسر کررہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ترک سچے مسلمان ہیں اور بڑی تعداد میں غیر مسلم اسلام قبول کررہے ہیں۔ ترکی اب فری مارکیٹ ہے۔ جس کی وجہ سے ترکی کی معیشت نے بہت ترقی کی ہے اور یہ بہت سے یورپی ملکوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ اور خوش حال ہے۔

ایک زمانے میں ترکی کی مساجد میں تالے لگ جاتے تھے جو صرف نماز کے وقت کھولے جاتے تھے۔ اب تمام مساجد کو از سر نو مرمت کرکے آراستہ کردیا گیا ہے اور انہیں دیکھ کر یوں

لگتا ہے جیسے ابھی تعمیر کی گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رفتہ رفتہ ترکی ایک اسلامی ملک بن جائے گا۔

آج کل ترکی میں صوفی ازم کا بول بالا ہے۔ ترکی کا صوفی رقص یہاں کی ایک قابلِ دید چیز ہے۔ صوفیوں کا فلسفہ یہ ہے کہ اپنی روح کو اتنا پاکیزہ بناؤ کہ اللہ سے تعلق پیدا ہو جائے۔ اللہ صوفیوں کی مرکزی طاقت ہے۔ صوفی کا تعلق روح کی ذریعہ اللہ سے ہوتا ہے۔ صوفی ازم کا مرکز قونیہ ہے۔ درویشوں کا یہ انداز سیاحوں کو بھی مسحور کر دیتا ہے اب حکومت نے ملک کے ہر شہر میں "رقص درویش" کا بندوبست کیا ہے۔

ایک شام ہم لوگوں نے محفل سماع میں شریک ہونے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل والوں سے معلومات حاصل کر کے ہم نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ محفل سماع سیاحوں اور مقامی لوگوں کے لیے یکساں دلچسپی کا حامل ہے۔

سماع کا آغاز ایک مختصر تقریر یا خطبے سے ہوا۔ یہ جگہ پاشا طبع کے نزدیک ہے۔ یہ حمام ساڑھے پانچ سو سال قبل تعمیر کیے گئے۔ عثمانی عہد میں شاہی خاندان کے افراد یہاں غسل کیا کرتے تھے مگر اب یہ حمام درویشوں کے رقص کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ محفل سماع کے آغاز میں خطبہ ہوا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد پانچ درویش اپنے مخصوص لباسوں میں نمودار ہوئے۔ چار درویش نمودار ہوئے۔ انہوں نے میوزک کا آغاز کیا جو مختلف سازوں پر مشتمل تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ڈرم ایک خاتون بجا رہی تھی۔ ان چاروں سازندوں کو اپنے فن پر عبور حاصل تھا۔ موسیقی کی سنگت میں سماع کی آواز میں زیادہ کشش پیدا ہوگئی تھی۔

جیسے جیسے سازوں کی رفتار تیز ہوتی گئی رقص کرنے والے درویشوں کے رقص میں بھی تیزی پیدا ہوگئی۔ وہ بہت تیزی سے چکر کھا رہے تھے۔ یہ سلسلہ پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ رقص کے دوران میں میوزک روک دیا گیا تھا۔ رقص تھما تو پھر سازوں کی آواز گونجنے لگی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد میوزک رک گیا اور دوبارہ رقص شروع ہوا۔ درویشوں کا بے داغ لبادہ سفید اور ٹخنوں تک نیچا تھا۔ جب وہ چکر کھاتے تھے تو لباس کا نچلا گھیر دار پھیروں کی صورت میں گھومنے لگتا تھا۔ ان لوگوں نے اونچی سرخ رنگ کی ترکی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ درویشوں کا یہ لباس رقص کا یہ انداز اتاترک زمانے میں ایسا ہی تھا۔ رقص دیکھنے والوں میں مرد اور جینز میں ملبوس خواتین بھی شامل تھیں۔ رقص کا یہ سلسلہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کافی دیر تک جاری رہا۔

خان صاحب نے مرزا اشرف سے کہا۔ "اگر ہم ایسا ہی رقص درویش پاکستان میں بھی شروع کر دیں تو کافی آمدنی ہو سکتی ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "مگر ڈرم میں بجاؤں گا۔"

خان صاحب اڑ گئے۔ "اس پر تو میری نظر ہے۔"

دونوں حضرات میں یہ بحث جاری رہی کہ ڈرم کون بجائے گا؟

آخر مرزا اشرف نے کہہ کر معاملہ رفع کر دیا کہ ابھی تو پاکستان میں یہ رقص شروع بھی نہیں ہوا ہے اور آپ ایک خیالی تصور پر جھگڑنے لگے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ترک بھی ایک زمانے میں قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے اور تلاش معاش کے سلسلے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہتے تھے۔ سلطنت ترکی کا بانی ارطغرل بھی اپنے چھوٹے سے قبیلے کا سردار تھا۔ اس معمولی سے خانہ بدوش کو دنیا کی ایک عظیم ترین سلطنت کی بادشاہت کیسے ملی یہ بھی ایک داستان ہے۔ ترکوں کا کہنا ہے کہ یہ کوئی لوک کہانی نہیں بلکہ ایک حقیقی اور تاریخی واقعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ترکوں کے جد امجد کا تعلق حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ ایک قبیلہ نورو بھی تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی قبیلے تھے جو مختلف زبانیں بولتے تھے لیکن بیشتر کی زبان ترکی تھی۔ چند قبائل جو ترکی زبان بولتے تھے وہ ترک کہلائے۔ اسی طرح جس علاقے میں زیادہ تر ترکی بولی جاتی تھی اس کو ترکستان کا نام دیا گیا۔

ان قبائل کی باقاعدہ فوجی طاقت نہیں تھی کہ وہ کسی بڑی قوت سے جنگ کر سکیں۔ اس لیے رومی شہنشاہ ان علاقے پر اپنا حکم چلاتے رہے۔ بازنطائین کے دورِ حکومت میں قسطنطنیہ کچھ عرصے اس کا پایہ تخت بھی رہا۔ جب ایک بڑے قبیلے سلاجقہ نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے رفتہ رفتہ ایک علیحدہ قوت حاصل کر لی۔

جب چنگیز خان اپنی خون آشام فوجوں کے ساتھ دنیا کو فتح کرتا پھر رہا تھا تو اس نے ترکی میں بھی کافی لوٹ مار مچائی اور بہت ظلم کیے۔ ترک تو کیا دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس وقت چنگیز خان کے سیلاب کو نہیں روک سکتی تھی۔ ارطغرل کا قبیلہ بھی منگولوں کے خوف سے جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ارطغرل کے والد کی وفات کے بعد ارطغرل نے باپ کی جگہ قبیلے کی سرداری سنبھالی۔

بھٹکتے ہوئے یہ قبیلہ جانے یا ان جانے میں سلطان سلجوقی کی سلطنت کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ قبیلہ اس وقت پندرہ سو افراد پر مشتمل تھا۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ ارطغرل کا ایک پہاڑی غیر آباد علاقے میں گزر ہوا تو پہاڑی کی چوٹی پر سے اس نے دیکھا کہ دو فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ ارطغرل ان میں سے کسی سے بھی واقف نہیں تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر اپنے ساتھیوں سمیت کھڑا دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک فوج کمزور پڑ رہی ہے۔ وہ فوراً چوٹی سے اتر کر کمزور فوج کی حمایت میں لڑنے لگا۔ دوسری فوج اس اچانک حملے سے گھبرا گئی۔ انہیں یہ بھی خیال آیا کہ شاید ان کے کچھ اور حمایتی آنے والے ہیں۔ اس خیال سے وہ فوج جو غالب نظر آ رہی تھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ طاقت ور فوج تاتاریوں کی تھی اور کمزور فوج سلطان علاؤالدین سلجوقی کی فوج کا ایک بچھڑا ہوا دستہ تھا۔ سلجوقی نے ارطغرل کی اس امداد سے متاثر ہو کر اس کو اپنی فوج میں شامل کر لیا اور یہ خانہ بدوش قبیلہ ایک باقاعدہ اور طاقت ور فوج کا حصہ بن گیا۔ سلطان سلجوق ارطغرل کی بہادری سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔

کچھ عرصے بعد تاتاریوں نے پھر حملہ کیا اور اس جنگ میں سلطان علاؤالدین سلجوقی ہلاک ہو گیا۔ اس کا بیٹا غیاث الدین سلجوقی بھی تاتاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان دونوں کی ہلاکت کے بعد حکومت کی باگ ڈور ارطغرل نے سنبھال لی اور اپنی فوج کا نشان سلجوقیوں کا ہلالی جھنڈا ہی رکھا جو آج بھی ترکوں کے قومی جھنڈے کا نشان ہے۔

ارطغرل کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا عثمان اس کی جگہ سردار منتخب ہوا۔ عثمان اپنے باپ کی زندگی ہی میں مسلمان ہو چکا تھا مگر ارطغرل سے راز چھپایا تھا۔

یہی وہ عثمان خان ہے جس نے ترکی میں عثمانیہ سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ عثمان خان کی پیروی کرتے ہوئے اس کے قبیلے کے دوسرے لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح عثمان خان کو یہ دہرا اعزاز حاصل ہے کہ نہ صرف اس نے دنیا کی ایک بہت وسیع اور طاقت ور سلطنت کی بنیاد ڈالی بلکہ اس کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے اسلام ترکی کا قومی مذہب بن گیا۔

شاعر نے کہا ہے کہ "خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔" اسی طرح قدرت کسی کو سرداری یا بادشاہت کے لیے منتخب کرتی ہے تو اس کو صلاحیتیں اور قابلیت بھی عطا کرتی ہے جو ایک بادشاہ کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ عثمان خان بذاتِ خود ایک بہادر اور بے خوف انسان تھا۔ قدرت نے اس کو قائدانہ صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ اس کو امور سلطنت غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ ادا کرنے کی خوبیوں سے بھی اللہ نے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کا طرز زندگی شاہانہ نہیں عوامی تھا۔ وہ انتہا درجے کا عادل اور انصاف پسند حکمران تھا۔ اس کی عدالت میں دولت، رسوخ اور مذہب کی اہمیت نہیں تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ بلا امتیاز انصاف کرتا تھا جس کی وجہ سے سب اس سے محبت کرتے تھے اور دل سے اس کی عزت کرتے تھے۔

عثمان خان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اسے دولت کا لالچ نہ تھا۔ وہ بہت فیاض حکمران تھا۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد فتح میں حاصل ہونے والی دولت کا ایک حصہ غریبوں، یتیموں، بیواؤں کے لیے الگ کر دیتا تھا اور باقی تمام مال غنیمت فوجیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اس لیے مال غنیمت سے حاصل ہونے والی دولت کا ایک پیسا بھی نہیں رکھتا تھا۔

وہ جس گھر میں رہتا تھا وہ شہر کے ایک عام گھر کی طرح تھا جس میں کوئی قیمتی سامان یا زیب و زینت نہ تھی اس کے پاس زر و جواہر نہیں تھے۔ اس لحاظ سے وہ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کی شجاعت بھی ضرب المثل تھی۔ مذہب کا بھی شیدائی تھا۔ اسے یہ شرف حاصل ہے کہ حکمرانی سنبھالتے ہی ایک جامع مسجد تعمیر کروائی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی جامع مسجد ہے۔

عثمان خان نے دس سال تک بروصہ کا محاصرہ جاری رکھا اور عہد کیا کہ اس قلعے کو فتح کیے بغیر دم نہیں لے گا۔ بروصہ کا محاصرہ جاری تھا کہ عثمان شدید بیمار پڑ گیا۔ اس کو مجبوراً واپس آنا پڑا لیکن اس نے سپہ سالار اورخان کو حکم دیا تھا کہ قلعہ فتح کیے بغیر واپس نہ آئے۔

اورخان ایک بہادر فوج کا بہادر سپہ سالار تھا۔ اس نے عثمان کی خواہش پوری کرنے کے لیے جان لڑا دی یہاں تک کہ قلعے والوں نے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیے اور بروصہ فتح کر لیا گیا۔ جس وقت بروصہ کی فتح کی خبر پہنچی عثمان بستر مرگ پر تھا لیکن وہ مرنے سے پہلے کچھ اہم فیصلے کرنا چاہتا تھا۔ اورخان کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے بعد اس نے اس کو وصیت کی کہ سب کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ پیش آنا اور انصاف کے معاملے میں کوئی امتیاز نہ کرنا۔

عثمان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس نے کبھی کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا۔ اس نے اپنے حسن سلوک سے اور ترکوں نے اپنے اوصاف کے ذریعے عیسائیوں کو مسلمان ہونے پر مائل کیا۔ عیسائی حکومت جنہیں مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئی تھی وہ ظالم اور سنگ دل عیسائیوں کے مقابلے میں بہت رحم دل اور انصاف پسند تھے۔ ترک فوجیں غیر مسلموں

کے جن علاقوں سے گزرتی تھیں وہاں کسی ایک کو بھی ہلاک نہیں کرتی تھیں جبکہ عیسائی فوجیں خود مفتوح عیسائیوں کے ساتھ جبر اور زیادتی کرتی تھیں۔ عیسائی ظالم اور سنگ دل ہونے کے ساتھ اپنا پرایا دیکھے بغیر سب کو لوٹ لیا کرتے تھے اور معمولی سی خطا پر موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ جو غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تھے ان میں اور پرانے مسلمانوں میں کوئی تفریق نہ تھی۔ وہ آپس میں شادیاں بھی کرتے تھے اور بہت محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ ترکوں کی نئی نسل مختلف اقوام کے افراد پر مشتمل تھی اور عثمان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ترکوں نے اپنے لیے عثمانی کہلانا زیادہ پسند کیا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کا آغاز تھا جسے کچھ عرصے بعد دنیا کی واحد سپر پاور کہلانا تھا اور تقریباً آدھی دنیا میں، تین براعظموں میں ان کی سلطنت پھیلانا تھا۔

ساتویں صدی میں نبی آخرالزماں کی آمد کے ساتھ ہی اسلام کا ظہور ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کا غلبہ ہو گیا۔ خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں عربوں نے بازنطینہ پر حملہ کیا۔ بازنطینی انہیں جنگلی اور اجڈ سمجھتے تھے لیکن جب آمنا سامنا ہوا تو بازنطینی کو بری طرح شکست ہوئی۔ خالد بن ولیدؓ نے جنگ یرموق (اردن) میں بازنطینی فوج کو شکست فاش دی۔ اس طرح بازنطینی سلطنت سمٹتی گئی۔ عربوں نے انقرہ، اناطولیہ اور دوسرے کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ بازنطینی سلطنت روبہ زوال ہو گئی۔

ترکی میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی یہاں نیا مذہب، نئی زبان، نیا رسم الخط بھی رائج ہو گیا۔ سکندر اعظم کے زمانے میں یہاں یونانی تہذیب کا غلبہ تھا اور یونانی زبان بولی جاتی تھی۔ اب اس کی جگہ عربی بولی جانے لگی اور عرب تہذیب و ثقافت کا دور دورہ ہوا۔ بازنطینی دور میں عیسائیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا اور ان سے جزیہ بھی وصول کیا جاتا تھا لیکن مسلمانوں نے یہ سب کچھ بدل دیا۔ ہر مذہب، نسل اور مذہبی خیالات کے لوگ بہت آرام و سکون سے رہتے تھے۔

ترک کون تھے یہ بتایا جا چکا ہے۔ لفظ ترک 1300ء کی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ ترک دوسرے قبیلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے جن میں منگول بھی تھے۔ چنگیز خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آدھا ترک اور آدھا منگول تھا۔

ترکوں کے بارے میں بہت سی لوک کہانیاں بھی مشہور ہیں جن سے ترک قوم کی تخلیق کا پتا چلتا ہے۔ ایک داستان میں بتایا گیا ہے کہ پہاڑی علاقے میں چند گھوڑ سوار سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ بچے اور خواتین بھی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کا بھیڑیا اس گروہ کے آگے آگے چل رہا تھا۔ ان کا سامان بھی پیچھے گاڑیوں اور خچروں پر آ رہا تھا۔ چند خیمے بھی ان کے ساتھ تھے تاکہ رات گزارنے کا بندوبست ہو جائے۔ دراصل یہ لوگ خانہ بدوش تھے جو بعد میں ترک قوم کی حیثیت سے دنیا میں جانے گئے۔

ان داستانوں کے مطابق دراصل یہی ترک قوم کا آغاز تھا لیکن اس کہانی میں بھیڑیا کہاں سے آ گیا؟

اس کی ایک الگ کہانی ہے۔ داستان گو کہتے ہیں کہ وسط ایشیا کی ایک شہزادی جنگل میں چند محافظوں کے ہمراہ سفر کر رہی تھی کہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے انہیں گھیر لیا۔ ایک سیاہ رنگ کا بھیڑیا جو جنگل میں گھوم رہا تھا اس نے جب شہزادی کو ڈاکوؤں کے نرغے میں دیکھا تو ڈاکوؤں پر حملہ آور ہو گیا۔ ڈاکو خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ شہزادی بھیڑیے کی ہمدردی اور بہادری سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے بھیڑیے سے شادی کر لی۔ ان دونوں سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ دو جڑواں بچے تھے۔ یہ بچے ترک کہلائے۔

اس سلسلے میں ایک اور داستان بھی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مادہ بھیڑیے کو جنگل میں دو چھوٹے جڑواں بچے مل گئے۔ دور دور تک کسی اور کا نام و نشان نہیں تھا۔ مادہ بھیڑیے کو ان بچوں پر ترس آ گیا۔ اس نے ان دونوں کو دودھ پلایا۔ وہ بہت جوان اور طاقت ور ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھائی نے ایک شہر آباد کیا جس کا نام روم یا روما تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترک بازنطینی کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے لیکن رومیوں سے اپنے تعلق پر فخر کرتے تھے اس لیے کہ وہ بھی ترکوں کی طرح بہادر تھے۔

☆☆☆

مرکزی دفاتر کیونکہ انقرہ میں ہیں اس لیے اکثر لوگ صبح آ کر شام کو واپس استنبول چلے جاتے ہیں۔ انقرہ کے ائیرپورٹ کا اپنا حسن ہے جو استنبول ائیرپورٹ سے مختلف ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ عملے میں کم سے کم صرف ضرورت کے مطابق عملہ رکھا جاتا ہے اس لیے ہمارے ائیرپورٹوں جیسا گپ شپ کا موقع ہی نہیں تھا۔

خودکار گیٹ سے باہر نکلے۔ لاؤنج بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ مسافر بھی صاف ستھرے اور مہذب تھے۔ مرزا مشرف نے کہولتی ہوٹل میں فون کے ذریعے بکنگ کرا لی تھی۔

انقرہ میں بہت زیادہ رش نہیں ہوتا۔ یوں سمجھیے کہ اسلام آباد بننے کے بعد جتنا کم ٹریفک ہوتا تھا وہی نقشہ یہاں بھی تھا۔ تفریح گاہوں کے مقابلے میں دفاتر یہاں زیادہ ہیں۔ لوگ تیزی سے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے کسی جگہ پہنچنے کی جلدی ہو۔ انقرہ خوب صورت شہر ہے۔ کمرشل اسٹور تو ہیں مگر وہ استنبول جیسی چہل پہل اور رونق دیکھنے میں نہیں آئی۔

ناشتا تو ہوٹل میں بفے قسم کا تھا۔ کھانے کی اتنی بہت سی دنیا قسم کی چیزیں موجود تھیں کہ ہم نے تو انڈے اور ٹوسٹ پر گزارا کیا مگر بٹ صاحب بار بار میز سے اٹھ کر جاتے اور پلیٹ میں کچھ لے آتے۔ ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب اس طرح بار بار اٹھ کر جانے سے لوگ کیا سوچیں گے؟“

”بھائی انہوں نے کھانے کے لیے ایک ہی پلیٹ رکھی ہے اب ایک پلیٹ میں کتنا کھانا آ سکتا ہے۔“ بٹ صاحب نے تمام چیزیں کھانے کے بعد سوئٹ ڈش کا رخ کیا اور آخر میں ہر قسم کے پھلوں سے انصاف کیا۔

ہم سب نے بٹ صاحب سے درخواست کی کہ ہوٹل والوں کی غلطی کو معاف کر دیجیے۔ آیندہ وہ کبھی آپ کو اپنے ہوٹل میں ٹھہرانے کی حماقت نہیں کریں گے۔ غالباً بٹ صاحب بھی اب سیر ہو چکے تھے اس لیے دو تین چھوٹی چھوٹی ڈکاریں لینے کے بعد ناشتے کی میز پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مرزا مشرف نے ہوٹل سے باہر نکل کر پہلے تو ہمیں انقرہ کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کیں۔ ترکی میں غیر ملکیوں کے خلاف جنگ کے لیے اناطولیہ مصطفیٰ کمال پاشا کا ہیڈ کوارٹر تھا کیونکہ دفاعی اعتبار سے اس کا محل وقوع بہت موزوں ہے۔ 1923ء میں اسے ترکی کا دارالحکومت بنا دیا گیا تھا جو آج تک دارالحکومت ہے۔

غیر ملکیوں کو ترکی کی سرحدوں سے باہر نکالنے کے بعد جب پہلی بار مصطفیٰ کمال انقرہ آئے تو ساری قوم کے ہیرو تھے۔ میلوں تک لوگوں کا ہجوم تھا جو اپنے قومی ہیرو اور فاتح کا استقبال کرنے اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بچے، بوڑھے، عورتیں، علما سبھی اس ہجوم میں شامل تھے اور مصطفیٰ کمال کے حق میں جذباتی نعرے لگا رہے تھے۔ مذہبی طبقہ بھی بہت زیادہ تعداد میں موجود تھا۔ عوام کا خیال تھا کہ مصطفیٰ کمال پاشا ترکی میں اسلامی طرز حکومت قائم کریں گے۔ انقرہ میں داخل ہونے کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا سیدھے مسجد حاجی بہرام میں گئے اور وہاں نماز ادا کی اور حاجی بہرام کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد انہوں نے عوام سے خطاب کیا اور انقرہ میں نمائندہ ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کا اعلان کیا۔

ان کے اس خطاب کے بعد تمام ملک سے ان کے پاس آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اراکین اسمبلی بھی ان سے ملنے آئے۔ ملاقاتوں کا مقصد آیندہ طرز حکومت کے بارے میں مختلف طبقے کے لوگوں سے تبادلۂ خیال کرنا تھا۔

انقرہ نہایت صاف ستھرا اور پُرسکون شہر ہے۔ استنبول جیسی گہما گہمی اور چہل پہل یہاں نظر نہیں آتی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے بحری قزاقوں کا مرکز تھا۔

بٹ صاحب نے کہا۔ ”مرزا صاحب اور سب تو ٹھیک ہے لیکن اب تک یہاں پہاڑیاں نظر نہیں آئیں؟“

مرزا صاحب ہنس پڑے۔ ”آپ کو پہاڑیوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟“

”اس لیے کہ دنیا کے ہر بڑے شہر کے بارے میں یہی سنا ہے کہ وہ سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔

استنبول بھی سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔“ مرزا صاحب نے بتایا۔

انگورہ کے اردگرد بہت سی چھوٹی پہاڑیاں ہیں بلکہ انہیں آپ ٹیلہ کہہ سکتے ہیں۔ انقرہ ان ٹیلوں کے درمیان میں ہے اس لیے یہاں آپ کو اتار چڑھاؤ نظر نہیں آئیں گے۔ جیسے کہ استنبول کی سڑکوں پر نشیب و فراز نظر آتا ہے۔ شہر کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اب پہاڑیوں پر بھی خوب صورت مکانات تعمیر ہونے لگے ہیں۔ رات کو جب روشنیاں جلتی ہیں تو انقرہ زیادہ پُرکشش نظر آتا ہے۔ یہاں سفارت خانوں کی بہتات ہے۔ کشادہ صاف ستھری سڑکیں، خوب صورت اور بلند عمارتیں اس شہر کی عظمت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس شہر میں اعلیٰ تعلیمی درس گاہیں اور ٹیکنیکل یونیورسٹی بھی ہے۔ شہر میں جگہ جگہ ممتاز ہستیوں کے مجسمے نصب ہیں۔ ایک چوراہے پر ہم نے دیکھا کہ ایک شاندار عمارت کے سامنے اتاترک میوزیم نمایاں نظر آ رہا ہے۔ اس کا داخل ہونے کا دروازہ خوب صورت درختوں اور پھولوں کے درمیان میں گھرا ہوا ہے۔ یہ میوزیم اس لیے بھی اہم ہے کہ یہاں خاص طور پر اتاترک سے متعلق ذاتی اشیا سجائی گئی ہیں۔ ان کا لباس، ان کے استعمال میں رہنے والی پستول اور بندوقیں، ان کے فل بوٹ، آفس ٹیبل غرضیکہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے... ان چیزوں کا مالک ابھی آ کر آپ کو خوش آمدید کہے گا۔ یہ میوزیم ایک کشادہ چوراہے پر ہے۔ گرمی یہاں برائے نام ہوتی ہے لیکن سردیوں میں برف باری ہوتی ہے اور سارا شہر سفید برف کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ مقامی لوگ اور سیاح برف باری کے موسم سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ایک دکان میں ہم کاغذ اور قلم خریدنے گئے۔ اس کی مالکہ ایک خوش پوش اور خوش شکل خاتون تھیں مگر انگریزی سے نابلد۔ مرحبا اور خوش آمدید کے بعد مزید بات چیت ممکن نہیں تھی۔ انہوں نے البتہ یہ سن کر خوشی کا اظہار کیا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔

ہم انہیں ہر طرح سمجھاتے رہے کہ ہمیں قلم اور کاغذ کی ضرورت ہے مگر ہمیں ترکی لفظ معلوم نہ تھا، کافی دیر سوچنے کے بعد ہم نے اپنی ہتھیلی پر انگلیوں سے لکھ کر بتایا تو سمجھ گئیں۔

''قلم؟'' انہوں نے ترکی میں کہا۔

ہم نے اس بات میں سر ہلا دیا پھر کاغذ کی ضرورت کا بھی اظہار کیا۔ وہ فوراً سمجھ گئیں اور لیٹر پیڈ بھی لا دیا۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ قیمت ادا کی جو بہت زیادہ نہیں تھی انہوں نے پھر شکریہ ادا کیا۔

بٹ صاحب خاموش نہ رہ سکے، بولے۔ ''ایسی خوش شکل اور خوش اخلاق لڑکی، آپ یہاں سے یہ سستی چیزیں لے کر جا رہے ہیں کچھ اور بھی لینا چاہیے۔''

ہم نے کہا۔ ''آپ کو اتنا لحاظ ہے تو کچھ آپ سب بھی خرید لیجیے۔ دیکھیے یہاں کیا کچھ ہے۔ کھلونے، سامانِ آرائش، خوشبوئیں وغیرہ وغیرہ۔'' یہ سن کر سب کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

شاہراہ اتاترک پر پارلیمنٹ ہاؤس کے چوک تک کا علاقہ شامل ہے۔ بہت بارونق سڑک ہے۔ بڑے بڑے شاندار اسٹورز، اسنیک بار، سینما گھر، ریستوران یہاں تک کہ مٹھائی کی دکانیں بھی یہاں نظر آ جاتی ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہر قسم کی مغربی مٹھائی کے ساتھ دیسی مٹھائی بھی لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں پر مختلف چھوٹی چھوٹی چیزیں اور مصنوعی نوادرات والوں نے رونق لگا رکھی ہے۔ اخباروں کے اسٹالز اور کتابیں اور میگزین بھی یہاں مل جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ ہر عمر کے لوگ کتابیں اور رسائل بڑے شوق سے خرید رہے تھے۔

خان صاحب بولے۔ ''کتابوں کی دکانوں پر اتنا رش؟ ان لوگوں کو پڑھنے کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے۔''

بٹ صاحب بولے۔ ''خان صاحب، یہ پڑھے لکھے لوگوں کا ملک ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا میں پڑھا لکھا نہیں ہوں؟''

''آپ کو کبھی پڑھتے لکھتے اور کتابوں کی دکانوں میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''بھائی اسکول، کالج میں جو پڑھ لیا وہی کافی ہے۔ لکھنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ جب ملک سے باہر ہوتا ہوں تو آپ کی بھابی کو ایک خوب صورت کارڈ بھی لکھ دیتا ہوں۔''

ترکی میں کئی اخبارات اور میگزین شائع ہوتے ہیں مگر یہ سب ترکی زبان میں ہوتے ہیں اور تمام اخبارات استنبول سے شائع ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی کا سفر نامہ بھی ہے۔ وہ بھی استنبول سے شائع ہوتا ہے۔

آگے چل کر ایک طرف سفارت خانوں کا طویل سلسلہ ہے۔ پاکستانی سفارت خانہ بھی اسی علاقے میں ہے۔ پاس ہی تالی بلی ہے۔ اس کے آگے کا علاقہ فیشن زدہ نوجوانوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ شراب خانے بھی ہیں۔ یہ قدیم اور جدید کا امتزاج ہے۔ ماڈرن خواتین، جدید ترین مغربی انداز کے ملبوسات میں بوڑھی ترک عورتیں پرانے انداز کے لباس میں گھومتی نظر آتی ہیں۔

فیشن ایبل خواتین کے ساتھ ایک چھوٹے قد کا خوب صورت کتا ضرور ہوتا ہے۔ شاہراہ اتاترک کے چوک میں اتاترک کا گھوڑے پر سوار خوب صورت مجسمہ ہے جس کے ساتھ دو گھوڑ سوار محافظوں کے مجسمے بھی ہیں۔ ترکی کا پرانا پارلیمنٹ ہاؤس اسی سڑک پر ہے۔ نائٹ کلبوں اور شراب خانوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

یہ علاقہ سیاحوں کے لیے بہت دلکشی کا باعث ہے کیونکہ چھوٹے، سستے ہوٹل اور مہنگے عالیشان ہوٹل اسی علاقے میں ہیں جہاں پر ہر قیمت اور کرائے کا ہوٹل مل جاتا ہے۔ یہاں ہر ایک کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ فیشن زدہ خواتین بھی سگریٹ نوشی کرتی نظر آتی ہیں۔ حیرت ہے کہ سگریٹ نوشی پر یہاں کوئی پابندی نہیں ہے۔

ترکی میں اتاترک کو جلالت کبیر بھی کہا جاتا ہے۔ کچھ فاصلے پر اتاترک کا مزار ہے۔ چاروں طرف درختوں اور سبزہ زاروں سے گھرا ہوا یہ مزار جدید تعمیرات کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں سفید سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ بہت بارعب اور خوب صورت لگتا ہے۔ اتاترک کے دست راست اور وزیر اعظم عصمت انونو کا مزار بھی اس کے پہلو ہی میں ہے۔

ریڈیو انقرہ کے نزدیک تجلیک پارک ہے۔ اسکولوں ... آس پاس کے خوب صورت مناظر دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے کہ آخر ہماری پاکستانی حکومتیں عوام کی سہولتوں، خوشیوں اور آرام کا اتنا خیال کیوں نہیں رکھتیں۔ ترک منگولوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ خونخوار، وحشی درندے، جنہوں نے طوفان کی طرح صحراؤں اور پہاڑوں کی خانہ بدوشی کو چھوڑ کر سیلاب کی طرح آدھی دنیا کو بہا لے گئے۔ جب چنگیز خان جیسا ان پڑھ، جاہل اور خون کا پیاسا انسان کی قوم اس قدر مہذب، تعلیم یافتہ، ترقی یافتہ ہو سکتی ہے تو پھر ہماری قوم تو ان سے بدرجہا بہتر ... دنیا کے حالات سے واقف اور تعلیم یافتہ بھی ہیں تو پھر ہم آج پسماندہ اور تہذیب سے بے تعلق کیوں ہیں۔

استنبول اور دوسرے شہروں میں ہم نے ٹریفک اس قدر منظم دیکھا کہ رشک آنے لگا۔ کیا مجال جو سڑک پر کوئی کار والا ہارن بجائے۔ یہ اخلاقی طور پر بھی برا سمجھا جاتا ہے اور دوسرے کاروں والے اتنی حیرت سے ہارن بجانے والے کو دیکھتے ہیں کہ وہ خود ہی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ سڑکوں پر لڑنا جھگڑنا اور تو تو میں میں کا ایک واقعہ بھی نظر نہیں آیا۔ بس ٹرام میں سوار ہوتے ہوئے بھی دھکم پیل نہیں ہوتی۔ خاموشی سے قطار بنا کر لوگ سوار ہوتے ہیں لیکن پہلے باہر آنے والے کو راستہ دیتے ہیں۔ سڑک پر کسی کو بلند آواز سے پکارنا تو دور کی بات ہے کسی جگہ ایک سے زیادہ لوگ ہوں تو اس طرح آہستگی سے بولتے ہیں جیسے اشاروں کی زبان سے باتیں کر رہے ہیں۔ بقول بٹ صاحب ہر وقت کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں جیسے کسی کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے۔

ہم نے کہا۔ ''سبب صرف ایک ہے، اس کا نام چنگیز خان ہے۔''

سب نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کی ترقی اور تہذیب کا سبب چنگیز خان ہے؟ وہ اجڈ جنگلی، سنگ دل درندہ؟''

''جی ہاں، جسے آپ جنگلی، اجڈ اور درندہ کہہ رہے ہیں وہ ایک بہت اچھا لیڈر تھا۔ بہت بہادر سپہ سالار تھا۔ اس کی جنگی حکمت عملی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ وہ اپنے قبیلے اور قوم سے مخلص تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے ایک دوسرے کے جانی دشمن قبیلوں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کر دیا تھا۔ اس کی قائدانہ صلاحیت اس زمانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔ اتنی سی بات آپ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔

بھائیوں اچھے لیڈر ہی اچھی قومیں بناتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو دیکھ لو، ایک دبلے پتلے، کمزور انسان انگریزوں اور ہندوؤں کی مشترکہ طاقت سے ٹکرا گئے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی مگر قوم کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں آخر دم تک باقی رہا۔ اس لیے کہ وہ سچے، کھرے، بہادر، بے خوف اور بے باک آدمی تھے۔ اس اکیلے اور دبلے پتلے آدمی نے دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک بنا دیا۔ ان کی دیانت داری، ذہانت اور قابلیت کا اعتراف ان کے دشمن بھی کرتے تھے۔ ان کا دامن ہر قسم کے داغ سے پاک تھا۔ انہوں نے قوم کی رہنمائی کی خاطر اپنی دولت برسانے والی وکالت چھوڑ دی۔ قوم سے انہوں نے کبھی کچھ نہیں مانگا سوائے جدوجہد اور ایثار کی۔ جب وہ دنیا سے گئے تو اپنا سب کچھ قوم کو دے گئے۔

وہ ایک لیڈر تھے جنہوں نے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو کروڑوں ہندوؤں اور انگریزوں کی بے پناہ طاقت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔''

ہم جوش میں بولتے چلے گئے۔ جب ذرا سانس لینے کو رکے تو بٹ صاحب نے کہا۔ ''آفاقی صاحب! ہم یہاں سیر کرنے آئے ہیں لیکچر سننے نہیں۔ یہ جو آپ نے بتایا ہے ہم بھی تاریخ اور جغرافیہ جانتے ہیں۔ بچپن میں کاغذ کے جھنڈے لہراتے پھرتے اور بن کے رہے گا پاکستان، لے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ پاکستان تو ہم نے بنایا ہے۔ آپ بلاوجہ لیکچر دینے کھڑے ہو گئے۔''

''اچھا بھئی، یہ بحث چھوڑیے اور سوچیے کہ کل ہمیں انقرہ جانا ہے۔''

''بلاوجہ اس کا نام انقرہ رکھ دیا۔'' بٹ صاحب بولے۔ ''انگورہ کتنا اچھا اور میٹھا نام تھا۔ نام لو تو منہ میں پانی بھر آتا ہے۔''

''جی۔'' خان صاحب نے کہا۔ ''مگر بٹ صاحب، انگور کھٹے بھی ہوتے ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''اگر کل واقعی انقرہ جانا ہے تو ہمیں جلدی ہوٹل پہنچنا ہوگا۔''

''جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ کیا فلائٹ لیٹ ہو رہی ہے؟''

''ابھی ہوٹل جا کر فیصلہ کرنا ہوگا کہ بس سے جائیں گے، ٹرین میں یا ہوائی جہاز سے، پھر پیکنگ کر کے بقیہ سامان ہوٹل والوں کے پاس رکھوانا ہوگا۔''

''ہاں یہ بہت اچھی ترکیب ہے۔ ہمیں ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔''

''کیوں نہیں دینا پڑے گا؟''

''اس لیے کہ کرایہ تو کمرے کا ہوتا ہے۔ ہمارا سامان تو کسی اسٹور میں رکھ دیں گے۔''

خان صاحب نے کہا۔ ''بٹ صاحب اگر یہ مذاق ہے تو اس پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ اگر حقیقت میں آپ یہی سمجھتے ہیں تو آپ سے بڑا بے وقوف سارے ترکی میں مشکل ہی سے ملے گا۔''

''خیر اس وقت بحث کرنے کا وقت نہیں کیونکہ ہم لوگ جلدی میں ہیں بلکہ اب تو ہمیں فوراً ڈولماس لینی ہوگی۔ میں اتنا سفر نہیں کر سکتا کہ پہلے ہوٹل جاؤں اور پھر انقرہ۔''

بحث کا بقول ان کے وقت نہیں تھا اس لیے ہم نے خاموشی سے ٹیکسی روک کر ہوٹل جانا مناسب سمجھا۔ ہوٹل پہنچ کر بٹ صاحب ایک دم اداس ہو گئے۔

''کیوں بھئی، کیا یاد آ گیا؟''

''اس لڑکی کی ڈیوٹی سویرے سویرے ہوتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھوں۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔ اب تک کنواری ہے۔''

''تو دوسری بھابی بنا کر پاکستان لے چلو۔''

''تم بٹ فیملی کو نہیں جانتے، ایسے معاملوں میں تو سنگی ہو جاتے ہیں۔''

بڑے صاحب سے چابیاں لے کر ہم نے بتایا کہ ہم کل صبح جا رہے ہیں۔ آپ بل وغیرہ تیار رکھیے گا۔

مرزا اشرف کے کمرے میں میٹنگ ہوئی کہ انقرہ کیسے جائیں۔ ہم ریل گاڑی کے حق میں تھے۔ خان صاحب بس کے حامی تھے مگر بٹ صاحب ہوائی جہاز سے جانا پسند کرتے تھے۔ آخر کار فیصلہ ہو گیا کہ بائی ائر جائیں گے۔ مرزا اشرف نے فلائٹ کے اوقات دریافت کیے تو دوسری طرف سے جواب ملا۔

''نو پرابلم، ہر ایک گھنٹے بعد فلائٹ انقرہ جاتی ہے۔ آپ جس وقت آئیں ٹکٹ خرید لیں۔''

دوسرے دن ناشتے کے لیے بٹ صاحب سب سے پہلے پہنچ گئے مگر بہت مایوس ہوئے جب پتا چلا کہ ہیروئن آج چھٹی پر ہیں۔

بٹ صاحب نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے اس ہوٹل کے درو دیوار سے مل کر رو دوں۔''

''وہ بہت ہیں کر لینا، فی الحال ناشتے کا آرڈر تو دیجیے۔''

''ناشتا کیسے کروں گا۔ میرے حلق سے تو ایک نوالہ بھی نہیں اترے گا۔''

مگر ناشتا شروع ہوا تو بٹ صاحب چار انڈے اور چار ٹوسٹ کھا گئے پھر پوچھا۔ ''کوئی سوئٹ ڈش ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''بٹ صاحب، صبر کریں باقی دس بارہ انڈے اور ٹوسٹ ہوائی جہاز میں کھا لینا۔''

بٹ صاحب باول نخواستہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ڈائننگ ہال میں ہی ڈولماس، ڈولماس پکارنے لگے۔

''بٹ صاحب ذور مین سے کہیں گے دو ٹیکسی منگوائے گا۔''

استنبول کے انٹرنیشنل ائر پورٹ سے کچھ فاصلے پر انقرہ جانے والا ائر پورٹ تھا جو سائز میں کم لیکن انتہائی نفیس اور چمکتا ہوا تھا۔ یہاں استنبول ائر پورٹ کے مقابلے میں چہل پہل کم تھی۔

فلائٹ وقت پر رخصت ہوگئی۔ ترکش ایئر لائنز کے طیارے بہترین ہیں۔ سروس ایسی تیز کہ ابھی آپ نے کافی کی پیالی ختم بھی نہیں کی کہ ائر ہوسٹس پیالی اٹھا کر لے گئی۔ لڑکیوں کا لباس مغربی ایئر ہوسٹس جیسا تھا۔ صورت شکل ایسی کہ بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔

''آفاقی صاحب، دونوں کو اپنی فلموں کے لیے سائن کر لیجیے۔''

ہم نے کہا۔ ''بٹ صاحب سارا استنبول بلکہ پورا ترکی حسین عورتوں سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ ہم کتنی لڑکیوں کو سائن کریں گے۔''

مسافروں کو لنچ پیک دیے گئے۔ اتنے مختصر سفر میں کافی تھا۔ طیارہ یوں لگا جیسے ابھی بن کر آیا ہے۔ ابھی ہم نے لنچ باکس ختم بھی نہیں کیے تھے کہ انقرہ پہنچنے کا اعلان ہو گیا۔

''لیجیے، ہم ترکی کے دارالحکومت انقرہ پہنچ گئے۔''

مصطفیٰ کمال کا انقرہ میں قومی ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا تھا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ سختی سے سیکولرازم کے قائل ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے اقتدار سنبھالنے کے بعد سب کچھ بدل کر رکھ دیا اور مذہب کو حکومت اور معاشرے سے خارج کر دیا۔ انہوں نے بڑی سختی سے ملک کو سیکولر بنا دیا۔ اور مغربی لباس اور طرز زندگی کو اپنایا۔ اتاترک کی وفات کے بعد بھی کافی عرصے تک یہاں سیکولرازم کا راج رہا لیکن اب تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ترکوں کی اکثریت اسلام پسند ہے اور یہ طبقہ اب ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔

ترکی میں نان گول ہوتے ہیں نہ فرانس کی طرح کھڑکیوں کی طرح لمبے، یہ لمبوترے ہوتے ہیں اور دکانوں پر انہیں سامان نمائش کی طرح لٹکایا جاتا ہے۔ ہم نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ ڈونر کباب سے پہلے سلاد اور فرنچ فرائز لائی گئیں۔ اس کے بعد کھانا آیا تو ایک موٹا نان پلیٹ میں رکھا تھا جس پر کباب تھے۔ اس کے اوپر ایک اور نان تھی۔ بیچارے پیٹو آدمی بھی یہ دو نان اور کباب تنہا ختم نہیں کر سکتا۔ یہ نان ضائع ہی ہو جاتے۔ ویسے ترکی کے شہروں میں ہر قسم کا کھانا مل جاتا ہے۔ ترکی کے مخصوص کھانے بھی بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ ہر شہر کے ٹیکسی والے کی کوشش ہوتی ہے کہ پرانا شہر ضرور دیکھے اور واقعی ترکی کے پرانے شہروں کا ماحول اور طور طریقے آج بھی پہلے کی طرح ہیں۔ اس میں چھوٹی دکانیں، پتلی سڑکیں، گھروں کی دیواروں سے دیواریں ملی ہوئی ہیں جن پر کھڑی ہو کر عورتیں گپ شپ کرتی ہیں۔ وہی پرانے لاہور کا نقشہ ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ترکی کے پرانے شہر بہت اچھی حالت میں اور نہایت صاف شفاف ہیں۔ کاش کوئی ہمارے پرانے شہروں کو بھی یہ رنگ روپ دے۔

ختم شد

جولائی

منظر امام

عیسوی سن کے اس اہم مہینے کا تذکرہ جو مشرق میں لُو دیتا ہوا آتا ہے. چلچلاتی گرمی کے اس مہینے میں بہت سارے اہم واقعات رونما ہوئے مگر یہاں صرف قابلِ ذکر واقعات مذکور ہیں۔ معلومات میں اضافہ کی خاطر عیسوی سن کے ساتویں مہینے کا تذکرہ

باذوق قارئین کے لیے تحفہ خاص

جولائی جارجین اور جولین کلینڈر کے مطابق سال کا ساتواں مہینا ہے۔ یہ نام مشہور روی جنرل جولیس سیزر کے اعزاز میں رکھا گیا ہے۔ جولیس سیزر ایک افسانوی کردار بن چکا ہے۔ وہ اسی مہینے پیدا ہوا تھا۔

جولائی کا مہینا زمین کے شمالی حصے پر سخت سردی کا دوسرا مہینا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے جنوبی حصے میں شدید گرمی ہوتی ہے۔

یہ مہینا تیز بارشوں اور گرج چمک کا بھی ہے۔

GIFSDAPRIN

JULY

اب آئیں جولائی کا تاریخ وار جائزہ لیتے ہیں۔
پہلی جولائی
پہلی جولائی 1939ء میں Emily mcculy کی پیدائش ہوئی تھی۔
اس کے علاوہ مشہور پرنسز لیڈی ڈیانا کی پیدائش بھی اس مہینے 1961 میں پہلی جولائی کو ہوئی تھی۔ ڈیانا کے باپ کا نام جان اسپنسر تھا۔ یہ حسین شہزادی پوری دنیا میں اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے بے حد ہر دل عزیز تھی۔ اسی سلسلے میں ایک بار پاکستان بھی آئی تھی۔
اگست 1996 میں شہزادہ چارلس سے طلاق ہوگئی تھی اور 31 اگست 1997 میں کار کے ایک المناک حادثے میں بری طرح زخمی ہوگئی۔ پیرس کے ایک ہاسپٹل میں انتقال ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف چھتیس برس تھی۔ اس کی اولادوں میں پرنس ولیم، پرنس ہنری اور ڈیانا فرانسس ہیں۔
پہلی جولائی کو دنیا بھر میں بالعموم اور ہندوستان میں خاص طور پر ڈاکٹرز ڈے منایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ دن ہندوستان کے باکمال فزیشن اور بنگال کے دوسرے وزیراعلیٰ ڈاکٹر بدھان چندر رائے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔
ڈاکٹر بدھان کو 1961 میں بھارت کا سب سے بڑا اعزاز بھارت رتن بھی دیا گیا تھا۔
کینیڈا میں اسی تاریخ کو کینیڈا ڈے مناتے ہیں۔ کیونکہ پہلی جولائی کو 1867 میں کینیڈا کی اپنی حکومت وجود میں آئی تھی۔
اسی تاریخ کو انٹرنیشنل جوک ڈے اور نیشنل پوسٹل ورکر ڈے بھی مناتے ہیں۔
پہلی جولائی کو مشہور فلم ساز ادارے M.G.M کا دہاڑتا ہوا شیر ٹریڈ مارک کے طور پر رجسٹر ہوا اور اسی تاریخ کو کوکا کولا کی بوتل کا ڈیزائن منظور ہوا تھا۔
پہلی جولائی 1818 کو ہنگری کے سائنس دان Semmal Iquaz کی پیدائش ہوئی۔ یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے پتا چلایا کہ بہت سی چھوت کی بیماریاں صرف ہاتھوں کے گندے رہنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اگر ہاتھوں کو صحیح طریقے سے دھویا جائے تو ایسی بیماریوں سے بچا جاسکتا ہے۔
1908 میں ایسٹی لاؤڈر کی پیدائش۔ اس نے ایسٹی لاؤڈر کاسمیٹکس بنایا۔

پاکستان میں پہلی جولائی 1970 میں ون یونٹ کا خاتمہ ہوا۔
دو جولائی 1962 میں آرکنساس میں پہلا وال مارٹ کھولا گیا۔ پاکستان میں 2 جولائی 1972 میں شملہ معاہدہ ہوا تھا۔ دو جولائی کو فرانس کے کان کنی کے انجینئر مارسل برٹرینڈ کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پہاڑوں کے اندر پیدا ہونے والے ہیروں کا پتا چلایا۔
2 جولائی 1888 میں waks Solman امریکی سائنس دان کی پیدائش۔ 1951 میں اس نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔
1906 نیوکلیئر سائنس دان ہانس بیتھ کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ وہ ایٹم بم کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ اس نے 1967 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔
2 جولائی 1932 میں ڈیو تھامس کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو کھانے پینے کا شوق تھا۔ اسی لیے اس نے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ "وینڈی" کھولا۔ اور اس وقت نہ صرف امریکا بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں وینڈی ریسٹورنٹ کی چین ہے۔
دو جولائی 1907 کو uaefely Enil نے الیکٹرک کنڈکٹر کو Wrappe کرنے کا طریقہ پیٹنٹ کروایا تھا۔
دو جولائی 1900 میں پہلے زیپلین (Zeppelin) کی پرواز ہوئی۔
کاؤنٹ فرڈی ننیڈ زیپلن نے 1897 سے زیپلن کے آئیڈیا پر اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ ایک آرمی آفیسر تھا۔
بالآخر 2 جولائی 1900 میں اس نے زیپلن بنا کر پرواز کا تجربہ کیا جو بہت کامیاب رہا۔ اس زیپلن کا نام LZ-3 تھا۔
1914 تک زیپلن کو بہت بہتر بنا دیا گیا۔ اس کی رفتار 136 میل فی گھنٹے تھی۔ وہ 4250 میٹر کی بلندی تک پرواز کرسکتا تھا اور اس میں ساڑھے چار ہزار پاؤنڈ بارود لے جانے کی صلاحیت تھی۔
3 جولائی 1979 کو ریڈیو سٹی میوزک ہال رجسٹر ہوا تھا۔
چار جولائی کو امریکا میں یوم آزادی منایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ امریکا میں برطانیہ کی نو آبادی تھی۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد امریکا کو آزادی حاصل ہوئی۔
4 جولائی 1776ء میں امریکا برطانیہ سے آزاد ہوا تھا۔ اس لیے یوم آزادی اسی یاد میں منایا جاتا ہے۔
4 جولائی کو نیشنل کنٹری میوزک ڈے منایا جاتا ہے۔
4 جولائی 1753 فرانسیسی ہوا باز فرنچ پاری کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے نارتھ امریکا میں پہلی بار غبارے سے پرواز کی تھی۔
1810 میں ٹیلر برنم کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے مشہور سرکس برنم بیلی کی ابتدا کی تھی۔
1883 میں Rube gold burg کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے صحافت کی دنیا میں اپنے سیاسی کارٹونز سے پوری دنیا کے اخبارات کو ایک نئی راہ دکھادی۔
4 جولائی 1885 کو لوئس بی میئر کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے دنیا بھر کے مشہور ترین فلم ساز ادارے میٹرو گولڈ وائن میئر کی بنیاد رکھی تھی۔ اس شخص نے پہلی بار دنیا بھر میں اسٹار سسٹم متعارف کروایا تھا۔
ایجاد کے شعبے میں چار جولائی 1933 میں ولیم کوج نے ایکسرے ٹیوب پیٹنٹ کروایا تھا۔ اس ٹیوب کو کوج ٹیوب کہتے ہیں۔
پاکستان میں 4 جولائی 1969ء کو پاکستان اور ہندوستان رن کچھ کے نقشے پر متفق ہوئے تھے۔ چار جولائی 1995 کو سندھ کی حکومت نے شام کے چھ اخبارات سے پابندی ختم کی تھی۔
پانچ جولائی 1810 P.T.Burnum کی پیدائش ہوئی تھی۔
کانی کٹ میں پیدا ہونے والا برنم ایک انتہائی دلچسپ اور ذہین شخص تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو مٹی کو سونا بنانے کا ہنر جانتا تھا۔ اس نے بے شمار دولت اپنی ذہانت اور شطرنج کی سی چال چلتے ہوئے حاصل کی۔
صرف بارہ سال کی عمر میں اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز لاٹری کے ٹکٹ فروخت کرنے سے کیا تھا۔ کچھ بڑا ہوا تو اس کی ملاقات ایک ایسی بوڑھی عورت سے ہوئی جس کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی عمر ایک سو ستر برس ہے اور وہ جارج واشنگٹن کی نرس رہ چکی ہے۔
برنم جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کے باوجود اس نے اس عورت سے ایک معاہدہ کرلیا۔
برنم نے اس عورت کو دیکھنے کے لیے ٹکٹ لگا دیا تھا۔
اس نے اس عورت کی خوب پبلسٹی کی۔ لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔
برنم نے خوب پیسے کمائے۔ اس کے بعد اس نے دنیا بھر کی فالتو چیزیں جمع کرکے یہ اعلان کردیا کہ یہ سب نوادرات ہیں جو اس نے دنیا کے مختلف ملکوں سے حاصل کی ہیں۔ یہ نمائش بھی بہت کامیاب رہی۔
برنم اسی طرح دولت سمیٹتا چلا گیا۔ اس نے اپنی سوانح عمری بھی لکھی تھی۔ انوکھی سوانح عمری کی بھی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔
5 جولائی 1794 کو سلوا سٹر گراہم کی پیدائش ہوئی۔ اس نے گراہم کریکر بنایا تھا۔
1891 پانچ جولائی کو جان نارتھروپ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1946 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔
5 جولائی 1904 میں جرمنی بایولوجسٹ ارنسٹ میئر کی پیدائش ہوئی تھی۔
پاکستان میں 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیا نے مارشل لا نافذ کیا تھا۔
6 جولائی کو پہلا تصویری پوسٹ کارڈ بنایا گیا تھا۔
6 جولائی 1904 میں البرٹ گورال نے ریلوے سوئچ متعارف کروایا تھا۔
6 جولائی 1884 کو ہارولڈ انڈر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے ایک گیم کنٹریکٹ برج متعارف کروایا تھا۔
7 جولائی 1989 میں وارنر برادرز نے اپنے کردار BAT MAN کو متعارف کروایا تھا۔ یہ کردار فلموں اور کارٹون میں بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اب تک اس کردار پر بہت سی فلمیں بن چکی ہیں۔
ایسا لگتا ہے جیسے مغرب میں حقیقی انسان کی کمی ہوگئی ہے۔ اس لیے اس قسم کے انسان سامنے آتے رہتے ہیں جیسے اسپائیڈر مین اور سپر مین وغیرہ۔
7 جولائی کو جوزف میری جیک ارڈ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے کپڑے کی صنعت کے لیے شٹل بنایا تھا۔ جس سے پیچیدہ ترین بنائی کا کام بھی آسان ہوگیا۔
آٹھ جولائی کو 1835 میں ایک حادثہ ہوا تھا۔ جان مارشل کی تدفین کے وقت جب رسم کے مطابق لبرٹی بیل بجایا جا رہا تھا جو بہت وزنی تھا تو اچانک وہ ٹوٹ کر لوگوں پر

آگرا۔اس سے بہت نقصان ہوا تھا۔

8 جولائی 1873 وہ تاریخ ہے جب پہلی بار اینا نکلوس نام کی ایک خاتون کو پیٹنٹ کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا تھا۔ یعنی وہ جس ایجاد کو چاہے منظور یا نامنظور کر سکتی تھی۔

8 جولائی 1972 کو پاکستان میں بھی ایک افسوسناک سانحہ ہوا۔اس تاریخ کو بدقسمتی سے کراچی میں لسانی فسادات پھوٹ پڑے تھے۔

8 جولائی 1986 کو پشاور ڈرائی پورٹ کا افتتاح ہوا تھا۔

8 جولائی 1995 میں واپڈا نے بجلی کے بل میں ریکارڈ اضافہ کردیا۔ یہ اضافہ 14.50 فی صد تھا جس سے لوگ بلبلا اٹھے تھے۔

9 جولائی 1802 میں تھامس ڈارن پورٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔اس شخص نے ایک مکمل الیکٹرک موٹر بنائی تھی۔

9 جولائی 1819 الیس ہوم کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے امریکا کی پہلی سلائی مشین بنائی تھی۔ 9 جولائی 1856 نکولا ٹیسلا کی پیدائش۔ اس نے کئی ایجادات کیں جن میں ریڈیو ایکسرے ویکیوم ٹیوب اور ایمپلی فائر شامل ہیں۔

9 جولائی 1911 جارج آرچ جس نے بلیک ہول اور وارم ہول کی اصطلاح دی۔

پاکستان میں 9 جولائی 1948 کو پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ جاری ہوا۔

9 جولائی 1967 کو کراچی میں محترمہ فاطمہ جناح کا انتقال ہوا تھا۔

9 جولائی 1968 کو امریکی فریڈرک شال یا مرنے دستی لیزر گن متعارف کروایا۔ یعنی جسے بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔

دس جولائی 1847 کو رچرڈ ہوئی نے مشہور روٹری پرنٹنگ پریس متعارف کروایا۔ یہ پرنٹنگ پریس آج اسی نام سے دنیا کے کئی ممالک میں قائم ہے۔

دس جولائی 1879 وٹامن اے دریافت کرنے والے میری نکولس کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اب یہ وٹامن ہماری خوراک کا ایک اہم جز بن گیا ہے۔

10 جولائی 1902 میں جرمن سائنس دان کرٹ آلڈر کی پیدائش ہوئی تھی۔اس نے 1950 میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

10 جولائی 1920 امریکی فزسٹ اووین چیمبرلین کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے پروٹون دریافت کیا اور اس کام پر اسے 1959 میں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔

دس جولائی 2006 کو اردو کے مشہور ادیب اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کا انتقال ہوا تھا۔ قاسمی صاحب کا نام احمد شاہ اعوان تھا۔ آپ 20 نومبر 1916 میں خوشاب میں پیدا ہوئے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے جرنلسٹ تھے۔ قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ بے شمار اعزازات حاصل کیے۔ ستارہ امتیاز (1980) پرائڈ آف پرفارمنس (تمغہ حسنِ کارکردگی) وغیرہ۔

کتابیں۔ شاعری کے مجموعے جلال و جمال، شعلۂ گل، کشتِ وفا۔ ان کے چند مشہور افسانے۔ چوپال، گنڈاسہ، سناٹا، کپاس کا پھول، آبلے، طلوع و غروب۔ آنچل وغیرہ۔ انتقال لاہور میں دس جولائی 2006 کو ہوا۔

ان کی وفات پر BBC نے تبصرہ کیا۔ Pakistan literary giant is dead

گیارہ جولائی 1899 میں E.D.White کی پیدائش ہوئی۔

یہ امریکا کا بہت بڑا ادیب تھا۔ اس نے 1921 میں گریجویشن کی۔ اس سے پہلے ہی اس نے لکھنا شروع کردیا تھا۔ بہت کم عرصے میں اس نے امریکی ادب کو کئی خوبصورت کتابیں دیں۔ جن کا شمار کلاسک میں ہونے لگا ہے۔

ایک بار کسی نے اس سے پوچھا۔ ”کیا اس کی کہانیاں حقیقت ہوتی ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں تصوراتی ہوتی ہیں کیونکہ حقیقی زندگی صرف ایک طرح کی ہوتی ہے دکھوں سے بھری ہوئی۔ باقی سب خواب ہوتے ہیں۔“

11 جولائی 1838 ایک ذہین اور جدت پسند تاجر جان رانامیکر کی پیدائش۔ اس نے تجارت کے شعبہ میں کئی جدتیں کیں۔ جیسے پہلی بار مکمل ڈیپارٹمنٹل اسٹور قائم کیا۔ مختلف اشیا پر قیمتوں کے ٹیگ لگوائے۔ اس نے اسٹور میں پہلی بار ریسٹورنٹ بھی قائم کیا۔

گاہکوں کے لیے منی بیک گارنٹی کی اصطلاح بھی اسی نے دی اور اپنے اسٹور کے لیے اخبارات میں اشتہارات شائع کروانے کا سلسلہ شروع کیا۔

گیارہ جولائی 1950 پاکستان نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جوائن کیا۔ اس بار گیارہ جولائی کو 17 رمضان ہے۔ 17 رمضان کو غزوۂ بدر ہوا تھا۔ بدر کے نام

سے دو غزوات کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک ہے بدر اولیٰ اور دوسرا ہے بدر کبریٰ۔ بدر اولیٰ۔ مدینہ میں حضرت زید بن حارثؓ کو چھوڑ کر آپؐ اس غزوے میں تشریف لے گئے تھے۔ بدر کبریٰ۔ اس غزوے میں ایک تخت آپؐ کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے تیر اندازی کی۔ اس غزوے میں فرشتے ساتھ ہوتے تھے (بہ حوالہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا)

گیارہ جولائی 2003 اٹھارہ ماہ بند رہنے کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بس سروس دوبارہ شروع ہوئی تھی۔

بارہ جولائی 1854 کو جارج ایسٹ مین کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کوڈک کیمرا بنایا تھا۔ اس کے علاوہ فوٹوگرافی کا رول بھی بنایا۔

بارہ جولائی 1913 امریکی فزسٹ جس نے ہائیڈروجن ایٹم میں الیکٹرون کی سرگرمی کا پتا چلایا۔ 1955 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

بارہ جولائی 1730 میں برطانیہ میں جوسیا ویڈوڈ کی پیدائش ہوئی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے جدید برتن سازی شروع کی۔ آج جو آپ گھروں ہوٹلوں اور بازاروں میں جدید قسم کے خوبصورت برتن دیکھتے ہیں ان کو بنانے کی ابتدا اس نے کی تھی۔

1849 میں کینیڈا کے فزیشن ولیم اوسلر کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو جدید میڈیسن کا فادر کہا جاتا ہے۔

12 جولائی 1959 کو شکریہ خانم پاکستان کی پہلی خاتون پائلٹ بنی تھیں۔

چودہ جولائی 1857 میں فریڈرک ماتاگ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے واشنگ مشین بنائی تھی۔

اسی تاریخ کو 1918 میں جے فورسٹر پیدا ہوا۔ اس نے ڈیجیٹل کمپیوٹر بنایا۔

چودہ جولائی 1912 برطانوی سائنس دان جیوفری ول کنسن کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اسے جدید کیمسٹری کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے 1973 میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

14 جولائی 1924 میں اسکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر جیمز کی پیدائش۔ اس نے 1988 میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

سارہ گوڈی پہلی سیاہ فام خاتون تھی جس نے چودہ جولائی کو اپنے پروڈکٹ کو پیٹنٹ کروایا۔

پاکستان میں 14 جولائی 1950 میں قائداعظم کے گھر وزیر مینشن کو قومی ورثہ قرار دیا گیا۔

چودہ جولائی 2005 میں KPK میں حسبہ بل منظور ہوا۔

15 جولائی 1817 برطانوی انجینئر جان ناؤلر کی پیدائش۔ اس نے لندن میٹروپولیٹن ریلوے بنایا تھا۔

پندرہ جولائی 1954 میں پہلے بوئنگ طیارے کی پرواز ہوئی تھی۔

پندرہ جولائی 1971 میں یاسمین کے پھول کو پاکستان کا قومی پھول قرار دیا گیا۔

15 جولائی 2001 میں آگرہ کے مقام پر پرویز مشرف اور واجپائی کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے۔

15 جولائی 1985 میں Paul Brainard نے پہلا پروگرام AL Dos Page maker متعارف کروایا۔

اس ایجاد سے پبلشنگ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔

کتاب کے لے آؤٹ سے لے کر کلر اسکیم تک یہ ایجاد انتخاب کرکے سامنے رکھ دیتی ہے۔

سولہ جولائی 1969 میں اپالو گیارہ نے چاند کی طرف پرواز کی۔ انسانی تاریخ کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس مہم کی قیادت نیل آرم اسٹرونگ نے کی تھی۔ اس کے ساتھ دو اور بھی تھے۔

سولہ جولائی 1704 بیری نوئی کی پیدائش کی تاریخ۔ اس نے لوم کے لیے شٹل بنایا۔ 1801 جرمن ریاضی داں جولیس پلوکر کی پیدائش۔ جس نے پلوکر فارمولا دیا۔

سولہ جولائی 1888 میں Frits- Zernike کی پیدائش۔ اس شخص نے Contrast Microscope بنایا تھا۔ جس سے بے رنگ عناصر بھی دکھائی دیں۔ 1953 میں اس نے نوبل پرائز حاصل کیا۔

سترہ جولائی 1932 Karla Kaskin کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ کارلا نیویارک میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی وفات 20 اگست 2009 کو سیاٹل میں ہوئی۔ کارلا کو بچوں کے ادب کی باکمال رائٹر کہا جاتا ہے۔ یہ بہت اچھی شاعرہ بھی تھی۔ اس نے نیشنل بک ایوارڈز کے علاوہ

اور بھی کئی اعزازات حاصل کیے۔ اس نے پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔

سترہ جولائی 1955 میں ڈزنی لینڈ کا افتتاح ہوا تھا۔ ڈزنی لینڈ ایک ایسی طلسماتی دنیا ہے۔ جہاں جانے والا اپنے آپ کو کہیں اور محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ والٹ ڈزنی کے خوبصورت خواب کی خوبصورت تخلیق ہے۔ کیلی فورنیا میں واقع اس پارک کو دنیا کا پہلا تھیم پارک کہا جاسکتا ہے۔ اس میں پورا ایک شہر آباد ہے۔

سترہ جولائی 1957 کو پاکستان میں نگار ایوارڈ کا اجرا ہوا۔

نگار ایوارڈ کو پاکستان کے سب سے بڑے اور مستند ایوارڈ کی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری کی ترقی میں نگار ایوارڈ کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ الیاس رشیدی (مرحوم) نے پاکستان کی فلم انڈسٹری کی حوصلہ افزائی کے لیے اس ایوارڈ کا اجرا کیا تھا۔ 46 سال باقاعدگی سے دیے جانے والا یہ ایوارڈ کئی برسوں سے تعطل کا شکار ہے۔

17 جولائی 1991 کو پاکستان اور چین کے اشتراک سے بنا ہوا الخالد ٹینک سامنے آیا۔ یہ ایک خاص جنگی ٹینک ہے۔ اس کے ڈیزائنر ہیں Norinco چائنا اور ہیوی انڈسٹریز ٹیکسلا اور بنانے والے Factory بھی یہی ہیں۔ اس میں عملہ 3 آدمیوں کا ہوتا ہے۔ اس کا وزن 46 ٹن ہے۔ لمبائی 10.7 میٹر۔ چوڑائی 3.50 میٹر۔ بلندی 2.40 میٹر اور اس کی رفتار 72 کلومیٹر فی گھنٹا ہے۔ یہ ٹینک ہمارے انجینئرز اور ماہرین کی دن رات کی کوششوں کا ثمر ہے۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں بھی اس کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا الخالد ٹینک ہندوستان کے ارجن ٹینک سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

18 جولائی کو ڈنمارک کے سائنس دان ہینڈرک کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1900ء۔ نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

18 جولائی 1950 کو۔۔۔ ایک اینٹی بایوٹک ٹیٹرامائی سین بنایا گیا۔

18 جولائی کو۔۔۔۔۔۔۔ پاکستان کے صدر غلام اسحاق خان اور وزیر اعظم نواز شریف نے اپنے دفتر چھوڑ دیے۔ یہ واقعہ 1993 کا ہے۔

انیس جولائی 1814 کو اسلحہ ساز Colt کی پیدائش، کولٹ ریوالور اسی کے نام پر ہے۔ 1835 میں سرجن چارلس مایو کی پیدائش۔ اس نے مایو کلینک کا آغاز کیا۔

19 جولائی 2005 پاکستانی حکومت نے پورے ملک میں دہشت گردی کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا۔

اس سال انیس جولائی فتح مکہ کی تاریخ ہے۔ یہ اسلامی تاریخ کا وہ بے نظیر واقعہ ہے جس نے اسلام کو ایک ایسا انقلاب دیا کہ پوری دنیا اس کے زیر اثر آگئی۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ ”جب اللہ کی مدد اور (مکہ کی) فتح آپہنچے اور وہ آثار جو اس پر کھلنے والے ہیں کہ آپ لوگوں کو اللہ کے دین یعنی اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو آپ رب کی تسبیح کریں اور اس سے استغفار کی درخواست کریں۔ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے (النصر 1-3)

10 رمضان 8 ہجری کو۔۔ جب آپؐ اور آپؐ کے تمام ساتھی روزے سے تھے مسلمانوں کی دس ہزار کی فوج مدینے سے نکلی اور عازم مکہ ہوئی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب اسلامی فوج مکہ میں داخل ہونے والی تھی تو مکہ کے واحد رئیس ابوسفیان نے اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اہل مکہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور یہ لوگ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوگئے۔ اس موقع پر یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اسے امان ملے گا۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا... وہ بھی محفوظ ہے اور جو مسجد الحرام میں داخل ہوگا وہ بھی مامون ہوگا۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ طواف مکمل کرنے کے بعد آپ نے عثمان بن طلحہ سے کعبۃ اللہ کی چابی لی اور کعبہ میں داخل ہوکر بتوں کو توڑنے اور گرانے کا حکم دیا۔ اس وقت آپ کے ہمراہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تھے۔ آپؐ بذاتِ خود اپنے دست مبارک سے پکڑی چھڑی سے بتوں کو گراتے جاتے اور یہ ارشاد فرماتے جاتے۔ ”حق آگیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل مٹنے کے لیے تھا۔“ اس موقع پر آپؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو انسانیت کا مکمل دستور ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسے خطبہ کی مثال نہیں ملتی۔ یہ موقع تھا جب حضرت بلالؓ نے اذان دی... اور خانہ کعبہ میں باجماعت نماز ادا کی گئی۔

بیس جولائی تاریخ انسانی میں پہلی بار انسان نے چاند پر پہلا قدم رکھا اپالو گیارہ کے ذریعے۔ اسی لیے اس تاریخ کو جو دن منایا جاتا ہے اسے مون ڈے کہتے ہیں۔ بیس جولائی کو شطرنج کا عالمی دن بھی منایا جاتا ہے۔

20 جولائی 1947 میں جرمن سائنس دان گرڈ بینگ کی پیدائش ہوئی۔ 1986 میں اس نے نوبل پرائز لیا۔

20 جولائی 2007 میں چوہدری افتخار دوبارہ چیف جسٹس مقرر ہوئے۔

اکیس جولائی کو نیشنل جنک فوڈ ڈے منایا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ جنک فوڈ کھاؤ بلکہ اس لیے کہ نہ کھاؤ۔ کھانے کے علاوہ ہر الم غلم چیزوں کے کھانے کو جنک فوڈ کہتے ہیں۔

21 جولائی 1875 میں مارک ٹوائن کے مشہور ناول کو کاپی رائٹ دیا گیا۔

اکیس جولائی 1984 میں امریکا میں انسان ہی کے بنائے ہوئے ایک روبوٹ نے فیکٹری ورکر کو کچل کر مار دیا تھا۔

21 جولائی 1810 میں ایک فرانسیسی کیمسٹ کی پیدائش۔ اس نے تھرمل پراپرٹیز پر ریسرچ کیا تھا۔

21 جولائی 1923 کینیڈین کیمسٹ ـــــ نے مارکس نمبوری پیش کی۔ 1992 میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

22 جولائی 1822 جارج مینڈل کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ یہ جینز کا سائنس دان تھا۔ اس نے انسانی ساخت میں اصولِ وراثت دریافت کیا۔ یعنی ہماری بہت سی عادتیں، بیماریاں وغیرہ ہمارے بزرگوں کی طرف سے ہم میں منتقل ہوتی ہیں۔

1887 میں جرمنی کے سائنس دان گستاؤ ہرٹز کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1925 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

1908 میں ایمی وانڈر کی پیدائش۔ یہ ایک اسکول ٹیچر تھی۔ اس نے ایک اصطلاح متعارف کروایا۔ جس کو ہم ایٹی کیٹ کہتے ہیں۔

یعنی ہمارا سماجی اور معاشرتی رویہ۔ عام بول چال میں استعمال کیا جاتا ہے کہ فلاں کے پاس ایٹی کیٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہے یا وہ جانتا ہی نہیں کہ ایٹی کیٹ کیا ہوتا ہے۔

تئیس جولائی 1929 میں رابرٹ بش کی پیدائش ہوئی

23 جولائی 1827 کو ہالینڈ کے ہائڈرالک انجینئر ناٹر کلانڈ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے راٹرے ڈیم (ہالینڈ کے ایک شہر) کا واٹر وے بنایا تھا۔

23 جولائی 1898 میں ایلیا کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ وہ خاتون ہے جس نے پہلی بار اٹلانٹک عبور کیا تھا۔

23 جولائی 1904 میں آئس کریم کون متعارف ہوئی تھی۔

پاکستان میں 24 جولائی 1976 میں لاہور اور امرتسر کے درمیان سمجھوتا ایکسپریس کا آغاز ہوا۔ 24 جولائی 1952 کو دوا ساز۔۔۔ ارنس اور یانس پنسلین کو ٹیبلٹ کی شکل میں لائے تھے۔

25 جولائی اس بار 25 جولائی کو یوم القدس منایا جائے گا۔ القدس (بیت المقدس) مسجد اقصیٰ کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک مسجد ہے جس کی بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے عمارت تکمیل تک پہنچائی۔ یہ مسجد شہر یروشلم (فلسطین) میں ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا قبلہ رہا ہے۔ کچھ عرصے تک مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمنا کے مطابق پھر ہمارا قبلہ کعبہ بن گیا۔ قرآن مجید کے دوسرے سپارے سیقول میں اس کا ذکر ہے۔

جب آپؐ معراج پر تشریف لے گئے تو آپ براق پر سوار ہوکر جبرائیل کے ساتھ پہلے تو مسجد اقصیٰ پہنچے اور وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں خدا فرماتا ہے۔ ”وہ خدا پاک ہے جو اپنے بندے (محمدؐ) کو راتوں رات مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا۔ جس کے گرداگرد (دین و دنیا) کی برکتیں دے رکھی ہیں۔ تاکہ ان کو اپنی قدرت کے چند نمونے معائنہ کروائیں۔

26 جولائی 1875 کو کارل یونگ کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک قابلِ ذکر ماہرِ نفسیات ہے۔ یونگ کے نظریات نے اس علم سے دلچسپی رکھنے والوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ ایک سوئس ماہر نفسیات تھا۔ اس نے مشرقی اور مغربی فلاسفی پر بہت کام کیا ہے۔ اس کے شعبے فلاسفی کے کیمسٹری، آسٹرولوجی، موسیقالوجی آرٹ اور ادب وغیرہ تھے۔ اس کا انتقال 6 جون 1971 میں ہوا تھا۔

26 جولائی 1894 میں برطانوی سائنس فکشن رائٹر آلڈس ہڈلے کی پیدائش ہوئی تھی۔

26 جولائی 1994 میں جوزف کاشین نے ٹیڈی بیئر کا ڈیزائن پیٹنٹ کروایا۔

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں۔ برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ۔۔۔بکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھبر کر بے بس کر دیا۔ اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرد نگی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی۔ تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کرنے کا کام بہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر وتی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرد نگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرد نگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی۔ تو بانو رہا ہو جائے گی۔ میں نے رامن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ منشی دل آ گیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پا لیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ..." میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پستول نکل کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام اور ؟؟ کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شملہ پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوا دیا۔ میں راج کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آ لگی اور رامن کی آواز ابھری۔ "ہلنا مت شہباز۔" میں نے اسے گھونسے مار کر بے ہوش کیا اور عقبی گلی سے نکل آیا۔ ہوٹل پہنچ کر اسکائپ کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھر والوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کنور کو اغوا کر کے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ بارڈر کراس کرلوں گا۔ اسے اغوا کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا تو امرت سنگھ سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نائف تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اسے میں نے قابو کرلیا۔ اس نے بتایا کہ رامن راج کنور کو نکال لے گیا ہے۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ ہیلی کاپٹر سے راج کنور کا پیچھا کروں گا اور اسے اغوا کر کے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنکاری جب ہیلی کاپٹر واپس لا رہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہو گیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر بری طرح جل کر گر گیا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہو کر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر نئے سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکا بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں۔ جیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھا دی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جیتو کے شانے پہ لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں جیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا سیتا کا شوہر ارون اسے ہراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آتی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ ہمیں ایک دوسری نوکرانی دی گئی۔ ہم حملے کی ریہرسل بھی کر رہے تھے کہ خبر آئی کہ فوراً کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔ ہم فتح خان کے ساتھ ایک دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ وہاں سے ٹہلنے کے لیے نکلا اور ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کرنے لگا تبھی کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا۔ ہوش آیا تو میں کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ رامن سامنے تھا۔ وہ تفتیش کر رہا تھا کہ کنور پیلس پر حملہ ہوا اور دھماکے سے میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو میں نے خود کو کرسی سے بندھا ہوا پایا پھر موقع پا کر آزاد ہو گیا اور نائیک کو الیکٹرک شاک لگا کر ٹھکانے لگایا اور کمرے سے سرنگ میں آ گیا۔ جیتو بھی مل گیا تبھی رامن اور منشی دل نے ہمیں گھیر لیا۔ پتا چلا کہ سادی اور بڑا کنور اب تک محفوظ ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ پوری سرنگ میں ڈیکٹا فون لگا ہے اور یہاں کی باتیں بڑا کنور سن رہا ہوگا۔ تبھی فائرنگ کی آواز سنائی دی اور میں نے چیخ کر کہا؟ "کنور ہوشیار سادی کو لے کر چھپ ---" مگر میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ زبردست فائرنگ شروع ہو گئی پھر سادی کی چیخ سنائی دی۔

(اب آگے پڑھیں)

منشی دل جی سیف ہاؤس کے دروازے کے سامنے یوں تن کر کھڑا ہوا تھا جیسے اس نے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو اور اب اس کے سامنے فاتحانہ کھڑا ہو۔ اندر سے فائرنگ کا شور باہر تک سنائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا جیسے اندر کئی گنوں کے دہانے کھل گئے ہوں۔ فائرنگ کا شور اتنا تھا کہ اس میں کچھ سنائی دینا محال تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ پس منظر میں انسانی چیخوں کا شور بھی تھا۔ سادی کی چیخ اس وقت سنائی دی تھی جب فائرنگ کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے بعد شور بڑھتا چلا گیا تھا کیونکہ ایک کے بعد کئی ہتھیار آتشیں نغمہ سرائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے اور جیتو نے منشی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اس کے آدمی درمیان میں آ گئے۔ انہوں نے ہتھیاروں کی نوک سے ہمیں واپس دھکیل دیا۔ جیتو بھی مضطرب تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔ "شوبی یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے، منشی جی کے آدمی اندر بھی ہیں۔ انہوں نے بڑے کنور کے وفاداروں پر فائر کھول دیا ہے۔"

میں نے تشویش سے کہا اور منشی دل جی کو آواز دی۔ "اگر سادی کو کوئی نقصان ہوا...."

"تو میں ذمے دار ہوں۔" منشی دل جی نے پلٹے بغیر کہا۔ "تم فکر مت کرو بڑے کنور اور سادھنا کو کچھ نہیں ہو گا۔"

اس وقت تک فائرنگ کا شور کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ منشی دل جی واکی ٹاکی تھامے خاموش کھڑا تھا جیسے فائرنگ رکنے کا انتظار کر رہا ہو۔ تقریباً آدھے منٹ بعد اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ منشی نے پوچھا۔ "کیا رہا...."

"سب مارے گئے۔" واکی ٹاکی سے دھیمی آواز آئی۔ "اجیت بھی مارا گیا۔"

"بڑا کنور اور سادھنا؟"

"وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں۔" دوسری طرف موجود شخص نے کہا۔

"دروازہ کھلواؤ۔" منشی دل جی نے حکم دیا۔ اس نے کسی اجیت کے مارے جانے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

شاید اجیت اس کا وفادار تھا جو بڑے کنور کے وفاداروں کی جوابی فائرنگ سے مارا گیا۔ مگر منشی دل جی جیسے لوگوں کے لیے انسان کی اہمیت کسی مچھر سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے اجیت کے مرنے پر ذرا بھی تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے فکر بڑے کنور اور سادی کی تھی۔ کچھ دیر بعد اسی آدمی نے اطلاع دی۔

''انہوں نے چیمبر اندر سے بند کرلیا ہے۔''

''تو اسے کھلواؤ۔'' منشی غرایا۔

''یہ نہیں کھلوا سکتے۔'' بڑے کنور کی آواز آئی۔ ''اسے صرف بم سے اڑایا جا سکتا ہے لیکن اس صورت میں اندر موجود کوئی فرد زندہ نہیں بچے گا۔''

''سادی ٹھیک ہے۔'' میں نے پوچھا۔ یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ بڑا کنور سادی سمیت اپنے چیمبر میں بند ہوگیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں شوبی....'' سادی کی روہانسی آواز آئی۔ ''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''تمہارے لیے سادی۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔''

''آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' سادی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''میں یہاں محفوظ ہوں۔''

''اگر تم اندر محفوظ ہو تو دروازہ کسی صورت مت کھولنا۔'' میں نے بڑے کنور سے کہا۔ ''تم کسی زہریلے ناگ پر بھروسا کر سکتے ہو اس شخص پر نہیں۔''

''اب میں جان گیا ہوں۔'' بڑے کنور نے تھکے لہجے میں کہا۔ ''اس نے مجھے بہت دھوکے سے ڈسا ہے۔ لیکن یہ مجھے زندہ حاصل نہیں کر سکتا۔''

''بکواس بند کرو۔'' منشی غرایا اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اس نے بڑے کنور سے کہا۔ ''دروازہ کھولو ورنہ میں ان دونوں کو شوٹ کردوں گا۔''

''احمقانہ دھمکی ہے۔'' میں ہنسا۔ ''لگتا ہے ناکامی نے تمہارا دماغ الٹ دیا۔ بھلا بڑے کنور کو میری اور بیتو کی جان کی کیا پروا ہوگی۔''

''بیتو بھی یہاں ہے؟'' سادی نے اضطراب سے پوچھا۔

''ہم اِدھر ہے دیدی۔'' بیتو نے جواب دیا۔

''میرے خدا تم بھی اِدھر چلے آئے۔'' سادی مزید پُرتشویش ہوگئی۔ ''اگر میں پھنس گئی ہوں تو لازمی تھا کہ سب یہاں چلے آتے۔''

میں نے پوچھا۔ ''بڑے کنور تم باہر کسی سے رابطہ کرکے مدد طلب نہیں کر سکتے۔''

''نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تمام کمیونیکیشنز بلاک ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہنگامی حالات کے لیے پیلس میں ایک جامر ہے جو تمام مواصلاتی رابطوں کو جو ہائیر بینڈ پر کیے جا رہے ہوں جام کردیتا ہے۔ اس سے موبائل سروس، سیٹلائیٹ موبائل اور انٹرنیٹ سروس بلاک ہوجاتی ہے۔''

''لیکن ہمارے ریڈیو تو کام کررہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ عام ایف ایم بینڈ پر کام کرتے ہیں۔'' بڑے کنور نے وضاحت کی۔ ''ان لوگوں نے سب سے پہلے اس جامر پر قبضہ کرکے اسے آن کردیا تھا۔''

''مگر پیلس کی بجلی اور جنریٹرز اڑا دیے گئے ہیں پھر وہ کیسے کام کررہا ہے؟''

''اس کے ساتھ اس کا اپنا جنریٹنگ یونٹ ہے جو اسے مسلسل پچاس گھنٹے بجلی مہیا کرسکتا ہے۔''

''پچاس گھنٹے میں ہم بجلی بحال کرسکتے ہیں۔'' منشی دل جی بولا۔ ''اس لیے باہر سے رابطے کو بھول جاؤ۔ بڑے کنور دروازہ کھول دو ورنہ میں سچ کہتا ہوں شہباز کو مار دوں گا اور تمہارے علاج کی آخری امید بھی ختم ہوجائے گی۔''

''میں دروازہ کھول دوں تاکہ تم مجھے اور سادی کو مار دو؟'' بڑے کنور نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ ہمیشہ مجھے دھوکا ہی دیتے رہوگے؟''

''دوسری صورت میں تم اندر ہی مروگے۔'' منشی دل جی نے دھمکی دی۔ ''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس دروازے میں ایک سوراخ کرکے اندر زہریلی گیس چھوڑ دی جائے گی اور تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔''

''نہیں باس۔'' اندر موجود منشی دل جی کا آدمی چلّایا۔ ''ایسا نہ کرنا۔''

''تب اس سے دروازہ کھلواؤ ورنہ اس کے ساتھ تم بھی مروگے۔''

''تم یہ حماقت نہیں کروگے۔'' بڑے کنور نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''ہاں میں ابھی یہ حماقت نہیں کروں گا۔'' منشی دل جی نے کہا۔ ''لیکن تم باہر نہیں آؤ گے تو میں یہی کروں گا اور پھر میں تلاش کرکے راج کنور کو بھی مار دوں اور آخر میں اس کے بچوں کو بھی.... اس کے بعد اس جاگیر کا میرے سوا کون وارث رہے گا۔ سب بالآخر میرے قبضے میں آئے گا۔ دوسری صورت وہی ہے جو میں چاہتا ہوں مجھے دے دو اور میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''میں تم پر اعتبار نہیں کرسکتا۔'' بڑے کنور نے جواب دیا۔

وہاں موجود تمام افراد منشی اور بڑے کنور کی گفتگو سننے میں مصروف تھے۔ ان میں ہمارے دو نگران بھی شامل تھے۔ بات کرتے ہوئے منشی نے اچانک رامن کو قریب بلایا اور اسے سرگوشی میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا اور وہاں سے نصف درجن آدمی لے کر چلا گیا۔ منشی نے یقیناً اسے کوئی کام سونپا تھا۔ اوپر سے نیچے آنے والے نصف درجن افراد پہلے ہی مختلف جگہوں پر نگرانی کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اب وہاں منشی کے علاوہ پانچ افراد اور تھے جن میں سے دو ہمارے نگران تھے۔ میرے خیال میں یہ موقع تھا۔ میں ایک بار پھر بیتو کی طرف سرکنے لگا۔ ہمارے درمیان مشکل سے ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں بہ ظاہر منشی کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم بڑے کنور سے کیا چاہتے ہو؟''

''وہ جانتا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں، تمہارا جاننا ضروری نہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے میں تمہاری مدد کرسکوں۔ اگر وہ کوئی قیمتی چیز ہے تو میں بلا تامل اسے حاصل کرنے میں مدد کرسکتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک ساری دنیا کی دولت بھی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔''

''تم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔'' منشی کے بجائے بڑے کنور نے کہا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے میں کر ہی دوں.... لیکن اس کے لیے میرا باخبر ہونا ضروری ہے۔ اتنا تو تم اور منشی جی بھی جانتے ہو میں لالچی آدمی نہیں ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ ورنہ راج کنور کے عشرت کدے میں بے پناہ دولت تھی جسے بانو نے آگ لگا دی، میں چاہتا تو ساری دولت بھی لے جا سکتا تھا لیکن میں نے بس کچھ رقم لی تھی۔ مزے کی بات ہے وہ بھی تقریباً بیکار رہی اور آخر میں جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔'' میں بول رہا تھا اور بولنے کے دوران بیتو کے آگے آرہا تھا۔ منشی دل جی غور سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ معاملہ بہت بڑی دولت کا ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''تو میرا اندازہ درست تھا، تم نے ہمیں بے وقوف بنایا کہ تم جاگیر پر قبضہ کرنا چاہتے ہو اور یہ بات مجھے ہضم نہیں ہورہی تھی۔''

''شہباز جی تم بہت خطرناک آدمی ہو۔'' منشی جی نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی وجہ سے مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھا ورنہ اب تک مجھے مار چکا ہوتا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے یہ کتنی بڑی دولت ہوسکتی ہے؟''

''کتنی ہوگی بلین ڈالرز میں ہوگی اور میرا خیال ہے یہ تراشیدہ یا ناتراشیدہ ہیروں کی صورت میں ہوگی۔''

منشی دل جی اچھل پڑا تھا۔ ''تم جانتے ہو اس کا مطلب ہے تم جھوٹ بول رہے تھے؟''

''یہ میرا اندازہ ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کنوروں کی جاگیر پر کچھ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ صرف یہاں موجود ہیروں کی کان ہے جس سے دولت حاصل کی جاسکتی ہے۔ نہ جانے کتنے عرصے سے اس کان سے ہیرے نکالے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہی ہیرے یہاں موجود ہیں اور تم بڑے کنور سے انہیں ہتھیانا چاہتے ہو۔ یہاں کے منشی ہونے کی وجہ سے تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ یہ ہیرے کتنی مالیت کے ہیں اور کہاں رکھے گئے ہیں؟''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''لیکن میں حاصل نہیں کرسکتا۔''

بات رفتہ رفتہ کھل گئی تھی۔ تو منشی دل جی اصل میں ہیروں کے چکر میں آیا تھا۔ کاش کہ میں اسے وادی والے راج اور اس کی بہن کا انجام دکھا سکتا۔ مگر شاید اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لالچ ایسی چیز ہے جو سامنے کھڑی موت کی پرواہ بھی نہیں کرتی ہے۔ یہاں بھی لالچ کی جنگ چل رہی تھی اور اب تک سو سے زیادہ افراد اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ مزید نہ جانے کتنے چڑھنے والے تھے۔ تیس کے قریب تو میرے ساتھ آنے والے افراد تھے۔ باقی کا تعلق کنور پیلس کی سیکورٹی اور منشی دل جی سے تھا۔ اس کے کم سے کم چھ آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ میں گفتگو کے دوران کسی حد تک بیتو کے سامنے آگیا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ

میری جیکٹ کی آستین سے وائس بم نکلنے کے لیے بیتو کو بھی پشت کرنا پڑتی اور ایسا کرتے ہی ہمارے نگران چوکنا ہو جاتے۔ فی الحال اس مسئلے کا حل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ افراد کم ہونے سے وہاں روشن ٹارچوں کی تعداد بھی کم ہوگئی تھی اور روشنی کم تھی۔ اس کے باوجود ہم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے گفتگو جاری رکھی۔

''وہ ہیرے یہاں سیف ہاؤس میں ہیں۔''

''نہیں وہ اوپر ہیں۔'' منشی نے کہا۔

''تب تمہیں بڑے کنور کی کیا ضرورت ہے اگر وہ کسی سیف میں بھی ہیں تو تم حاصل کر سکتے ہو۔''

''وہ جس سیف میں ہیں یہ انہیں حاصل نہیں کر سکتا۔'' بڑے کنور نے کہا اور ناخوش گوار لہجے میں منشی سے کہا۔ ''تمہیں اپنی زبان بند رکھنا چاہیے تھی صرف شہباز ہی نہیں تمہارے ساتھ موجود لوگ بھی سن رہے ہیں۔''

''تم فکر مت کرو یہ میرے وفادار ہیں۔''

''جیسے تم میرے وفادار تھے؟'' بڑے کنور نے طنز کیا۔ ''ان ہیروں کے لالچ نے تمہیں غداری پر مجبور کر دیا اسی طرح کوئی اور لالچ میں تم سے غداری کر سکتا ہے۔''

''میں تمہاری طرح اندھا اعتماد کرنے والا شخص نہیں ہوں۔'' منشی جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میرے آدمی اچھی طرح جانتے ہیں مجھ سے غداری کا کیا انجام ہوگا۔''

''انجام کا خیال کسی کو نہیں روک سکتا.....'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''ورنہ آج دنیا میں امن ہوتا۔''

''ہائے۔'' اچانک بیتو کراہا۔ اس نے دوسری طرف جھکتے ہوئے ایسی آواز نکالی جیسے قے کر رہا ہو۔

''کیا ہوا؟''

''انہوں نے پیٹ پر مکا مارا تھا۔'' بیتو نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''اندر کچھ ہو رہا ہے۔''

میں منشی دل جی کی طرف گھوما۔ ''تمہارے آدمیوں نے میرے ساتھی کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔''

''لڑائی میں ایسا ہوتا ہے۔'' منشی نے بے پروائی سے کہا۔ ''تمہارے ہاتھوں میرے کئی آدمی مارے گئے ہیں۔''

بیتو دوسری طرف جھکا ہوا قے کرنے کی آوازیں نکال رہا تھا مگر اس کے پشت سے بندھے ہاتھ میری کلائی ٹٹول رہے تھے وہ جیب کی زپ تلاش کر رہا تھا اس کی جیکٹ کی کلائی پر بھی ایسی زپ تھی اس لیے اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے کسی قدر ہاتھ اوپر کر کے زپ کھولی اور اندر سے وائس بم نکال لیا۔ میں نے بہ ظاہر منشی کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تمہارے آدمی زر خرید ہیں.... اس لیے تمہیں ان کی پروا نہیں ہوگی میرا ہر ساتھی قیمتی ہے وہ میری مرضی کے بغیر انگلی بھی نہیں ہلاتے ہیں۔ اگر میں جان مانگوں تو جان بھی دے دیں۔''

منشی دل جی نے اس بے تکی بات کا کوئی جواب نہیں، مجھے اس کے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو بیتو کو اشارہ دے رہا تھا جو اس نے سمجھ لیا اور نکالا ہوا وائس بم مجھے تھما دیا۔ بم لیتے ہی میں ذرا پیچھے ہو گیا تھا۔ اب بیتو بھی سیدھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے منشی کے کم آدمیوں سے خوشی ہوتی لیکن اب میری خواہش تھی کہ کاش وہ سب یہاں ہوتے۔ مگر اکثریت یہاں سے دور تھی اور وہ بم کا شکار نہیں ہوتے۔ یہاں ہونے کی صورت میں وہ سب ناکارہ ہو جاتے۔ میں نے بم کے فوری استعمال کے بجائے کچھ دیر انتظار کر لینا مناسب سمجھا اور منشی سے پوچھا۔ ''پیلس پر تمہارا مکمل قبضہ ہو گیا ہے پھر تم نے اپنے آدمیوں کو کہاں بھیجا ہے؟''

''یہاں بڑے کنور کے کچھ وفادار ہیں ان کا صفایا ضروری ہے۔'' اس نے کہا۔ یعنی اس کے آدمی اوپر گئے تھے۔

''اس کا مطلب ہے تم سب کو نہیں خرید سکے.... صرف رامن اور اس جیسے کچھ ضمیر فروش تمہارے ساتھ شامل ہوئے۔''

''سب کو خریدنے کی ضرورت نہیں تھی' میں نے بس کام کے آدمی چنے اور کسی نے بکنے سے انکار نہیں کیا۔''

''دولت چیز ہی ایسی ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''مگر کیا رامن بھی دولت کے لالچ میں تمہارے ساتھ آیا ہے؟''

''دولت کسے بری لگتی ہے۔'' منشی جی نے شانے ہلائے۔

''میرا خیال ہے تم اسے بھی صاف کر دو گے کیونکہ وہ تم سے زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ اگر اس کی نیت خراب ہو گئی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

منشی دل جی نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز جی تم کچھ زیادہ ہی نہیں سوچتے ہو؟''

''صرف زیادہ ہی نہیں میں درست سوچتا ہوں۔ اب تک میرے تمام خیالات درست ثابت نہیں ہوئے ہیں کیا؟''

''کچھ زیادہ ہی درست ثابت ہوئے ہیں۔'' منشی نے پرخیال انداز میں کہا۔

''منشی میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ تم کسی کو نہیں چھوڑو گے۔ ان سب کو بھی مار دو گے تاکہ کوئی راز دار نہ رہے ورنہ لوگ اس دولت کے لالچ میں تمہارا پیچھا کرتے رہیں گے۔''

''سوچتے رہو ضروری نہیں ہے کہ تمہاری ہر بات درست ثابت ہو۔''

منشی نے مجھے جھٹلا دیا تھا مگر میرا دل کہہ رہا تھا وہ بالآخر یہی کرے گا۔ ورنہ وہ یوں دوسروں کے سامنے یہ راز فاش نہ کرتا۔ اس نے اور بڑے کنور نے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا کہ جب ہیرے اوپر کسی جگہ محفوظ تھے تو منشی خود انہیں کیوں حاصل نہیں کر رہا تھا جب کہ وہ اس جگہ سے واقف بھی تھا۔ ایسی کیا وجہ تھی کہ بڑے کنور کو قبضے میں کرنا ضروری تھا۔ وائس بم فوری استعمال نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے خدشہ تھا منشی کے آدمی پاس ہی ہوں گے۔ وہ فوری آ سکتے تھے اور مجھے اور بیتو کو ان ہتھکڑیوں سے آزاد ہونے میں کچھ وقت لگتا۔ اس کے بعد ہم اس قابل ہوتے کہ آنے والوں کا مقابلہ کر سکتے۔ مگر اب منشی نے بتایا تھا کہ اس کے بیشتر آدمی اوپر پیلس میں بڑے کنور کے بچے کھچے وفاداروں کا صفایا کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے یہ موقع اچھا تھا۔ میری تو خواہش تھی کہ رامن بھی یہاں ہوتا مگر اس کا نہ ہونا بھی اچھا تھا۔ اگر وہ کسی طرح بچ نکلتا تو ہماری لیے بڑی مشکل کھڑی ہو جاتی۔

کسی قدر غور کرنے کے بعد میں نے وائس بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی پن نکالنے کے پانچ سیکنڈ بعد یہ پھٹ جاتا۔ میں نے بیتو کی طرف دیکھ کر خفیف سا سر ہلایا اس نے جواباً سر کو اتنی ہی جنبش دی اس کا مطلب ہے وہ تیار تھا۔ میں نے پن نکالی اور ذہن میں گننے لگا۔ تین تک گنتے ہی میں نے گھوم کر بم درمیان میں پھینک دیا اور بیتو سے کہا۔ ''سانس روک لو۔''

میں نے کہتے ہی سانس روک لی تھی۔ میرے کانوں میں ریڈیو کے ائرفون پلگ لگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود صرف چند فٹ کے فاصلے سے بم کی شاک ویو نے مجھے دھکیلا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے خاصے فاصلے سے سنا تھا اور اس وقت بھی اس کی آواز قابلِ برداشت نہیں تھی۔ بس یہ کہ اس نے حواس باختہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت خود پر قابو پانے کے لیے مجھے باقاعدہ جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ٹھوس چیز کانوں کے راستے میرے دماغ میں داخل ہونے کے لیے زور لگا رہی ہو۔ میں زمین پر گر گیا تھا اور گول مول ہو کر خود کو آواز سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ صرف اضطراری حرکت تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو میں کانوں پر رکھ کر کسی حد تک بچ سکتا تھا۔ میری آنکھیں بھی بند ہوگئی تھیں اور دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بیتو کا مجھے نہیں پتا تھا مگر میرے ذہن پر جیسے دھندی چھا رہی تھی اور میں اس سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ آواز رک گئی ہے لیکن دماغ میں اب بھی اس کی گونج تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں نہ ہوں۔ مگر میں اپنی حالت کی پروا کیے بغیر اٹھا اور تیزی سے نزدیک پڑے منشی کے آدمی کی طرف بڑھا۔ وہ اوندھے منہ پڑا تھا اور ساکت تھا۔ میں نے الٹا بیٹھ کر اس کی جیبیں ٹٹولیں مگر اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے میں اپنے ہاتھوں کی ہتھکڑی کاٹ سکتا۔ کھینچ کر باندھ دی جانے والی یہ ہتھکڑی مضبوطی میں فولادی ہتھکڑی سے کم مضبوط نہیں ہوتی ہے۔ اگر اسے زور لگا کر اتارنے یا توڑنے کی کوشش کی جائے تو یہ اور کلائیوں میں گڑتی ہے۔ میں دوسرے کی طرف بڑھا مگر اس کے پاس بھی چاقو یا دھار والی کوئی چیز نہیں تھی۔ کان ابھی تک سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی آواز آ رہی ہے مگر وہ آواز واضح نہیں تھی۔ منشی دل جی سیف ہاؤس کے فولادی دروازے سے ٹکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ہونٹ ہل رہے تھے مگر کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

اصل میں بیتو چلا رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی بات نہیں سن رہا ہوں تو وہ اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آیا۔ سب کی ٹارچیں رائفلوں کے ساتھ نیچے پڑی تھیں اور روشنی مزید محدود ہو گئی تھی۔ میں نے ٹارچیں ایک ایک کر کے بند کرنا شروع کر دیں اور آخری ٹارچ بند کی تھی کہ عقب سے بیتو مجھ سے ٹکرایا۔ میں بھڑک کر پیچھے ہٹا مگر پھر بیتو کی آواز سن کر رک گیا۔ اس کی آواز بگڑ کر میرے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔ میں فوکس کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ پھر بیتو نے میرا ہاتھ پکڑ اور

ہاتھ سے پستول چلانے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا نہیں۔ اس پر اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور خود ٹٹول کر ایک رائفل پر لگی ٹارچ آن کی۔ پھر اس نے زمین پر بیٹھ کر کسی طرح دونوں ہاتھ کمر اور پیروں سے گزار کر سامنے کر لیے۔ یہ بہت مشکل کرتب تھا اور بیتو جیسے چھریرے جسم کا آدمی ہی دکھا سکتا تھا یہ میرے بس سے باہر تھا۔ پھر وہ منشی دل جی کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے منشی کی جیکٹ ٹٹولی اور اس سے پستول نکال لیا۔ اس وقت تک دماغ کسی حد تک قابو میں آ گیا تھا۔ میں نے بیتو سے پوچھا۔

"پستول کا کیا کرو گے؟"

مجھے اپنی ہی آواز اجنبی اور لہراتی محسوس ہوئی تھی لیکن اب یہ کسی حد تک واضح تھی۔ بیتو نے کہا۔ "اس کی مدد سے آزاد ہو گا، آپ نماز کے انداز میں لیٹ کر ہاتھ اوپر کر لو۔"

پہلے میں سمجھا نہیں کہ نماز کے انداز میں لیٹنے سے اس کی کیا مراد ہے لیکن پھر میں سمجھ گیا۔ میں سجدے میں گیا اور سر زمین پر ٹیک کر دونوں ہاتھ عقب میں ہوا میں بلند کیے۔ بیتو نے ٹارچ کا رخ اس طرف کیا۔ میں نے دونوں کلائیوں کو ممکنہ حد تک الگ کیا اور بیتو نے پستول کا دستہ میری کمر پر رکھ کر نال کا رخ اوپر کی طرف کیا اور میرا ہاتھ بچاتے ہوئے ہتھکڑی پر فائر کیا۔ اس کے باوجود گولی میری بائیں کلائی کو چھوتی گزری اور ایسا لگا جیسے کسی نے دہکتی سلاخ سے چھو دیا ہو۔ مگر ساتھ ہی گولی نے ہتھکڑی کو کاٹ دیا اور ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ آزاد ہوئے۔ میں تیزی سے اٹھا اور باقیوں کی تلاشی لی تو ایک کے پاس چاقو مل گیا۔ اس سے بیتو کی بندشیں کاٹیں اور ٹارچ بند کرتے ہوئے نائٹ ویژن آن کر لیا۔ یہ ابھی تک ہمارے سروں پر تھے اور منشی کے آدمیوں نے انہیں یا ریڈیو لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پانچ افراد کے پاس پانچ رائفلیں تھیں۔ پستول صرف منشی کے پاس تھا۔

اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ہر ایک کے پاس رائفلوں کے اضافی میگزین بھی تھے۔ ہم نے وہ بھی نکال لیے۔ کیونکہ ہم دو تھے اس لیے صرف دو رائفلیں چھوڑ کر باقی رائفلوں کے میگزین نکال کر انہیں بیکار کر دیا تھا۔ منشی کے پانچوں آدمی بے ہوش تھے۔ البتہ منشی کسی قدر ہوش میں تھا۔ مجھے بڑے کنور اور سادی کا خیال آیا۔ پتا نہیں ان کا کیا حال تھا انہوں نے بھی اسپیکر پر واکس بم کی آواز سنی تھی میں نے بڑے کنور کو پکارا۔ "تم میری آواز سن رہے ہو.... کیا تم ہوش میں ہو؟"

بڑے کنور کی آواز نہیں آئی تو میں نے سادی کو پکارا۔ "سادی تم ٹھیک ہو.... میری آواز سن رہی ہو۔"

جواب میں کسی نے کنکناتی ہوئی بہت مدھم آواز نکالی۔ بیتو بولا۔ "یہ دیدی ہے۔"

مجھے بھی آواز نسوانی لگی تھی۔ میں نے بے تابی سے کہا۔ "سادی پلیز اونچا بولو.... تم ٹھیک ہو نا....؟"

"میں.... ٹھیک.... ہوں۔" اس بار سادی نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "بڑے بھیا بے ہوش ہیں وہ ہل نہیں رہے۔"

"سادی کیا تم دیکھ سکتی ہو.... اندر موجود منشی کے آدمیوں کا کیا حال ہوا ہے؟"

"نہیں.... مجھے نہیں معلوم کہ یہاں سے کیسے دیکھنا ہوگا۔" سادی کا مطلب تھا کہ وہاں اسکرینیں موجود تھیں لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ سیف ہاؤس کے باقی حصوں کو کیسے دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔

"سادی وہ ریموٹ کہاں ہے جس سے سیف ہاؤس کا دروازہ کھولا جاتا ہے؟"

"وہ بڑے بھیا کے پاس ہے۔" سادی نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں نے اسے نکال لیا ہے لیکن اس پر کئی بٹن ہیں۔"

"اس کی ساخت بتاؤ۔"

"اس پر چھ بٹن ہیں۔ دو اوپر لگے ہیں ان کا کلر ریڈ ہے، نیچے کے دو گرین ہیں اور آخر کے دو بلو ہیں۔"

چھ بٹن کا مطلب تھا کہ باقی بٹنوں کا کوئی نہ کوئی مقصد تھا اور سوچے سمجھے بغیر انہیں استعمال کرنے سے کچھ اور بھی ہو سکتا تھا میں نے کہا۔ "سادی کوئی بٹن مت دبانا.... بڑے کنور کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو.... جلدی، ہمارے پاس وقت کم ہے۔"

"میں کیسے ہوش میں لاؤں۔"

"وہاں پانی ہو گا وہ منہ پر چھڑکو اور پلانے کی کوشش کرو اس سے اسے ہوش آ جائے گا۔" میں نے ہدایت کی حالانکہ یہ آواز کا شاک تھا اور دماغ براہِ راست متاثر ہوا تھا۔ بڑا کنور ویسے ہی بیمار شخص تھا اور بوڑھا بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں سادی صحت مند اور جوان تھی۔ اس لیے وہ آواز جھیل گئی اور جلدی ہوش میں آ گئی۔ پھر انہوں نے براہِ راست آواز کو نہیں سنا تھا اسپیکر سے گزر کر وہ کسی قدر کم ہو گئی ہو گی۔ مجھے امید تھی کہ بڑے کنور کا حال منشی اور اس کے

ساتھیوں کا سا نہیں ہوا ہو گا۔ سادی اپنا کام کر رہی تھی اور ساتھ ہی بڑے کنور کو آوازیں دے رہی تھی۔ بیتو سرنگ کی طرف چلا گیا تھا اگر کوئی اس طرف سے آئے تو ہم قبل از وقت خبردار ہو جائیں۔ واکس بم کو پھٹے دس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور ابھی صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے باہر یقیناً روشنی ہو چکی تھی لیکن اب تک کوئی اس طرف نہیں آیا تھا۔

جب تک سادی بڑے کنور کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار تسلی سے منشی دل جی اور اس کے آدمیوں کی تلاشی لے لوں۔ میں نے یہ کام کیا اور فائدہ ہوا۔ منشی کے پاس سے ایک چھپا ہوا پستول اور نکل آیا اور وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ مگر اس کی کھلی آنکھوں میں اب بھی پتلیاں قابو میں نہیں تھیں۔ اسے ہوش میں آنے میں مزید وقت درکار تھا۔ اس کے آدمیوں میں سے دو مر چکے تھے۔ ان کے کانوں اور ناک سے خون نکل آیا تھا۔ شاید دماغ آواز کی شدت برداشت نہیں کر سکا تھا۔ انہیں مردہ پا کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم اس جادوکار چیز سے صرف اس لیے بچ گئے کہ ہمارے کانوں میں ائرفون تھے۔ باقی تین مکمل طور پر بے ہوش تھے۔ واکس بم ان کے درمیان میں پھٹا تھا اور وہ براہِ راست نشانہ بنے تھے۔ منشی تقریباً بارہ تیرہ فٹ کی دوری پر تھا۔ اس لیے اس کی بچت ہو گئی تھی وہ مرا نہیں تھا اور نہ ہی مکمل طور پر بے ہوش ہوا تھا۔

"سادی بڑے کنور کو ہوش آیا؟"

"نہیں شوبی.... پتا نہیں کیا ہے، بالکل رسپانس نہیں دے رہے ہیں۔" اس نے فکر مندی سے کہا۔ "کیا میں ریموٹ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کروں۔"

"نہیں۔" میں نے منع کر دیا۔ "پتا نہیں باقی بٹن کس لیے ہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تباہ کرنے والا عمل شروع ہو جائے۔ تم بڑے کنور کو ہوش میں لانے کی کوشش جاری رکھو اور ہاں تم دونوں جس چیمبر میں ہو اس کا دروازہ اسی ریموٹ سے بند ہوتا اور کھلتا ہے؟"

"نہیں یہ تو ہاتھ سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے اس کے اندر سیف جیسا ہینڈل لگا ہوا ہے۔" سادی نے بتایا۔

"اندر کوئی ہتھیار ہے؟"

"بڑے بھیا کے پاس ایک پستول ہے، میں نے وہ بھی نکال لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہو۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں یہیں ہوں.... مطلب ان سرنگوں میں ہی ہوں اور تم اطمینان رکھو میں تمہیں لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"اس کے برعکس آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں تو مجھے اطمینان ہو گا۔ آپ اب بھی خطرے میں ہیں۔" سادی نے کہا اور پہلی بار پوچھا۔ "یہ آواز کیسی تھی خدا کی پناہ ایسا لگا جیسے براہِ راست دماغ پر آ کر لگی ہو۔ میرے تو ہوش گم ہو گئے تھے۔"

"یہ ایک طرح کا بم تھا جو پھٹ کر بہت تیز آواز نکالتا ہے۔"

"اتنی دیر تک؟" سادی کو تعجب ہوا تھا۔

"آواز تو پانچ سیکنڈ ہوتی ہے لیکن لگتا ہے کہ نہ جانے کتنی دیر جاری رہی۔" میں نے کہا۔ "تم اب خاموش ہو جاؤ اور اگر مائک آف کر سکتی ہو تو اسے آف کر دو لیکن اسپیکر آن رکھنا۔"

"میں کوشش کرتی ہوں۔ مجھے اس سسٹم کا زیادہ نہیں پتا ہے۔"

"بڑے کنور کے پاس ایک واکی ٹاکی بھی تھا۔"

"وہ ہے۔"

"میں اسی پر رابطہ کروں گا۔" میں نے کہا۔ میں نے اپناوا کی ٹاکی حاصل کر لیا تھا جس پر بڑے کنور سے بات کرتا تھا۔ اس نے اس وقت نہیں بتایا تھا کہ یہاں اسپیکر سسٹم بھی ہے جس پر وہ براہِ راست بات کر سکتا ہے۔ شاید اس وقت وہ براہِ راست بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر منشی اور اس کے آدمیوں کو چیک کیا۔ منشی اب کسی قدر ہوش میں تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ دہشت زدہ نظر آنے لگا کیونکہ میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

"کک.... کون.... ہو؟"

"تمہاری موت۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "اپنے آدمیوں سے کہو سرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔"

"کک.... کیس.... کیسے.... کہوں؟" اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ "اس کی مدد سے...."

مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ٹھیک سے بات کرسکتا۔ اس کے آدمی ہوشیار ہو جاتے۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ خود بات کرلوں۔ میں نے واکی ٹاکی آن کیا اور بولا۔ ''منشی کے کتو، میری آواز سن رہے ہو نا؟ غور سے سنو.... منشی میرے قبضے میں ہے اور اگر کسی نے سیف ہاؤس کی طرف آنے کی کوشش کی تو میں اسے ماردوں گا۔''

''شہباز!'' دوسری طرف سے رامن کی آواز آئی۔ ''تم یہاں سے نکل نہیں سکتے اس لیے بہتر ہوگا ہتھیار ڈال دو۔''

''منشی کے ہوتے ہوئے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں موجود لوگوں کا باس منشی نہیں ہے بلکہ میں ہوں اور جو چیز وہ حاصل کرنا چاہتا تھا اب وہی میں حاصل کرلوں گا۔''

یہ اطلاع تشویشناک تھی کہ رامن نے اتنی دیر میں منشی کے آدمیوں کو خرید لیا تھا۔ یقیناً اس نے انہیں حصے کا لالچ دیا ہوگا۔ بے شک ان کے حصے میں بعد میں موت آتی۔ لیکن اس وقت وہ جان پر کھیل کر بھی یہ بے پناہ دولت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے دانت پیسے، یہ منحوس دولت میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو منشی کبھی ہمارے پیچھے نہ آتا۔ نہ رامن اس کے ساتھ مل کر سازش کرتا۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ مجھے اس صورتِ حال سے نمٹنا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اول تو مجھے تمہاری اس بات کا یقین نہیں ہے۔''

''ایسا کرو تم منشی کو سرنگ کے موڑ تک بھیج دو میں خود اسے شوٹ کردیتا ہوں تب تمہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔''

''دوسرے تمہاری مجبوری بھی وہی ہے۔ بڑا کنور اور سادی اندر ہیں اور واکس بم نے ان کے بھی ہوش اڑا دیے ہیں۔ وہ جواب نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر تم اس دولت تک کیسے پہنچو گے؟''

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔'' رامن فکرمند ہوگیا۔ ''اگر انہیں کچھ ہوا تو وہ دولت پھر کوئی حاصل نہیں کرسکے گا۔''

''تم سوچ لو اگر تم یا کوئی دوسرا اس طرف آیا تو اسے پہلے مجھ سے نمٹنا پڑے گا۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اگر تم منشی سے ملے ہوئے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کس شخص کو دھوکا دیا ہے اور اسے اب تک پتا چل گیا ہوگا۔ بے شک تم لوگوں نے یہاں موجود تمام رابطے کاٹ دیے ہیں مگر وہ بھارتی حکومت سے بات کرسکتا ہے اور اس کی بات کوئی نظرانداز نہیں کرے گا۔''

''تم ڈیوڈ شا کی بات کررہے ہو تو وہ یہاں بھارت میں اتنی بڑی توپ نہیں ہے۔''

''چھوٹی ہی سہی.... لیکن بھارتی حکومت کو کنور خاندان کی فکر تو ہوگی اور تم بھول رہے ہو راج کنور بھی اسی کے پاس ہے۔ اگر اس نے راج کنور کو رابطے کی اجازت دی تو تم لوگ بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

''مشکل میں تم پڑو گے۔'' رامن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ایک بار تم بھارتی ایجنسیوں کے قبضے میں آگئے تو تمہاری روح بھی ان کے قبضے سے نہیں نکل سکے گی۔''

''دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور واکی ٹاکی آف کر دیا۔ رامن کی بات نے مجھے بھی فکرمند کردیا تھا۔ جتنا میری بات نے اسے پریشان کیا تھا اتنا ہی اس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ ہم جتنی دیر یہاں رکتے یہاں سے نکلنا اتنا ہی مشکل ہوجاتا۔ خاص طور سے میرے لیے۔ میں واپس ہال کی طرف آیا۔ گزشتہ رات سے میں نے چند گھونٹ پانی پیا تھا اور میرا گلا پیاس سے خشک ہورہا تھا۔ مگر یہاں پانی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے منشی کے آدمیوں کو بھی ٹٹولا تھا لیکن وہ کمبخت بھی خالی تھے۔ ہماری طرح مکمل تیاری سے نہیں آئے تھے۔ پیتو کا بیگ گرفتاری کے بعد چھین لیا گیا تھا اس میں پانی اور کھانے کا سامان تھا۔ وہ بیگ نہ جانے کہاں تھا۔ منشی اب ہوش میں تھا۔ میں رامن سے جو گفتگو کررہا تھا اس کا ایک حصہ اس نے بھی سنا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''منشی جی بازی پلٹ گئی اور تاریخ نے خود کو دہرایا ہے۔ رامن نے تمہارا تختہ الٹ کر تمہارے آدمیوں کی کمان سنبھال لی ہے اور اب وہ خود ان ہیروں کے چکر میں ہے۔''

منشی دل جی کے منہ سے رامن کے لیے نا گفتنی نکلی تھی مگر میں متاثر نہیں ہوا۔ ''مجھے شک ہے کہ وہ ڈراما کررہا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ میں تمہیں سرنگ کے موڑ تک بھیج دوں۔ وہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کرکے ثبوت دے سکتا ہے۔''

''نہیں۔'' منشی خوفزدہ ہوگیا۔ ''اس نے سچ بغاوت کردی ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔''

''تب تم نے اس پر بھروسا کیسے کیا؟''

''کیونکہ وہی اندر سے ہماری مدد کرسکتا تھا۔ اس کے بغیر ہم اتنی آسانی سے پیلس گارڈز کا صفایا نہیں کرسکتے تھے۔''

منشی میرے قابو میں تھا اس لیے میں اس سے سوالات کرسکتا تھا۔ ''تم نے ڈیوڈ شا تک رسائی کیسے حاصل کی؟''

''مجھے معلوم تھا کہ وہ عرصے سے یہاں ہے اور اصل میں تمہارے پیچھے آیا ہے۔ جب تم یہاں لائے گئے تھے تب اس نے بڑے کنور سے رابطہ کیا تھا اور میں بھی واقف ہوگیا تھا۔''

''تب تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس کے قبضے میں ہوں۔''

''یہاں پیلس میں میرے آدمی تھے، ان سے مجھے معلوم ہوگیا کہ تم واپس آگئے ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر تم یہاں ہوگے تو صرف ڈیوڈ شا سے رابطہ کرسکتے ہو۔''

''تمہارا اندازہ غلط ہے میرا اس سے رابطے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اس نے مجھے پکڑوایا تھا فتح خان کی مدد سے۔''

''مگر میرا یہ اندازہ تو درست ثابت ہوا کہ تم ڈیوڈ شا کے پاس ہو۔ اس کے بعد میرا کام آسان ہوگیا۔ میں نے اس سے رابطہ کیا اور اسے ایک آدمی کی ضرورت تھی جو کنور پیلس سے واقف ہو۔'' منشی دل جی نے جلدی جلدی کہا۔ ''میری بدقسمتی کہ میں سارے پلان سے واقف تھا اور میں کامیاب بھی رہا مگر میرے آدمی تمہاری ٹھیک سے تلاشی نہ لے سکے۔''

''درست کہا یہ ان کی نااہلی تھی لیکن اصل میں یہ قدرت کا کھیل ہے، وہ تم جیسے لوگوں کو آزاد چھوڑ دے تو تم درندوں کی طرح آس پاس کے لوگوں کو پھاڑ کھاؤ۔'' میں نے کہا۔

منشی دل جی نے گہری سانس لی۔ ''مجھے معلوم ہے تم مجھے چھوڑو گے نہیں، لیکن میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تمہارا اصل دشمن کنور خاندان ہے۔''

''جس کے تم بھی ایک رکن ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ راج کنور کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتا وہ ڈیوڈ شا کی تحویل میں تھا۔'' منشی جی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ بات تم بھی جانتے ہو۔''

''لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ اب ڈیوڈ شا کی تحویل میں نہیں ہے اس نے اسے چھوڑنے کا کہا تھا۔''

''ہاں لیکن اسے چپ لگا کر چھوڑا گیا تھا۔''

''ایسی چپ تلاش کرنا اور اسے ناکارہ بنانا آج کل بچوں کا کھیل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ راج کنور سے ڈیوڈ شا کی کوئی ڈیل ہو چکی تھی اور اسی وجہ سے اس نے اسے چھوڑا ہے۔ ورنہ وہ ہاتھ آئے دشمن کو یوں چھوڑنے کا قائل نہیں ہے۔''

منشی جی نے غور کیا۔ ''تمہارا مطلب ہے ڈیوڈ شا بھی ڈبل کھیل کھیل رہا ہے؟''

''اس کھیل میں سب ہی ڈبل کھلاڑی ہیں۔''

''اب تم کیا کرو گے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اگر طبعی موت تک زندہ رہنا چاہتے ہو تو کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ میں تمہیں ماردوں۔ اس وقت موت کا فرشتہ جسے تم یم دوت کہتے ہو آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔''

منشی کو خبردار کرکے میں سرنگ تک آیا اور سادی کو واکی ٹاکی سے کال کی۔ میں نے ایک نمبر دبایا جو اصل میں بڑے کنور کے واکی ٹاکی کا نمبر تھا۔ سادی نے کال ریسیو کی۔ میں نے پوچھا۔ ''بڑے کنور کو ہوش آیا؟''

''نہیں.... لیکن ہلنے جلنے لگے ہیں۔''

''کوشش کرتی رہو۔'' میں نے کہا۔ ''اسے جلد از جلد ہوش میں لاؤ تب ہی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

''شوبی اگر انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا تو؟'' سادی نے ہچکچا کر پوچھا۔

''ریموٹ کنٹرول اور پستول تمہارے پاس ہے تم مجبور کرسکتی ہو اگر ذرا ہمت کرو تو....''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں۔''

''شاباش گڑیا تم کرسکتی ہو.... ضروری نہیں ہے تم بڑے کنور کو دھمکاؤ.... اپنی عقل سے کام لو اور اسے راضی کرو۔ اگر دیر ہوئی تو ہمارا نکلنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہاں ہر طرف دشمن ہیں۔''

''ٹھیک ہے شوبی میں سمجھ گئی۔''

واکی ٹاکی بند کرکے میں منشی دل جی کے پاس آیا۔ اسے نظر نہیں آرہا تھا مگر میری آہٹ محسوس کرکے وہ جلدی سے بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اندر تمہارے کتنے آدمی

ہیں؟"

"تین دا ایک مر گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کا واکی ٹاکی آگے بڑھایا۔ "ان سے بات کرواور صورتِ حال پوچھو.... باہر کے بارے میں کوئی اشارہ مت دینا۔"

اس نے سر ہلایا اور واکی ٹاکی کا ایک بٹن دبایا۔ "اندر کیا ہو رہا ہے۔"

"باس وہ چیمبر میں ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم اسے نہیں کھلوا سکتے۔"

"کنور کے آدمیوں کو چیک کر لیا کوئی زندہ تو نہیں ہے۔"

"دو زندہ تھے ان کی گردن کاٹ دی ہے۔" دوسری طرف سے منشی کے آدمی نے یوں آرام سے کہا جیسے گردن نہیں گاجر مولی کاٹنے کی بات کر رہا ہو۔

"گڈ! پوری طرح ہوشیار رہو۔" منشی نے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔ میں نے اس سے واپس لے لیا۔ قابو میں آتے ہی منشی پھر سے گریہ مسکین بن گیا تھا۔ اس نے لجاجت سے کہا۔ "شہباز جی.... اب میری آپ سے دشمنی نہیں رہی ہے تو کیوں نہ ہم مل کر اپنے دشمنوں کے خلاف لڑیں؟"

منشی کی پیشکش قابلِ غور تھی۔ بے شک اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کے آدمی بغاوت کر کے رامن سے مل گئے تھے مگر وہ یہاں کا بھیدی تھا۔ یہاں کے بارے میں جو وہ جانتا تھا وہ شاید دونوں کنور برادران بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ مگر میں نے فوری ردِعمل نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ "منشی تمہیں اب خیال آ رہا ہے کہ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کچھ دیر پہلے تم یہ بات بھولے ہوئے تھے۔"

"میں نے پھر بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر دشمنی ہوتی تو پکڑتے ہی میرے آدمی تمہیں مار دیتے۔"

یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔ لیکن اس پر مجھے یقین تھا کہ منشی نے کسی وجہ سے مجھے اور بیتو کو مارنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ہم سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر یہ فائدہ اس کے ذہن میں نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ ہمیں ایک لمحہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دیتا۔ فی الحال مجھے آئیڈیا نہیں تھا کہ اس کا مجھ سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے کسی معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑے کنور کو میرا خون درکار تھا اور مجھے سادی واپس چاہیے تھی۔ باقی اس جاگیر اور اس کے دولت کے تنازعے سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ میری بلا سے جو اس پر قابض ہو جاتا اور دوسرے کے ساتھ جو چاہے سلوک کرتا۔ منشی نے اپنی چال چلی تھی مگر رامن پر آ کر پھنس گیا۔ اگر میں وائس بم استعمال نہ بھی کرتا تو اس کے خلاف بغاوت ہو چکی تھی۔ مجھے بس اتنا فائدہ ہوا کہ میں ایک محدود دائرے میں آزاد ہو گیا تھا لیکن اس سرنگ سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ ابھی تو میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر بڑے کنور نے سیف ہاؤس کھول دیا تو میں سادی کو لے کر یہاں سے کیسے نکلوں گا؟ مجھے اس دولت کا خیال آیا جس کے پیچھے سب آپس میں لڑ مر رہے تھے۔ میں نے منشی سے پوچھا۔

"ہیرے کہاں ہیں اور انہیں کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟"

"وہ اوپر بڑے کنور کے خاص کمرے میں ہیں۔ جو کچھ عرصے پہلے اس کا بیڈ روم بھی تھا۔"

مجھے یاد آیا بڑے کنور کا سوچ بچار والا کمرا جس میں صرف ایک کرسی اور ایک آتشدان تھا۔ شمال کی طرف کھڑکی کھلتی تھی اور اس سے آتی سرد ہوائیں آتشدان کی گرمی کو زائل کرتی تھیں۔ بعد میں وہ بڑے کنور کا بیڈ روم بن گیا تھا۔ "اب وہ بیڈ روم نہیں ہے؟"

"نہیں اسے دوبارہ اسی حالت میں لایا گیا تھا یہ راج کنور اور تم لوگوں کے جانے کے بعد ہوا تھا۔"

"ٹھیک ہے وہ ہیرے وہاں ہیں تو انہیں حاصل کرنا کیا مسئلہ ہے۔ مضبوط ترین تجوری کو بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ بے شک اس میں وقت لگے گا لیکن وقت تمہارے لیے مسئلہ نہیں تھا۔"

منشی نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ کام سیف کاٹنے سے نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے تجوری میں کوئی ٹریپ ہے.... کوئی بم ہے؟"

اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں اندر فاسفورس کی ایک تہ ہے اگر سیف کو غلط نمبر دیا گیا تو فاسفورس جل اٹھے گا اور ہیرے خاک ہو جائیں گے۔ یہ سب منٹ سے بھی پہلے ہو گا۔ تیز ترین طریقے سے بھی سیف کھولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

اب میں سمجھ گیا تھا کہ بڑا کنور کیوں لازی تھا۔ فاسفورس کی آگ بہت شدید ہوتی ہے۔ اسے بجھانا بھی ممکن نہیں ہوتا ہے۔ ہیرے اصل میں کاربن کی ایک صورت ہیں۔ ان میں اور کوئلے کی ترتیب میں کاربن کے تناسب کا فرق نہیں ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہیرے کاربن کی خالص صورت ہیں۔ اگر یہ بالکل خالص ہوں تو شفاف ہوتے ہیں اور اگر ان میں معمولی سی کسی دوسرے عنصر کی ملاوٹ ہو تو یہ رنگدار ہو جاتے ہیں۔ آگ انہیں کوئلے کی طرح جلا دیتی ہے۔ دنیا کے قیمتی ترین ہیرے کوہ نور جس کی مالیت کا اندازہ لگانا دشوار ہے اگر اسے صرف ایک منٹ کے لیے موم بتی کی معمولی سی لو پر رکھا جائے تو اس کی مالیت ایک روپیہ بھی نہیں رہ جائے گی۔ یہ ٹریپ بڑے کنور نے یقیناً اسی وجہ سے لگایا تھا کہ اگر کوئی تجوری تک رسائی حاصل کر لے اور بغیر درست طریقہ کار کے اسے کھولنے کی کوشش کرے تو اس کے ہاتھ بھی سوائے ہیروں کی راکھ کے اور کچھ نہ آئے۔ میں نے سر ہلایا۔ "میں سمجھ گیا۔ لیکن کیا یہ طریقہ رسکی نہیں ہے۔ کوئی بھی غلط نمبر ملا کر اندر موجود دولت کو خاکستر کر سکتا ہے۔"

"شہباز جی آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے.... یہ جدید ترین سیف ہے۔ اس میں متوازی تین کوڈز ملائے جاتے ہیں۔ پہلا کوڈ غلط ملانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن دوسرے اور تیسرے کوڈز میں ایک لفظ یا نمبر غلط ملایا تو اندر آگ بھڑک اٹھے گی۔ پہلا کوڈ درست ملانے سے اگلا کوڈ ملانے کا موقع ملے گا ورنہ کچھ نہیں ہو گا۔"

منشی جی نے ٹھیک کہا تھا۔ میں ان معاملات میں اناڑی تھا۔ کیونکہ کبھی تجوریوں سے واسطہ نہیں رہا۔ میرے دفتر میں ایک لاکر تھا جس کی چابی زیادہ تر منیجر طاہر کے پاس رہا کرتی تھی۔ ادائیگیاں اسی کی ذمے داری تھیں۔ حویلی میں خزانچی ماں جی تھیں۔ ان کے پاس ایک بہت پرانا مضبوط دھاتی ٹرنک تھا۔ رقم اور قیمتی اشیا اسی میں ہوتی تھیں۔ ایک بار تمام گھر والے کئی دن کے لیے کہیں گئے تھے اور ماں جی چابی ٹرنک کے اوپر چھوڑ گئی تھیں۔ واپس آئیں تو وہیں رکھی ملی تھیں اور ایک روپیا بھی غائب نہیں تھا۔ اس وقت بھی حویلی میں تین ملازم چھوڑ کر گئے تھے۔

اس سیف اور اس کا سسٹم بنانے والوں نے ہر پہلو پر نگاہ رکھی تھی۔ اچانک واکی ٹاکی پر بیپ ہوئی تو میں اسے نکالتا ہوا سرنگ کے آغاز تک آ گیا وہاں بیتو چوکس تھا۔ سادی کی کال تھی۔ اس نے کہا۔ "شوبی بڑے بھیا ہوش میں آ گئے ہیں۔"

"میری بات کراؤ۔"

چند لمحے بعد بڑے کنور کی نحیف آواز آئی۔ "شہباز یہ کیا تھا؟"

"وائس بم۔" میں نے بتایا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اشارہ نہیں دے سکا۔ یوں سمجھ لو کہ قدرت نے مجھے موقع دیا آزاد ہونے کا۔"

"کیا حالات تمہارے قابو میں ہیں؟"

"کم سے کم سیف ہاؤس کے سامنے کے تو ہیں۔ اوپر رامن اور اس کے آدمی ہیں۔"

"منشی کہاں ہے؟"

"وہ میری قید میں ہے لیکن اس لحاظ سے بیکار ہے کہ رامن اور اس کے آدمیوں نے بغاوت کر دی ہے۔ وہ اب ان ہیروں کے چکر میں ہیں جن کے لیے منشی نے یہ سارا کھیل کھیلا ہے۔"

"اوہ.... اب تم چاہتے ہو کہ میں سادھنا کو لے کر باہر آ جاؤں۔"

"اگر تم اندر رہنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن سادی کو باہر بھیج دو۔ تم جان گئے ہو وہ یہاں نہیں رہے گی اور رہے گی تو مر جائے گی۔ اسے اس کے شوہر کے پاس واپس بھیج دو اس کی خوشی اسی میں ہے۔ میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا تم جو مرضی چاہے کرتے رہنا۔"

"میں ایسا ہی کرتا اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم اسے لے کر بہ حفاظت نکل سکو گے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن شہباز ان حالات میں مجھے یقین نہیں ہے کہ تم اسے لے کر یہاں سے نکل سکو گے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور صرف دو آدمی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔"

"لیکن سیف ہاؤس میں رہنا بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

"میں اور سادی یہاں محفوظ ہیں اگر تم یہاں سے نکل جاؤ تو میرا وعدہ ہے۔ پیلس کا کنٹرول حاصل کرتے ہی میں سادی کو واپس بھیج دوں گا۔"

مجھے تعجب ہوا۔ "تمہیں ان حالات میں بھی امید ہے کہ پیلس کا کنٹرول حاصل کر سکو گے؟"

"تم یا کوئی اور یہاں کے اور میرے معاملات کے بارے میں نہیں جانتا ہے۔ ہاں مجھے یقین ہے اس میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔"

بڑے کنور کے لہجے میں اعتماد تھا۔ اس نے مجھے

سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ اعتماد شاید کسی باہر کی امداد کے بھروسے پر تھا۔ اب یہ مدد انتظامیہ کی طرف سے آتی یا کسی نجی ذریعے سے دونوں صورتوں میں، میں پیلس میں ہونے کی صورت میں مشکل میں پڑ جاتا۔ مگر یہاں سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بڑے کنور سے کہا۔ ''تم باہر نہیں آؤ گے؟''

''ہاں اور تم خود سوچو کہ تم دو آدمی ہمارا کس طرح دفاع کرو گے۔ اگر تم مجھے نظر انداز کر دو تب بھی سادھنا تمہاری ذمے داری ہوگی کیا تم اسے لے کر یہاں سے باہر جا سکتے ہو۔ اول تو پیلس سے نکلنا ہی مسئلہ ہوگا۔ اگر یہاں سے نکل گئے تو اس علاقے سے کیسے نکلو گے جہاں آنے جانے کے لیے بس چند سڑکیں ہیں۔ کسی کو آرام سے روکا جا سکتا ہے اور اگر یہاں سے نکل گئے تو انڈیا سے کیسے نکلو گے۔''

''مجھے اللہ پر بھروسا ہے وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم سادی کو باہر بھیجو۔''

''تم اس کی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔'' بڑے کنور نے خبردار کیا۔ ''تم لوگوں کے بچ نکلنے کا چانس ایک فیصد بھی نہیں ہے۔''

''میں اس سے بھی کم پر چانس لیتا رہا ہوں۔'' میرا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''تم وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''ٹھیک ہے تم سادھنا سے بات کرلو۔'' بڑے کنور نے واکی ٹاکی اس کے حوالے کر دیا۔ اس گفتگو کے دوران میں اپنے ذہن میں کچھ تجزیے جاری رکھے ہوئے تھا۔ رامن اور اس کے ساتھیوں کے یہاں نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اوپر کا کنٹرول حاصل کر رہے تھے۔ رامن کے ساتھ اس کے اور منشی کے آمادۂ بغاوت آدمی ملا کر دو درجن سے زیادہ افراد ممکن نہیں تھے اور یہ بہت بڑے کنور پیلس پر مکمل کنٹرول کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ انہیں یقیناً مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہوگا اور ان کی توجہ ہر طرف نہیں ہوگی۔ ایسے میں ہمارے پاس چانس تھا کہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا بڑا کنور جلد سیف ہاؤس کا دروازہ کھول دے، وہ جتنی تاخیر کرتا ہمارے لیے اتنی ہی مشکل ہوتی۔ کچھ دیر بعد سادی کی آواز آئی۔

''شوبی میں کیا کروں؟'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ ''میں بڑے بھیا کو سمجھا نہیں سکتی اور وہ سب بھی نہیں کر سکتی جو آپ کہہ رہے ہیں۔ شوبی پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں میرے مقدر میں واپس آنا ہوا تو میں واپس آجاؤں گی۔''

''میں تمہیں لینے آیا ہوں اور لے کر جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''بڑے کنور سے پوچھو کہ وہ کس برتے پر یہ یقین سے کہہ رہا ہے کہ وہ جلد پیلس کا کنٹرول حاصل کرلے گا۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' خلافِ توقع منشی نے کہا اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ''یہ سمجھتا ہے کہ اس نے سارے کام چھپا کر کیے ہیں؟''

میں چونکا اور اس کے پاس چلا آیا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''اس نے ایک حفاظتی دستہ بنایا ہوا ہے جس میں بھارتی آرمی کے سابق کمانڈوز شامل ہیں وہ یہاں سے کچھ دور ایک جگہ رہتے ہیں۔ یہ انہیں دن میں دو بار سگنل بھیجتا ہے۔''

''تم سن رہے ہو۔'' میں نے واکی ٹاکی میں کہا۔ میں نے اس کا بٹن آن کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے بڑے کنور نے کسی قدر کمزور لہجے میں کہا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''اگر تم ان کو سگنل نہ بھیجو تو؟''

''وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں آجائیں گے اور معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔''

''تم نے آخری بار سگنل کب بھیجا؟''

''رات بارہ بجے۔''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بج کر بارہ منٹ ہو رہے تھے۔ ''یعنی تم اگلا سگنل دوپہر بارہ بجے بھیجو گے۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایک بجے تک آجائیں گے۔'' بڑے کنور نے کہا۔

''وہ کبھی نہیں آئیں گے۔'' میں نے منشی دل جی کی طرف دیکھا۔ ''میں نے ٹھیک کہا نا منشی جی؟''

''شہباز جی ٹھیک کہہ رہے ہیں وہ کبھی نہیں آئیں گے میرے آدمی انہیں راستے میں نرک کی طرف روانہ کر دیں گے۔''

''تم نے سن لیا۔'' میں نے بڑے کنور سے کہا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' منشی دل جی نے کہا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے وہ بے شک کمانڈوز ہوں گے اور جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہوں گے لیکن وہ بے نقاب ہو گئے ہیں اور ان کو نشانہ بنانا بہت آسان ہے۔ ایک یا چند بم ان کو راستے میں ہی صفحۂ ہستی سے نابود کر دیں گے۔''

میری بات پر بڑے کنور کو چپ لگ گئی۔ صاف ظاہر تھا اس کی خوش فہمی ہوا ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ منشی دل جی ایسا بھیدی تھا جو تقریباً اصل مالک جتنا واقف تھا۔ بلکہ مجھے شبہ تھا بعض راز اس کے اپنے ہوں گے اور بڑا کنور بھی ان سے ناواقف ہوگا۔ بہ وقت ضرورت منشی جی نے اپنے بچاؤ کے لیے رکھے ہوں گے۔ میں نے بڑے کنور سے کہا۔ ''تم نے سن لیا اب باہر سے مدد آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ تب بھی کیا تم اندر ہی بیٹھے رہنا پسند کرو گے۔''

''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔''

''سوچو۔'' میں نے بدمزگی سے کہا۔ ''لیکن اتنی دیر مت کرنا کہ پھر کچھ کرنے کے لیے وقت ہی باقی نہ رہے۔''

میں بیتو کے پاس آیا اور دھیمی آواز میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ''اب تم کیا کہتے ہو؟''

''شوبی اگر یہ مان جائے تو ابھی نکل سکتا ہے دیر ہوگئی اور اوپر والوں نے ہتھیار ڈال دیے تو پھر ادھر سے نکلنا بہت دشوار ہو جائے گا۔''

''مسئلہ یہ ہے کہ وہ شاید ہی مانے اب ہم کیا کریں اندر گھس نہیں سکتے۔ سادی نرم دل ہے وہ اپنے بھائی کو مجبور نہیں کر پا رہی ہے۔''

بیتو نے کچھ دیر سوچا اور بولا۔ ''شوبی ہمارا دل کہتا ہے ویدی کو لے کر جائے، آگے آپ جو حکم کرو۔''

''میں تم کو یا اپنے کسی ساتھی کو حکم نہیں دے سکتا۔ ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں کہ بڑا کنور کیا فیصلہ کرتا ہے اس کے بعد ہم اپنا لائحہ عمل طے کریں گے۔''

''شوبی اگر کوئی اس طرف سے آئے تو....''

''بنا وارننگ شوٹ کر دو، اگر محسوس کرو کہ وہ حملہ کرنے آرہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کسی بھی حربے کے لیے تیار رہنا.... گیس اور دوائس بم اب ان کے پاس بھی ہوں گے۔ ہمارے پاس بس یہ رائفلیں اور پستول ہیں۔''

''ہم دونوں سے نمٹ سکتا ہے۔'' بیتو نے سر ہلایا۔

ہم اس جگہ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ آگے رامن کے آدمی مورچہ بند ہوں گے اور وہ ہمیں اتنی آسانی سے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

مجھے اس ہال میں اترنے والے راستے کا خیال آیا جو گرنیڈز سے تباہ کر کے بند کر دیا تھا۔ میں ملبے پر چڑھ کر اوپر آیا، آگے بہ ظاہر راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن میں جھک کر اور گھس کر آگے بڑھا۔ اس موقع پر نائٹ ویژن خاصی کام آرہی تھی، جلد میں نے ایک رخنہ تلاش کرلیا جو اوپر تک جا رہا تھا۔ میں ذرا نیچے آیا اور بیتو کو آواز دی۔ وہ آیا تو میں نے سرگوشی میں اسے بتایا کہ میں اوپر جانے کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس لیے وہ اب نیچے کا بھی خیال رکھے۔ بیتو نے سر ہلایا۔ ''ہم دیکھ لے گا۔ پر آپ دیکھ کر جانا ایسا نہ ہو کہ ملبا گرنے والا ہو۔''

''میں خیال رکھوں گا۔'' میں نے کہا اور دوبارہ اوپر کی طرف بڑھا۔ بعض جگہ پر ملبا سرک رہا تھا۔ مگر اس میں نیچے مزید خلا نہیں تھا اس لیے گرنے کا خدشہ نہیں تھا۔ میں اس رخنے تک پہنچا اور دوسری طرف جھانکا مگر کچھ نظر نہیں آرہا تھا بس ایسا ہی آڑا ترچھا ملبا پڑا تھا۔ جگہ بہت تنگ تھی اور اگر آگے راستہ بند ملتا تو واپس آنا بھی آسان نہ ہوتا۔ مگر میں نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ رائفل پر ٹارچ لگی تھی مگر اسے روشن کرنے کا مطلب تھا کہ اگر سوراخ کے دوسری طرف کوئی موجود ہوا تو اسے اپنی تشریف آوری سے خبردار کرتا۔ اس لیے میں نائٹ ویژن کے بل بوتے پر آگے سرکتا رہا۔ یہ رخنہ میری جیسی جسامت کے آدمی کے لیے چھوٹا تھا۔ بیتو اس میں آرام سے آجاتا اور کاکی تو ٹہلتا ہوا جاتا۔ مگر میں کسی کو آگے نہیں کرسکتا تھا یہ کام مجھے ہی کرنا تھا۔ اگر یہاں داخلے کا راستہ نکل آتا تو شاید ہماری بچت کی کوئی سبیل نکل آتی۔ مجھے امید تھی کہ اس راستے کو بند پا کر پہلے منشی اور اب رامن کے آدمی یہاں سے ہٹ گئے ہوں گے۔

مگر یہ میرا خیال تھا، یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اس راستے کو صاف کر کے خاموشی سے نیچے آنے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ یہاں جس طرح ملبا بکھرا ہوا تھا خاموشی سے نیچے آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں خود سرک رہا تھا اور اس سے آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اگر کوئی حد میں ہوتا تو وہ ان آوازوں کو سن لیتا۔ اس لیے میں نے اس حالت میں بھی اپنا پستول سامنے رکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں سرکتا ہوا سیڑھیوں کے اوپری حصے تک آگیا ہوں۔ یہاں سے واش روم کچھ ہی دور تھا۔ بدبو نے میرے اندازے کی تصدیق کی تھی۔ گرنیڈز کے فراخ دلانہ استعمال نے واش روم کی اندرونی ساخت تباہ کر دی تھی اور سیوریج لائنیں پھٹ گئی تھیں۔ یہ بدبو ان ہی سے اٹھ

رہی تھی۔ بہرحال یہ ناقابلِ برداشت نہیں تھی شاید اس لیے بھی کہ یہ واش روم بہت کم استعمال ہوتا ہوگا۔

راستہ اب بہت تنگ ہوگیا تھا اور میں بہ مشکل ہی آگے بڑھ پا رہا تھا۔ بالآخر میں اس خلا سے سر نکالنے میں کامیاب ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا خانہ تھا۔ میں نے غور کیا تو یہ وہی خانہ محسوس ہوا جس میں خفیہ دروازہ لگا ہوا تھا۔ خفیہ دروازہ مکمل طور پر تباہ ہوچکا تھا اور اس کے ہائڈرولک سسٹم کا آئل بہہ نکلا تھا۔ یہ جگہ چپچپا رہی تھی۔ میں نے ماربل کا ایک ٹکڑا کوشش کرکے ہٹایا تو اتنا راستہ بنا کہ میں باہر نکل سکوں۔ دیواریں گرنے سے یہ خانہ آخری طرف سے بھی بند ہوگیا تھا اور اب صرف اس کی چھت کھلی تھی۔ میں نے ایک طرف دیوار پر ہاتھ ٹیکے اور سر آہستہ سے اوپر کیا۔ دوسری طرف واش روم کا کھلا حصہ تھا اگرچہ وہاں بھی ملبا بکھرا ہوا تھا لیکن یہاں سے بہتر صورتِ حال تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ساتھ والے کمرے میں لگی آگ بجھا دی گئی تھی۔ آگ جس طرح سے بھڑکی تھی اور میں نے پورے کمرے میں لگائی تھی اس کے ازخود بجھنے کا امکان کم تھا۔ دھواں بھی نکل چکا تھا۔ میں احتیاط سے اس خستہ حال دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔

واش روم میں کوئی نہیں تھا اور کمرا بھی خالی تھا۔ میں نے سب سے پہلے پانی کی تلاش کی۔ اکثر نل بھی تباہ ہوگئے تھے لیکن ایک نل ٹھیک مل گیا۔ میں نے اسے کھولا تو سرد شفاف پانی آرہا تھا۔ میں نے پہلے چکھا اور پھر پیا لیکن زیادہ پینے سے گریز کیا۔ واپس کمرے میں آیا۔ اس کا دروازہ جلنے سے بچ گیا تھا اور بند تھا۔ میں نے اسے کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ یہاں بھی تاریکی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ پستول رکھ کر میں نے رائفل سنبھال لی تھی۔ یہاں کسی لمحے بھی کسی سے سامنا ہوسکتا تھا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ عمارت خالی تھی۔ میں راہداری سے گزر رہا تھا کہ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے اندر کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہ آپس میں بات کررہے تھے اور اونچی آواز میں کررہے تھے۔ ان کا انداز رازدارانہ نہیں تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا تو وہ لاک نکلا۔ اسی لمحے اندر سے کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔

"دروازہ کھولو۔" کوئی چلّا کر بولا مگر آواز باہر بہت کم آئی تھی۔ "ہمیں کیوں قید رکھا ہے۔"

"تم لوگ کون ہو؟" میں نے تالے کے سوراخ پر دونوں ہاتھوں سے پیالہ بنا کر رکھا اور اس میں منہ ڈال کر بولا۔

"کیا... کون ہو تم؟"

"میں ان میں سے نہیں ہوں جنہوں نے تمہیں یہاں قید کیا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اب اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"ہم پیلس کے گارڈز ہیں۔"

"تمہیں قید کرنے والے کون ہیں۔"

"جو بعد میں آئے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم کتنے لوگ ہو؟"

"ہم پانچ ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہمارے باقی سارے ساتھی مارے جاچکے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اکثر تو ہمارے ہاتھ سے مارے گئے تھے اور باقی منشی و رامن کے آدمیوں نے مارے ہوں گے۔ میں نے پوچھا۔ "تم جانتے ہو بڑا کنور کہاں ہے؟"

"وہ سیف ہاؤس میں جاچکے ہیں۔"

مجھے وہ آدمی باخبر لگا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ "تم لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں؟"

"نہیں ہمارے ہتھیار چھین لیے گئے تھے۔"

"یہ دروازہ لاک ہے اسے اندر سے نہیں کھولا جاسکتا؟"

اس نے میرے احمقانہ سوال پر افسوس کیا۔ "اگر کھول سکتے تو ہم یہاں قید ہوتے۔"

"پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا اور لاک پر پستول کی نال رکھ کر فائر کیا۔ دوسرے فائر پر لاک ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رائفل سنبھال لی۔ ایک خطرہ تو مجھے اندر والوں سے تھا دوسرا خطرہ یہ تھا کہ آس پاس رامن کے آدمی ہوئے تو وہ فائر سن کر آجائیں گے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ پانچوں گورکھے باہر آگئے۔ انہوں نے خاص گارڈز والی وردی پہن رکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی انہیں کیسے بخش دیا تھا جب کہ وہ خاص گارڈز میں سے تھے۔ میں نے یہی سوال کیا تو مجھ سے بات کرنے والے نے کہا۔ "ہم گیس کا شکار ہوگئے تھے اور جب تک ہوش میں آتے دوسرے آچکے تھے۔" بولنے والا تقریباً چالیس برس کا گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے اور تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "رام پال جوگندر... ان میں کچھ پیلس کے لوگ تھے۔"

"باقی باہر سے آئے تھے اور وہ پہلے منشی اور اب رامن کے آدمی ہیں۔ پیلس پر حملہ میں نے کیا تھا لیکن میرا مقصد صرف اپنی بہن کو واپس لے جانا تھا۔ منشی اور رامن بڑے کنور کی جان کے دشمن ہورہے ہیں۔ انہوں نے سارے مواصلاتی رابطے ختم کردیے ہیں اور اب باہر سے کوئی مدد نہیں آسکتی ہے۔"

رام پال غور سے سن رہا تھا۔ "میں تمہیں جانتا ہوں... میں پیلس کا نائب سیکورٹی انچارج ہوں۔"

"بڑا کنور سیف ہاؤس کے چیمبر میں مقید ہے کیونکہ اس کے ساتھ اندر جانے والے گارڈز میں تین غدار اور منشی کے آدمی تھے انہوں نے باقی سب کو ماردیا ہے۔"

رام پال کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ "ان میں میرا بھائی بھی شامل تھا۔"

"مجھے افسوس ہے لیکن ان میں سے کوئی نہیں بچا میں نے خود سنا تھا جو فائرنگ سے بچ گئے تھے انہیں ذبح کردیا گیا تھا۔"

کمرے میں روشنی تھی اور وہی روشنی باہر آرہی تھی لیکن میں نے نائٹ ویژن آف نہیں کیا تھا کیونکہ آگے تاریکی تھی۔ روشنی سے بچنے کے لیے میں ایک طرف ہوگیا تھا۔ رام پال یہ سن کر جذباتی ہوگیا۔ "اگر یہ سچ ہے تو میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"یہ سچ ہے اگر تم میرے ساتھ چلو تو میں بڑے کنور سے تمہاری بات کراسکتا ہوں۔"

"ہم تیار ہیں۔"

"تم اور تمہارے آدمی آگے چلیں گے۔ ابھی میں تم پر اعتماد نہیں کرسکتا جب تک بڑے کنور سے بات کراکے تمہاری تسلی نہ کرادوں۔"

وہ مان گئے اور میرے آگے روانہ ہوئے۔ کیونکہ ان کے پاس نائٹ ویژن نہیں تھا اس لیے ہم نے وہیں سے ٹارچیں اور ایمرجنسی لائٹس لے لیں۔ وہ واش روم اور اس کا حشر دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ رام پال خفیہ راستے سے واقف تھا۔ میں نے پہلے انہیں اس راستے کو ذرا وسیع کرنے کو کہا۔ پانچ افراد نے مل کر چند منٹ میں خاصا ملبا نکال لیا اور راستہ چوڑا ہوگیا اب اس سے آسانی سے گزرا جاسکتا تھا۔ پہلے وہ پانچوں نیچے گئے۔ میں نے ٹیٹو کو آواز دے کر بتایا کہ پیلس کے پانچ گارڈز نیچے آرہے ہیں۔ ان کے بعد میں نیچے گیا اور رام پال کے واکی ٹاکی پر بڑے کنور سے رابطہ کرایا۔ بڑے کنور کی آواز سن کر وہ اٹینشن ہوگیا اور اس نے اوپر کی صورتِ حال کی رپورٹ دی۔ پھر میں نے اس سے واکی ٹاکی لے کر بڑے کنور سے کہا۔

"اب تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اوپر کیا صورتِ حال ہے۔ تم جتنی دیر کروگے یہاں سے نکلنا اتنا ہی دشوار ہوتا جائے گا۔ فی الحال مرکزی پیلس میں بھی کوئی نہیں ہے یا پھر چند ایک لوگ ہیں ہم ان کا صفایا کرسکتے ہیں۔ اوپر اس چوہے دان کے مقابلے میں بہتر ہوگا۔"

"ہم اوپر کیسے جائیں گے تم نے راستہ تباہ کردیا ہے۔" بڑے کنور نے اس بار انکار نہیں کیا۔

"تمہارے آدمیوں نے راستہ کسی قدر صاف کردیا ہے ذرا کوشش کے بعد اس سے گزرا جاسکتا ہے۔ پھر ہم اسے بند کردیں گے۔"

رام پال منشی ول جی کے پاس بیٹھا اس سے پوچھ گچھ کررہا تھا ان لوگوں کو دیکھ کر منشی کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آرہے تھے۔ رام پال نے مجھ سے کہا۔ "یہ غیر ضروری ہے اسے ہمیں ٹھکانے لگادینے دیں۔"

"ہونا تو یہی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ابھی مجھے اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے اس لیے یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔"

اسی لمحے واکی ٹاکی پر بپ ہوئی۔ دوسری طرف سے بڑے کنور نے کہا۔ "میں دروازہ کھولنے جارہا ہوں تم ہوشیار رہو۔"

میں نے اضافی اسلحہ رام پال اور اس کے ساتھیوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ان کو میگزین دیے اور انہوں نے رائفلیں لوڈ کرلیں۔ پھر سب نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ میں نے منشی کو سامنے کیا اور اس سے کہا۔ "دروازہ کھلنے جارہا ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار ڈال کر باہر آجائیں۔" میں منشی کے بالکل پیچھے تھا۔ پھر میں نے واکی ٹاکی پر بڑے کنور سے کہا۔ "ریموٹ سے سیف ہاؤس کا دروازہ کھول دو مگر تم اور ساوی اندر ہی رہو گے۔"

"میں کھول رہا ہوں۔" اس نے کہا اور چند سیکنڈ بعد سیف ہاؤس کے دروازے سے ویسی ہی سنسناتی ہوئی آواز آئی جیسی خفیہ دروازے کھلتے وقت آتی تھی۔ یہ دروازہ بھی یقیناً ہائڈرولک طریقے سے کھلتا اور بند ہوتا ہوگا۔ کسی اور

طریقے سے اتنا وزنی دروازہ کنٹرول کرنا آسان نہیں تھا۔ میں اور میرے ساتھی ہوشیار تھے۔ میں نے جیتو کو اس جگہ سے دور رکھا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی منشی دل جی نے چلا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

”ہتھیار ڈال کر باہر آجاؤ۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو باس؟“ اندر سے ایک آدمی نے کہا۔

”میں حکم دے رہا ہوں۔“ منشی نے اس بار غرا کر کہا۔ ”فوراً ہتھیار ڈال کر باہر آجاؤ۔“

وہ دونوں منشی کے وفادار تھے۔ اس لیے حکم کی تعمیل کی مگر جیسے ہی وہ دروازے پر نمودار ہوئے رام پال نے اچانک دو فائر کیے اور دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ گولیاں ان کے سروں پر لگی تھیں۔ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟“

”یہ میرے بھائی کے قاتل تھے، میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”اس پر آپ مجھے جو سزا دو گے مجھے قبول ہے۔“

میں نے خود پر قابو پایا اور سخت لہجے میں کہا۔ ”یہاں ہر کوئی کسی نہ کسی کا قاتل ہے۔ خود پر قابو رکھو.... اچھا تھا اگر میں تمہیں خالی رائفل دیتا۔ اس طرح تم جذباتی ہوتے رہے تو بڑے کنور کی حفاظت کے لیے تم پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے۔“

رام پال سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں آگے آیا اور اندر کا حال دیکھ کر میری طبیعت مالش کرنے لگی تھی۔ وہاں ہر طرف لاشیں اور خون بکھرا ہوا تھا۔ یہ سب ان دونوں نے کیا تھا اور اس کا صلہ کیا ملا؟ وہ خود بھی لاشوں میں شامل ہو گئے تھے۔ میں لاشوں اور خون سے بچتے ہوئے چیمبر کی طرف بڑھا اس کا فولادی دروازہ نمایاں تھا۔ میں نے بڑے کنور کو آواز دی۔ ”تم سن رہے ہو؟“

”ہاں سن رہا ہوں۔“ بڑے کنور نے جواب دیا۔

”یہاں سب کلیئر ہے باہر آجاؤ۔“

”یہ فائرنگ کیسی تھی؟“

”رام پال نے جذباتی ہو کر منشی کے دونوں ساتھیوں کو مار دیا۔ یہاں مارے جانے والوں میں اس کا بھائی بھی شامل ہے۔ اب تم اور ساوی باہر آؤ تاکہ ہم اوپر جائیں۔“

اسی لمحے باہر سے جیتو نے پکار کر کہا۔ ”کچھ لوگ ادھر آ رہا ہے۔“

”ان کو روکو۔“ میں نے کہا اور بڑے کنور نے کہا۔ ”جلدی کرو.... وہ لوگ آرہے ہیں۔“

چیمبر کا دروازہ کھلا، ساوی آگے تھی وہ آتے ہی مجھ سے چمٹ گئی اور میرے بازو سے سر ٹکا لیا۔ وہ رو رہی تھی میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”پاگل روتی کیوں ہے ابھی تیری دیکھ بھال کرنے والے زندہ ہیں جب نہ ہوں تب رونا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے لرز کر کہا۔ ”شوبی میں آپ کے لیے بہت دعا کرتی تھی۔“

”مجھے اسی کی ضرورت ہے اب چلو۔“ میں نے پیچھے کھڑے بڑے کنور کی طرف دیکھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

اس نے سر ہلایا لیکن ساوی نے کہا۔ ”بڑے بھیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے رام پال سے کہا۔ ”تم لوگ بڑے کنور کو لے کر اوپر جاؤ، جب تک ہم آنے والوں کو روکتے ہیں۔“

”سادھنا میرے ساتھ جائے گی۔“

”نہیں یہ میرے ساتھ جائے گی کیونکہ تم خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا اور ساوی سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس پستول ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں ہے۔“

”سیف ہاؤس لاک کر دو۔“ میں نے کہا تو بڑے کنور نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی ریموٹ کے ساتھ کچھ کیا اور فولادی دروازہ سنسناتی آواز کے ساتھ بند ہونے لگا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد رام پال بڑے کنور کو لے کر سوراخ کی طرف بڑھا۔ اس کے دو آدمی بڑے کنور کو سہارا دے رہے تھے۔ اس کے سوراخ میں داخل ہونے کے بعد ساوی نے آہستہ سے کہا۔ ”بڑے بھیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بہت مشکل سے ہوش میں آئے تھے اور بہت دیر تک تو اٹھ بھی نہیں سکے تھے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کیسی ہو تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں اس لحاظ سے میں آرام سے تھی۔“ ساوی نے کہا۔ ”میری خدمت کے لیے دو خادمائیں تھیں، ڈاکٹر اور نرس ہر وقت میرے ساتھ ہوتے تھے۔“ پھر اسے خیال آیا۔ ”جیتو کہاں ہے؟“

”ہم یہاں ہے دیدی۔“ جیتو نے سرنگ کی طرف سے کہا۔ ”ابھی ادھر سے ہٹ نہیں سکتا ہے۔“

اپنی اپنی داستان

بھلے وقتوں کی بات ہے کہ جو لوگ سرکاری یا غیر سرکاری طور پر کچھ عرصہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں گزار آئے تھے، زندگی بھر اسی کی داستانیں مزے لے لے کر سناتے رہتے تھے اور سننے والے کے دل میں ایک حسرت بھری امنگ کروٹ لیتی تھی کہ کاش ارض بطن کے اس حسین خطے کا دیدار مجھے بھی نصیب ہوتا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسی خطۂ جنت نشاں سے لوٹنے والا ہر مسافر اپنے ساتھ ایک داستانِ خونچکاں لایا، جسے جو کوئی سنتا، درد و کرب سے تلملا اٹھتا۔ مجھے یہ دونوں بھلے اور برے وقت دُعا کا میں دیکھنے نصیب ہوئے۔ ایک سیلانی سیاح یا گشتی صحافی کے طور پر نہیں، بلکہ اس شجر پا بہ گل کی طرح جس نے موسم گل میں رنگ و بو کی دلآ ویز چادر اوڑھی اور موسم خزاں میں اپنے برگ و بار سے بھی محروم ہوا اور بالآخر ایک تند و تیز آندھی نے اسے جڑ ہی سے اکھاڑ پھینکا۔

وقت کی قدر

اللہ جانے کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہماری قوم (پاکستانی) کو وقت کی قدر نہیں حالانکہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ وقت کے قیمتی ہونے کا جتنا احساس ہماری قوم کے افراد کو ہے اتنا دنیا کے کسی کونے میں بھی موجود نہیں۔ ہم لوگ تو ہزاروں جانیں ضائع کر دیتے ہیں وقت ضائع نہیں کرتے چنانچہ جن احباب نے بسوں، ویگنوں یا رکشوں میں کبھی سفر کیا ہے تو وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ڈرائیور حضرات وقت ضائع کیے بغیر منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے جس برق رفتاری اور چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی اور یہ خصوصیت صرف ڈرائیور حضرات تک محدود نہیں بلکہ ہماری قوم کا ہر فرد اس جذبے سے مالا مال ہے کہ وقت ایسی چیز کو یونہی ضائع نہیں کرنا چاہیے چنانچہ بس یا ٹرین میں سوار ہونے کے لیے وہ قطار تک نہیں بناتے کہ اس طرح نہ جانے خواہ مخواہ کتنی گھڑیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بس یا ٹرین سے اترتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو کہنیوں سے دھکیلتے ہوئے جلدی سے جلدی اترنے کی کوشش کرتے ہیں ہم لوگوں کو چڑھنے کی بھی جلدی ہوتی ہے اور اترنے کی بھی اس کی وجہ ماسوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم وقت کی قدر و قیمت سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔

بڑے کنور کے ساتھ رام پال دو ساتھیوں کے ساتھ گیا تھا۔ دو اور منشی دل جی نیچے تھے۔ وہ دونوں جیتو کے ساتھ تھے۔ میں نے سوراخ میں جھانک کر رام پال کو آواز دی۔ ”اپنا ایک آدمی بھیجو منشی کو لے کر جائے گا۔“

کچھ دیر میں ایک آدمی آگیا اور میں نے اس کے ساتھ منشی کو روانہ کر دیا۔ پھر خود ساوی کو لے کر روانہ ہوا۔ میرے پیچھے جیتو آتا اور اس کے پیچھے رام پال کے باقی دو آدمی آتے۔ ان لوگوں کو اسلحہ دیتے ہوئے مجھے کچھ خدشہ ہوا تھا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ میں آگے تھا اور ساوی میرے پیچھے تھی۔ ہم جب نکلنے کے قریب پہنچے تو میں نے جیتو کو آواز دی۔ ”اب تم بھی آجاؤ۔“

کچھ دیر میں جیتو بھی یہاں تھا۔ رام پال اور اس کے آدمیوں نے راستہ مزید صاف کر دیا تھا۔ وہ بڑے کنور سمیت جلے کمرے میں موجود تھے۔ بڑا کنور ہانپ رہا تھا۔ اسے آرام اور علاج کی ضرورت تھی لیکن فی الحال دونوں ہی دستیاب نہیں تھے۔ جیتو اور ان دونوں کے آتے ہی میں نے ملبا ڈال کر اس راستے کو بند کرنے کا حکم دیا اور رام پال کے آدمی اس میں لگ گئے۔ وہ کنکریٹ اور سرامک کے بڑے بڑے ٹکڑے سوراخ میں ڈال رہے تھے ساتھ ہی چھوٹے پتھر اور مٹی بھی ڈال رہے تھے۔ اب کوئی اس طرف سے آنا چاہتا تو اس کے لیے یہ کام آسان نہ رہتا۔ میں ان کی نگرانی کر رہا تھا اور اب جیتو ساوی سے مل رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اسے رہا کرانے کے لیے ہم نے کیا کیا کوششیں کی تھیں اور کن مراحل سے گزرے تھے۔ ساوی خوش ہو رہی تھی اور ساتھ ہی فکرمند بھی۔ اس نے جیتو سے کہا۔ ”تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے دیدی.... آپ ہمارا دیدی ہو.... کوئی بھائی اپنی بہن کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟“

”یہاں سے نکلنا بہت مشکل کام ہے۔“

”شوبی دو بار پہلے بھی یہ مشکل کام کر چکا ہے۔“ جیتو نے فخر سے کہا۔ ”آپ نہیں جانتا شوبی کیا چیز ہے۔“

”مجھے کیوں نہیں پتا.... کیا میں ان کے ساتھ نہیں رہی تم بھول رہے ہو مجھے دو بار گولی لگی تھی۔“

”تعریفیں بس۔“ میں نے کمرے میں آکر کہا اور بڑے کنور سے پوچھا۔ ”اب ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”میرے رہائشی حصے میں۔“ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ”سب وہیں ہے.... اسلحہ بھی اور میری دوائیاں

بھی۔"

"تم دوائیاں لے کر نہیں آئے تھے؟"

"نہیں جلدی میں رہ گئی تھیں۔"

"تب چلو۔" میں نے کہا اور دونوں غیر مسلح گارڈز سے کہا۔ "تم کنور کو سنبھالو گے۔ بیتو اور سادی کنور کے ساتھ ہوں گے۔ رام پال تم ایک آدمی لو اور میرے ساتھ چلو۔"

"آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"میں راستہ کلیئر کرنے جارہا ہوں۔" میں نے کہا اور رام پال سے پوچھا۔ "تمہارے پاس نائٹ ویژن ہے؟"

"میرے پاس ہے۔"

"ٹھیک ہے وہ پہن لو.... دوسرا تمہارے ساتھ ہوگا ہمیں اس فلور کی لائٹ اڑانی پڑے گی۔"

"وہ کیسے؟ فیوز بکس یہاں نہیں ہے۔"

"اس کی فکر مت کرو.... کسی کے پاس سکہ ہے۔"

سب کے پاس کوئی نہ کوئی سکہ تھا۔ میں نے ایک سکہ کمرے کے بلب ہولڈر میں لگا کر اوپر سے انرجی سیور فٹ کردیا۔ جیسے ہی بٹن آن کیا کمرے کے ساتھ راہداری بھی تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ اس کمرے کی روشنی بند ہوگئی تھی جس میں یہ پانچوں قید تھے۔ گویا یہ فلور یا راہداری بجلی سے محروم ہوگئی تھی۔ رام پال نے ایک چھوٹی سی نائٹ ویژن گاگلز نکال پہن لی۔ یہ بہت اچھی کوالٹی نہیں تھی کیونکہ تاریکی میں یہ کسی بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھی۔ ہم باہر نکل آئے۔ سیڑھیوں تک آئے یہاں نیچے کے حصے میں رخ خان کے آدمی اور مقامی گارڈز کی لاشیں ایک ڈھیر کی صورت میں جمع تھیں۔ میں نے رام پال کو اشارہ کیا کہ وہ سیڑھیوں کو چیک کرے اور خود سیڑھیوں کے پیچھے سے گزرنے والی راہداری کی طرف بڑھا۔ یہ آگے جاکر بائیں طرف مڑ رہی تھی۔ اس طرف روشنی تھی۔ میں نے ایک وال لیمپ کو اتار کر اس میں سکہ رکھ کر بلب لگایا تو یہاں کا فیوز بھی اڑ گیا۔

آگے کوئی نہیں تھا۔ میں رک گیا۔ کچھ دیر میں رام پال بھی اپنے ساتھی کے ہمراہ آگیا اور ہم اس راہداری کے کمرے چیک کرنے لگے۔ مگر یہ جگہ مکمل طور پر خالی تھی۔ میں نے رام پال سے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے تو اس نے مجھے بتایا کہ اس راہداری سے نکلنے کے بعد ہم دائیں طرف جائیں تو بڑے کنور کے.... مخصوص حصے تک پہنچ جائیں گے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جاکر بڑے کنور کو لے آئے تب تک میں اس کے ساتھی کے ہمراہ یہیں رکتا ہوں۔ رام پال چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کے آدمی کو وہیں چھوڑا اور خود دبے قدموں آگے کی طرف بڑھا۔ راہداری آگے جاکر پھر دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر بائیں طرف دیکھا وہاں روشنی تھی۔ ہمیں اسی طرف جانا تھا۔ میں کونے پر رک گیا۔ چند منٹ بعد رام پال باقی سب کو لے کر آگیا۔ وہ اور بیتو سب کی رہنمائی کررہے تھے کیونکہ اس تاریکی میں وہی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے بیتو سے پوچھا۔

"جب میں بڑے کنور سے بات کررہا تھا تب تم نے کہا تھا کچھ لوگ اس طرف آرہے ہیں۔"

"شوبی وہ کم سے کم تین آدمی تھا وہ موڑ تک آیا مگر جب ہم نے آپ کو خبردار کیا تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور دوبارہ نہیں آیا۔"

میں فکر مند ہوگیا۔ اگر دشمن سرنگ میں ہمارے پاس آگیا تھا تو اس طرح جھلک دکھا کر واپس جانے کی کیا تک تھی۔ اسے حملہ کرنا چاہیے تھا جب کہ وہ جانتا تھا کہ ہم یہاں محصور ہیں۔ رام پال نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "سر ہمیں آگے جانا ہوگا.... بڑے کنور کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے دیکھا وہ بہ مشکل سہارا لیے کھڑا تھا۔ سجاوی بہرحال اس کی بہن تھی اور اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ بھی اس کے پاس تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ "چلو لیکن بہت محتاط رہنا ہوگا۔"

میں اور رام پال آگے تھے۔ منشی ہمارے ساتھ تھا۔ جب کہ بیتو اور رام پال کے دو مسلح ساتھی عقب میں تھے۔ وہ پشت کی حفاظت کرتے چل رہے تھے کیونکہ دشمن کسی بھی طرف سے آسکتا تھا۔ مجھے ذرا خوش فہمی نہیں تھی کہ رامن نے اس عمارت کو نظر انداز کردیا ہوگا۔ یہیں وہ ہیرے تھے جو اس سارے فساد کی جڑ تھے۔ جہاں راہداری گھوم رہی تھی میں نے رام پال سے پوچھا۔ "بڑے کنور کے حصے تک جانے کا اور کوئی راستہ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف یہی ایک راہداری جاتی ہے۔ اس پر بھی سخت سیکورٹی ہوتی ہے۔ آخری حصے میں خاندان کا کوئی فرد بھی بغیر اجازت اور چیک کے نہیں جاسکتا۔ بڑے کنور کو سب سے زیادہ خطرہ خاندان والوں سے ہی تھا۔ راج کنور اس کا بھائی تھا اور منشی رشتے دار تھا اور دونوں اسے دنیا سے رخصت کردینا چاہتے تھے۔ میں اور رام پال محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری بندوقوں کا رخ سامنے کی طرف تھا اور ہم ایک سیکنڈ کے نوٹس پر فائر کرنے کے لیے تیار تھے۔ ایک جگہ دو گارڈز کی لاشیں اپنے ہی خون میں غلطاں پڑی تھیں۔ ان کے پاس سے گزر کر ہم اس چھوٹے دائرے نما ہال میں داخل ہوئے جس کے تین اطراف میں کمرے تھے اور ان میں وسط والا کمرا بڑے کنور کا خاص کمرا تھا۔ یہاں بھی تباہی کے آثار تھے اور جا بجا ملبا بکھرا ہوا تھا۔ شاید یہاں بھی جنگ ہوئی تھی۔ وہاں روشنی تھی اس لیے سب نے نائٹ ویژن آف کردیں۔ ابھی تک ہمیں کہیں مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہم سب ہال میں آگئے اور بڑا کنور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا کہ میں نے اسے روکا۔ "نہیں، پہلے چیک کرنے دو۔"

رام پال آگے بڑھا تھا کہ منجمد ہوگیا۔ ایسا لگا جیسے اسے کچھ نظر آیا ہو۔ میں نے تقلید کی اور فوراً ہی مجھے وہ چیز نظر آگئی۔ یہ ہال کے تقریباً وسط میں رکھا ایک گھی کے پانچ کلو کے ڈبے کے برابر کا ڈائنا مائٹ بنڈل تھا جس کے ساتھ ایک سرکٹ منسلک تھا اور بیٹری سمیت سب واضح تھا۔ میں پلٹنے لگا تھا کہ مجھے رامن کی مکروہ آواز سنائی دی۔ "نہ.... نہ شہباز.... مزید کوئی حرکت مت کرنا ورنہ میں ریموٹ کا بٹن دبادوں گا اور اس جگہ موجود کوئی فرد زندہ نہیں رہے گا۔ تم سب میری نظروں میں ہو اس لیے کوئی بھی حرکت نہ کرے۔"

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔"

"اچھا تمہارے پیچھے موجود منشی خاموشی سے سرک رہا تھا اسے روکو اگر مرنا نہیں چاہتے ہو تو...."

میں نے مڑ کر منشی کو دیکھا تو وہ فوراً ساکت ہوگیا لہٰذا رامن نے درست کہا تھا۔ "تم نے اسی لیے اپنے آدمیوں کی جھلک دکھائی تھی کہ ہم اوپر آجائیں؟"

"ہاں اور تم میری توقع پر پورے اترے۔" اس نے کہا۔ "شہباز میں صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔ اپنا تمام اسلحہ پیچھے گیلری میں پھینک دو۔"

میں ٹریپ در ٹریپ کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ ایک ٹریپ سے نجات پاتا تو دوسرے میں پھنس جاتا۔ منشی کے مقابلے میں رامن زیادہ خطرناک ثابت ہورہا تھا۔ اس نے بہت چالاکی سے ہمیں پھانسا اور وہاں آنے پر مجبور کردیا جہاں وہ ہمیں اور خاص طور سے بڑے کنور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں اس نے ہمارے استقبال کے لیے ایک بم ٹریپ رکھا تھا اور خود کہیں دور بیٹھ کر وہ اب ہمیں مجبور کررہا تھا۔ میں نے کہا۔ "رامن اگر تم نے اس بم کو اڑادیا تو ہم سب مر جائیں گے پھر تم وہ ہیرے کس طرح حاصل کرو گے۔"

"ابھی راج کنور ہے۔" رامن نے بے پروائی سے کہا۔ "میں اس کی مدد سے ہیرے حاصل کرلوں گا۔"

"اسے سیف کا کمبی نیشن نہیں معلوم ہے۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ راج کنور کو لازمی معلوم ہوگا اور اگر اسے بھی علم نہیں ہوا تب بھی میں اس سیف کو لے جاؤں گا اور آج کل ٹیکنالوجی بہت ترقی کرچکی ہے میں اسے کھلوالوں گا۔ بہرحال تم سیف اور ہیروں کی نہیں اپنی فکر کرو.... میں دیکھ رہا ہوں تم میں سے کسی نے ہتھیار نہیں پھینکے ہیں میں اب دس تک گنوں گا اور پھر بوم.... ایک دو تین چار...."

میں نے اپنی رائفل پھینک دی پھر باقی سب نے بھی میری پیروی کی۔ ہم نے اتنی زور سے پھینکی تھیں کہ وہ سرکتی ہوئی گیلری میں چلی گئیں۔ رامن نے کہا۔ "پستول بھی، تم سب کے پاس پستول ہوں گے۔"

"صرف دو پستول ہیں۔" میں نے کہا اور اپنا پستول پھینک دیا۔ بیتو نے میری تقلید کی۔

"اوکے تم سب سر ہاتھ پر رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور اب کسی کے پاس سے پستول یا کوئی بھی ہتھیار نکلا تو وہ اسی سے مارا جائے گا۔"

"اوکے.... اوکے۔" میں نے دل ہی دل میں اس مکار آدمی کو سناتے ہوئے سادی سے کہا۔ "پستول پھینک دو کسی کے پاس کوئی چاقو ہے تو وہ بھی پھینک دو ورنہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہوگا۔"

اس بار سادی نے پستول اور رام پال نے ایک بڑا فوجی چاقو نکال کر پھینکا تھا۔ یہ شاید اس نے کے پاس رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی اور سروں پر ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ رامن نے سادی اور بڑے کنور کو بھی رعایت نہیں دی اور انہیں بھی اسی طرح بیٹھنا پڑا۔ چند سنٹ بعد گیلری کی طرف سے چار مسلح افراد برآمد ہوئے اور انہوں نے ہال میں چاروں طرف اس طرح پوزیشن سنبھال لی کہ کوئی فرد یا اس کی حرکت ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ پھر دو افراد

آئے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ میں پہلے بھی ان لوگوں کو دیکھ چکا تھا۔ آنے والے دونوں سب کی مکمل جامع تلاشی لینے لگے۔ وہ کوئی جگہ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک سادی کی طرف بڑھا تو میں نے کہا۔ "رامن سدھیہ کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے پھر اسے شوٹ کر دیتے ہیں۔" رامن نے سرد لہجے میں جواب دیا تو سادی کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ میں نے مجبوراً سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے لیکن اپنے آدمیوں سے کہو صرف تلاشی لیں، مجھے مشتعل کرنے والا کوئی کام نہ کریں ورنہ ایسا نہ ہو تم ان کی وجہ سے ہیروں سے محروم ہو جاؤ۔"

"تم فکر مت کرو وہ صرف تلاشی لیں گے۔"

سادی کی تلاشی لینے والے نے اس کو بھی پوری طرح ٹٹولا تھا مگر اس کے انداز میں بدمعاشی نہیں تھی اور نہ ہی اس نے غیر ضروری طور پر اسے دیر تک چھوا۔ اس کے باوجود سادی کے لیے یہ صبر آزما مرحلہ تھا۔ دس منٹ میں یہ مرحلہ بھی مکمل ہو گیا۔ کسی کے پاس سے کچھ نہیں نکلا تھا۔ بڑے کنور کے ڈھیلے چوغے کو بھی اچھی طرح ٹٹولا گیا تھا۔ اس کی قیمتی لکڑی اور ہاتھی دانت کے دستے کی بنی چھڑی ایک اچھا ہتھیار ہو سکتی تھی مگر تلاشی لینے والے نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ بڑے کنور کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے استعمال کر سکتا۔ وہ بہ مشکل گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور اچانک ہی وہ نیچے لڑھک گیا۔ سادی نے فکر مندی سے کہا۔ "آپ ٹھیک ہیں؟"

میں نے بلند آواز سے کہا۔ "رامن بڑے کنور کی حالت خراب ہو رہی ہے اسے دوا کی ضرورت ہے جو اس کے کمرے میں ہے۔"

"فکر مت کرو یہ مرے گا نہیں۔" رامن نے کہا۔ وہ اپنے طریقہ کار سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تلاشی لینے کے بعد اس کے آدمی ہمارا اسلحہ سمیٹ کر لے گئے اور چار مسلح افراد اسی طرح ساکت اور چوکس کھڑے تھے۔ وہ پیلس کے گارڈز میں سے نہیں تھے بلکہ منشی کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے اب منشی کے بجائے رامن کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ اپنے فیصلے پر ذرا بھی شرمسار نہیں تھے۔ ان کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ان میں سے کسی نے منشی سے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ وہ خود سہما ہوا تھا۔ منشی ذہین آدمی تھا اور یقیناً کسی قدر حوصلہ مند بھی تھا لیکن حوصلہ بس اس وقت تک تھا جب تک حالات اس کے قابو میں تھے۔ جہاں حالات اس کے قابو سے نکلے اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کی حالت اس بھیڑ کی سی ہو رہی تھی جس نے قصائی کو دیکھ لیا ہے اور اس امید میں ہو کہ آج اس کی باری نہیں آئے گی۔

مگر اب وہ پُرسکون تھا حالانکہ معاملہ رامن کے ہاتھ میں چلا گیا تھا اور وہ اس کا حریف تھا۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مگر اب منشی اتنا خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسلحہ سمیٹ کر جانے والے چند منٹ بعد ہی رامن کے پاس لوٹ آئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریموٹ نما آلہ تھا۔ اس نے بم کی طرف اس کا رخ کر کے چند بٹن دبائے اور اس کے سرکٹ پر جلنے بجھنے والی ایل ای ڈیز بند ہو گئیں۔ گویا بم ڈی ایکٹی ویٹ ہو گیا تھا۔ مگر یہ چند لمحے یہاں موجود افراد پر بہت بھاری گزرے تھے کیونکہ اگر غلطی سے کوئی اور بٹن دب جاتا تو ہم پچھتانے سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ رامن کے ساتھ چھ افراد تھے اور مزید درجن افراد دوسری جگہوں پر تھے۔ اس نے آتے ہی خونی نظروں سے منشی دل جی کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ "منشی بازی الٹ گئی ہے اب یہ میرے ہاتھ میں ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" منشی بے پروائی سے بولا۔ "لیکن ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔"

میرے ساتھ رامن بھی چونکا تھا۔ رامن نے غرا کر کہا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔"

"کیوں نہ میں تمہیں جلد نرکھ بھیج دوں۔" رامن نے جیکٹ سے پستول نکال کر اس کا رخ منشی کی طرف کیا تو وہ اس بار بھی پُرسکون رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ضرور تاکہ تم بڑے کنور کی مدد سے بھی سیف نہ کھلوا سکو۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" رامن بولا۔

منشی نے حقارت سے اسے دیکھا۔ "تم ایک دو ٹکے کے سرکاری ملازم اگر تمہیں کنور پیلس کا انتظام مل گیا تو تم نے خود کو کچھ سمجھنا شروع کر دیا۔ تم ساری عمر بھی یہاں رہو تو اس جگہ کے بارے میں وہ نہیں جان سکتے جو میں جانتا ہوں۔"

"او کے اگر میں تمہارے سر کے بجائے سینے میں سوراخ کر دوں تو تم یہ کویتا (شاعری) چھوڑ کر سیدھی بھاشا میں بات کرو گے۔"

"سیدھی بھاشا میں بات یہ ہے کہ سیف کھولنے کے لیے تین کمبی نیشن درکار ہوتے ہیں۔ ایک بڑے کنور کے پاس ہے دوسرا سادھنا کے علم میں تھا لیکن بڑے کنور نے اس سے حاصل کر لیا۔"

"تیسرا کمبی نیشن راج کنور کے پاس ہوگا۔" میں نے کہا۔ "لیکن منشی نے اسے حاصل کر لیا ہے۔"

منشی دل جی میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "شہباز جی تمہاری ذہانت پر مجھے کبھی شبہ نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ میں تمہارے ساتھ خوف زدہ تھا کیونکہ تمہارے پاس مجھے زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ تم بلاوجہ کسی کو نہیں مارتے ہو۔ اس سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" اس نے پھر حقارت سے رامن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اس نے پھر پستول منشی کی طرف کیا۔

"اس کے باوجود میں تمہارے سر میں سوراخ کر سکتا ہوں۔"

"اور اس کے بعد ان احمقوں کو کیا جواب دو گے جو صرف ہیروں کے لالچ میں تمہارے جیسے گدھے کے ساتھ شامل ہوئے۔ رامن یہ میرا منصوبہ تھا اور مجھے اس کے ایک ایک حصے کا علم ہے۔" منشی نے ان کی طرف اشارہ کیا جو پارٹی بدل کر رامن کے ساتھ مل گئے تھے۔

رامن کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آئے تھے۔ میں منشی جی کے دلیے پر حیران تھا۔ اس نے اصل پتا اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ میرے لیے یہ پتا بیکار تھا۔ اس نے رامن کے لیے بچا کر رکھا تھا اور موقع آنے پر اس کے سامنے پھینک دیا تھا۔ ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ ان افراد کے انداز میں بھی تبدیلی آگئی تھی جو اصل میں منشی کے ساتھ تھے مگر اب رامن کے ساتھ تھے۔ وہ رامن کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کا انداز اتنا چوکنا نہیں رہا تھا۔ ان میں وہ ہٹا کٹا سیاہ فام بھی شامل تھا جو منشی کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا اور اس کے آدمیوں کو وہی کنٹرول کر رہا تھا۔ اب وہ بھی رامن کے ساتھ تھا اور اس کے آدمی بھی رامن کے ساتھ تھے۔ رامن سوچ میں پڑ گیا تھا۔ منشی دل جی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اب بھی کھیل میں شامل تھا اس سے باہر نہیں ہوا تھا۔

یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا تھا کہ صورت حال میں اچانک تبدیلی سے رامن اپنے طے شدہ پلان پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب اسے منشی کو بھی شامل کرنا تھا۔ اب میں سمجھا تھا کہ منشی اور رامن کیوں مجھے اور سادی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ بہ ظاہر ہم ان کے لیے بیکار تھے اور وہ بیکار چیزیں رکھنے کے بجائے انہیں پہلی فرصت میں ٹھکانے لگانے کے قائل ہیں۔ سادی کے پاس ایک کمبی نیشن تھا اور اگر بڑا کنور آسانی سے نہیں مانتا تو سادی کی مدد سے اس پر دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف میرے ذریعے سادی کو دباؤ میں لایا جا سکتا تھا۔ پھر بیتو کی مدد سے مجھ پر دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ منشی اور رامن اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہماری زندگی کی زنجیر برقرار رکھی تھی۔ ایک بار سیف کی دولت ان کے ہاتھ میں آجاتی تو وہ اس زنجیر کو ایک بار ہی ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے تھے۔

رامن سے بات کر کے منشی دل جی خاموش کھڑا تھا۔ اس نے پھر کچھ کہنے یا رامن سے سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ضرورت مند رامن تھا وہ نہیں۔ مگر رامن کے ذہن میں اب بھی ابہام تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ امید تھی۔ اس نے منشی کی طرف دیکھا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تم سے وہ کمبی نیشن نہیں نکلوا سکتا؟"

"تم ایسا کر سکتے ہو، تم میرے جسم کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہو اور میں تشدد برداشت کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اگر تمہیں تشدد کے لیے میرا جسم ہی نہ ملے تو تم کیا کر لو گے؟"

رامن چونکا۔ "کیا مطلب؟"

منشی دل جی نے اپنا منہ کھول کر دکھایا۔ "یہ دیکھو میرے منہ میں کیا ہے۔"

اس کی زبان پر ایک چھوٹا سا شیشے کا کیپسول تھا۔ اس میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ اس نے دکھا کر منہ بند کر لیا اور اسے واپس جبڑے اور گال کے درمیان کر کے بولا۔ "اس میں سائنائیڈ ہے۔ دنیا کا خطرناک ترین زہر، مجھے بس کیپسول توڑنا ہوگا اور میں ایک سیکنڈ میں مر جاؤں گا۔ پھر تم میری لاش پر تشدد کر کے پوچھتے رہنا۔"

"تم بلف کر رہے ہو۔" رامن نے بے یقینی سے کہا۔ "اس قدر خطرناک چیز تم منہ میں لیے پھر رہے ہو۔ اگر غلطی سے یہ تمہارے پیٹ میں چلا گیا تو.....؟"

"میں نے اسے ابھی منہ میں لیا ہے اس سے پہلے یہ میرے لباس میں تھا اور اگر یہ غلطی سے بھی پیٹ میں چلا گیا تب بھی بہت کم امکان ہے یہ اندر ٹوٹے گا۔ جب تک میں

اسے چباؤں گا نہیں میں محفوظ ہوں لیکن اسے چبانے میں سیکنڈ کا دسواں حصہ لگے گا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں تم پر قابو پالوں گا؟" رامن بدستور شک میں تھا۔

"نہیں یہ میں نے برے وقت کے لیے رکھا ہے۔ میں ناکام رہتا تو بڑے کنور کے ہاتھ آنے کے بجائے اسے چبانے کو ترجیح دیتا۔" منشی دل جی نے کہا۔ "عذاب سے اور سسک کر مرنے سے بہتر ہوتا میں اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیتا۔"

منشی نے ثابت کردیا تھا کہ اس نے واقعی ہر پہلو پر نظر رکھی تھی۔ یہ اسی کا منصوبہ تھا۔ رامن طفیلیے کے طور پر شامل ہوا تھا۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے یا تو وہ منشی کا تعاون حاصل کرلیتا یا پھر ہیرے بھول جاتا۔ لیکن اس صورت میں وہ ان خون خوار لوگوں کو کیا جواب دیتا جو صرف دولت کے لالچ میں اس کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ اگر انہیں دولت نہ ملتی تو وہ رامن کی بوٹیاں نوچ لیتے۔ اس کے پاس واحد راستہ منشی کو ساتھ ملانے کا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ میرے سامنے ایک اور کھیل شروع ہوگیا تھا اور میں اسے دل چسپ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس میں میرے ساتھ سادی اور بیتو کی زندگی بھی داؤ پر لگی تھی۔ ہاں یہ کھیل جتنا الجھتا ہماری زندگی کے امکانات اتنے ہی بڑھ جاتے۔ سادی نے بڑے کنور کو سنبھال کر اٹھا لیا تھا۔ اس نے رامن سے کہا۔ "ان کو دوا کی ضرورت ہے۔"

"فکر مت کرو اگر کچھ دیر دوا نہ ملی تو یہ مرے گا نہیں۔" رامن نے نفرت سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے بڑے کنور سے کوئی خاص پرخاش ہو حالانکہ بڑے کنور نے ایک بار اسے معاف کیا تھا اور اسے پیلس کا منتظم بھی بنایا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو رامن کو پیلس سے لات مار کر نکال چکا ہوتا۔ اس کے برعکس رامن کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی عناد دبائے بیٹھا ہے اور اب اسے موقع مل رہا تھا۔ گرنے کے بعد بڑے کنور کا بڈ سر سے ہٹ گیا تھا اور اس کا چہرہ نمایاں تھا جس پر سانپ جیسی دھاریاں تھیں اور وہ خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ منشی اور رامن کے آدمی اسے دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ زہریلا سانپ ہو۔ انہوں نے ایسا انسان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ رامن اور منشی اسے دیکھتے رہے تھے۔ میں نے رامن سے کہا۔

"تمہارے احساسات اپنی جگہ لیکن اگر یہ ... ہوگیا یا طبیعت زیادہ خراب ہونے سے پرلوک سدھار گیا ... کیا تم کبھی نیشن لینے اس کے پیچھے جاؤ گے۔ تم نے تو ... وہاں جانا بھی نہیں ہے۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو۔" رامن نے خون خوار لہجے میں کہا۔ "ایسا نہ ہو میں پہلے تمہیں نرکھ بھیج دوں۔"

"تمہارا ارادہ تو یہی ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اوپر والے کی مرضی ہو۔"

"ٹھیک ہے اگر اوپر والے کی مرضی یہی ہے کہ یہ بنا دوا کے مرجائے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"شہباز جی ٹھیک کہہ رہے ہیں اسے دوا دینے دو۔" منشی جی نے کہا۔ "دیر خطرناک ہوسکتی ہے۔"

"تم اپنا منہ بند رکھو۔" رامن اس پر الٹ پڑا۔ ایسا لگ رہا تھا اس غیر متوقع صورت حال نے اس کی قوت فیصلہ متاثر کی تھی۔ وہ سب کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ کسی نے ... ہٹے کٹے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔

"تم اس شخص کے ساتھ مل گئے ہو جس کے پاس فیصلہ کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔"

"رامن جی ... اسے دوا لینے دو۔" سیاہ فام نے کہا۔ اس کا لہجہ بغیر کسی جذبے کے تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ رامن کو باس نہیں سمجھ رہا ہو۔ بس اس کے ساتھ ہے ... نے اسے بھی خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"بکواس مت کرو یہاں باس میں ہوں۔"

"واقعی۔" سیاہ فام کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ "اگر ہم منشی کا ساتھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ آئے تو تم نے خود کو باس کہنا شروع کردیا۔"

"میں باس ہوں۔" رامن نے کہا اور اس کا ہاتھ جیکٹ کی جیب کی طرف گیا جس میں اس نے ریموٹ رکھا تھا۔ سیاہ فام نے رائفل کا رخ اس کی طرف کردیا۔

"نہیں رامن جی ... ہاتھ اوپر رکھو ..."

"تم غداری کر رہے ہو۔" رامن غرایا لیکن اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

"میں تمہاری غلطی ٹھیک کر رہا ہوں۔" ... اس کی جیب سے ریموٹ نکال لو ... پستول بھی۔"

رامن کے پیچھے کھڑے آدمی نے سیاہ فام کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ تلاشی لینے والوں میں شامل تھا۔ اس بار اس نے رامن کی تلاشی لی تھی۔ پھر سیاہ فام کے اشارے پر وہ ...

ہمارے ساتھ آ کھڑا ہوا میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس موقع کے لیے ہمارے ہاں کہتے ہیں وایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ...."

رامن خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے منشی کی طرف دیکھا۔ "یہ تو نرا ایجنٹ ہے تم پڑھے لکھے شخص ہو اس موقع کے لیے کوئی شعر ہوگا تمہارے ذہن میں ....؟"

"رنگ بدلتا ہے آسمان کیسے کیسے۔" منشی دل جی نے مسکرا کر کہا۔

"پچھلے دس گیارہ گھنٹوں میں واقعی کچھ زیادہ ہی بدل گیا ہے میری تو عقل خبط ہو کر رہ گئی ہے۔ حالات کے اتنے تماؤ بھراؤ میں نے شاید اس پورے عرصے میں نہیں دیکھے جتنے ان چند گھنٹوں میں دیکھ لیے ہیں۔"

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" منشی دل جی نے پھر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دیا۔ منشی دل جی میرے پاس تھا میں نے ذرا جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"منشی جو لوگ بیک اپ ٹیم کی دیکھ بھال کے لیے گئے ہیں ان کی واپسی کب تک ہوگی۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "ان کی واپسی نہیں ہوگی وہ اپنا کام کر کے چلے جائیں گے۔"

"اس کے برعکس میرا خیال ہے وہ یہیں آئیں گے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ منشی یوں خاموش اور انجان ہوگیا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

سیاہ فام نے اپنے ایک آدمی کو بھیج کر بڑے کنور کے کمرے سے اس کی دوائیں منگوا دی تھیں اور سادی اب اسے دوا دے رہی تھی۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ کمانڈ اب سیاہ فام کے پاس ہے۔ کم سے کم یہاں موجود باقی افراد اس کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے منشی سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"اس کا نام جگنو ہے۔" منشی جی نے کہا۔ "بمبئی کا مشہور بدمعاش ہے۔ باقی سارے آدمی اس کے ہیں۔"

"یعنی دوسرے آدمیوں پر بھی اسی کا ہولڈ ہوگا۔"

"بالکل .... سوائے رامن کے چار پانچ آدمیوں کے۔"

"ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھ چکا ہوں یہاں کے گارڈز نکمے اور نااہل ہیں۔"

"مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔" منشی جی نے کن انکھیوں سے رام پال کی طرف دیکھا۔ "یہاں موجود سارے گارڈز ایک ہی قبیلے کے اور تقریباً سب آپس میں رشتے دار ہیں۔ ایک نے دوسرے کو رکھوایا اور دوسرے نے تیسرے کو۔"

"یہ تو اس خطے کی خاص بات ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میرٹ کے بجائے اقربا پروری نے ہمیں ہر شعبے میں نان پروفیشنل کردیا ہے۔"

"بس یہ بھی ایسے ہی گارڈز ہیں جنہیں گن اٹھا کر فائرنگ کرنا آتی ہے لیکن جب ان کا واسطہ صحیح معنوں میں پروفیشنل سے پڑا تو یہ سب ڈھیر ہوگئے۔"

"آدمی تو تمہارے بھی کم پروفیشنل نہیں ہیں انہوں نے کینیے کرنل کے انتہائی تربیت یافتہ آدمیوں کو اڑا کر رکھ دیا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"یہ اس طرح کے پروفیشنل ہیں کہ جان لینا اور دینا دونوں جانتے ہیں۔" منشی جی نے سر ہلایا۔ "اسی لیے کامیاب بھی رہے۔"

"لیکن کرنل کے آدمیوں کو تمہارے آدمیوں کی طرف سے حملے کا خدشہ بھی تو نہیں تھا۔"

"اسی وجہ سے تو آسانی سے مارے گئے۔" منشی بولا۔ "انہوں نے خاموشی سے کارروائی کی اور تمام اسنائپرز اور میزائل چلانے والوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ان کی جگہ سنبھال کر انہوں نے کارروائی شروع کردی۔ وہ مہارت میں کرنل کے آدمیوں سے کم نہیں ہیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ان کی مہارت میں نے دیکھی تھی جب انہوں نے دونوں اے پی سی گاڑیاں اڑا دیں۔ میں خود کئی بار ان کے نشانے سے بال بال بچا۔"

تمہاری یہاں موجودگی حیرت انگیز تھی۔ تمہارے بارے میں یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ تم کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو یہ خیال کسی کو نہیں تھا کہ تم پکڑ کر کنور پیلس میں پہنچائے جا چکے ہو۔"

"بس قسمت کی بات ہے، دو معمولی ملازموں نے مجھے قابو کرلیا تھا لیکن کیا رامن نے تمہیں میرے بارے میں بتایا نہیں؟"

"اس سے میرا رابطہ نہیں تھا۔ میں اسے حملے سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔" منشی نے رامن کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں شروع سے اس سے خدشہ تھا۔"

"اس جیسے شخص پر اعتبار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟" منشی دل جی کے لہجے میں پھر حقارت آگئی۔

”یہی خیال اس کا بھی ہوگا۔“ میں نے کہا۔”اب ایسا لگ رہا ہے کہ جگنو نے خود سب سنبھال لیا ہے؟“

”یہ بھی اس قابل نہیں ہے۔“ منشی نے سرگوشی کی۔

”تب کیا ہوگا؟“

جگنو باہر چلا گیا تھا اور جاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہوشیار کر گیا تھا۔ اس کے آدمی اس کے حکم کے تابع تھے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جگنو کس کے ساتھ ہے اس کا اندازہ مجھے اس سے ہوا کہ جگنو کے بدلتے ہی انہوں نے لمحے بھر میں اس کا ساتھ دیا اور ذرا بھی نہیں ہچکچائے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ رامن کے آدمیوں کو ٹھکانے... لگا نے گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مرکزی پیلس کا سامنے والا حصہ تباہ ہو گیا تھا تب یہاں آمد و رفت کیسے ہو رہی تھی۔ میں نے منشی دل جی سے پوچھا۔ اس نے کہا۔”یہاں ایک راستہ ہے اس سے باہر جا سکتے ہیں۔“

میں نے رامن کی طرف دیکھا۔”پیلس میں بے شمار عام ملازمین بھی ہیں وہ کہاں ہیں؟“

”ان میں سے کئی مارے گئے ہیں اور باقی بچنے والے جمنازیم کی عمارت میں بند کر دیے گئے ہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔”تم ان کی نہیں اپنی فکر کرو۔“

”مجھے تو تمہاری فکر بھی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اس دوران میں بیتو سرک کر میرے پاس آ گیا تھا اور کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”شوبی یہ کیسا فلم ہے ہر دو منٹ بعد ولن بدل جاتا ہے۔“

”یہ زندگی کا فلم ہے۔“

”اب ہم کیا کرے۔“

”دیکھے اور انتظار کرے۔“ میں نے کہا۔”مجھے امید ہے ابھی اور بھی بہت کچھ ہوگا۔“

میں نے جان بوجھ کر ذرا بلند آواز میں کہا تھا اور رامن کے ساتھ منشی جی نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ منشی نے کہا۔”کیا مطلب ہے تمہارا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے شانے اچکائے۔”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

جگنو کے آدمی بھی اسی کے علاقے کے تھے۔ لیکن وہ صورت شکل سے بمبئی کے بجائے ساؤتھ کے لگ رہے تھے۔”ان کا تعلق ساؤتھ سے ہے؟“

منشی نے سر ہلایا۔”ہاں یہ اصل میں مدراس کے ہیں۔ ان کی زبان بھی مدراسی ہے۔ مگر بمبئی میں ان کا گروہ بہت مضبوط ہے۔“

بمبئی انڈیا کا وہ شہر ہے جس میں ہر صوبے کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جیسے پاکستان میں کراچی ہے۔ جس میں ہر صوبے بلکہ آس پاس کے تمام ملکوں کے لوگ بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جگنو کے ساتھی خاموش اور چوکس تھے۔ دوائی لینے کے بعد بڑے کنور کی حالت بہتر تھی اور اب وہ بغیر سہارے کے خود سے کھڑا تھا۔ جگنو جاتے ہوئے ریموٹ کنٹرول بم بھی باہر لے گیا تھا اگرچہ اس کا سرکٹ آف کر دیا گیا تھا لیکن پھر بھی وہ بم تھا ایک گولی اسے اڑا سکتی تھی اور آس پاس موجود کوئی فرد زندہ نہیں بچتا اس لیے اس کا یہاں سے ہٹا دینا ہی مناسب تھا۔ سچی بات ہے بم کی موجودگی میں میرے اعصاب بھی کشیدہ تھے اور اس کے ہٹائے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ پتا نہیں جگنو اسے کہاں لے گیا تھا۔ کیونکہ جگنو کے ساتھی معمولی حرکت پر کوئی اعتراض نہیں کر رہے تھے اس لیے ساری میرے پاس آ گئی اس نے سہمے لہجے میں کہا۔

”شوبی اب کیا ہوگا؟“

”وہی جو اللہ چاہے گا اور جو اللہ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اب تک اسی نے بچایا ہے اور آگے بھی وہی بچائے گا۔“

ساری نے جھرجھری لی۔”شوبی پہلا دھماکہ بہت خوفناک تھا مجھے لگا جیسے پورا پیلس گر جائے گا۔ عمارت اپنے لرزی تھی۔“

”ہم نے میزائل مار کر اس عمارت کا سامنے والا حصہ تباہ کر دیا تھا دھماکہ اسی کا تھا مجھے معلوم تھا کہ تمہارا کمرا اندر کی طرف ہے اور تم محفوظ رہو گی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“

”میرے ساتھ جو خادمائیں تھیں وہ فوراً مجھے نکال کر بڑے بھیا کے پاس لے گئیں۔ تب سے میں ان کے ساتھ تھی۔ پھر اوپر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ گارڈز اوپر گئے تو پھر دھماکا ہوا تب بڑے بھیا نے سیف ہاؤس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”ساری تم بڑے کنور پر کس حد تک اعتماد کر سکتی ہو؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

”اس کے کمرے میں موجود سیف کا ایک قیمتی پیشن تمہارے پاس ہے کیا تم کو یاد ہے؟“

”ہاں یاد ہے کیونکہ میں نے خود لگایا تھا اور بڑے کنور کی ہدایت کے مطابق اسے بار بار دہرا کر یاد کیا تھا۔“

”پھر تم نے بڑے کنور کو بتا دیا؟“

”نہیں میں نے تو نہیں بتایا۔“

”لیکن منشی جی کا کہنا ہے کہ اسے معلوم ہے۔“

منشی نے سر ہلایا۔”بے بی تمہارے لباس میں ایک بٹن نما مائک لگا تھا جب تم یاد کر رہی تھیں تو یہ مائک تمہاری آواز بڑے کنور تک پہنچا رہا تھا۔“

ساری نے سرد آہ بھری۔”گویا میں شروع سے ان لوگوں کے نزدیک بس ایسے ہی تھی۔“

”لیکن تم ہمارے لیے ایسی ہی نہیں ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے پتا چلا ہے کہ میں کچھ ہوں۔“

”تم کچھ نہیں ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو، بیتو کی دیدی ہو، وسیم کی زندگی ہو اور سفیر کی سالی اور کچھ عرصے بعد ایک منے یا منی کی ماما بھی ہوگی۔“

”شوبی....“ وہ جھینپ گئی۔

”دیدی ہم ماموں بنے گا۔“ بیتو خوش ہو کر بولا۔

”اگر سفیر یہاں ہوتا تو کہتا کہ تم پہلے ہی ماموں بنے ہوئے ہو۔“ میں ہنسا۔ ہم آپس میں بات کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ بات کرتے ہوئے میری نظر بڑے کنور کی طرف گئی تو وہ جھول رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا وہ اچانک لڑکھڑایا اور نیچے گر کر ساکت ہو گیا۔ ساری اس کی طرف لپکی۔

”کیا ہوا.... بڑے بھیا۔“

میں ساری کے پیچھے تھا۔ میں نے بڑے کنور کو سیدھا کیا تو وہ بے ہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بے ترتیب تھی۔ میں نے نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی تو اسے بھی غیر متوازن ہی پایا۔ جگنو کے آدمی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور جب میں نے پلٹ کر منشی کی طرف دیکھا تو اس کے برابر سے رامن کو غائب پایا۔ اسی لمحے جگنو کے آدمیوں نے بھی محسوس کر لیا۔ ایک چلایا۔”وہ بھاگ گیا....“

”دادا مار ڈالے گا۔“ دوسرے نے کہا۔”تم تینوں یہاں رکو میں اسے دیکھتا ہوں۔“

وہ باہر نکل گیا اور میں نے منشی سے کہا۔”پیلس کا ڈاکٹر کہاں ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے؟“

”اگر وہ بچ گیا ہے تو جمنازیم والی عمارت میں ہوگا۔“ منشی نے کہا۔

”ان لوگوں کو بتاؤ.... یہ اپنے استاد سے کہیں ڈاکٹر کو جلدی بلاؤ.... ورنہ تم لوگوں کی اتنی جدوجہد اور اتنے لوگوں کا خون رائیگاں جائے گا۔“

منشی نے جگنو کے ایک آدمی سے کہا۔”بڑے کنور کی حالت خراب ہے اس کے لیے فوری ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ یہ مر گیا تو ہیرے کسی کو نہیں ملیں گے اور جگنو کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

منشی کی بات سن کر اس کے ماتھے پر شکنیں آ گئی تھیں۔ لیکن اس نے جگنو کو اطلاع کرنے میں دیر نہیں کی۔ اس نے ویسا ہی ایک چھوٹا واکی ٹاکی نکالا جیسا میں نے منشی کے پاس دیکھا تھا اور جگنو کو کال کی۔ پہلے اس نے بڑے کنور کی طبیعت خرابی کا بتایا پھر اس نے اطلاع دی کہ رامن افراتفری کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا تھا۔ یہ سن کر جگنو نے اسے یقیناً بے نقط سنائی تھیں کیونکہ موسم گرم نہ ہونے کے باوجود اس کے سیاہ چہرے پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ وہ ہکلا ہکلا کر اسے بتانے لگا کہ یہ اس کی بھول نہیں تھی۔ پھر اس نے رابطہ کاٹ کر کسی اور کو کال کی کیونکہ کال جا رہی تھی اور آگے والا بندہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ وہ یہاں سے جانے والے کو کال کر رہا تھا اور وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ خیریت سے نہیں تھا۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کی اور فوری اس کی اطلاع جگنو کو دی تھی۔ میں نے آہستہ سے بیتو سے کہا۔”گڑبڑ شروع ہو گئی ہے شاید ہمیں موقع ملے ہوشیار رہنا۔“

بیتو نے سر ہلایا۔ بہ ظاہر ہم بڑے کنور کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ساری ہلکی آواز میں رو رہی تھی لیکن موقع کی مناسبت سے اس نے اپنی آواز کسی قدر اونچی کر لی تھی۔ میں نے بیتو سے کہا۔”کسی بھی ایسی صورت حال میں تم اپنے پاس والے کو دیکھو گے۔ ہتھیار چھیننے سے زیادہ اسے ناکارہ کرنے کی کوشش کرنا اور یہ بھی کہ وہ گن استعمال نہ کرنے پائے۔“

”ہم سمجھ گیا۔“

”ساری ایسی کسی صورت حال میں تم اس ستون کے پیچھے ہو جاؤ گی۔“ میں نے ہال کے وسط میں لگے آرائشی ستون کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ میری فکر نہ کریں۔“ ساری نے آنسو صاف

کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پلیز شوبی کچھ کریں ورنہ اگر ان کا داؤ چل گیا تو یہ ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔“

”ہم کوشش کریں گے۔“ میں نے کہا اور بیتو کی طرف دیکھا۔ ”لیکن میرے اشارے کے بغیر کچھ مت کرنا چاہے موقع کتنا ہی آسان کیوں نہ لگ رہا ہو۔“

باقی تین پریشان تھے کیونکہ ان کا چوتھا ساتھی نہ تو واپس آیا تھا اور نہ ہی اس نے واکی ٹاکی پر جواب دیا تھا۔ رامن ایک بار پھر عیاری سے بچ نکلا تھا اور وہ اس کام کا ماہر بھی تھا۔ پھر قسمت بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ مجھے خطرہ تھا کہ رامن نے چوتھے پر قابو پالیا تھا اور اب وہ مسلح تھا۔ یہ بات ان تینوں نے بھی محسوس کر لی تھی اور اب ان کی توجہ ہم سے زیادہ گیلری کی طرف تھی۔ مگر ان تینوں میں سے کوئی اس طرف جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ یقیناً خود کو ایک ساتھ زیادہ محفوظ تصور کر رہے تھے۔ کال کرنے والے نے ایک بار پھر واکی ٹاکی پر جگنو سے رابطہ کیا۔ ”دادا کچھ اور لوگ ادھر بھیجو.... لگ رہا ہے اس نے کالی کو قابو کر لیا ہے۔“

جواب میں وہ جگنو سے مزید ناگفتنی سن کر بے مزہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف سے گائیڈ لائن ملتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک طرف کیا اور ہمیں رائفل کی نال پر آگے کیا۔ وہ ہمیں گیلری کے سامنے لے آئے تھے اور خود ہمارے پیچھے تھے۔ منشی نے بے چینی سے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”سوال نہیں۔“ واکی ٹاکی والا غرایا۔ ”چل ادھر....“

”منشی کیسے آدمی ہائر کیے ہیں تم نے جو عزت بھی نہیں کرتے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ منشی نے کچھ کہا نہیں۔ اتنا تو میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اگر رامن اس طرف سے حملہ کرتا تو پہلے ہم نشانہ بنتے البتہ انہوں نے بڑے کنور کو اسی جگہ پڑے رہنے دیا تھا جہاں وہ موجود تھا۔ مگر رامن نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور مجھے اس سے اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ بے شک وہ سیاست میں مار کھاتا تھا اور چال نہیں چل سکا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ میدانِ عمل کا زیرک کھلاڑی تھا۔ یہاں ایک کے مقابلے میں تین تھے اور گیلری میں چھپنے کی گنجائش کم تھی۔ یہاں وہ آسانی سے مار لیا جاتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کامیاب ہو کیونکہ مجھے سب سے زیادہ خطرہ اسی سے تھا۔ دس منٹ بعد جگنو اپنے دو آدمیوں اور ایک شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے پاس میڈیکل بیگ اعلان کر رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ جگنو نے اس سے کہا۔ ”بڑے کنور کو دیکھ.... اسے کچھ ہوا تو تو بھی ساتھ ہی پرلوک جائے گا۔“

پھر اس نے منشی کی طرف دیکھا اور اپنے نائب کو گھورا۔ ”اسے یہاں کیوں رکھا ہے؟“

”دادا تم نے کہا تھا....“

”باقی سب کے لیے کہا تھا اسے ابھی بچانا ہے۔ ابھی وہ آ کر اسے گولی مار جاتا تو سیف تیرا باپ کھولتا؟“

اب واکی ٹاکی والے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس کے اشارے پر ایک آدمی منشی کو ہمارے پاس سے لے گیا۔ میں نے جگنو سے کہا۔ ”یہ تمہارا خیال ہے کہ وہ ادھر حملہ کرے گا۔“

”سب ادھر ہے تو وہ پھر کدھر حملہ کرے گا۔“ جگنو نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”وہاں حملہ کرے گا جہاں تم نے سوچا نہیں ہوگا اور وہ اپنا کام کر جائے گا۔“ میں نے اس کا طنز نظر انداز کیا۔ ”تم جو بم لے گئے تھے وہ کہاں ہے؟“

”میرے ساتھیوں کے پاس ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”رامن کے ساتھیوں کے ساتھ تم نے کیا کیا؟“

اس نے ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گہری سانس لی۔ ”اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھی اس دنیا سے نہ جائیں تو ان سے کہو بم سے فوراً دور ہٹ جائیں۔“

اس نے الجھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تو کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”ضروری ہے رامن کے پاس اس بم کا ایک ہی ریموٹ ہو، تمہارے آدمی نے اس کی تلاشی تو نہیں لی تھی۔“

جگنو اچھل پڑا تھا اس نے جلدی سے واکی ٹاکی نکال کر ایک نمبر دبایا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی تو جگنو نے کہا۔ ”بم سے دور چلے جاؤ.... سوال کیوں کرتا ہے کتے....“

اسی لمحے دور سے دبا ہوا دھماکہ سنائی دیا اور جگنو واکی ٹاکی پر چلاتا رہ گیا۔ اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا کیونکہ جواب دینے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ جگنو نے واکی ٹاکی پٹخ دیا اور میری طرف آیا۔ اس نے میری جیکٹ کا کالر

پکڑا۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

”کیونکہ میں اسے جانتا ہوں۔“ میں نے آرام سے اپنا کالر چھڑایا۔ ”میرا خیال ہے کوئی نہیں بچا ہوگا اور اگر بچ بھی گیا ہوگا تو رامن اسے نہیں چھوڑے گا۔ تم سمجھ لو کہ تمہارے پاس بس یہی پانچ بندے ہیں۔“

جگنو کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے میرا کالر چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر بڑے کنور کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیگ سے ایک انجکشن نکالا اور سرنج میں بھر کر اسے بڑے کنور کی نس میں انجکٹ کر دیا۔ پھر وہ نبض تھام کر گھڑی دیکھنے لگا۔ دو منٹ بعد اس نے جگنو سے کہا۔ ”اب حالت بہتر ہے لیکن انہیں آرام کی ضرورت ہے یہ یہاں پڑے رہے تو ان کی حالت پھر خراب ہو جائے گی۔“

”اسے کمرے میں پہنچا دو۔“ جگنو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور وہ بڑے کنور کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر سمیت وہیں رکا تھا۔ بڑے کنور کو کمرے میں پہنچا کر جگنو میرے پاس آیا۔ ”اب تیرا کیا خیال ہے.... وہ کیا کرے گا؟“

”میں جوتشی نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بم کے حوالے سے مجھے خیال آیا تھا کہ اس نے اضافی ریموٹ بھی رکھا ہوگا۔ اس نے اپنا کام کر لیا ہے۔ ممکن ہے جنازیم میں کچھ آدمی ہوں اس کے۔“

جگنو فکر مند ہو گیا۔ اس نے یقیناً دولت کے چکر میں ٹیک اوور کیا تھا لیکن یہ ٹیک اوور الٹا اس کے گلے پڑ گیا تھا۔ اس کے ستّر فیصد ساتھی موت کی نیند سو چکے تھے اور اب وہ پانچ آدمیوں کے ہمراہ کس طرح یہ دولت حاصل کر سکتا تھا۔ جب کہ ابھی بڑا کنور بے ہوش تھا اور منشی کی زبان کھلوانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ کیونکہ وہ زہریلا کیپسول منہ میں رکھ کر بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ زبردستی کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان تمام مراحل سے گزر کر ہی سیف میں موجود دولت تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد یہاں سے نکلنے کا مرحلہ تھا اور یہ بھی آسان نہیں تھا۔ جگنو کے ساتھی ذرا ڈھیلے تھے مگر وہ خود ہماری طرف سے بہت چوکنا تھا۔ اس نے آتے ہی سب کو ٹائٹ کر دیا تھا۔ اب وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں واپس ہال کے وسط میں آنے کی اجازت مل گئی تھی اور دو افراد اب گیلری پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

منشی اب بالکل خاموش تھا۔ ایک بار میں نے اسے دیکھا تو وہ غیر محسوس انداز میں کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا اور تب میں نے وقت دیکھا۔ بارہ بجنے میں دو منٹ تھے۔ مجھے یاد آیا کہ بارہ بجے اگر بڑے کنور کی طرف سے سگنل نہ گیا تو اس کا بیک اپ دستہ کنور پیلس کی طرف روانہ ہو جائے گا اور اسے روکنے کے لیے منشی کے آدمی راستے میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس دستے سے نمٹ کر وہ واپس پیلس کی طرف آتے۔ اگرچہ منشی نے انکار کیا تھا مگر میں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ یہیں آئیں گے اور منشی کو ان کا ہی انتظار تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کتنی دیر میں آتے لیکن اب اس میں بہت زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ رامن اور اب جگنو اس بات سے بے خبر تھے۔ ساوی ہال میں تھی۔ میں نے جگنو سے کہا۔ ”اسے بڑے کنور کے پاس جانے دو یہ اس کی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔“

”یہ ادھر ہی رہے گی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر موجود ہے۔“ جگنو نے صاف انکار کر دیا۔ اسے رامن کی فکر تھی۔ مجھے جواب دے کر وہ کمرے میں چلا گیا اور میں نے ڈاکٹر سے کہتے سنا۔ ”یہ کب تک ہوش میں آئے گا۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتے.... بڑے کنور کمزور اور بوڑھے ہیں۔ پھر بیمار بھی ہیں اس لیے کچھ کہنا....“ اس کے بعد ڈاکٹر کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو جگنو نے اس کے منہ میں پستول کی نال ڈالی ہوئی تھی اور اس کی گھگی بندھی تھی۔ جگنو نے غرا کر کہا۔

”مجھے بکواس نہیں یہ بڑھا ہوش میں چاہیے۔ ابھی دس منٹ کے اندر اسے ہوش نہیں آیا تو تو ہمیشہ کی نیند سو جائے گا.... کیا سمجھا؟“

جگنو نے ڈاکٹر کے منہ سے پستول نکالا تو اس کی جان میں جان آئی مگر فوراً ہی جان پر بن گئی تھی کیونکہ جگنو نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اگر یہ دس منٹ میں ہوش میں نہ آئے تو اس سالے کو ٹپکا دینا۔“

جگنو میری طرف آیا۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے ساوی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تیری کیا لگتی ہے؟“

”بہن ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”سنا ہے تو اسے بچانے اور لے جانے آیا ہے؟“

”ایسا ہی سمجھو۔“ میں نے کہا۔

”تب اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو جا کر اس حرامی کو مار دے۔“

”رامن کو؟“

”اور کون ہے یہاں.... تیرے پاس آدھا گھنٹا ہے۔“ جگنو بولا۔

میں پریشان ہوگیا۔ ”میں کیسے مار سکتا ہوں اور مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے؟“

”نہیں پتا تو جا کر تلاش کر، اسے بھی تیرے بارے میں نہیں پتا ہوگا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی سے رائفل لے کر اس کا میگزین الگ کیا اور دونوں چیزیں میری طرف بڑھائیں۔ ”یہ لے اور جا کر اسے تلاش کر.... آدھا گھنٹا گزر گیا تو یہ لڑکی زندہ نہیں رہے گی۔“

میں پچھتایا کہ مجھے رامن کے بارے میں بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ یقیناً اسی وجہ سے جگنو کے خر دماغ میں یہ خیال آیا تھا۔ ”میں اتنے بڑے کنور پیلس میں اسے کیسے تلاش کر سکتا ہوں؟“

”یہ تیرا کام ہے ویسے بھی تو اس کے بارے میں بہت جانتا ہے۔“ جگنو کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

”اس کے بارے میں جانتا ہوں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ ابھی کہاں ہے؟“

”باہر نکلے گا تو جان لے.... اب جا اور اس کا سر لے آ.... اگر اس کا سر بچانا چاہتا ہے۔“ اس نے ساوی کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”ہم بھی ساتھ جائے گا۔“ بیتو نے مداخلت کی۔ ”یہ ہمارا بھی دیدی ہے۔“

”نہیں تم یہیں رہو۔“ میں نے عجلت میں کہا اور آنکھ سے بیتو کو اشارہ بھی کیا۔ وہ سمجھ کر چپ ہوگیا۔ میں نے جگنو سے رائفل اور اس کا میگزین لے لیا۔ ”وہ میرا بھی دشمن ہے اور میں اسے مارنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن تم یہ آدھے گھنٹے والی شرط مت رکھو.... اور مجھے ایک واکی ٹاکی بھی دو میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔ واکی ٹاکی سے تمہیں اطمینان رہے گا کہ میں یہیں ہوں کہیں بھاگا نہیں ہوں۔“

جگنو نے سوچا اور سر ہلاتے ہوئے ایک واکی ٹاکی میری طرف بڑھا دیا۔ ”ٹھیک ہے پر بھاگنے کی سوچنا بھی مت۔“

”مجھے ایک چاقو بھی چاہیے۔“

بادل ناخواستہ جگنو نے میرا یہ مطالبہ بھی پورا کیا۔ اس نے ایک آدمی سے چاقو لے کر میرے حوالے کیا۔ میں نے چاقو موزے میں اُڑس لیا اور جگنو سے کہا۔ ”ہوشیار رہنا تم بے شک دادا ہو کے مگر وہ بھی بہت خطرناک آدمی ہے، را کا ایجنٹ رہ چکا ہے۔“

”اگر وہ یہاں آیا تو بچ کر نہیں جائے گا۔“

”اگر وہ یہاں آیا تو منہ اٹھائے نہیں آئے گا۔ وہ ایسے آئے گا جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔“ میں نے میگزین رائفل میں لگانا چاہا تو اس نے روک دیا۔

”یہاں نہیں.... اس گیلری سے نکلنے کے بعد لگانا۔“

”اگر وہ گیلری کے باہر موجود ہوا تو میں میگزین لگاتا رہ جاؤں گا اور وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔“

”تب گیلری کے کنارے پہنچ کر لگا لینا پر یہاں نہیں.... کہیں تیرے ذہن میں آتم ہتھیا کا خیال نہ آ جائے۔“

”مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا اس لیے زندہ ہوں۔“ میں نے رائفل شانے سے ٹانگ لی اور ساوی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”حوصلہ رکھنا میں آؤں گا۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ میرا حوصلہ ہیں۔“

”بیتو تمہارے ساتھ ہے۔ تم ساوی کا خیال رکھو گے۔“

”آپ بے فکر رہو۔“ بیتو نے کہا۔

میں جگنو کے سامنے رکا۔ ”دادا تم اگر میرے بارے میں جانتے ہو تو امید ہے تم مجھے اپنا دشمن بنانے سے گریز کرو گے۔“

”اپن کو بھی دشمن پالنے کا شوق نہیں ہے تو جا....“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ میں گیلری میں آگے بڑھا اور اس کے سرے تک آتے ہوئے رائفل میں میگزین لگا لیا تھا۔ گیلری سے باہر آتے ہی میں نے رائفل سامنے کر لی تھی۔ یہ خاصا سنسنی خیز مرحلہ تھا کیونکہ رامن کی یہاں موجودگی کا بہت زیادہ امکان تھا۔ وہ یہاں سے جا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہاں وہ دولت تھی جس کے پیچھے یہ سب دیوانے ہو رہے تھے۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے میں نے کھلے دروازے سے دیکھا یہ ایک چھوٹی نشست گاہ تھی اور اس کی وسطی میز پر تازہ پھل اور پانی موجود تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے رات سے کچھ نہیں کھایا اور پانی بھی کم نصیب ہوا تھا میں نے اندر آ کر دو عدد سیب لیے اور پانی کا ایک گلاس پی کر آگے روانہ ہوگیا۔ فی الحال میں سیب نہیں کھا سکتا تھا کیونکہ میری ساری توجہ آس پاس تھی۔ دس منٹ میں میں نے مرکزی پیلس کا یہ سارا حصہ دیکھ لیا۔ رامن یا کوئی دوسرا فرد یہاں نہیں تھا۔ اب مجھے باہر جانا تھا۔ میں نے واکی ٹاکی پر جگنو سے رابطہ کیا۔

”وہ یہاں پیلس میں نہیں ہے میں باہر جا رہا ہوں، منشی سے پوچھ کر مجھے باہر جانے والا راستہ بتاؤ۔“

جگنو نے منشی جی سے پوچھا اور اس نے بتایا تو مجھے خود بھی یاد آ گیا یہ وہ راستہ تھا جس سے مجھے عقب میں واقع کلینک اور جمنازیم کی عمارت میں لے جایا جاتا تھا۔ میں مختلف راستوں سے ہوتا ہوا اس دروازے تک آیا۔ اسے بم سے اُڑا دیا گیا تھا اور اس کی چوکھٹ تک غائب تھی۔ غالباً یہ لاک تھا اور کھولنے کے بجائے حملہ کرنے والوں نے اڑانا مناسب سمجھا۔ میں باہر آیا۔ عمارت کے ساتھ ساتھ پتھروں سے بنی روش گھوم رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا کونے تک آیا۔ یہاں سے مجھے نیچے واقع گیسٹ پیلس کا اوپری حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ کنور پیلس ایک بڑی پہاڑی ڈھلان پر اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کی مختلف عمارتیں مختلف سطحوں پر ہیں۔ کنور پیلس اور اس کے ساتھ کلینک اور جمنازیم والی عمارات سب سے اوپر اور بلند ہیں۔ نیچے جاتی ڈھلان کو مختلف حصوں میں بانٹ کر ہموار کیا گیا تھا یوں ایسے قطعے وجود میں آ گئے جو ایک دوسرے سے دس سے بارہ فٹ بلند تھے۔

اس سے نہ صرف سیکورٹی کی گئی تھی بلکہ اس پورے پیلس میں دل کشی اور خوب صورتی پیدا کی گئی تھی۔ میرے سامنے جمنازیم والی عمارت درختوں کے پار تھی اگر کوئی اس کی اوپری منزل پر ہوتا تو مجھے دیکھ سکتا تھا۔ یہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں روش سے اتر کر اس کی طرف بڑھا اور درختوں کی آڑ میں پاس پہنچ گیا۔ بہ ظاہر عمارت میں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ لیکن کنور پیلس کے بچ جانے والے افراد اور ملازمین کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ واحد عمارت تھی جو میزائلوں سے بچی ہوئی تھی کیونکہ یہ عام استعمال میں نہیں تھی۔ اس کا داخلی دروازہ صحیح سلامت تھا۔

میں درختوں کی آڑ میں عمارت کے عقبی حصے میں آیا۔ مگر اس طرف سے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کھڑکیاں تھیں جن پر گرل تھی۔ مجھے آگے سے ہی اندر جانا تھا۔ اس میں رسک تھا کہ رامن نے کوئی ٹریپ لگایا ہو مگر مجھے دیکھنا تو تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ گھوم کر اگلے حصے میں آیا۔ اس طرف کھڑکیوں کے پٹ ٹوٹ کر باہر گرے ہوئے تھے جیسے اندر کوئی دھماکا ہوا ہو۔ دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور دروازہ کھلتے ہی جاہی کا بھیانک منظر سامنے آیا تھا۔ وہاں کم سے کم آٹھ دس افراد کی ادھڑی ہوئی اور مسخ شدہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے جسموں سے گوشت اور لوتھڑے الگ ہو کر دیواروں اور چھتوں پر چپکے ہوئے تھے۔ داخلی ہال کی حالت بری تھی۔ فرش میں سوراخ ہو گیا تھا۔ کیونکہ جمنازیم کی عمارت کے نیچے تھا۔

میں نے ختنہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہاں پھیلی خون اور گوشت کی بو سے میرا دل متلانے لگا تھا۔ اندر آنے پر اندازہ ہوا کہ لاشوں کی تعداد زیادہ تھی شاید جگنو کے باہر موجود سارے آدمی یہیں تھے اور وہ سب دھماکے میں مارے گئے تھے۔ میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ ایک پستول تھا جو ایک عدد ہاتھ کے ساتھ تھا۔ ہاتھ کلائی سے الگ ہو گیا تھا۔ میں نے رائفل کی نال سے ہاتھ الگ کیا اور پستول اٹھا لیا اس پر کسی قدر خون لگا ہوا تھا اسے ایک طرف ڈھیر پردے سے صاف کیا اور جیکٹ میں رکھ کر آگے بڑھا۔ میرا اندازہ تھا کہ عام لوگوں کو جمنازیم میں قید کیا گیا ہو گا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں کسی کو قید کیا جا سکتا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے آیا تو جمنازیم کا فولادی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر موت کا سا سناٹا تھا۔ میرا دل رک سا گیا۔ جہاں زندہ افراد ہوں اور بے شک خاموش ہوں وہاں ایسا سناٹا نہیں ہوتا ہے۔ زندگی اپنا ارتعاش خود رکھتی ہے مگر اس وقت مجھے لگا وہاں کوئی زندہ فرد نہیں ہے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جمنازیم میں قدم رکھا اور پھر میرے دانت بھنچ گئے تھے۔

ایک طرف ڈھیر کی صورت میں کنور پیلس کے عام ملازموں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں مرد عورت دونوں تھے۔ ان سب کو سروں میں ایک ایک گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا اور یہ کام یقیناً منشی اور رامن کا تھا۔ یہ پچاس سے اوپر لوگ تھے۔ انہیں بہ آسانی یہاں قید کیا جا سکتا تھا مگر سفاک قاتلوں نے انہیں بھی نہیں بخشا تھا۔ کنور پیلس کی حدود میں رہنے والے اکثر ملازمین بیوی بچوں والے تھے اور انہیں رہائش ملی ہوئی تھی۔ پتا نہیں ان پر کیا گزری تھی؟ شاید انہیں بھی مار دیا گیا تھا۔ درندے بھی ایسا قتل عام نہیں کرتے ہیں۔ مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون کی جگہ کوئی گرم سیال دوڑ رہا ہے۔ اگر منشی، رامن اور جگنو اس وقت میرے سامنے

ہوتے تو میں بے دریغ انہیں قتل کر دیتا۔ میں اوپر آیا۔ کلینک والے حصے میں واٹر ڈسپنسر سے پانی پی کر اور سر پر ڈال کر میں نے خود کو ٹھنڈا کیا۔

میں نے خود کو یاد دلایا کہ میری ذمے داری سادی اور بیٹو کو بہ حفاظت یہاں سے نکال لے جانا تھا۔ اس لیے مجھے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ مجھے دیکھنا تھا کہ پیلس کی حدود میں کیا ہوا تھا اور ابھی کیا ہو رہا تھا۔ میں باہر آیا اور وسطی لان میں لگے سب سے اونچے درخت کی طرف بڑھا۔ یہ کوئی سرو جیسا درخت تھا۔ چھ فٹ کے بعد اس کی دائیں بائیں بے شمار شاخیں نکلی تھیں اور اس کی بلندی کوئی پچاس فٹ تھی۔ میں آرام سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ درخت کے آخری حصے پر آنے کے بعد آس پاس کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ مگر جہاں تک نظر جاتی تھی تباہی و بربادی کے آثار تھے۔ تباہ شدہ گاڑیاں، اسلحہ اور لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میزائلوں اور بموں نے عمارتوں کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ کئی جگہوں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا مگر کوئی زندہ یا حرکت کرتی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں تقریباً دس منٹ درخت پر رہا اور میں نے واکی ٹاکی پر جگنو کو اطلاع دی۔

”رامن نظر نہیں آ رہا ہے میرا خیال ہے وہ جان بچا کر یہاں سے نکل گیا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور اتنے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔“ اس نے عیاری سے کہا۔ ”پر تو نے خیال بدل دیا.....وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ وہ ادھر ہی ہوگا۔“

میں نے ایک بار پھر خود کو ملامت کی۔ ضرورت سے زیادہ بولنا بعض اوقات یونہی گلے پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے مجھے ایک موقع بھی ملا تھا۔ کنور پیلس کی تمام کمیونیکیشن لائنیں ہم پہلے ہی تباہ کر چکے تھے اور ریڈیائی رابطوں کو جامر نے روکا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ جامر سامنے والے حصے میں قید خانے کی عمارت کے پاس کہیں نصب تھا۔ یہیں پیلس کا پاور اسٹیشن تھا اور جامر کو خاصی پاور درکار ہوتی ہے۔ اس کا بیٹری یا اس جیسی کسی چیز سے گزارا نہیں ہوتا ہے۔ میں نیچے اترا اور اس طرف روانہ ہو گیا۔ میں مرکزی پیلس کے ساتھ سے گزرا اور گھاس کی دو الگ سطحوں والے تختے عبور کیے۔ بلاشبہ سیکورٹی کے لحاظ سے یہاں ہر ممکن خیال رکھا گیا تھا مگر ضرورت پڑنے پر ان میں سے کوئی چیز کام نہیں آئی تھی۔ نہ آدمی نہ اسلحہ اور نہ ہی

الیکٹرانک سیکورٹی۔ گزشتہ ساڑھے دس گھنٹے کے دوران میں یہاں دو سو کے قریب افراد مارے جا چکے تھے۔ بڑا کنور دشمنوں کے نرغے میں تھا اور اس کی وجہ سے سادی اور ہم بھی پھنس چکے تھے۔ نہ وہ سادی کو اغوا کراتا اور نہ ہمیں یہاں آنا پڑتا۔

قید خانے کی تباہ شدہ عمارت کے عقب میں ایک چھوٹی سی عمارت نے میری توجہ حاصل کر لی۔ اس تک بجلی کی موٹی تاریں جا رہی تھیں۔ اس کے اوپر ایک موبائل ٹاور نما کھمبا لگا ہوا تھا اور یقیناً یہی جامر تھا۔ اس کے سامنے کم سے کم چار گارڈز کی لاشیں موجود تھیں۔ وہ جامر کے نگران تھے اور پہلے ان کا خاتمہ کیا گیا تھا۔ میں نے پہلے سن گن لی۔ کنکریٹ کا ایک ٹکڑا دیوار پر پھینک کر مارا۔ جب اس کی آواز پر کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تو میں عمارت کی طرف بڑھا۔ ابھی میں نے اندر قدم رکھا تھا کہ واکی ٹاکی سے بیپ ابھری میں نے جلدی سے نکال کر کال ریسیو کی اور بدمزگی سے بولا۔ ”تم کیوں کال کر رہے ہو اگر رامن آس پاس کہیں ہوا تو وہ بیپ سن کر ہوشیار ہو جائے گا۔“

”آدھا گھنٹا ہو گیا ہے۔“

”آدھا گھنٹا تو یہاں ایک سے دوسری جگہ جانے میں لگ جاتا ہے اور تم نے کہا تھا کہ آدھے گھنٹے والی شرط ختم ہے۔“

”اس وقت کہا تھا پر اب ہے۔ تمہارے پاس آدھا گھنٹا اور ہے۔ اگر ایک بج کر دس منٹ تک رامن یا اس کی لاش کے ساتھ نہ آئے تو یہ لڑکی اور لڑکا دونوں مارے جائیں گے۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میرے اندر گھنٹی بجنے لگی۔ میری غیر موجودگی میں کوئی تبدیلی آئی تھی جس کے نتیجے میں جگنو کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ کیا انہوں نے سیف تک رسائی حاصل کر لی تھی اور یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا جب منشی سے اس کی کوئی ڈیل ہو جاتی۔ عمارت میں ایک سنسناتی آواز گونج رہی تھی۔ میں سوچتے ہوئے جلدی سے اندر آیا اور جامر کے کنٹرول روم میں داخل ہوا۔ یہ خاصا جدید اور طاقتور جامر تھا جس نے آس پاس کی موبائل کمیونیکیشن بلاک کر دی ہوں گی۔ اس کا کنٹرول پینل کمپیوٹرائزڈ تھا اور میری سمجھ سے بالاتر تھا اس لیے میں نے آسان کام کیا وہ سرخ بٹن پش کیا جس پر پاور لکھا ہوا تھا۔ اس کے دباتے ہی سنسناتی آواز رک گئی۔

اب وہاں سناٹا تھا۔ ایک اسکرین پر نظر آنے والی گلو

فل لائن نیچے آئیں اور پھر ختم ہو گئیں۔ یقیناً جامر نے کام روک دیا تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور ایک جگہ مجھے پاور سرکٹ بریکر بورڈ دکھائی دیا۔ میں نے اس کا ہینڈل نیچے کیا تو عمارت کی ساری روشنیاں بجھ گئیں۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام سرکٹ بریکر نکال لیے اور انہیں جیب میں ڈال کر عمارت سے باہر آیا تھا کہ مجھے دوبارہ اندر جانا پڑا کیونکہ نزدیک ہی کچھ افراد کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ وہ اس عمارت کے عقب میں تھے۔ میں نے غور کیا... تو ایسا لگا وہ آگے جا رہے تھے۔ میں نے احتیاط سے عمارت کے کونے سے جھانکا تو کم سے کم چار افراد مجھے ایک گھاس کے تختے سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔ ان کی پشت میری طرف تھی اور میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ وہ میری جیسی جیکٹ اور بلٹ پروف میں تھے۔

کیا وہ ہمارے ساتھی تھے؟ مگر ہمارا کوئی ساتھی آزاد اور زندہ نہیں تھا۔ ان کے غائب ہوتے ہی میں حرکت میں آیا اور گھاس پر تیز قدموں سے دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں وہ غائب ہوئے تھے۔ یہاں ایک راہداری نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا فرش اور دیواریں پختہ تھیں لیکن چھت نہیں تھی یہ راہداری ایک دروازے تک گئی تھی۔ جس کی دوسری طرف کی سطح اس سطح سے نیچی تھی۔ اس کا دروازہ بھی غائب تھا۔ کسی گرنیڈ نے اسے اڑا دیا تھا۔ پختہ روش پر بھاری جوتوں کی آواز گونجتی اس لیے مجھے محتاط ہونا پڑا تھا جب میں دروازے تک آیا تو میں نے ان لوگوں کو گھاس میں غائب ہوتے دیکھا۔ منظر واضح نہیں تھا۔ جب میں نے دیکھا تو آخری آدمی نیچے ہو رہا تھا اور اس بار بھی اس کی پشت میری طرف تھی اس لیے میں چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ آوازوں سے بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کون تھے؟

آخری آدمی کے غائب ہوتے ہی میں اس جگہ آیا جہاں گھاس کا ایک بڑا سا ٹکڑا الگ ہو کر پڑا تھا یہ ایک چوکور تختہ تھا جس پر مٹی جما کر گھاس لگائی گئی تھی اور اسے اس چوکور خلا پر اس طرح جمایا ہوا تھا کہ وہ باقی گھاس سے الگ نظر نہیں آتا تھا۔ میری معلومات میں خفیہ سرنگوں کی طرح ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نیچے تاریک خلا تھا اور بہ ظاہر یہ ایک چھوٹی سرنگ لگ رہی تھی۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد میں نے اندر اترنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے خانے کے کناروں پر اترا پھر ان پر ہاتھ جما کر دونوں پاؤں سمیٹ کر اندر گیا۔ میں نے ہاتھوں پر زور دیا کہ پاؤں زور سے نیچے نہ لگیں اور

آواز نہ ہو۔ خلاف توقع فرش پانچ فٹ سے زیادہ نیچے نہیں تھا۔ میں نے جھک کر آگے دیکھا تو سوائے تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آیا لیکن جیسے ہی نائٹ ویژن کا بٹن دبایا سب نظر آنے لگا۔

یہ ایک کچی سرنگ تھی اس کا فرش اور دیواریں مٹی کی تھیں البتہ چھت پر مٹی روکنے کے لیے لکڑی کے تختے لگائے گئے تھے۔ سرنگ کا آغاز اسی جگہ سے ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سرنگ عجلت میں اور محدود مقصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ مجھے آگے جانا تھا۔ میں نے رائفل سنبھالی اور آگے بڑھا۔ ذرا آگے آیا تو مجھے بہت ہلکی سی گونجتی آواز سنائی دینے لگی جیسے آگے جانے والے بات کر رہے ہوں۔ مگر الفاظ اور لہجہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے بھی یقیناً نائٹ ویژن کا استعمال کیا تھا کیونکہ یہاں ہلکی سی بھی روشنی نہیں جھلک رہی تھی۔ اگر انہوں نے روشنی کی ہوتی تو مجھے بہت واضح دکھائی دیتی۔ کچی زمین پر آواز پیدا ہونے کا امکان کم تھا۔ بس یہ خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی اگر پیچھے دیکھے اور رک جائے تو میں اس کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ سرنگ سیدھی نہیں تھی بلکہ جگہ جگہ سے مڑ رہی تھی بعض جگہوں پر مجھے کنکریٹ بھی نظر آئی جو کسی عمارت کا زیرِ زمین حصہ تھی اور شاید اسی وجہ سے سرنگ جگہ جگہ سے مڑ رہی تھی۔

ایک جگہ میں مڑنے لگا تو مشکل سے دس فٹ کے فاصلے پر ایک پختہ دیوار میں خلا نظر آیا تھا اور وہ چاروں اس میں جا چکے تھے۔ دوسری طرف بھی اندھیرا تھا لیکن جب میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو یہ پختہ سرنگ ثابت ہوئی تھی۔ دیوار کا خفیہ راستہ ایک عمارت کی سیڑھیوں تلے رابطہ سرنگ میں کھل رہا تھا اور وہ لوگ مرکزی سرنگ میں جا چکے تھے۔ میں باہر آیا۔ سرنگ کا یہ دروازہ خودکار طریقے سے کھلنے اور بند ہونے والا نہیں تھا بلکہ ایک دو بائی تین فٹ کی سلیب دیوار میں اس طرح نصب تھی کہ بہ ظاہر وہ دیوار کا حصہ لگتی تھی اندر سے اسے تاروں کی مدد سے باندھا ہوا تھا کٹر کی مدد سے ان تاروں کو بہ آسانی کاٹ دیا گیا اور دھکا دینے پر سلیب نکل گئی۔ اسے واپس لگانے کی زحمت نہیں کی گئی تھی جیسے انہوں نے گھاس کا تختہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ گویا انہیں اب اس راستے کو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سرنگ میں ان کے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔

میں مرکزی سرنگ تک آیا۔ وہ لوگ مرکزی پیلس کی طرف جا رہے تھے۔ جب وہ ایک موڑ سے مڑ گئے تو میں اس

جگہ سے نکلا اوران کے پیچھے روانہ ہوا۔اب تک مجھے ان کی صورتیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ منشی کے آدمی تھے اور شاید وہی ٹیم تھی جسے بیک اپ ٹیم کو روکنا اور دنیا سے رخصت کرنا تھا تاکہ وہ یہاں کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائیں۔وہ اپنا کام کرکے آگئے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ انہیں کہاں سے اندر جانا تھا۔آگے بڑھتے ہوئے میں مضطرب ہوگیا۔اگر یہ اسی طرف جارہے تھے تو ان کا جگنو اور اس کے آدمیوں سے تصادم لازمی تھا اور اس تصادم میں نہ جانے کون بچتا ہے اور کون مارا جاتا ہے۔ وہاں بیٹو اور سادی بھی تھے۔ان کا خیال آتے ہی میرے قدم تیز ہوگئے تھے۔اس دوران میں وہ مجھ سے کوئی سو گز آگے نکل چکے تھے۔میں نے موڑ سے جھانک کر دیکھا وہ سیف ہاؤس والے ہال سے ذرا پہلے دیوار میں موجود ایک خلا میں داخل ہورہے تھے اور آخری آدمی بھی اندر جاچکا تھا۔

یہ خلا بھی میرے لیے نیا تھا۔جب بڑے کنور کو اوپر جانا تھا تب اس نے اس راستے کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور بہت مشکل سے تباہ شدہ راستے سے اوپر گیا تھا۔اس کا مطلب تھا اس سرنگ میں کچھ راستے ایسے بھی تھے جن کے بارے میں بڑا کنور بھی لاعلم تھا۔میں دبے قدموں اس راستے تک آیا۔اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ اسے عجلت میں کچے انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس میں صرف بیرونی فنشنگ کا خیال رکھا گیا تھا وہ بھی اسے چھپانے کے لیے۔ اندر تقریباً کچے پلاسٹر سے بنی کھردری سیڑھیاں تھیں۔اس بار بھی سلیب کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔جہاں یہ سیڑھیاں ختم ہوئی تھیں وہاں بھی اندھیرا تھا اور مجھے لکڑی کے تختے دکھائی دے رہے تھے۔میں اوپر آیا تو پتا چلا کہ تختے ایک بیڈ کے نیچے لگے تھے۔فرش میں قالین تلے ایک سلیب اس طرح نصب کی گئی تھی کہ اسے بہ آسانی اٹھالیا گیا تھا اور وہ ایک طرف رکھی تھی۔یہاں آنے والے جاچکے تھے۔

میں بیڈ تلے نکل آیا۔بیڈ کے نیچے آکر میں نے گن لی اور سناٹا پاکر باہر نکل آیا۔کمرا تاریک تھا۔یہاں کی لائٹ اڑی ہوئی تھی۔میں نے ذہن میں مرکزی کا پیلس کا نقشہ تازہ کیا۔یہ راستہ اصل راستے سے ذرا پہلے نکلا تھا گویا یہ اس کمرے کی پشت والا کمرا ہونا چاہیے تھا۔دیکھنے میں یہ خاص آراستہ نہیں تھا یعنی ایسا کمرا نہیں تھا جس میں پیلس کا کوئی فرد یا ان کا مہمان ٹھہرے۔ایسا لگ رہا تھا یہ دوسرے درجے کے افراد کے لیے مخصوص بیڈروم تھا۔جانے والے دروازہ بند کر گئے تھے میں نے کھول کر باہر جھانکا۔یہ پیلس کے سامنے والے حصے کی ایک راہداری ثابت ہوئی۔راہن کی تلاش میں میں یہاں تک آیا تھا اسی راہداری کے ایک کمرے سے میں نے سیب اٹھائے تھے جو اب تک میری جیب میں تھے۔باہر کے مناظر دیکھ کر میری رہی سہی بھوک بھی مر گئی تھی۔راہداری خالی تھی اب میں نے تیز قدمی دکھائی اور بڑے کنور کے حصے والی گیلری تک پہنچ گیا۔وہاں سے تیز آواز میں گفتگو سنائی دے رہی تھی۔جگنو چلا رہا تھا۔

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"کیوں نہیں کرسکتا۔" ایک آواز آئی اور پھر ٹھس کی آواز سنائی دی جگنو کی کراہ بلکہ ڈکرانے کی آواز اس سے زیادہ نمایاں تھی لیکن مجھے ان دونوں آوازوں سے کوئی مطلب نہیں تھا میں تو دوسرے آدمی کی آواز سن کر دنگ رہ گیا تھا۔وہ فتح خان تھا۔اس کا لہجہ اور بولنے کا انداز ایسا تھا کہ لاکھوں میں پہچانا جاسکتا تھا اور میں تو کان بند کرکے بھی اس کی آواز شناخت کرسکتا تھا۔یعنی آنے والے چار آدمیوں میں ایک فتح خان بھی تھا۔تو کیا میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا وہ منشی کی دوسری ٹیم نہیں تھی؟ مگر فوراً ہی منشی کی آواز آئی۔

"خان تم بروقت آئے۔"

"ہم ہمیشہ بروقت آتا ہے.... پر ادھر شہباز خان نظر نہیں آرہا ہے۔"

"اس احمق نے اسے ہتھیار دے کر راہن کے پیچھے بھیجا تھا۔" منشی نے جگنو کے بارے میں کہا مجھے یقین تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

"برا کیا....اسے چھوڑنا زندہ شیر چھوڑنے کے برابر ہے۔"

"یہ اس سے واکی ٹاکی پر رابطہ کر رکھے ہوئے تھا وہ پیلس کی حدود میں ہے۔"

"کدھر ہے اس کا واکی ٹاکی۔" فتح خان نے کہا اور میں نے نہایت پھرتی سے اپنا واکی ٹاکی نکال کر آف کردیا۔ کچھ دیر بعد فتح خان نے کہا۔"اس کا واکی ٹاکی بند جارہا ہے۔"

"اسے چھوڑو....بڑا کنور ہوش میں ہے اس سے سیف کھلواؤ اور یہاں سے چلو۔"

"اتنا جلدی کس بات کا ہے اب ادھر کوئی باقی نہیں رہا ہے۔باہر بھی کسی کو نہیں پتا کہ ادھر کیا ہورہا ہے۔"

"پیلس کی بیک اپ ٹیم کا کیا ہوا؟"

ڈراپ سین

سسکتی ہوئی آسیبی رات کا سناٹا شکستہ و نیم پختہ قبروں پر کڑیالے ناگ کی طرح سرسرا رہا تھا۔ایک ناقابلِ بیان سی نحوست پورے قبرستان پر طاری تھی۔فضا کے ہولناک سناٹے میں ہوائیں بین کرتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔میں اس وقت مشتعل انداز میں جامد ہوچکی تھی۔میرا پورا وجود سرتاپا کپکپا رہا تھا۔چہرے پر وحشت سمٹ آئی تھی۔آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔اشتائے راہ بادلوں میں بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ہواؤں کا زور بتدریج بڑھنے لگا۔میرے سامنے ایک دلدوز اور ہولناک منظر تھا۔ایک خوف ناک چڑیل میری طرف بڑھ رہی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے بالکل قریب آکر.....پھر میں ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور.....ٹی وی بند کردیا اور رات کو ڈراؤنی فلمیں دیکھنے سے توبہ کرلی۔

انسان

بادل کا دل بھر آتا ہے تو وہ برسات کی صورت میں رو دیتا ہے۔پہاڑ جب غموں کا بوجھ برداشت نہیں کرپاتا تو وہ آتش فشاں کے روپ میں اپنا زہر اُگل دیتا ہے۔

پھول غموں کی دھوپ میں مرجھا جاتے ہیں۔دنیا میں ہر جاندار اور بے جان چیز کے اندر دکھ ہوتا ہے اور ہر کوئی اپنے اپنے طریقے سے دل بھر آنے پر دکھوں کا اظہار کردیتا ہے۔بعض انسان بہت بے بس ہوتے ہیں کیوں کہ نہ وہ بادل، نہ پہاڑ، نہ پھول ہوتے ہیں۔اپنے دُکھ کو کسی پر ظاہر نہیں کرتے اور کچھ لوگ ہر غم و دکھ بہت جلد دوسروں پر ظاہر کردیتے ہیں اور جو ایسا کرتے ہیں وہ فائدے میں رہتے ہیں مگر کچھ لوگوں کو کسی سے کچھ کہنے کی عادت ہی نہیں ہوتی۔ایسے انسانوں کا دکھ ان کے وجود کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے جس طرح لکڑی کو دیمک چاٹ جائے تو وہ کھوکھلی ہوجاتی ہے۔

ایسا ہی انسان کا بھی حال ہے۔اس طرح برسوں کے اس عمل کے بعد انسان ان تمام چیزوں کو شکست دے کر امر ہوجاتا ہے۔

"وہ بے فکری سے آرہا تھا اور ایک دھماکے نے ان کو بے فکری سے اُدھر بھیج دیا...تم لوگ کیا کہتا ہے جہنم کو؟"

"نرکھ۔" بیٹو نے زبان کھولی۔"جدھر تم بھی جائے گا۔"

"چھوٹا لڑکا تم اپنا زبان بند رکھو۔" فتح خان نے کہا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔"ادھر کا خیال رکھو.....وہ تمہارا باپ شہباز خان آگیا تو سب سے پہلے تمہاری.....میں سوراخ کرے گا۔" فتح خان نے ناقابلِ تذکرہ جگہ کا ذکر کیا۔"ان کا مافق آنکھ بند کرکے پہرہ دیا تو ان کی طرح ہمیشہ کے لیے سو جائے گا۔"

فتح خان یقیناً جگنو اور اس کے ساتھیوں کا ذکر کررہا تھا۔اب کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ سب مارے جاچکے تھے۔فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے خاموش ہتھیار استعمال کیے تھے اس لیے فائرنگ کا شور بھی سنائی نہیں دیا تھا۔اس سے پہلے وہ لوگ گیلری کے سامنے نمودار ہوتے میں آڑ میں ہوگیا تھا۔اچانک مجھے بیٹو کے چلّانے کی آواز آئی۔"دیدی کو چھوڑو۔"

سادی مزاحمت کر رہی تھی۔ فتح خان نے کہا۔"خاموش۔"

ٹھک کی آواز آئی۔سادی چلّائی۔"یہ تم نے کیا کیا ہے؟"

میرا دل رک گیا کیا فتح خان نے بیٹو کو شوٹ کردیا تھا اور میں آڑ سے نکلنے والا تھا کہ اس کی آواز آئی۔"فکر مت کرو کچھ دیر کو سویا ہے بہت بولتا ہے ہم کو بولنے والا بندہ اچھا نہیں لگتا ہے۔تم ادھر چلو تمہارا برادر سے بات کرے گا۔"

مجھے تسلی ہوئی اور میں رک گیا تھا۔فتح خان یا اس کے کسی ساتھی نے بیٹو کا سر بجایا تھا ٹھک کی آواز اسی کی تھی۔وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔فتح خان اسے مارنے کی غلطی صرف ایک صورت میں کرسکتا تھا جب اسے یقین ہو کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔فتح خان کی آواز معدوم ہوگئی تھی وہ سادی کو بڑے کنور کے پاس لے گیا تھا۔میں نے گھڑی اتار کر اس کا ڈائل باہر نکالا اور ہال کا منظر دیکھنے کی کوشش کی۔فتح خان کے دو آدمی مستعدی سے ٹہل رہے تھے اور ان کی نظر اسی طرف تھی۔میں نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔گھڑی کا ڈائل چھوٹا تھا مگر سیاہ رنگ کا تھا اس لیے نظر آسکتا تھا۔فتح خان کے ساتھ تین آدمی تھے اور چوتھا وہ خود تھا۔بیک وقت چار آدمیوں سے نمٹنا جب کہ وہ مستعد بھی ہوں آسان کام نہیں تھا۔فتح

خان کے آنے سے مجھے سادی اور بیتو کی طرف سے اطمینان ہوا تھا۔ اگر اس کی جگہ جگنو، رامن یا منشی کا غلبہ ہوتا تو میں فکر مند ہی رہتا۔ وہ ان تینوں کی طرح میرا اور میرے ساتھیوں کی جان کا دشمن نہیں تھا۔

میں فی الحال کچھ کرنے سے قاصر تھا اس لیے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ فتح خان اور منشی نے یہاں ہمیشہ تو نہیں رہنا تھا اور وہ ہیرے لے کر یہاں سے نکلتے۔ اگر فتح خان میرے ساتھیوں کو قبضے میں رکھنے کا فیصلہ کرتا تب بھی میں انہیں چھڑانے کی پوزیشن میں تھا۔ اس لیے بلا وجہ محاذ چھیڑنا مناسب نہیں تھا جب کہ ابھی ہیرے ان کے ہاتھ نہیں آئے تھے اور ان کے سروں پر ویسے ہی خون سوار تھا۔ اس کا اندازہ مجھے کنور پیلس میں ہونے والی قتل و غارت گری سے ہو گیا تھا۔ فتح خان اس میں براہِ راست شامل نہیں تھا اور اس کے چند ساتھی مارے بھی گئے تھے۔ ممکنہ طور پر اس کے دو ساتھی وہی تھے جو سرنگ سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے۔ لیکن فتح خان اور اس کے ساتھی ابھی کنور پیلس کی بیک اپ سیکورٹی ٹیم کو مار کر آ رہے تھے۔ اس لیے صاف ان کے ہاتھ بھی نہیں تھے۔ ایک بار وہ دولت حاصل کر لیتے تو ان کا جنون ٹھنڈا پڑ جاتا اور پھر ان سے نمٹنا آسان ہوتا اس وقت وہ بس بھاگنے کی فکر میں ہوتے۔

میں گیلری کے ساتھ عقب میں بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے رامن کا خوف تھا کہ کہیں وہ پیچھے سے نہ آ جائے۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ کہیں گھات لگا کر میری طرح اندر والوں کا منتظر ہو گا۔ پھر بھی خطرہ تو تھا اور اس کے باوجود میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ اگر میں کسی کمرے میں چلا جاتا تو ہال اور بڑے کنور کے کمرے میں ہونے والی کارروائی سے بے خبر ہو جاتا۔ مجھے زیادہ فکر بیتو اور سادی کی تھی۔ وہ دونوں ہال میں تھے اور وہاں فتح خان کے ساتھی تھے۔ میں سادی کے معاملے میں ان لوگوں پر کوئی بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ بارہا میں نے دیکھا تھا فتح خان کے ساتھی چھٹے ہوئے بدمعاش اور اوباش ہوتے تھے۔ وہ خود بھی کم نہیں تھا۔ مگر میرے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہتا تھا۔ حد یہ کہ جب اس نے سویرا کو حویلی سے نکالا تب بھی اس کی عزت و احترام کا پورا خیال رکھا تھا۔ مگر یہ خیال اس کے ساتھیوں کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں یہاں سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وقفے وقفے سے گھڑی کے ڈائل سے ہال کی نگرانی کر رہا تھا۔ کبھی فتح خان کے دو آدمی نظر آتے اور کبھی تیسرا بھی دکھائی دیتا تھا۔

مگر فتح خان بڑے کنور کے کمرے میں کیا کر رہا تھا اس کا اندازہ کرنا دشوار تھا۔ یقیناً وہ اس سے مذاکرات کر رہا تھا کہ وہ اسے سیف کا کمبی نیشن بتا دے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس میں کتنی دیر لگ سکتی تھی اور اگر بڑا کنور اڑ جاتا تو سادی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ میری ساری توجہ گیلری اور ہال کی طرف تھی۔ اسی نگرانی کے چکر میں، میں اپنے عقب سے غافل ہوا تھا اور اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو دیر ہو گئی تھی۔ میں نے گھومنا چاہا لیکن کسی ہتھیار کی نال آ کر میرے سر سے لگ گئی اور پھر فتح خان کی آواز آئی۔ ”ناشہباز خانا بلنا مت۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ”تم یہاں کیسے آئے؟“

”جیسے باہر سے اِدھر آیا۔ اپنا رائفل اتار کر نیچے ڈال دو، بالکل آرام سے۔“

میرے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مختصر سی مدت میں کبھی اتنی بار میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں ہوا تھا۔ ”میرا خیال ہے اس طرف سے آنے کا واحد راستہ یہی ہے۔“

”تمہارے دوسرے کئی خیالوں کی طرح یہ بھی غلط ہے۔“

میں نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ ”فتح خان تم نے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے آقا کو بھی دھوکا دیا ہے۔“

”بے شک....“ اس نے بلا جھجک تسلیم کر لیا۔ ”ہیروں کے لیے ہم اپنے باپ کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔“

”تم ہم دونوں میں سے کسے اپنا باپ سمجھتے ہو۔“ میں نے اسے اشتعال دلانا چاہا لیکن وہ لومڑی کی طرح مکار اور سرد مزاج شخص تھا۔ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”دونوں کو.... اب تم چاقو بھی پھینک دو۔“

اسے معلوم تھا کہ جگنو نے مجھے کون کون سے ہتھیار دیئے تھے۔ میں نے جھک کر چاقو بھی نکال کر پھینک دیا۔

”اور کچھ....“

”بس اب آگے چلو۔“

میں آگے بڑھا۔ ”تم شروع سے منشی کے ساتھ اس منصوبے میں شامل تھے؟“

”بالکل.... منشی کو یہ آدمی بھی میں نے دیا.... اسے کیا پتا ان چیزوں کا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا مجھے یاد آ رہا تھا کہ ان میں سے کچھ آدمی وہ تھے جو تم نے میری پہلی انڈیا یاترا میں میری تلاش پر لگائے تھے۔“

”تم ٹھیک پہچانا.... وہ جگنو کا گروپ تھا۔ پر اس بار اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا میں نے ٹھیک کر دیا۔“

میں ہال میں پہنچا تو میں نے دیکھ لیا کہ اس نے کیسے جگنو اور اس کے ساتھیوں کا دماغ درست کیا تھا۔ اس نے ان کے سروں میں سوراخ کر دیا تھا۔ وہاں مزید چھ لاشوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”دولت چیز ہی ایسی ہے آدمی کا دماغ خراب کرتی ہے۔“

”میں سب کا دماغ درست کر سکتا ہے۔“

”تم نے جس طرح دوسروں کا دماغ درست کیا ہے اس طرح کوئی تمہارا دماغ بھی درست کر سکتا ہے۔“

”ہمارا قسمت۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ بیتو فرش پر یوں دراز تھا کہ اس کا سر سادی کی گود میں تھا۔ ضرب کی شدت سے سر پھٹ گیا تھا اور خون نکل آیا تھا۔ سادی نے اپنا دوپٹا پھاڑ کر اس کے زخم پر پٹی باندھ دی تھی۔ فتح خان اسے بڑے کنور کے سامنے لے جا رہا تھا مگر پھر کسی وجہ سے اسے یہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے فتح خان کے ساتھ دیکھ کر سادی مایوس ہوئی تھی۔ میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ”تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔“

”ابھی میں اور بھی اچھا نہیں کرے گا۔“ اس نے کہا اور سادی کی طرف دیکھا۔ ”اس کا بھائی شرافت سے نہیں مان رہا ہے لیکن میرے کو پہلے تمہارا فکر تھا۔“

”یہاں سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔“

فتح خان نے دانت نکالے۔ ”یہ کنوروں کا محل ہے جتنا سامنے نظر آنے والا راستہ ہے اس سے زیادہ نہ دکھائی دینے والا راستہ ہے۔“

”سادی کا اب کنور خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق تو ہے۔“ فتح خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تبھی تو اس نے اسے یہاں بلوایا ہے۔ شہباز اسے لے کر اندر چلو۔“ فتح خان نے سادی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جھک کر بیتو کو دیکھا۔ اس کی سانس اور نبض ٹھیک تھی۔ مجھے لگا کہ وہ ہوش میں تھا لیکن بے ہوش بنا ہوا تھا۔

”فتح خان اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے اگر اسے کچھ

ہوا تو...."

"تو تم ہم کو نہیں چھوڑے گا۔ بے شک نہ چھوڑو۔" فتح خان نے فراخ دلی سے کہا۔ "اب چلو اسے لے کر ورنہ میں اپنا آدمی کو بولتا ہے۔ وہ لے جائے گا۔"

میں نے سہارا دے کر سادی کو اٹھایا۔ "فتح خان میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں سادی کو اس معاملے میں ملوث نہ کرو ورنہ اس کے بعد شاید ہمارے درمیان کبھی نارمل تعلق نہیں ہوگا۔"

فتح خان کے چہرے پر چند لمحے کو ہچکچاہٹ آئی تھی اور پھر اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ "شہباز خانا میں یہ رسک لے گا۔ اِدھر وادی کے ہیرے سے کہیں زیادہ ہیرا ہے۔"

ہم بڑے کنور والے کمرے میں آئے۔ جہاں وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر نقاہت تھی لیکن وہ ہوش میں تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر موجود تھا اور اس کے ساتھ ہی منشی بھی موجود تھا۔ ان سب کی نگرانی کے لیے فتح خان کا ایک آدمی موجود تھا۔ فتح خان کے اشارے پر اس کا آدمی ڈاکٹر کو لے کر کمرے سے چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب فتح خان نے منشی کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر خوب صورت آتش دان کا ایک ابھرا ہوا پتھر دو بار دبایا تو یک دم آتش دان دو حصوں میں تقسیم ہونے لگا۔ یہاں بھی وہی سنسناتی آواز آ رہی تھی جو ہائڈرولک سسٹم کی نشانی ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک بڑے فریج کے سائز اور شکل کا سیف تھا۔ اس کے اوپری حصے میں شیشے کی اسکرین تھی۔ منشی نے اس کے نیچے لگا بٹن دبایا تو شیشے پر کی بورڈ ابھر آیا۔ یہ تقریباً پورا کی بورڈ تھا اس میں تمام انگریزی کے حروف بھی اور علامات تھیں۔ ایک طرف چھوٹا نمرک کی پیڈ تھا۔ فتح خان نے بڑے کنور سے کہا۔

"اپنا کمبی نیشن بتاؤ۔"

مگر بڑا کنور خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ میں نے مشورہ دیا۔ "بہتر ہے اب تم بتا دو کیونکہ فتح خان بہر حال ان لوگوں سے بہتر ہے۔ مگر اسے سفاکی میں کم مت سمجھو۔"

بڑے کنور نے ٹھہرے انداز میں کہا۔ "شہباز میں ان میں سے کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔"

"بات تمہارے اعتماد کی نہیں ہماری مجبوری کی ہے۔ دوسری صورت میں یہ سادی کو نشانہ بنائیں گے کیا تم برداشت کرو گے۔"

پہلی بار بڑے کنور کے چہرے پر اضطراب آیا۔ "مجھے اب اس دولت کی پروا نہیں ہے لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ہمیں چھوڑ دیں گے؟"

"کوئی ضمانت نہیں ہے۔" فتح خان نے صفائی سے کہا۔ "پر یہ شہباز خان مجھ کو جانتا ہے۔"

"میں تمہیں عام معاملات کی حد تک جانتا ہوں لیکن اگر تم نامعلوم مالیت کے ہیروں پر قابض ہو گئے تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"مجھے تم لوگوں کو مار کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے صرف دو گھنٹے چاہیے ہوں گے اور اس کے بعد سارے بھارت کی پولیس اور ایجنسیاں بھی مل کر مجھے تلاش نہیں کر سکیں گی۔"

"تم نے منشی کا ذکر نہیں کیا؟" میں نے طنز کیا۔

"ہم یہاں سے اپنی اپنی راہ لیں گے۔" فتح خان نے شانے اچکائے۔ "مجھے نہیں معلوم یہ کہاں جائے گا اور اسے نہیں معلوم میں کہاں ہوں گا۔"

سادی میرے پاس تھی اور سہمی ہوئی میرے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ اچانک فتح خان نے پستول کا رخ سادی کی طرف کر دیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ "بڑا کنور فیصلہ کرو.... آر یا پار.... ایک جواب دو.... ہم تین تک گنے گا۔"

میں نے سادی کو اپنی اوٹ میں لے لیا۔ "فتح خان پہلے تمہیں مجھے شوٹ کرنا ہوگا۔"

فتح خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ہم کو معلوم ہے پہلے تم کو مارے گا تب ہی گولی اس کو لگے گا۔"

سادی تڑپ گئی۔ "نہیں شوبی...."

"ایک...." فتح خان نے کہا۔

"بھیا۔" سادی چلائی۔ "اسے بتا دو۔"

"دو...." فتح خان نے کہا تو سادی زور لگا کر سامنے آنے لگی مگر میں نے اسے اپنی اوٹ میں رکھا۔

"تین...." فتح خان نے کہا تو سادی زور سے چلائی اور مجھے بڑے کنور کی آواز آئی۔

"بس.... میں تیار ہوں۔"

میں جو گولی کھانے کے لیے تیار ہو گیا تھا میرا سخت ہوتا جسم نرم پڑ گیا۔ بڑا کنور بستر سے اٹھ رہا تھا کہ اچانک جھٹکا کھا کر گرا۔ میں نے اس کے سینے پر چھوٹے کو سرخ ہوتے دیکھا۔ اسی لمحے آتش دان کے پاس کھڑے منشی دل جی کے سر میں سوراخ ہو گیا۔ اس کا خون اچھل کر سیف پر گیا تھا اور وہ لٹو کی طرح گھوم کر گرا تھا۔ چوکنا فتح خان اپنی جگہ سے اچھلا اور بیڈ پر گرا تھا۔ اس پر چلائی جانے والی گولی اس جگہ سے گزری جہاں وہ ایک لمحے پہلے تھا۔ اگلے لمحے وہ بیڈ کے دوسری طرف گرا اور اس نے دروازے پر کھڑے رامن پر فائر جھونک مارا۔ وہ خاموشی سے اندر آیا تھا اور خاموش پستول سے سب کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ تینوں کو نشانہ بنا لے گا مگر فتح خان نے اس کا اعتماد غلط کر دیا تھا۔ وہ بڑے کنور کو گولی لگتے ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بچا تھا اور اس نے گرتے ہی خود کو سنبھال کر جوابی فائر کیا اور اس بار میں نے رامن کو اپنی گردن تھامتے ڈگمگاتے دیکھا۔ گولی اس کے نرخرے سے گزر گئی تھی۔ یہ سب پانچ سیکنڈ سے بھی پہلے ہو گیا تھا۔

سادی میرے پیچھے تھی اور جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ بدحواس ہو کر پیچھے ہٹی تھی۔ اسی لمحے راج کنور ڈگمگاتے رامن کو دھکیلتا ہوا اندر آیا تو سادی اس کے سامنے تھی اس نے اسے پکڑ کر اپنی ڈھال بنا لیا۔ میں جو رامن کے گر جانے والے پستول کی طرف جا رہا تھا رک گیا۔ رامن اور راج کنور ساتھ ساتھ آئے تھے یعنی ان میں گٹھ جوڑ تھا لیکن راج کنور نے ایک غلط نظر بھی زمین پر ایڑیاں رگڑتے رامن کی طرف نہیں ڈالی۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ وہ سادی کو آڑ بنائے سیف کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی حرکت کے ساتھ ساتھ فتح خان بھی حرکت کر رہا تھا۔ راج کنور کو اسی سے خطرہ تھا کیونکہ وہ مسلح تھا۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"کوئی حرکت نہ کرے ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"ہم کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" فتح خان نے کہا۔ "اگر تم نے پستول کا رخ میرا طرف کیا تو میں ضرور گولی چلائے گا۔"

"ایک منٹ راج۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "دیکھو تمہارے سارے دشمن مارے جا چکے ہیں۔ تم نے اپنے بھائی کو بھی مار دیا۔ لیکن تم جانتے ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں صرف سادی کو یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔ "میرے سب سے بڑے دشمن اور میری مشکلوں کے ذمے دار تم ہو۔"

"یہ غلط ہے میں نے کبھی تم سے دشمنی نہیں کی۔ دشمنی تم لوگوں نے کی اور میں نے ہمیشہ اپنا دفاع کیا۔ سادی کو بھی میں جان کر نہیں لے گیا تھا۔ اسے تم لوگوں کے دشمن قبائلی لے گئے تھے اور میں نے وہاں اس کی جان بچائی تھی۔ اگر قبائلیوں کو پتا چل جاتا کہ یہ تمہاری بہن ہے تو تمہاری ساری کامیابی ناکامی میں بدل جاتی۔"

"یہاں ہونے والی قتل و غارت گری کا ذمے دار کون ہے تم ہونا۔" راج غرایا۔

"یہ بھی غلط ہے۔ میں نے صرف سادی کو واپس لے جانے کا پلان بنایا تھا۔ اسے خونریز تم سب نے مل کر کیا۔ تمہاری یہاں اچانک آمد بتاتی ہے کہ تم بھی اس میں شامل تھے۔"

"میں نے یہ سب نہیں چاہا تھا۔"

"تبھی پر رامن نے سب سے پہلے بڑے کنور کو شوٹ کیا۔" میں نے تلخی سے کہا اور ایک نظر سادی کو دیکھا تو رو رہی تھی۔ اس کی نظریں بڑے کنور پر مرکوز تھیں۔ اس نے کہا۔

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ دولت کے لیے اتنے گر جائیں گے۔ اپنے ہی بھائی کو مار دیں گے۔"

"بکواس مت کرو! یہ میری مجبوری تھی۔" راج کنور نے بے رحمی سے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "تو نے ہماری ناک کٹوا دی۔ پہلے اس کمار سے شادی کی جو اچھوت تھا اور پھر ایک مسلے سے شادی کرلی۔ تجھے مار کر مجھے خوشی ہوگی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے تم بچ جاؤ گے۔" میں نے کہا۔ میرا ہاتھ رفتہ رفتہ حرکت کر رہا تھا۔

"ہاں پہلے میں تجھے ماروں گا۔ یہ تجھے مرتا دیکھے گی اس کے بعد اس کی باری آئے گی۔" راج کنور کے چہرے اور لہجے کی وحشت ہر گزرتے لمحے بڑھ رہی تھی۔

"اگر تم نے شہباز کو مارا تو میں تجھے نہیں چھوڑے گا۔" فتح خان نے اسے للکارا۔

"فتح خان تم گولی نہیں چلاؤ گے اس نے سادی کو ڈھال بنایا ہوا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں کسی سادی کو نہیں جانتا۔ میں تم کو جانتا ہے۔ شہباز خان میں نے قسم کھایا تھا کہ تم کو اپنے ہاتھ سے مارے گا، پر نہیں مار سکا۔ ہو سکتا ہے کبھی مار دے۔ اس لیے اگر کسی نے تم کو مارا تو میرا قسم ادھورا رہ جائے گا۔ میں اسے نہیں چھوڑے گا۔"

پچویشن ایسی تھی کہ آدمی ہنس بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے فتح خان نے یہ بات نہایت سنجیدگی سے کی تھی۔ میں نے راج کنور پر نظر جمائے ہوئے کہا۔ "تمہارا شکریہ.... راج کنور تم نے بڑے کنور کو مار دیا ہے سیف کا اولین کمبی نیشن اس کے پاس ہے۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "کمبی نیشن پہلے ہی میرے پاس ہے۔"

"اگر اس نے کمبی نیشن بدل دیا ہو؟" میں بات کو طول دے رہا تھا کہ راج کنور کے سر سے خون اترے۔ ویسے میں نے محسوس کیا تھا کہ فتح خان کی دھمکی کے بعد وہ ذرا دھیما ہوا تھا اور اس کے چہرے کی دہشت میں کمی آئی تھی۔ کمرے میں تین افراد کی لاشیں تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو کتنے عرصے سے مجھ سے دشمنی کرتے چلے آئے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں یا وہ میرے ہاتھوں موت کے دہانے تک آئے لیکن قدرت نے وقت نہیں رکھا تھا اس لیے بچ گئے۔ خاص طور سے رامن اتنی بار بچ کر نکلا تھا۔ کم سے کم تین مواقعوں پر وہ موت سے بچا تھا مگر جب قضا آئی تو اچانک ہی مر گیا۔ اسے مرنے میں ایک منٹ کا وقت بھی نہیں لگا تھا اور منشی دل جی تو سیکنڈ میں مر گیا تھا۔ رامن نے عقب سے اس کے سر میں گولی اتار دی تھی۔ بڑے کنور کا کمزور جسم اپنے خون میں نہایا ہوا بستر پر بکھرا ہوا تھا۔ راج کنور نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولا۔

"ایک بار لگ جانے کے بعد صرف کمپنی کا آدمی آکر کمبی نیشن کو ری سیٹ کرسکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تینوں کمبی نیشن لگا کر سیف ایک بار کھولا جائے۔"

"دوسرے لفظوں میں یہ سیف بہت کم کھلا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "آخری بار چار مہینے پہلے کھلا تھا۔ جو ہیرے سودے سے بچ جاتے تھے وہ اسی میں رکھ دیئے جاتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم دوسرے درجے کے ہیرے فروخت کرتے تھے اور اول درجے کے اس میں رکھتے تھے۔ یہ محفوظ دولت تھی جس کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اس پر کوئی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے بڑے کنور کا کمبی نیشن تمہارے پاس ہے۔"

"اس کا بھی۔" راج کنور نے سادی کے جکڑے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ کراہی تھی۔ اس کے لیے راج کنور کے انداز میں بے پناہ نفرت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک لمحہ سوچے اور ہچکچائے بغیر اسے مار سکتا تھا۔ "سیف کھولنے کے لیے اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"راج تم سب سے بیک وقت نہیں لڑ سکتے۔" فتح خان نے کہا۔ "تم شہباز اور اسے مار سکتے ہو لیکن میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔"

راج کنور کے چہرے پر اب ہچکچاہٹ کے آثار تھے۔ فتح خان کی دھمکی نے صورتِ حال بدل دی تھی۔ یہ سچ تھا کہ اگر وہ مجھے مارتا تو فتح خان اسے مار دیتا اور اسے سادی کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ میرا ہاتھ بدستور حرکت میں تھا اور یہ اتنی خفیف حرکت تھی کہ راج کنور مجھے دیکھنے کے باوجود بھانپ نہیں سکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ مار دھاڑ والا آدمی نہیں تھا اس لیے جو بات میں نے پہلے سوچ لی تھی وہ ذرا دیر سے اس کے ذہن میں آئی۔ وہ مجھے شوٹ کرتا اور سادی کو ڈھال بنا کر فتح خان کے پاس جاکر اسے بھی مار دیتا۔ فتح خان کی چلائی گولیاں سادی کو لگتیں اور راج کنور کا یہ مقصد بھی پورا ہو جاتا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس کا ذہن اس طرف نہ جائے۔ مگر جب اس کے تاثرات بدلے تو میں نے جان لیا یہ حل اس کے ذہن میں آگیا ہے۔

اس نے سادی کو اس طرح آڑ میں لیا کہ فتح خان کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے محفوظ رہے اور پستول کا رخ میری طرف کیا تھا۔ میں جست لگانے کو تیار تھا کہ کھلے دروازے سے بیتو بگولے کی طرح اندر آیا اس نے مجھے دھکا دیا تھا۔ راج کنور نے فائر کیا اور بیتو گھوم کر گرا تھا۔ میری دہاڑ اور سادی کی چیخ ایک ساتھ نکلی تھی۔ سادی اتنی زور سے تڑپی کہ راج کی گرفت سے نکل گئی اور بیتو کی طرف لپکی۔ راج جھٹکے سے سنبھل کر پستول کا رخ سادی کی طرف کر رہا تھا۔ میں نے ناقابلِ یقین تیزی سے جیکٹ میں موجود پستول نکالا۔ یہ وہی پستول تھا جو میں نے جگنو کے آدمی کے ہاتھ سے نکالا تھا۔ فتح خان یہاں چوک گیا تھا اور اس نے میری تلاشی نہیں لی تھی۔ اس سے پہلے راج ٹریگر دباتا میں نے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا اور پھر ہر گولی کا جھٹکا اسے پیچھے دھکیلتا رہا۔ آخری گولی کے ساتھ وہ سیف سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ سرکتا ہوا نیچے گرا تھا۔ میں بیتو کی طرف لپکا۔ سادی اسے سنبھال رہی تھی۔ گولی نے بائیں طرف عین بلٹ پروف جیکٹ سے ذرا اوپر اس کی گردن کے نیچے سوراخ کر دیا تھا اور اس سے خون بے پناہ تیزی سے ابل رہا تھا۔ گولی نے یقیناً بڑی شریان کاٹ دی تھی۔ "نہیں..... نہیں۔"

میں نے کہتے ہوئے بیتو کا زخم ہاتھ سے دبایا۔ لمحے میں میرا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔ بیتو کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی اور یہ موت کی زردی تھی۔ اسی لمحے گھڑی کی ٹوٹنے کا چھنا کا سنائی دیا تھا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(شکیل الرحمٰن کھاناں کا جواب)

نعیم صدیقی..........کراچی

وہ کلی کہاں چلی بیکلی کی چھاؤں میں
سادگی نے چھولیا دامنِ حیات کو

ندرت..........کراچی

وہ ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لوں تو ٹھنڈ پڑ جائے
اگرچہ لاکھ رم شعلہ حنا دیکھوں

ارباز خان..........کوئٹہ

وابستۂ سنگِ در وداں ہی نہیں میں
اک موم کی مورت بھی مکیں ہے مرے دل میں

حیات محمد..........شادی پور

وہ چہرہ ہاتھوں میں لے کر کتاب کی صورت
ہر ایک لفظ ہر اک نقش کی ادا دیکھوں

نورین اسلم..........لاہور

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
دے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

نازش ممتاز..........اسلام آباد

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

(منشی خورشید احمد کنول لنڈن کا جواب)

احمد علی صابر..........میرپور آزاد کشمیر

صبر و ضبط کے لیے ہیں بے شمار نذرانے
تیری یاد آئی تھی آج مجھ کو سمجھانے

(محمد عمران جوانانی کراچی کا جواب)

نیاز ملکانی..........سکھر

کیوں جنوں بڑھ گیا یوں خرد گھٹ گئی
دل پہ غالب ہوئے جب سے رنج و محن

رابعہ اسلم..........لاہور

یوں چپ ہیں لوگ سن کے میرے غم کی داستاں
جیسے یہاں وطن میں کسی کے زباں نہیں

(حسن خان، سوات کا جواب)

نوشین اظہر..........پشاور

آرہا ہے مری وحشت پہ شباب
تجھ سے ملنے کے زمانے آئے

(نازش پروین، لاہور کا جواب)

نورین اصغر..........وہاڑی

اے ساکنان کوچہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

امجد حبیب..........راولپنڈی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

(ایم افضل کھرل ننکانہ کا جواب)

ناصر عباس..........لاہور

ناز و انداز دل دکھانے لگے
اب وہ فتنے سمجھ میں آنے لگے

محمد امجد..........فیصل آباد

نہ تو ہے کہیں اور نہ میں ہوں کہیں
یہ سب سلسلے ہیں خیالات کے

عزیز الدین..........لاڑکانہ

ناچیز ہے صد مہر سلیماں مرے نزدیک
بلقیس کے ہونٹوں کا نگیں ہے مرے دل کا

نجمہ فروز..........چارسدہ

نہ ملا گوہر گفتار ہمیں کو نہ ملا
ہم تو ان گونجتی گلیوں میں عبث خوار ہوئے

نصرت جاوید..........کراچی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ نگہ کی تیغ بازی وہ سپاہ کی تیغ بازی

(منشی محمد عزیز لنڈن کا جواب)

نورین تبسم.........سکھر
یاد آتے ہی تم کو ہم شاید
پھیکا پھیلا ہے رنگ کاجل کا

احمد حسن.........سیالکوٹ
یہ کون ادھر سے گزرا میں سمجھا حضور تھے
اک موڑ مڑ کے جو دیکھا زمانہ تھا

محمد ذیشان......کوٹ ادو
یہ حکم ہے کہ اندھیرے کو روشنی سمجھو
ملے نحیب تو کوہ و دمن کی بات کرو
(گل فرید کوئٹہ کا جواب)

محمد مدثر مے......لندن
اے حسرت دیدار یہ کیا راز ہے آخر
وہ سامنے آتے ہیں تو دیکھا نہیں جاتا

نسیم اختر نیازی......لالہ موسیٰ
ان بہاروں میں یارب کیا ہوگیا
گل نے پہنا ہے خون سے بھرا پیرہن

مدثر حسین خان......خان پور
اے آہ میری خاطر وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدہ مشکل نہیں رہا

فہد شیخ......چنیوٹ
آرہا ہے تری وحشت پہ شباب
تجھ سے ملنے کے زمانے آئے

نزہت پروین.........حاصل پور
آئے ہیں جیسے شہر بدر کر کے یہ نادان
وہ شعلہ کب رنگ چمن ہے میرے دل میں
(ارشد خان کوئٹہ کا جواب)

نصرت فتح محمد.........کوئٹہ
اب کی بہار میں تو عجب ماجرا ہوا
زخموں کا باغ ایک ہی شب میں ہرا ہوا

احمد توحید.........کراچی
آئینہ دیکھا تو دل سے یہ صدا آئی نہاں
عمر بھر ساتھ رہے پھر بھی شناسا نہ ہوئے

بیگم شمسی.........اسلام آباد
اے کہ کرنوں سے تیری اپنے سیہ خانے میں
چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے
(نوشین مصطفیٰ لاہور کا جواب)

سعید احمد چوہان......لندن
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں
(نسرین عادل کراچی کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن......لاہور
یہ نگاہ شوق کی افتادگی کو ہم آوارگی سمجھتے ہیں
تعظیم کرتے ہیں اسی نگاہ کی جو کہیں ٹھہر جائے

نیاز کھوسو......حب
یہ کہانی تمام ہو تو سہی
زندگانی کی شام ہو تو سہی

کنیز فاطمہ......اسلام آباد
یقیں آنے کو تو آجائے ان کے عہد و پیماں کا
مگر چشم بد وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
(آفاق علی شاہد کراچی کا جواب)

مرزا ہادی بیگ......لطیف آباد
میرے عیبوں کو گننے والو بیشک مجھے سنگسار کردو
مگر اٹھائے وہ پہلا پتھر جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو

احمد تبسم......شورکوٹ
ملا کرتی تھی جن سے روح کو بالیدگی
وہی قدریں اٹھا کے ہم نے رکھ دیں طاق نسیاں میں
(خاقان عباسی لاڑکانہ کا جواب)

منشی عزیز مے......لندن
یہ کس نے آکے مجھے نیند سے جگایا ہے
بس اک رستہ ہے اک آواز ہے اور اک سایہ

اکرم علی بھٹو......میرپور خاص
یاد رکھیے مجھے دعاؤں میں
بس یہی التماس ہے اے دوست

صفیہ سلطان......حیدرآباد
یہ حوادث کا تلاطم یہ زمانہ ظالم
غم سے بھڑکے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہورہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 104
30 جولائی 2014ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جولائی 2014ء تک علمی آزمائش 104 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

علمی آزمائش۔ 104

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جولائی 2014ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کا سوال

چاچڑاں میں 1261 ہجری میں پیدا ہوئے۔ صوفی شاعر اور عالم تھے۔ اولیا کرام کے مزاروں کی زیارت کا خاص شوق تھا۔ پورے برصغیر میں پھرا کرتے تھے۔ فریضہ حج کے لیے مکہ بھی گئے۔ چولستان کا علاقہ بہت پسند تھا۔ اپنی تصانیف میں اس خطے پر بہت کچھ لکھا۔ اردو، فارسی، پنجابی، سندھی، ہندی اور عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے شاعری میں نئی بحر اور اوزان ایجاد کیے۔ امیر بہاولپور کا پورا خاندان ان سے خاصی عقیدت رکھتا تھا۔

علمی آزمائش 101 کا جواب

ممتاز مفتی ضلع گرداس پور کے بٹالہ میں 12 ستمبر 1905 میں پیدا ہوئے، پاکستان کے بڑے مصنفین میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے ایک ناول نے تو شہرت کی بلندیوں کو چھولیا اور اب ادب کا شہپارہ کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف کا یہ ایک ناول ہی انہیں ادب کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

انعام یافتگان

1- نصیر الدین شیخ، چنوٹ　2- سیدہ ادیبہ رضوی، جہلم　3- اشرف بٹ، لاہور
4- وسیم احمد، کراچی　5- نیاز حسن خان، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نورین تبسم، فدا حسین، سدرہ شاہین، ناصر حسن چنگیزی، غازی شاہ، اقصیٰ حسن، شازیہ بتول، نادیہ محراب علی زرین خٹک، وسیم زیدی، طوبیٰ حسن، فیاض ملک، صوفی خٹک، دیا حسنین، صدف مصطفی، دعا زہرا، نادر

شاہ، خلیق اطہر، انتظار حسین زیدی، زرش حنا، محمد احمد، زرتاش علی، فہیم احمد، کائنات بتول، زریاب علی۔ لاہور سے، ظہیر الحسن قزلباش، نیاز سومرو، محمد بلال مصطفی، اسد شکیل، افتخار احمد تارا، نوشین ملک مرزا یوسف بیگ، احمد یاسین ملک، بیگم صفدر جاوید، شگفتہ مشتاق، شاہد حسن، محمد یاسین، فراز علی، خالد یونس اسلام، فیض محمد خان، اصغر عباس، فصاحت مرزا، محمد عظیم خان، اشفاق کیانی، جاوید سرکار، یحییٰ برلاس، ندا علی سید، کائنات مرزا، کوکب جمیل، حسنین، مرسلین، نادر علی، طوبیٰ مصطفی۔ پنڈی سے نگار ملک فتح الدین، قمر عباس، کوکب فاروقی، نثار میمن ظفر اسماعیل، رضوان احمد ہاشمی نصرت حسین۔ اسلام آباد سے فتح دین، ناصر اختر ناصر، ممتاز الدین شیخ، عباد انصاری، نسیم بٹ، نعمان شاہ، انور یوسف زئی۔ مظفر گڑھ سے خاقان خان، جان محمد عباسی، زاہد سونگی، احمد توحید، ازباز خان، نجم شیرازی۔ حیدرآباد سے عقیل احمد، زہیب منصور، فتح الباری، عنایت اللہ، آغا مظہر، ذیشان قزلباش، مرزا استقار بیگ، مرزا ہادی بیگ۔ میرپور خاص سے انعام الحسن، ناصر زید پوری، انصار حسین، احمد صفی افتخار، امتیاز حسن، تحزیٰ امولکھ۔ میرپور آزاد کشمیر سے نیاز بجت، افتخار احمد، محمود نیاز، فتح الباری، محمد توقیر، ارشاد حسین، فہیم الدین، ناصر حسن، خان محمد خان۔ قاسم خان، قمبر حسن، غلام حسین، نازش خان۔ کوئٹہ سے تقی چنگیزی، نصرت اللہ، محمد سالکین، دردانہ قمر، احباب خان۔ جہانیاں سے شیخ کمال احمد، نعمان سلمان، بشیر احمد، صالح شیخ، نوید احمد۔ شیخوپورہ سے نیاز احمد مرتضوی، سلمیٰ احمد، نادر شاہ، غلام حسن بٹ۔ ملتان سے احسن خان اچکزئی، طارق حبیب، فرقان حمیدی، فیض مسیح، جمنا اختر، محمد علی مشاہد، ثنا بخاری، آفتاب مقصود، اختر حسین، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، جاوید اقبال، ڈھوڈا ل، ثروت ناز، اختر عباس، نعیم اختر، نعت مرزا، منظر خان، بھکول، ثنا یونگی، سید عزیز الدین، محمد احمد آفرید خان، زینب بتول، خالد آرائیں۔ سکینہ تقوی، عنبرین چشتی۔ بہاولپور سے اطہر یونس، ثنا اللہ، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، منظر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نعیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ نگار افروز، اقبال حسن، فہیم آزاد، ذیشان حیدر، بہادر علی۔ بہاولنگر سے سبط حسن، غازی اختر، تجسم زہرہ، نیاز احمد، قطب الدین احمد۔ پشاور سے سمندر خان، بشمان، لقمان، نعمان، یار علی خان، بشیر خان۔ جہلم سے انور کلیم شاہ، ثنا بخاری، بہادر خان، انوار شاہ، یوسف خان، سنمان زیدی، چوہدری نیاز مسلم خان، ماسٹر قیوم محمد، کوکب گردیزی، شہباز خان، ابراہیم شاہ، بیگم انوار شاہ، نگار ملک، فیض الحسن، ظہیر الحسن قزلباش، ذیشان فہیم آزر، کمال حسن، انصار الحسن زیدی، فہیم بھٹ۔ خان پور سے ارشد کریم، نیاز الدین۔ یاسمین فرحت، فراز احسن فاروقی، خالد بٹ، فیض لاشاری، قیام الدین، نگار مصطفی۔ میانوالی سے سہاب خان۔ سکھر سے نوازش علی حیدر ملکانی، انجم شیراز، فہد علی، مصطفی نیازی، عباس خان، صفدر علی، وحید ول، عنبر نعیم۔ ساہیوال سے محمد افضل خان، فضل حق، محمد آمان خان، نصرت علی، عشرت خان، خلیل اللہ، انوار خان۔ منڈی بہاؤ الدین سے فرحت خان، زاہد علی، تاثیر حسین، فرحت خان، عدا علی، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفی، ناصر کیانی، سعید امجد، نذر علی۔ رحیم یار خان سے فصاحت خان، نسیم احمد، ارشد محمود، ملک فیروز الدین، محمد سراج الدین، اختر عباس، ایم اے شاہد، نعیم شیرازی، فخر اسلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، ارہام خان، جویریہ، فہیم شاہ، علی عباس، خادم حسین، فیض بلوچ، محمد خواجہ، سید احترام حسین رضوی، زاہد خان۔ اظہر الدین، سید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا حسن، ملک صفدر، مریم ریاض، بختاور شاہ، عارفہ سلطان، ابرار احمد، مہوش اختر، نوید فہیم، اصغر طوری بخش، محمود اچکزئی، نزرانہ شاہ، ارباب خان، نجم الدین حیدر، تنویر حسین زیدی، رجب علی مرزا، نادر خان، مرید علی خاکوانی، مہر خان، اسلم خان، بیگم امتیاز علی دستوری۔ سیالکوٹ سے حسن عالم، درویش خان، منظر خان، محمد مظہر، فرحت حسین باقر علی۔ کھلابٹ ٹاؤن سے منشی اعتماد علی، راحیلہ شیخ، سندس امتیاز۔ سرگودھا سے ثنا، ادریس احمد خان، نیاز احمد، منظر خان۔ پاراچنار سے زاہد علی طوری، اظہر بخش، نصرت شاہ، دیدار علی طوری۔ اٹک سے زبیر اللہ، ثنا، جبران، عرفان منور، ادریس علی خان۔

ممالک غیر سے نصیر الدین نصیر (مانچسٹر یو کے) نعیم بٹ (جرمنی) زاہدہ خان (عمان) فلک شیر (زاہدان، ایران) نیاز اسلم جونیجو (فرنکفورٹ)

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت
زندگی حادثات وواقعات کا مجموعہ ہے۔ زندگی میں بڑے بڑے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر عقل سے کام لیا جائے تو ہر مسئلہ حل ہوتا چلا جاتا ہے جیسے میں نے اپنی بیٹی کے بھکتے قدم کو روک لیا تھا۔

ایمل
(لاہور)

"کیا تاریخ خود کو دہرانے جارہی ہے؟" میں نے سوچا اور سنبل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ویسے ہی ستارے چمک رہے تھے جیسے کبھی میری آنکھوں میں چمکتے تھے اور اس کے رخسار پر ویسے ہی گلاب کھل رہے تھے جیسے کبھی میرے رخساروں پر کھلے تھے اور چال میں وہی لڑکھڑاہٹ تھی جو کبھی میری چال میں آئی تھی۔ میں وجہ بھی جانتی تھی۔ اس کی وجہ نوابزادہ اکبر جلال تھا۔ جنوبی پنجاب کے ایک جدی پشتی دولت مند نواب خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج یا آکسفورڈ جانے کی بجائے یہاں لاہور آگیا تھا۔ وہ جس نجی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ سنبل بھی اسی میں پڑھ رہی تھی۔ اکبر سے اس کی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ اس نے اکبر کو مجھ سے ملوانے اور اس کے بارے میں بتانے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی تھی کیونکہ ہماری کلاس میں ایسی جھجک یا شرم بہت پہلے ترک کی جاچکی تھی۔

اکبر تھا بھی ایسا کہ کوئی لڑکی اس کے سامنے دل ہار جائے، لمبا اور ورزشی جسم والا اکبر جلال نوابزادہ کی بجائے کوئی اسپورٹس مین یا فلمی ہیرو لگتا تھا۔ گھنے اور لمبے گھنگریالے بال جو شانوں تک آتے تھے۔ کھڑے نقوش جن میں بیک وقت سختی بھی تھی اور کشش بھی۔ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا جو جان گئی کہ سنبل نے اسے مجھ سے کیوں ملوایا ہے۔ اگرچہ سنبل نے کچھ کہا نہیں تھا۔ مگر اس کی آنکھیں، اس کے رخسار اور اس کی چال چیخ چیخ کر اس کے دل کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ اکبر کا اس کے ساتھ جو حاکمانہ انداز تھا اور وہ اس پر جس طرح کی غیر محسوس گرفت قائم کر چکا تھا۔ وہ اشارہ دے رہی تھی کہ اب ان دونوں کو ایک ہونے سے روکنا بہت مشکل ہے۔ وہ اس کے لیے ہر دیوار گرا دینے کا عزم کر چکے تھے۔ درحقیقت وہ ذہنی طور پر ایک ہو چکے تھے۔ سنبل صرف اٹھارہ سال کی تھی بلکہ ابھی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے آنرز کا یہ دوسرا سال تھا۔ اکبر اس سے چار سال بڑا تھا اور وہ ماسٹر کر رہا تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد بھی اکبر کئی بار ہمارے ہاں آیا۔ کبھی وہ ملنے آتا تھا اور کبھی سنبل کو لے جانے کے لیے آتا تھا۔ سنبل اس سے باہر ملتی تھی اور اس نے کبھی یہ بات مجھ سے نہیں چھپائی۔ میں نے بتایا نا کہ ہماری کلاس میں یہ سب عام سی باتیں ہیں۔ البتہ میں نے سنبل کو یہ سمجھا دیا تھا کہ عورت محبت ضرور کرے لیکن شادی سے پہلے خود کو مرد کے حوالے نہ کرے ورنہ وہ اس کے لیے بے وقعت ہو جاتی ہے۔ کچا پھل رہ جاتی ہے جسے بے صبری میں شاخ سے توڑ لیا جاتا ہے مگر پھر چکھ کر ایک طرف ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ سنبل نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ اسے بھی اپنی عزت کا احساس تھا۔ اس

کے باوجود میں کسی قدر فکر مند تھی کیونکہ اب معاشرہ بدل گیا ہے۔ پہلے جو اقدار تھی اسے اب بیکار سمجھا جاتا ہے۔ دوسری بات جو میں نے سنبل کے ذہن میں ڈالی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کم سے کم آنرز مکمل کرے گی اور اس کے بعد ہی میں اس کی شادی کا فیصلہ کروں گی۔

میں کم عمری کی شادی کے سخت خلاف ہوں۔ جس میں لڑکیوں کو اپنا ہوش نہیں ہوتا ہے وہ شادی کی ذمے داریاں کہاں سے پوری کریں۔ اس عمر میں تو انہیں اپنے اچھے برے کا پتا نہیں ہوتا ہے۔ ابھی اس کا آنرز مکمل ہونے میں دو سال سے زیادہ کا وقت تھا۔ مگر سنبل انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں تھی وہ بہت مضطرب تھی اور پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ وہ دستک دے کر اندر آئی وہ مضطرب سی لگ رہی تھی اور میں اس کی یہ کیفیت خوب پہچانتی تھی۔ جب اسے کوئی بات کہنی ہو اور اسے خطرہ ہو کہ میں منع کر دوں گی تو اس کی حالت ایسی ہی ہوتی تھی۔ وہ آکر بستر کے کنارے بیٹھ گئی اور کچھ دیر دونوں ہاتھ آپس میں ملتی رہی۔ میں سکون سے انتظار کر رہی تھی کہ وہ کب بولتی ہے۔ بالآخر اس نے کہا۔ "ماما مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟"

"میں سن رہی ہوں۔"

"ماما.... وہ .... میں اکبر سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ جلد از جلد۔"

☆☆☆

"ایمل تم نے عماد حسین شاہ کو دیکھا۔" مہرین نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں یہ کون ہے؟" میں نے ریک سے ایک کتاب اٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ آج پروفیسر غزالی کا پیریڈ آف تھا اور ہم لائبریری آگئے تھے۔

"انگلش ڈپارٹمنٹ میں آیا ہے۔ لیکن کیا پرسنالٹی ہے.... ایسا بندہ کہ یونیورسٹی کی آدھی لڑکیاں اس کی دیوانی ہو گئی ہیں۔"

پنجاب یونیورسٹی میں ایک سے بڑھ کر ایک بندہ آتا ہے۔ اس لیے مجھے تعجب ہوا۔ "ایسی کیا بات ہے اس میں؟"

"تو دیکھے گی تو پتا چلے گا تجھے۔"

بیس سال پہلے موبائل، کیبل ٹی وی اور انٹرنیٹ نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں تبدیلی کی رفتار بہت سست تھی۔ اس وقت ہمارے بڑوں کو لگتا تھا کہ معاشرہ تیس چالیس سال میں تبدیل ہوا ہے۔ مگر اس کے بعد تبدیلی کی ایسی رفتار آئی کہ دس سال میں ہر چیز معہ لوگوں اور ان کے

رویوں کے سب بدل کر رہ جاتا ہے۔ تبدیلی کا دورانیہ مختصر اور رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ اس وقت فیشن بھی برسوں میں بدلتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک ہی سوٹ ہم کئی کئی سال پہنتے تھے اور وہ فیشن میں ہوتا تھا۔ اب ہر چند مہینے بعد فیشن بدل جاتا ہے۔ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ والد ٹی وی میں کام کرتے تھے۔ وہ ٹیکنیشین تھے مگر ان کے تعلقات سب سے تھے اور اکثر ہمارے گھر نامور اداکار، ڈرامہ نگار اور پروڈیوسر آتے تھے۔ ادب اور آرٹ سے خود بہ خود تعلق بن گیا تھا۔ اتنی ہمت تو نہیں تھی۔ ابو سے کہتے کہ وہ کسی ڈرامے میں کام دلوا دیں۔ لیکن شوق ضرور تھا کہ کسی ڈرامے میں کام کروں، ہیروئن کا کردار ادا کروں۔

یہ شوق میں نے کالج میں پورا کیا۔ یہاں ڈرامہ اور آرٹ سوسائٹی تھی اور ایک نامور ٹی وی آرٹسٹ اسے پروموٹ کرتے تھے۔ یہاں میں نے کئی ڈراموں میں حصہ لیا اور میری اداکاری کو سراہا گیا۔ مگر اداکاری سے قطع نظر میرا شوق تعلیم تھی۔ میں نے گریجویشن میں اردو ادب لیا تھا اور گریجویشن اتنے اچھے نمبروں سے کیا کہ مجھے آرام سے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ والد کی طرف سے تعلیم کے معاملے میں ہم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹیاں جتنا پڑھیں گی وہ پڑھائیں گے۔ اس پر امی نے ہنگامہ کیا وہ چاہتی ہیں کہ دوسری بہنوں کی طرح گریجویشن کے بعد میری شادی کر دیں۔ مگر ابو نے میری خواہش کا احترام کیا۔ میری دونوں بڑی بہنوں نے گریجویشن کو کافی سمجھا تھا اور ان کا خود آگے پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا اس لیے ان کی شادیاں ہو گئیں۔ میں آگے پڑھنا چاہتی تھی اس لیے مجھے اجازت مل گئی۔

میں نے ماسٹر کے لیے بھی اردو ادب کا انتخاب کیا تھا۔ اس وجہ سے آرٹس اور فائن آرٹس سے خود بہ خود ایک تعلق بن گیا۔ پھر یونیورسٹی کی ڈرامہ سوسائٹی بھی جوائن کر لی۔ اس کے تحت کئی ڈراموں میں حصہ لیا۔ لیکن یہ سب فارغ اوقات کے شغل تھے تعلیم میری اولین ترجیح تھی اسی بنا پر پہلے سمسٹر میں ٹاپ کیا تھا۔ یہ دوسرا سمسٹر تھا۔ کچھ ہم خیال لڑکیوں کا ایک گروپ تھا جس میں میں بھی شامل تھی اور یونیورسٹی کی روایت کے برخلاف ہمارے گروپ میں لڑکے نہیں تھے۔ یہاں زیادہ تر گروپ دونوں اصناف پر مشتمل ہوتے ہیں مگر کچھ ان سے ہٹ کر صرف ایک ہی صنف بھی مشتمل ہوتے تھے اور ہمارے گروپ ان میں سے ایک تھا۔

میرے علاوہ مہرین، سعدیہ، روشنا، حرا اور بشریٰ تھیں۔ میرے اور مہرین کے علاوہ باقی سب دوسرے شعبوں میں تھیں مگر اس سے ہمارے گروپ پر اثر نہیں پڑا تھا۔ ہماری سیٹنگ ایسی تھی کہ باقاعدگی سے کلاسز اٹینڈ کرنے کے باوجود ہم دن میں ایک بار ضرور مل کر بیٹھتے تھے۔

اس روز اتفاق سے پیریڈ آف ہونے کی وجہ سے صرف مہرین میرے ساتھ تھی اور ہم لائبریری میں تھے۔ مہرین عماد کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں بے توجہی سے سن رہی تھی اصل میں مجھے غالب کا ایک انتخاب مل گیا تھا اور میں اسے دیکھنا چاہتی تھی اس لیے جب مہرین کا عماد نامہ زیادہ ہی طول پکڑنے لگا تو میں نے تنگ آ کر کہا۔ "اچھا بابا اسے بھی دیکھ لوں گی ابھی تو مجھے یہ کتاب دیکھنے دو۔"

اس نے جل کر کہا۔ "تم تو ہو ہی بدذوق۔"

"بدذوق میں ہوں یا تم۔ میں غالب کے لیے آئی ہوں اور تم مجھے عماد حسین شاہ کے قصے سنا رہی ہو۔"

"مرضی تمہاری۔" اس نے کہا اور ریڈرز سیکشن کی طرف چلی گئی۔ میں کتاب دیکھ رہی تھی کہ مجھے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں نے ایسے ہی سرسری نظروں سے دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔ آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کوئی مرد اتنا حسین ہو سکتا ہے۔ نوے فیصد لڑکیوں کی طرح میں مرد کو ایک مضبوط شخصیت اور محبت کے محرک کے طور پر لیتی تھی۔ ان کی جسمانی خصوصیات میرے نزدیک اتنی اہم نہیں تھیں۔ مگر یہ شخص جو میرے سامنے کھڑا تھا ایسا نہیں تھا کہ میں اسے نظر انداز کر دیتی۔ موٹی اور مد بھری آنکھیں، جن پر شفاف پپوٹوں کا غلاف تھا۔ پیوست مردانہ گھنی بھنویں، ستواں ناک اور بھرے ہونٹوں کے اوپر نفاست سے تراشی مونچھیں تھیں جو نہ بہت بڑی تھیں اور نہ بہت چھوٹی۔ ایسی سرخی مائل رنگت جس میں جلد کی صفائی نمایاں ہوتی ہے۔ اسے سرخ و سفید نہیں کہا جا سکتا تھا مگر ایسی دلکش رنگت والی جلد میں نے بہت کم دیکھی تھی۔

مضبوط جسم اور اس سے زیادہ مضبوط چھلکتا ہوا اعتماد کا تاثر۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کا کسرتی جسم نمایاں تھا۔ سائیڈوں سے مختصر بنے بال اوپر سے بڑے اور کسی قدر بکھرے ہوئے تھے مگر یہ بھی اچھے لگ رہے تھے۔

درحقیقت وہ ان مردوں میں سے تھا جن کا کچھ بھی برا نہیں لگتا ہے۔ مجھے خاصی دیر سے اس کی زیر لب مسکراہٹ سے احساس ہوا کہ میں اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ یہ احساس ہوتے ہی جھینپ گئی اور جلدی سے رخ پھیر لیا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو ایک مسحور کن مہک جیسے میری سانسوں تک میں اتر گئی تھی۔ یوں لگا جیسے یہ پرفیوم نہیں اس کی اپنی مہک ہو۔ میں نے پوچھا نہیں، مگر میں نے جان لیا وہ عماد حسین شاہ تھا۔ جس کے بارے میں چند لمحے پہلے مہرین مجھے بتا رہی تھی اور مجھے لگا کہ اس نے شاید ہماری گفتگو سن لی تھی اور شاید اسی لیے وہ جان بوجھ کر میرے سامنے آیا تھا۔ میرے رد عمل نے اسے بتا دیا کہ مہرین کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ ٹھیک ہے وہ بہت دلکش آدمی تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں یوں بے خود ہو جاتی۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا کہ اب اس سے سامنا ہوا تو اس کی طرف دیکھوں گی بھی نہیں، اسے نظر انداز کر دوں گی۔ جب میں خود کو سنبھالتی ہوئی مہرین کے پاس آئی تو اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "کیا بات ہے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے جو ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔"

"نہیں یار مجھے لگ رہا ہے بھوک کی وجہ سے چکر آ گیا۔" میں نے بہانہ بنایا۔ "صبح ناشتے کیے بغیر نکل آئی تھی۔"

"تو کینٹین چلتے ہیں۔" مہرین فوراً کھڑی ہو گئی۔ ہم کینٹین آئے۔ یہاں کچھ دیر بعد بشریٰ اور حرا بھی آ گئیں۔ ان کے پیچھے سعدیہ اور روشنا بھی چلی آئیں اور گپ شپ میں اگلا پیریڈ بھی نکل گیا مگر یہ اہم نہیں تھا۔ پروفیسر شرافت ادبی تاریخ پر جو لیکچر دیتے تھے وہ بوریت سے بھرپور ہوتا تھا اور دوران کلاس اکثر طلبہ اونگھتے رہتے تھے۔ جب تک گفتگو کا موضوع عماد حسین شاہ نہیں ہوا تھا میں نارمل تھی مگر اس کا ذکر آتے ہی میں بے چینی محسوس کرنے لگی۔ وہ سب بھی اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں۔ اگرچہ وہ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں مگر نہ جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ جب بشریٰ نے دو تین بار اسے اپالو سے تشبیہ دی تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے کہا۔ "خدا کے لیے اتنی زمین آسمان کی قلابیں بھی مت ملاؤ... ٹھیک ہے خوبرو ہو گا مگر ہمیں کیا؟"

"ہائے ہمیں ہی تو سب ہے۔" حرا نے آنکھ ماری۔ "کیا لڑکوں کا ہی حق ہے کہ لڑکیوں میں خوب صورتی تلاش کرتے پھریں۔ ہم لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہے کہ لڑکوں کی خوب صورتی دیکھیں یا اس کے بارے میں بات کریں جیسے لڑکے ہمارے بارے میں کرتے ہیں۔"

"حق ہے لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم صنف نازک ہیں اور خوب صورت ہونا ہماری ضرورت ہے۔ ہم حق دار ہیں کہ لڑکے ہماری طرف متوجہ ہوں۔ ہمارا لڑکوں کی طرف متوجہ ہونا ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ پرانی باتیں ہیں اب کون ان کی پرواہ کرتا ہے۔" حرا نے لاپروائی سے کہا۔ وہ ہم سب میں بولڈ تھی۔ اسی لمحے میں نے دیکھا ایک میز آگے عماد بیٹھا ہوا تھا اس کی پشت ہماری طرف تھی لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ ان میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں گئی تھی۔ ہم سب اتنی آواز سے ضرور بات کر رہے تھے کہ اس کے کانوں تک ہماری آواز پہنچ گئی ہو گی۔ میں ذرا بوکھلائی تھی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اچھا موقع ہے، میں اس تاثر کو زائل کر سکتی تھی جو پہلی ملاقات میں عماد پر آیا ہو گا۔

"بات پرانی اور نئی کی نہیں ہے۔" میں نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔ "ہمیں کسی کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر کسی میں کوئی خوبی ہے تو اس کے اپنے لیے ہے ہمارے لیے تو نہیں ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہو۔" بشریٰ بولی۔ "لیکن ہم صرف فار انجوائے کر رہے ہیں۔"

"بس تو اسے انجوائے کی حد تک رکھو کسی کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ "اب چلو اگلا پیریڈ شروع ہونے میں چند سنٹ ہیں۔"

مہرین میرے ساتھ آ گئی۔ میں عماد کے پاس سے گزری مگر جان بوجھ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ البتہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ میں خوش شکل تھی، بلکہ اب بھی ہوں۔ نسوانی دلکشی تھی اور اوڑھنے پہننے کا سلیقہ تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ لڑکے راہ چلتے میری طرف متوجہ ہوتے ہیں یا میرے آگے پیچھے ہوتے ہوں۔ اس لیے مجھے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ عماد جیسا خوبرو مرد میری طرف متوجہ ہو گا۔ دو دن بعد میں لان میں درخت تلے بیٹھی ہوئی ایک نئے ادبی ناول کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوشش

فن لینڈ

شمالی یورپ کی ایک جمہوریہ۔ اس کے شمال میں ناروے۔ مشرق میں روسی فیڈریشن جنوب میں خلیج بوتھنیا اور بحیرۂ بالٹک اور مغرب میں سویڈن ہے۔ ملک کی مجموعی لمبائی کا تیسرا حصہ دائرہ قطب شمالی کے شمال میں ہے۔ رقبہ 129-130 مربع میل (337032 مربع کلومیٹر) دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر: ہلسنکی زبان: فنش، سویڈش (دونوں سرکاری) مذہب: لوتھرن مسیحی 97 فیصد۔ سکہ: مارکا (Markkaa) کہلاتا ہے۔ فن لینڈ ساٹھ ہزار جھیلوں کی سرزمین ہے اور یہ تقریباً تمام ملک کے جنوبی حصے میں ہے۔ ملک کا 70 فیصد زمینی رقبہ جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ تیس فیصد حصے میں دلدلیں ہیں۔ ساحلی پٹی نشیبی ہے۔ انتہائی شمال میں کم بلند پہاڑیاں ہیں۔ قومی آمدنی کا بیشتر حصہ صنعتوں (کاغذ، کاغذی مصنوعات، تانبے کی صفائی، جہازرانی، فرنیچر، پارچہ بافی اور کیمیادی سامان) سے حاصل ہوتا ہے۔ جئی، جو، گندم، آلو، چقندر اور رائی کاشت کی جاتی ہے۔ معدنیات میں تانبا، نکل، لوہا، کرومیم، جست، ٹیٹنیم اور کوبالٹ قابل ذکر ہیں۔ ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج ہے (صدر چھ سال کے لیے انتخابی کالج کے 301 ارکان کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے) کاروبار حکومت میں وزیراعظم اور اس کی کابینہ صدر کی مدد کرتی ہے۔ ایک ایوانی پارلیمنٹ ایڈس کنتا (Edus Kunta) 200 ارکان پر مشتمل ہے۔ انہیں بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر، چار سال کے لیے چنا جاتا ہے۔ ملک میں 12 لانیت یا صوبے ہیں، جن پر گورنر حکومت کرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ان علاقوں میں جو اب فن لینڈ میں شامل ہیں، قطبی خطے کے لوگ آباد تھے، جنہیں Lapps کہا جاتا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں انہیں جنوب اور جنوب مغرب سے آنے والے فن قبیلوں نے شمال کی طرف دھکیل دیا۔ بارہویں صدی میں فن لینڈ کے باشندوں کو سویڈن کے لوگوں نے مسیحی بنایا اور سولہویں صدی میں یہ ملک سویڈن کے زیرنگیں

ان معنوں میں کہ ادیب حضرت نے اس میں ادب کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اور کہانی کو نظر انداز کیا ہوا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ ہمارے جدید ادب کے پروفیسر اس کی تعریف کر رہے تھے اور آنے والی کلاسز میں اس پر ڈسکشن ہونی تھی۔ معاً مجھے قریب سے آواز آئی۔

”مشکل ہے نا؟“

میں چونکی مجھے قطعی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ وہاں کب آیا اور کتنی دیر سے وہاں موجود تھا۔ میں نے کسی قدر خشک لہجے میں پوچھا۔ ”ایکسکیوزمی؟“

وہ وہیں گھاس پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے بولا۔ ”میں نے پڑھا ہے اور بہت مشکل سے پڑھا ہے۔“

”آپ تو انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”ہاں لیکن اردو ادب پڑھنے پر پابندی تو نہیں ہے؟“ اس نے کہا۔

”ضرور پڑھیں۔“ میں نے کہا اور کتاب بیگ میں رکھ دی۔ میں اٹھ رہی تھی کہ اس نے کہا۔

”یہ ضروری تو نہیں ہے کہ جسے آپ اہمیت نہ دیں وہ بھی آپ کو اہمیت نہ دے۔“

”مجھے آپ سے اتفاق ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”معاف کیجیے گا میری کلاس ہے۔“

”ضرور پھر ملاقات ہوگی۔“ اس نے خوشدلی سے کہا۔

میں اوپر سے جتنی پرسکون تھی اندر سے اتنی پرسکون نہیں تھی۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح اچانک میرے پاس آئے گا اور مجھ سے بات کرے گا وہ بھی اتنی بے تکلفی سے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اکیلی تھی اور آس پاس کوئی ساتھی نہیں تھی ورنہ میرا اچھا خاصا ریکارڈ لگتا۔ کیونکہ میں اس کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ میں کلاس میں آئی تھی لیکن میری توجہ لیکچر پر بالکل نہیں تھی۔ میں اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پھر یہ سوچیں میرے ذہن اور وجود پر محیط ہو گئیں۔ اس لیے جب عماد نے پیش قدمی کی تو میں بالکل مزاحمت نہیں کر سکی۔ اپنے الفاظ کے دعوے کے برعکس میں اسے اہمیت دیے بغیر نہ رہ سکی اور پھر وہ اتنا اہم ہو گیا کہ باقی سب غیر اہم ہو گیا۔ میری ساتھی، میری تعلیم اور میرے گھر والے سب عماد کے آگے غیر اہم ہو گئے تھے۔ مجھے تو

ایک نوابی ریاست بن گیا۔ 1721ء میں روس نے صوبہ وائی بورگ (Viborg) پر قبضہ کر لیا اور 1809ء تک سارا ملک سلطنت روس کے زیر اقتدار آ گیا البتہ مقامی لوگوں کو اندرونی خودمختاری حاصل رہی۔ 1899ء میں زار روس نکولاس دوم نے یہاں روسی کلچر کو فروغ دینے کی کوشش کی، جس سے فن قوم پرست بھڑک اٹھے اور انہوں نے روسی گورنر جنرل کو قتل کر دیا۔

1906ء میں روسی حکومت نے فن لینڈ کو چند مراعات دینے کا اعلان کیا اور ملک میں ایک ایوانی پارلیمنٹ قائم کی گئی جس کے ارکان بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیے گئے۔ 1917ء میں، انقلاب روس کے بعد، فن لینڈ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا لیکن ملک کی تقریباً نصف آبادی فن لینڈ کو سوویت یونین میں مدغم کرنے اور نصف مکمل آزادی کی حامی تھی۔ اول الذکر سرخ (ریڈ) اور ثانی الذکر سفید (وہائٹ) کہلائے۔ آزادی کے حامیوں نے، جرمن فوج کی مدد سے، سرخوں کو کچل دیا اور فن لینڈ جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ 1939ء میں سوویت یونین نے مطالبہ کیا کہ فن لینڈ لینن گراڈ کے شمال میں واقع خاکنائے کیریلین میں اپنی قلعہ بندیاں ختم کر دے اور خلیج فن لینڈ کے متعدد جزائر اس کے حوالے کر دے۔ فن لینڈ نے یہ مطالبات مسترد کر دیے جس پر 1940ء میں سوویت یونین کی فوجوں نے اس پر حملہ کر دیا اور شدید جنگ کے بعد جس میں پہلے پہل سوویت افواج کو ہزیمت اٹھانا پڑی فن لینڈ کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ 1941ء میں نازی جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کیا تو فن لینڈ کی حکومت نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ 1947ء میں پیرس کے معاہدہ امن کی رو سے، فن لینڈ نے مزید علاقے سوویت یونین کے حوالے کر دیے اور تاوان جنگ ادا کرنے پر بھی رضامند ہو گیا۔ 1955ء میں فن لینڈ اقوام متحدہ کا رکن بنا اور اس نے غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی۔ 1970ء میں دائیں بازو کی سینٹر پارٹی نے کمیونسٹوں کے اشتراک سے حکومت بنائی۔ 1971ء میں کمیونسٹ پارٹی حکومت سے علیحدہ ہو گئی۔

مرسلہ: شاہد، لاہور

بھی یاد نہیں رہا کہ میں نے اس کے بارے میں اپنی دوستوں سے کیا کہا تھا۔ وہ کیسے مجھ پر حاوی ہو گیا، میں نہیں جانتی۔ وہ جو چاہتا میں کرتی تھی اگر وہ مجھ سے شادی سے پہلے جسمانی تعلق قائم کرنا چاہتا تو شاید میں یہ بھی مان جاتی مگر اس نے اس کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے اپنانا چاہتا تھا۔

میرا ماسٹر کا پہلا سال تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ماسٹر مکمل ہونے تک میں گھر والوں سے بات نہیں کر سکتی۔“

”میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

”پلیز عماد۔“ میں بے بسی سے بولی۔ ”میں آپ کو یقین دلاتی ہوں میرے گھر والے میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔“

”بات تمہارے گھر والوں کی مرضی کی نہیں ہے۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔ ”بات یہ ہے کہ مجھے تم چاہیے ہو اور میں اس کے لیے کوئی غلط طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتا۔“

اس کے انداز میں ایسا اعتماد تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ غلط طریقہ بھی اس کے اختیار میں تھا اور اسے نہ اختیار کرنا اصل میں میرا نہیں بلکہ اس کا اختیار تھا اور یہ بات سچ تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تب میں کیا کروں۔“

”اپنے گھر والوں سے بات کرو۔ تم شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہو۔“

جب میں عماد کے سحر میں آئی اور ساری یونیورسٹی کو پتا چل گیا تو میں نے ذرا بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ میری دوست جب مجھے میرے ہی الفاظ یاد دلاتیں تو میں اس طرح سنتی تھی جیسے وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے کہہ رہی ہوں۔ لوگ مجھے پیٹھ پیچھے اور بعض منہ پر کیا سمجھتے اور کہتے تھے مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا عماد حسین شاہ لہو بن کر میری رگوں دوڑ رہا ہے۔ سانس بن کر میرے وجود میں سما رہا ہے۔ اگر وہ نہ رہا تو میرا بدن لہو اور سانس سے محروم ہو کر محض ایک مردہ وجود رہ جائے گا۔ اگر وہ رات کو دن یا دن کو رات کہتا تو مان جاتی۔ آنکھ بند کر کے یقین کر لیتی۔ اس لیے جب اس نے کہا کہ اسے میری ضرورت ہے اور میں گھر والوں سے بات کروں تو میں نے اسی دن امی سے بات کی۔ صرف بات نہیں کی بلکہ صاف کہہ دیا کہ میں عماد سے شادی کروں گی اور جلد کروں گی۔ اس کا رشتہ آئے تو اسے قبول کیا

جائے۔ امی میرے لہجے اور الفاظ پر دنگ رہ گئی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

"ایمل تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ یہ تو مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہی ہے۔"

"امی اسی سے اندازہ لگا لیں کہ میں کس قدر سنجیدہ ہوں۔" میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آنے والے دن میرے گھر میں جو بھونچال آیا اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ابو بھائی اور بہنیں سب اس مسئلے پر میٹنگ کر رہے تھے اور پھر مجھے مجرم کی طرح طلب کیا گیا۔ مگر میں بے خوف ہو گئی وہاں بھی میں نے کھل کر وہی کہا جو امی سے کہا تھا اس پر بھائیوں نے مجھے مارا، بہنوں نے ملامت کی اور ابو ساکت رہ گئے تھے مگر مجھے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ جب یہ سب ہو گیا اور میں نے سارے ستم برداشت کر لیے تو صرف اتنا کہا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں کورٹ میرج نہ کروں تو میری بات مان جائیں۔"

وہ میرے گھر والے تھے اور مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ خاص طور سے ماں باپ جو اولاد کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ جان گئے کہ میں ایسا ہی کروں گی۔ اس لیے دو دن بعد ابو نے امی سے کہلوا دیا کہ میں عماد حسین سے کہوں کہ وہ رشتہ لے آئے۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے بعد میرا اس گھر سے اور اس کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ شادی کے بعد میں پھر بھی اس گھر میں نہیں آؤں گی اور نہ ہی اس کے کسی فرد سے ملوں گی۔ مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے اگلے دن یہ خوش خبری عماد حسین کو سنائی اور اس سے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں کو میرے گھر بھیجے۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ "جس طرح تمہارے گھر والے شادی کے بعد تم سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے اسی طرح میرے گھر والے بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوں گے۔ میں ان کے علم میں لائے بغیر شادی کروں گا اور تمہارا واسطہ صرف مجھ سے ہوگا۔"

جب مجھے اپنے گھر والوں کی پرواہ نہیں تھی تو عماد حسین شاہ کے گھر والوں کا خیال کہاں سے ہوتا بلکہ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ بس میں اور عماد ہوں گے ہماری زندگی میں کوئی تیسرا فرد نہیں ہوگا۔ میں نے اس سے کہا۔ "آپ آجائیں، میں گھر والوں سے بات کر لوں گی۔"

گھر والے پہلے ہی میرے مستقبل سے لاپرواہ ہو چکے تھے اور وہ میری شادی یوں کرتے جیسے مردہ دفناتے ہیں۔ اس لیے انہیں کوئی غرض نہیں تھی کہ میرے رشتے کے لیے کون آتا ہے۔ میں نے امی کو بتا دیا کہ صرف عماد حسین شاہ آئے گا کیونکہ اس کے گھر والے بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہیں۔ امی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ہماری بلا سے کوئی بھی آئے۔ ایمل یاد رکھنا اب اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا، سمجھ لینا تم ہمارے لیے مر چکی ہو اور جو مر جاتے وہ واپس نہیں آتا ہے۔"

"یہ آپ کی مرضی ہوگی۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "اگر آپ میری شادی پر خوش نہیں ہیں تو یہ بھی آپ کی مرضی ہے۔"

عماد حسین شاہ آیا تو اس سے صرف امی اور ابو ملے تھے۔ یہ کوئی خوشگوار ملاقات نہیں تھی کیونکہ ابو نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ رخصتی کے بعد مجھ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ عماد دو افراد اور قاضی لے کر آئے اور مجھے نکاح پڑھا کر لے جائے۔ عماد کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ شاید میں اس طرح گھر والوں پر دباؤ نہ ڈالتی تو یہ شادی ذرا طریقے سلیقے سے ہو جاتی۔ اس وقت میں پاگل ہو رہی تھی مجھے سوائے عماد کے کچھ سجائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ہر صورت اس کی ہو جانا چاہتی تھی۔ جیسی کہ اس کی خواہش تھی۔ ایک ہفتے بعد عماد حسین قاضی اور دو گواہ لایا اور مجھے گھر کے کپڑوں میں رخصت کرا کے لے گیا۔ اس نے کہا تھا کہ میں اپنے گھر سے ایک چیز بھی نہ لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ بالکل عام سے لباس میں نکاح کے بعد عماد کے ساتھ آ گئی۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ عماد لاہور کے ایک پوش علاقے میں شاندار قسم کی کوٹھی میں رہتا ہے لیکن میں نے یہ کوٹھی کبھی دیکھی نہیں تھی۔ جب میں یہاں گاڑی سے اتری تو حیران رہ گئی تھی۔ یہ دو کنال سے زیادہ بڑی کوٹھی تھی جس کا طرز تعمیر بتانے کے لیے کافی تھا کہ کسی بہت دولتمند کی رہائش ہے۔ آگے بہت بڑا اور خوب صورت لان تھا۔ پورچ میں کئی گاڑیوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ عماد کے پاس دو گاڑیاں تھیں ایک امریکن بیوک اور ایک مرسیڈیز تھی۔ کیونکہ وہ دونوں گاڑیاں استعمال کرتا تھا۔ کوٹھی میں ایک خادمہ میری منتظر تھی وہ مجھے اندر لے گئی جہاں دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ مجھے دلہن بنانے آئی تھیں۔ میرے لیے عروسی لباس، جیولری اور دوسری تمام چیزیں عماد پہلے ہی لے چکا تھا۔ پہلے میں نہائی پھر انہوں نے میرے بال تک

سنوارے۔ تین گھنٹے بعد جب میں نے آئینہ دیکھا تو خود کو پہچان نہیں سکی تھی۔ عماد نے دیکھا تو وہ پاگل ہو گیا تھا۔

آنے والے چند دن ایسے گزرے کہ مجھے دوسروں تو کیا خود اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ مجھے صرف عماد اور اس کا والہانہ پن یاد تھا۔ اپنے گھر والوں کی یوں فکر یا خیال نہیں تھا کہ انہوں نے پہلے ہی مجھ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اگر میرے اندر کوئی رہا سہا خیال تھا بھی تو وہ ان کے اس رویے نے ختم کر دیا تھا۔ چوتھے دن ہم ہنی مون منانے کے لیے گئے پندرہ دن تک حسین وادیوں میں گھومتے رہے۔ اگر کلاسز کا خیال نہ ہوتا تو شاید مہینے سے بھی اوپر وہاں رہتے۔ واپس آ کر ہم دونوں چھٹیوں کا ازالہ کرنے لگے۔ شادی کا ابتدائی خمار اتر گیا تھا اور اب ہمیں یونیورسٹی کی فکر تھی۔ میرا دوسرا سمسٹر قریب تھا۔ شروع کے کچھ دن اتنے مصروف گزرے۔ جو نوٹس رہ گئے تھے انہیں مکمل کرنے لگے۔ سمسٹر کے بعد چند دن کی چھٹی ملی تھی۔ میرا خیال تھا کہ عماد میرے ساتھ رہے گا مگر اس نے بتایا کہ وہ حویلی جا رہا ہے۔

"اور میں؟"

"تم یہاں رہو گی۔" اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔

"اکیلے؟"

"نہیں یہ تین ملازم کس لیے ہیں۔"

کوٹھی میں ایک چوکیدار، ایک مالی اور باہر کے کام کرنے والا اور ایک ملازمہ تھی۔ مالی اور ملازمہ میاں بیوی تھے۔ ان کو سرونٹ کوارٹر دیا ہوا تھا۔ چوکیدار گیٹ کے ساتھ چھوٹی سی کوٹھری میں رہتا تھا۔ ملازمہ اندر کے کاموں کے ساتھ صفائی اور دوسری چیزیں دیکھتی تھی۔ ایک باورچی تھا لیکن میں نے اس کی چھٹی کر دی۔ کھانا اب میں خود بناتی تھی۔ عماد نے منع کیا تھا مگر میں نے اصرار کیا تو وہ مان گیا بلکہ اسے میرے ہاتھ کا ذائقہ پسند آیا تھا۔ میں بس اس کے اور اپنے لیے کھانا بناتی تھی۔ چوکیدار کے لیے کھانا ملازمہ ہی نکالتی تھی۔ ویسے بھی ہم اکثر باہر کھاتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ تینوں وقت کا کھانا ہم گھر میں کھاتے ہوں۔ اتوار کو چھٹی کے دن بھی لازمی کہیں نہ کہیں جاتے تھے۔ یہاں عماد کے کچھ دوست اور جاننے والے تھے۔ جب اس نے ولیمہ کیا تو ان ہی دوستوں اور ان کی فیملیز کو بلایا تھا۔ کبھی ہم ان کے ہاں جاتے تھے اور کبھی وہ ہمارے ہاں آتے تھے۔ عماد

جدید شادی

جدید دور کی شادی جدید رسمیں تھیں
فریق دونوں ظفر یوں خوشی میں پھول گئے
دلہن بھی ہو گئی گھر سے ہنسی خوشی رخصت
خیال بعد میں آیا نکاح بھول گئے

شاعر: ظفر کمالی

محلے کی سیاست

ظفر کامیابی قدم چوم لے گی
جو تھی دور پہلے وہ پاس آ گئی ہے
لگے چونا جلدی نہ کیوں روز ان کو
سیاست محلے کی راس آ گئی ہے

شاعر: ظفر کمالی

چلا گیا اور میں اکیلی رہ گئی تھی۔

تب مجھے پہلی بار سوچنے کا موقع ملا۔ جب تک عماد تھا مجھے اس کے سوا کچھ سوجتا ہی نہیں تھا اب وہ نہیں تھا تو مجھے خیال آیا کہ میں اس کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ کون تھے بہن بھائی کتنے تھے اور وہ کیا کرتے تھے۔ میری معلومات صفر تھی۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ اس کا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک بڑے جاگیردار گھرانے سے تھا۔ یہ اتنے دولت مند تھے کہ عماد کچھ نہیں کرتا تھا اس کے باوجود نوابوں جیسی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کا ہاتھ اتنا کھلا ہوا تھا کہ بعض اوقات میں اسے روکتی تھی کہ اتنا خرچ نہ کرے۔ مگر وہ لاپرواہی سے کہتا۔ "کیوں خرچ نہ کروں، مجھے کوئی کمی تو نہیں ہے۔"

میں جتنا چاہتی خرچ کرتی تھی۔ میرے پرس میں ہزاروں کی رقم بھری رہتی تھی اور اس سے پہلے وہ خرچ ہوتی عماد مزید رقم اس میں ڈال دیتا تھا۔ شادی کے بعد ایک بار بھی ایسا موقع نہیں آیا جب مجھے اس سے جیب خرچ کے لیے کہنا پڑا ہو۔ عروسی لباس کے ساتھ بہت بھاری اور قیمتی پتھروں سے جڑا ہوا سیٹ دیا تھا۔ ایک کلائی کے لیے چوڑیاں تھیں اور دوسری کے لیے سونے کے کڑے تھے۔ پھر اس نے منہ دکھائی میں مٹر کے دانے کے برابر یاقوت جڑی انگوٹھی دی تھی۔ جب ہم ہنی مون سے واپس آئے تب بھی

ان نے سونے کا ایک چھوٹا سیٹ اور کئی چیزیں دلائی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سونے کی کوئی نہ کوئی چیز ہر وقت پہنے رہوں۔ کوٹھی جتنی شاہانہ تھا اس کا ساز و سامان اور آرائش بھی اتنی ہی شاہانہ تھی۔ ایک ایک چیز اعلیٰ ترین تھی۔ ہر چیز کی باقاعدہ مینٹیننس کی جاتی تھی۔ پوری کوٹھی میں اے سی لگے ہوئے تھے اور اس وقت بجلی کا اتنا مسئلہ نہیں ہوتا تھا اس کے باوجود کوٹھی میں جنریٹر نصب تھا جو لائٹ جاتے ہی خود بہ خود اسٹارٹ ہو جاتا تھا اور لائٹ آنے پر خود بند ہو جاتا تھا۔

اگر مالی لحاظ سے دیکھا جائے تو میں اس لحاظ سے بھی خوش قسمت عورت تھی۔ عماد تو تھا میرا دل پسند محبوب۔ اس سے جدائی کے یہ دن میں نے کیسے گزارے، میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اگلے سمسٹر کی تیاری کر لوں گی مگر جب کتاب کھولتی تو مجھے عماد یاد آتا اس کی باتیں اور اس کی بے تابیاں یاد آتیں۔ میں ایک لفظ نہیں پڑھ سکی تھی۔ بس اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر میں نے اس کے پس منظر کے بارے میں سوچا۔ مجھے تجسس ہوا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کا خاندان کیا تھا۔ اس کے خاندان میں کتنے لوگ تھے اور وہ میرے بارے میں جانتے تھے یا نہیں۔ میں نے جتنی بار عماد سے اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھا وہ اتنی صفائی سے ٹال گیا اور مجھے دوسری باتوں میں لگایا کہ مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

وہ یہاں سے کبھی کبھی اپنے گھر کال کرتا تھا اور اگر کال آتی تو ملازمہ ریسیو کرتی تھی۔ اس نے مجھے کال ریسیو کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ اس لیے میں فون ریسیو بھی نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس کی حویلی کے فون نمبرز بھی نہیں معلوم تھے۔ جب تجسس ہوا تو میں نے عماد کی الماری کھول کر دیکھی۔ اس میں اس کے کپڑے اور دوسرا استعمال کا سامان تھا مگر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کے گھر والوں کے بارے میں بتاتی۔ اس کی کوئی ڈائری نہیں تھی اور نہ ہی کہیں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح فون کے پاس جو ڈائری رکھی تھی اس میں عماد کے دوستوں اور جاننے والوں کے نمبر تھے مگر اس کے گھر کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس وقت ایسے فون سیٹ نہیں آتے تھے جو میموری رکھتے ہوں اور ان سے ڈائل نمبروں کا پتا چل جائے۔ یہ سادہ ڈیجیٹل سیٹ تھا۔ ایک کمرا اسٹڈی کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے وہاں تلاشی لی تو ایک دراز سے کچھ لفافے برآمد ہوئے۔ ان میں ان چیکس کی نقول تھیں جو عماد کے نام لکھے گئے تھے اور یہ اچھی خاصی مالیت کے چیک تھے جو ملتان کے ایک بنک کے تھے۔ چیک پر شہاب حسن [illegible] کے سائن تھے۔ یہ عماد کے والد کا نام تھا۔ عماد کے گھر والوں کے بارے میں میری معلومات بس اسی حد تک تھیں۔

عماد چار دن کا کہہ کر گیا تھا اور بائی روڈ گیا تھا۔ [illegible] پہلے دن سے بیتابی سے اس کی واپسی کی منتظر تھی۔ [illegible] جب پانچواں دن ہوا اور وہ واپس نہیں آیا تو مجھے ہول چڑھنے لگے تھے۔ شام تک میں نے رونا شروع کر دیا اور [illegible] اس کے ایک دوست صبیح الدین کو کال کی۔ ”صبیح بھائی [illegible] کل آنے کا کہہ کر گئے تھے مگر اب تک نہیں آئے ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔

”آرام سے بھابھی آرام سے.... یہ کوئی خاص بات نہیں ہے وہ کسی وجہ سے رک گیا ہوگا۔“

”میرے پاس کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے، پلیز [illegible] بھائی آپ معلوم کر کے مجھے بتائیں ورنہ کل تک تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“

”اوکے میں ٹرائی کرتا ہوں۔“ صبیح الدین نے کہا اور آدھے گھنٹے بعد اس نے مجھے کال کر کے بتایا کہ عماد خیر یت سے ہے اور وہ مزید دو دن بعد آئے گا۔ اب مجھے غصہ آنے لگا۔ اس شخص کو احساس ہی نہیں تھا۔ اگر اسے کسی وجہ سے دیر ہو رہی تھی تو ایک کال کر کے بتا نہیں سکتا تھا۔ آنے والے دو دن تک یہ غصہ بڑھتا رہا تھا اور جب عماد آیا اور کمرے میں آیا تو میں پھٹ پڑی تھی۔ اسے بے حس اور خود غرض قرار دیا۔ جسے میری کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا جب میں بول بول کر تھک گئی تو اس نے آرام سے کہا۔

”بس یہی بات تھی؟“

”عماد۔“ میں چلا اٹھی تھی۔

”چلاؤ مت۔“ اس کا لہجہ سخت اور بیگانہ ہو گیا۔ ”جو کہا ہے وہ کرو.... تم بیوی ہو.... بیوی بن کر رہو۔“

”میں بیوی ہونے کی حیثیت سے پوچھ رہی ہوں۔“

”حیثیت۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تم بھول رہی ہو تمہیں یہ حیثیت میں نے دی ہے ورنہ چاہتا تو تم کو ایسے ہی حاصل کر لیتا تب تم کیا کرتیں۔“

عماد کہہ کر واش روم میں چلا گیا اور میں سن رہ گئی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چند دن پہلے مجھ پر دل و جان لٹانے والا کہہ رہا تھا کہ میری جو حیثیت تھی وہ اس کی بخشی ہوئی تھی اور یہ اس کی محبت نہیں عنایت تھی جو میں اس

کی بیوی تھی۔ وہ واش روم سے آیا تو میں نے کہا۔ ”عماد آپ کا مطلب ہے کہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے سوائے اس کے جو آپ متعین کریں۔“

”اردو میں ماسٹر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ تم اپنی بات بہت اچھے طریقے سے کہہ سکتی ہو۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو اور آئندہ میں کہیں جاؤں میری غیر موجودگی میں میرے کسی دوست سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ ہماری بات باہر کہیں جائے۔“

”میں پریشان ہو گئی تھی اس....“

”تمہیں میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے میری بات کاٹی اور کمرے سے نکل گیا۔ اس دن کے بعد سے اس کا رویہ ایسا ہوا کہ میں بہت دن تک تو شک میں رہی کہ میں پہلے کوئی خواب دیکھ رہی تھی یا یہ کوئی خواب تھا۔ عماد صرف رات کے وقت میرا ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ میں اس کی ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے بیگانہ ہو جاتا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ یونیورسٹی چلا جاتا اور وہاں سے کہاں جاتا مجھے نہیں معلوم تھا۔ کبھی گھر آتا تو شام کے وقت تیار ہو کر نکل جاتا تھا۔ پھر رات گئے آتا اگر میری طلب ہوتی تو پاس آتا تھا ورنہ کروٹ لے کر سو جاتا۔ مجھے یہ بھی شبہ ہوا کہ شاید اس کا صبیح الدین کو کال کرنا برا لگا تھا اور وہ مجھے سزا دے رہا تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد مجھے یقین آ گیا تھا کہ یہی اس کا اصل روپ تھا۔ اس سے پہلے جو روپ تھا وہ صرف دکھاوا تھا۔ اسے ایک عورت کی ضرورت تھی جو اس کے گھر میں رہے۔ اس کی خدمت کرے اور اس کی ضروریات پوری کرے۔ اسے میری صورت میں وہ عورت مل گئی تھی یہ اس کی مہربانی نہیں چالاکی تھی کہ اس نے مجھے نہ صرف شادی کے بندھن میں جکڑ لیا تھا بلکہ میری واپسی کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے میرے گھر والوں سے کٹوا دیا تھا۔

جیسے جیسے میں سوچ رہی تھی میری آنکھیں کھل رہی تھیں اور میں اپنی عقل پر ماتم کر رہی تھی۔ ایک شخص کی محبت میں دیوانی ہو کر میں نے سامنے نظر آنے والی حقیقتوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ میری آنکھ خود نہیں کھلی تھی۔ اگر عماد اپنی اصلیت خود نہ دکھاتا تو شاید اب بھی میری آنکھیں بند ہی رہتیں۔ پتا نہیں اس نے اچھا کیا تھا یا برا کہ اتنی جلدی مجھے اصلیت دکھا دی۔ کچھ عرصے تو مجھے دھوکے میں رکھتا۔ اس کی حقیقت رفتہ رفتہ خود مجھ پر کھلتی تو شاید مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اس وقت محسوس ہوئی تھی۔ میں بیمار پڑ گئی تھی۔ اس نے میرا خیال رکھا تھا۔ باقاعدہ سے ڈاکٹر آ کر چیک کرتا تھا اور ملازمہ کی ذمے داری لگا دی تھی کہ وہ مجھے باقاعدگی سے دوا دے۔ میری خوراک کا خیال رکھے۔ البتہ عماد کا رویہ وہی تھا۔ میں دو ہفتے تک یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ بیماری سے اٹھی تو کمزوری نے جکڑ لیا تھا۔

اس روز یونیورسٹی گئی تو عماد مجھے اتار کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے سب مختلف اور الگ سا لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ میری آنکھوں پر بندھی عماد کے سحر کی پٹی اتر گئی تھی۔ جس کے پیچھے مجھے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میں ان دوستوں سے ملی جن کو نظر انداز کر رہی تھی۔ شاید ان کو بھی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اتفاق سے ہمیں مل بیٹھنے کا موقع ملا اور مہرین نے پوچھا۔ ”ایمل تجھے کیا ہوا ہے اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہے؟“

”میاں جی سونے کہاں دیتے ہوں گے۔“ بشریٰ نے شرارت سے کہا۔ ”اس کا خود بھی سونے کو دل کہاں کرتا ہوگا تو کمزور تو ہوگی رات بھر جاگ کر۔“

وہ سب ہنسی مذاق کرنے لگیں لیکن جب میری آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوئے تو وہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ مہرین نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”ایمل کیا ہوا یار کیوں رو رہی ہے ہماری کوئی بات بری لگ گئی ہے کیا؟“

”نہیں تم لوگوں کی کوئی بات بری نہیں لگی۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”اپنے نصیب پر رو رہی تھی۔“

میرے جملے پر وہ سراپا سوال بن گئی تھیں۔ وہ سب بیک وقت بولنے لگیں۔ ”کیوں کیا ہوا؟“

”ہم تو تجھ پر رشک کر رہے ہیں۔“

”خوابوں کا شہزادہ مل گیا۔“

”ایمل تم خوش ہو نا اس شادی سے؟“

”بس چند دن کی خوشی تھی۔“ میں نے آنسو صاف کیے۔ ”اس کے بعد سب بدل گیا۔“

میں نے ان کو بتایا کہ عماد کس طرح بدلا ہے۔ بلکہ بدلا نہیں ہے اس نے اپنے اوپر جو نقاب چڑھا رکھی تھی وہ اتر گئی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھایا ہے۔ وہ دم بہ خود سن رہی تھیں۔ پھر مہرین نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس شخص کو تو نے سب کو چھوڑ کر پایا وہ ایسا نکلے گا؟“

"سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے جس کے لیے سب کو چھوڑا وہ میرا نہیں ہے۔"

"وہ تمہارا شوہر ہے۔" حرا نے یاد دلایا۔

"صرف شوہر ہے۔" میں تلخ ہو گئی۔ "اس سے اچھا شوہر میرے گھر والے میرے لیے تلاش کر سکتے تھے۔ میں نے عماد سے شادی کی تھی۔ مجھے صرف شوہر نہیں چاہیے۔"

"اب جو ہے تجھے اسی پر گزارا کرنا ہے۔" مہرین نے مجھے آئینہ دکھایا۔ "واپسی کا دروازہ تو خود بند کر چکی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

اس ملاقات کے دوران میں نے محسوس کیا کہ مہرین کچھ کہنا چاہتی ہے مگر دوسروں کی موجودگی میں جھجک رہی ہے۔ جب ہم اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہے تھے تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے کہا۔ "ایمل تو اتنے دن یونیورسٹی نہیں آئی اس لیے تجھے پتا نہیں ہے شاید۔"

"کیا پتا نہیں ہے؟"

وہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ "آج کل عماد آئی آر کی ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے، دونوں اکثر ساتھ نظر آتے ہیں اور وہ اس کے ساتھ یونیورسٹی آتی جاتی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"بس آج تم عماد کے ساتھ آئی ہو ورنہ وہی آ رہی تھی۔"

میں کلاس سے فارغ ہو کر عماد کے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے آئی اور پھر میں نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ عماد ایک خوب صورت اور ماڈرن لڑکی کے ساتھ باہر آ رہا تھا۔ لڑکی نے چست جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ حالانکہ اس وقت ایسے لباس کا رواج نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک عقبی لان کی طرف چلے گئے۔ میں پتھرائی آنکھوں سے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دوپہر میں جب ہم واپس جا رہے تھے تو میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "وہ لڑکی کون تھی جس کے ساتھ آپ ڈیپارٹمنٹ سے آ رہے تھے؟"

"تم نتاشا کی بات کر رہی ہو۔" عماد نے مخصوص اعتماد اور لاپروائی سے کہا۔ "وہ آئی آر میں پڑھتی ہے۔"

"تب انگلش کے ڈیپارٹمنٹ تک کیسے چلی آئی؟" میں نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

"کیونکہ مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔" عماد نے یوں کہا کہ میرے پاس پوچھنے کے لیے مزید کوئی سوال نہیں رہا۔ بیوی ہونے کا حوالہ یوں نہیں دے سکتی تھی کہ اس نے پہلے ہی جتا دیا کہ یہ شادی اس کا احسان تھا۔

"اچھی تو میں بھی لگی تھی۔ تو کیا اس سے شادی کا ارادہ ہے؟"

"ابھی سوچا نہیں ہے لیکن ارادہ ہو بھی سکتا ہے۔" عماد نے میری طرف دیکھا۔ "آخر تم سے بھی تو شادی کی ہے۔"

"جو آپ کا احسان ہے۔"

"میں نے کہا نا اس شادی کو تم جو چاہے سمجھو۔"

اس وقت مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے پھر مجھ سے شادی کا حوالہ کیوں دیا ہے۔ اس کی بات کا کیا مطلب تھا کہ اس نے مجھ سے بھی تو شادی کی ہے۔ سچی بات ہے کہ مجھے یہ جان کر اتنا دھچکا نہیں لگا تھا کہ عماد کسی اور لڑکی میں دل چسپی لے رہا ہے کیونکہ وہ اس سے بڑا دھچکا مجھے پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس کی مجھ سے محبت اور دل چسپی صرف ایک دھوکا تھی۔ البتہ یہ تھا کہ ذاتی رویے کے علاوہ اس میں اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گھر کے معاملات میرے سپرد تھے اور وہ پہلے کی طرح مجھے کھلا خرچ دیتا تھا۔ بلکہ اب اس نے یہ کیا کہ میرا اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا اور اس میں ایک ساتھ ہی ایک لاکھ روپے جمع کرا دیے تھے۔ جو اس وقت اچھی خاصی رقم تھی۔ مگر مجھ سے بیگانہ ہو گیا تھا، اپنی مرضی ہوتی تو پاس آتا تھا ورنہ نہیں۔ میرا خیال تھا کہ نتاشا سے اس کا افیئر چلے گا۔ مگر چند ہفتے بعد مجھے یونیورسٹی میں اطلاع مل گئی کہ اس نے نتاشا سے ملنا چھوڑ دیا ہے اور وہ اس کے خلاف باتیں کرتی پھر رہی ہے۔ میں نے عماد سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

"وہ بس ایسے ہی تھی صورت ہی صورت اندر سے خالی تھی۔ مجھے ایسی لڑکیاں زیادہ دیر اچھی نہیں لگتی ہیں۔"

"اچھا تو اور لڑکیاں بھی ہیں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تم کیا سمجھتی تم اکیلی ہو، تم سے پہلے بھی کئی تھیں اور تمہارے بعد بھی کئی ہوں گی۔"

میں اس کی فطرت سمجھ گئی تھی وہ کسی ایک پر گزارا کرنے والا شخص نہیں تھا۔ میں اسے روک نہیں سکتی تھی اور روکتی بھی کس کے سہارے، اپنے سارے سہارے میں خود ترک کر چکی تھی۔ اب میرے پاس سوائے خاموشی سے صبر

کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ عماد وہی کرتا جو اس کا دل کرتا۔ جیسا کہ اس نے میرے معاملے میں کیا تھا۔ میں تیسرے سمسٹر کی تیاری کر رہی تھی کہ میری طبیعت خراب ہوئی۔ میں سمجھی شاید جیسے پہلے خراب ہوئی تھی اسی طرح اب بھی خراب ہوئی تھی۔ مگر ڈاکٹر نے آ کر دیکھا تو اسے معاملہ کچھ اور لگا اور اس نے عماد سے کہا کہ مجھے کسی گائنی کو دکھایا جائے۔ عماد ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس نے ظاہر کیا کہ میں امید سے ہوں۔ اس نے ٹیسٹ لیا اور اگلے دن تصدیق ہو گئی کہ میں امید سے ہوں۔ یہ خبر سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ مجھے بچوں کی خواہش نہیں تھی بلکہ موجودہ صورت حال میں بچے نہیں چاہتی تھی۔ پر یہ خدا کی دین تھی۔

عماد بھی خوش تھا اس نے مجھ سے کہا کہ میں یونیورسٹی سے چھٹی لے لوں۔ تیسرا سمسٹر دے کر آخری سمسٹر بعد میں دے لوں مگر میں نے فیصلہ کیا کہ میں آخری سمسٹر بھی دے لوں گی۔ اس میں سات مہینے رہ گئے تھے۔ اگر میری طبیعت نے اجازت دی تو میں پیپرز دوں گی ورنہ نہیں۔ اس لیے میں یونیورسٹی جاتی رہی۔ تیسرے سمسٹر تک تو معاملہ سیٹ رہا تھا۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ میری دوستوں کو بھی علم نہیں تھا حالانکہ وہ کئی بار پوچھ چکی تھیں کہ کیا ہمارا اولاد کا ارادہ نہیں ہے۔ تب میں نے ان کو یہی جواب دیا تھا کہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ پانچویں مہینے میں میرا جسم بھاری ہونے لگا تھا۔ اس سے وہ لوگ کھٹک گئیں تب میں نے بتا دیا کہ میں امید سے ہوں۔ وہ خوش ہو گئی تھیں۔ میرا خیال رکھنے لگی تھیں۔ یہاں قسمت نے میرا ساتھ دیا اور مجھے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا کہ میں فائنل نہ دے پاتی۔ فائنل کے دو مہینے بعد سنبل کی پیدائش ہوئی تھی اور تب پہلی بار اس حوالے سے عماد کا موڈ خراب ہوا کیونکہ اس کی خواہش لڑکے کی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"ہمارے ہاں ہمیشہ پہلے لڑکا ہوتا ہے۔"

"آپ کے ہاں کوئی سسٹم ہوگا کہ پہلے لڑکا ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے علم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔"

"غالباً یہ بھی بکواس ہے کہ اولاد مرد کی تقدیر سے ہوتی ہے۔ تب ہی مرد کی کہلاتی ہے۔"

"تم کیا سمجھتی ہو اگر تم بیٹی پیدا کرو گی تو مجھے بیٹا نہیں ملے گا۔"

"آپ کی تقدیر میں ہوگا تو ضرور ملے گا۔"

"وہ میری تقدیر میں ہے اور مجھے مل چکا ہے۔" عماد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میں چونک گئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب واضح ہے ایک تم ہی نہیں ہو جو مجھے اولاد دے سکتی ہو۔"

میں سن ہو گئی تھی۔ "عماد آپ نے دوسری شادی کی ہوئی ہے؟"

"ہاں لیکن تم سے۔" وہ مخصوص انداز میں بولا۔ "ایمل تم میری دوسری بیوی ہو۔ میری پہلی بیوی جو میری کزن بھی ہے حویلی میں ہے اور میرے دو بیٹوں کی ماں ہے۔"

"آپ نے مجھے یہاں بھی دھوکا دیا ہے؟" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے پاس ایک یہی تو افتخار رہ گیا تھا کہ عماد کیسا ہی سہی ہے تو میرا۔ باہر دوستیاں بھی کرتا ہے تب بھی آتا میرے پاس ہے۔ اس نے مجھ سے یہ افتخار بھی چھین لیا تھا۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور میں اس کی دوسری بیوی تھی۔ وہ مجھ سے اپنے گھر والوں کو نہیں پہلی بیوی کو چھپاتا تھا۔ مگر آج اس نے خود بتا دیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کے دو بیٹے بھی ہیں۔ اسے میرا طعنہ برا لگا کہ اولاد مرد کی قسمت سے ہوتی ہے اسی لیے وہ یہ راز کھول گیا۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تم جو چاہے سمجھو اور اب تم کو پتا چل گیا کہ میری نہیں یہ تمہاری قسمت ہے۔" اس نے ایک نظر سنبل کو دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ میرے پاس سوائے آنسو بہانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسپتال سے واپس آنے تک میں سوچتی رہی اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ لیکن اس سے الگ ہونے سے پہلے میں خود کو مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے رزلٹ آتے ہی میں نے ایم فل میں داخلہ لیا۔ اس میں یہ آسانی تھی کہ روز جانا نہیں پڑتا تھا اور میں سنبل کو بھی دیکھ سکتی تھی۔ دوسرے عماد مجھے جو دیتا تھا اب اسے خرچ کرنے کے بجائے میں اپنے اکاؤنٹ میں ڈال رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد میں نے اس سے مطالبہ کیا کہ یہ کوٹھی میرے نام کی جائے۔

"کیوں کیا مسئلہ ہے تم رہ تو رہی ہو؟"

"ہاں لیکن اگر تم اچانک دنیا سے رخصت ہو جاؤ تو تمہارے گھر والے مجھے اور میری بچی کو دھکے مار کر یہاں سے نکال دیں۔ ماں باپ کے گھر کا دروازہ میں ہمیشہ کے لیے بند کر کے آئی تھی تو کیا میں اور میری بیٹی سڑک پر جا کر بیٹھیں گے؟"

یہ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ میں نے بتایا کہ پیسے کے معاملے میں وہ نواب تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "یہ کوٹھی میں تمہارے نام نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے بابا کے نام پر ہے۔"

"تمہارے گھر والے میرے بارے میں جانتے ہیں۔"

"ظاہر ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ لاعلم ہوں لیکن تم میرا مسئلہ ہو ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ وہ کوٹھی میرے نام کرنا نہیں چاہ رہا ہے اس لیے جھوٹ بولا ہے لیکن ایک سال بعد اس نے اسی علاقے میں ایک نسبتاً چھوٹی کوٹھی لے کر وہ سنبل کے نام کر دی تھی اور اس کے کاغذات میرے حوالے کر دیے۔ "یہ لو اب مجھے کچھ ہوا بھی تو تم دونوں بے سہارا نہیں ہو گے۔"

یہی نہیں اس نے ایک اکاؤنٹ سنبل کے نام سے کھولا اور اس میں پانچ لاکھ روپے جمع کرائے تھے اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً اس میں رقم جمع کراتا رہتا تھا۔ جب میں اس سے الگ ہوئی تب بھی اکاؤنٹ میں رقم آتی رہی۔ ایم فل کے بعد میں نے ایک گرلز گورنمنٹ کالج میں لیکچرر کی آسامی کے لیے اپلائی کیا تھا۔ عماد نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سنبل دو سال کی ہونے والی تھی اب وہ میری فیڈ کے ساتھ اوپر کی غذا بھی لیتی تھی۔ اس کے لیے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی وہ اس مانوس تھی اس لیے میں اسے چھوڑ کر جا سکتی تھی۔ مزید دو سال بعد میری جاب پکی ہو گئی اور تنخواہ بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اب عماد سے الگ ہو کر رہ سکتی تھی اور میں نے اس سے خلع کا مطالبہ کر دیا۔ وہ شاید پہلے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ میں نے اپنا بیڈروم سنبل کی پیدائش کے بعد ہی الگ کر لیا تھا اور اس کے دروازے اس پر بند تھے۔

جب ہمارے درمیان میاں بیوی والا رشتہ ہی نہیں رہا تھا تو پھر ساتھ رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے میرا مطالبہ مان لیا اور مجھے خلع دے دی میں سنبل کے نام کی کوٹھی میں شفٹ ہو گئی۔ میرے پاس تقریباً بیس لاکھ روپے تھے جو میں نے فکس ڈیپازٹ کرا دیے۔ میری تنخواہ تھی اور پھر عماد سنبل کے اخراجات کے لیے ماہانہ رقم دیتا تھا اس سے ہمارا گزارا بہت آسانی سے ہو جاتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی لیکن نئی کار بھی لے کر دی تھی۔ مجھے ڈرائیونگ آتی تھی، کار سے بہت سہولت ہو گئی۔ جو ملازمہ سنبل کو سنبھالتی تھی میں اسے ساتھ لے آئی، کچھ عرصے بعد اس کی شادی ہوئی تو میاں بیوی دونوں کو کوٹھی کا سرونٹ کوارٹر دے دیا۔ اس کا میاں ایک ہوٹل میں لگا تھا۔ سنبل اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گئی تھی اسے ایک اچھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ صبح کالج جاتے ہوئے اسے اسکول چھوڑتی تھی اور وہاں سے ملازمہ اسے لے آتی تھی۔ پھر میں نے اپنی کلاسز کی سیٹنگ اس طرح کر لی کہ میں ایک بجے تک آف کر جاتی تھی اور تب میں خود سنبل کو اسکول سے لانے لگی۔ جب تک ملازمہ اسے لاتی رہی، مجھے اطمینان نہیں ہوا تھا۔

جب میں نے عماد سے خلع مانگی تو میرا خیال تھا کہ وہ مجھے تنگ کرے گا اور شاید مجھے عدالت سے خلع لینی پڑے لیکن اس نے آسانی سے خلع دے دی۔ پھر سنبل اور اس کے اخراجات کے حوالے سے بھی مجھے پریشان نہیں کیا بلکہ توقع سے بڑھ کر دیا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ ایک طرف تو اس نے میری حرمت کا خیال رکھا اور مجھے شادی کر کے عزت سے حاصل کیا، دوسری طرف چند دن میں مجھ سے یوں لاپروا ہو گیا جیسے میں کوئی شوپیس تھی جسے اس نے لا کر کوٹھی میں سجا دیا تھا اور اب اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ ذاتی رویے سے ہٹ کر اس نے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے گالی یا تہذیب سے گرے الفاظ نہیں سنے اور نہ ہی اس نے کبھی مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں اس سے لڑتی تب بھی وہ ایک حد میں رہ کر جواب دیتا تھا۔ مالی لحاظ سے بھی اس نے کبھی پریشان نہیں کیا مجھے ہمیشہ میری توقع سے بڑھ کر دیا۔

اسے مجھ سے محبت نہیں تھی اور نہ ہی میں اتنی حسین تھی کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہو جاتا۔ میری سمجھ میں اس شادی کی ایک ہی وجہ آتی تھی، میں نے اسے شروع میں نظر انداز کرنے کے دعوے کیے تھے۔ شاید اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی اور وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ جب تک اس نے مجھے حاصل نہیں کر لیا اسے چین نہیں آیا۔ میں اس کی محبت نہیں اس کی ضد تھی اور جب اس نے اپنی ضد پوری کر لی تو میری کوئی حیثیت

نہیں رہی۔ اس نے مجھے ایک طرف ڈال دیا۔ اسی لیے جب میں نے اس سے خلع مانگی تو اس نے بنا کسی شرط یا مزاحمت کے مجھے خلع دے دی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے مجھ سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ خلع کے شروع دنوں میں میں بہت ڈسٹرب رہی تھی۔ سوچیں میرے ذہن پر رہ رہ کر حملہ کرتی تھیں اور ڈپریشن کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آتی تھی اس لیے میں نیند کی دوا لینے لگی تھی پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس لیے میں نے خود پر قابو پایا اور بالآخر سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ چند مہینے میں زندگی سیٹ ہو گئی اور میں سکون سے اپنے معمولات نمٹاتی تھی۔

سنبل چار سال سے اوپر کی تھی جب میں نے عماد سے خلع لی۔ وہ باپ کے قریب نہیں تھی لیکن اس سے مانوس ضرور تھی اس لیے جب ہم الگ ہوئے تو وہ کئی دن بے چین رہی تھی اور بار بار مجھ سے پوچھتی رہی تھی کہ ہم واپس اپنے گھر کب جائیں گے۔ میں ہمیشہ اسے یہی جواب دیتی کہ اب یہی ہمارا گھر ہے۔ پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ اب ہمیں یہیں رہنا ہے تو اسے میری طرح قرار آ گیا تھا۔ اسکول میں داخل کرایا تو اسے نئی مصروفیت ملی اور وہ عماد کو تقریباً بھول گئی تھی۔ پہلے میں دکھی ہوتی تھی، گھر کے ماحول کی وجہ سے بہت کم ہنستی مسکراتی تھی۔ اب وہ ماحول نہیں رہا تو میں سنبل کے ساتھ کھیلنے اور ہنسنے بولنے لگی تھی وہ اس پر بھی بہت خوش تھی۔ کچھ عرصے میں آس پاس رہنے والوں سے ہمارا ملنا جلنا ہوا تو سنبل کی کئی سہیلیاں بن گئیں اور اب وہ شام کو ان کے ساتھ کھیلتی تھی۔

میں نے اسے عصر سے مغرب کے درمیان باہر جانے اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد اسے پہلے ایک خاتون قرآن شریف پڑھانے آتی تھی پھر ایک لڑکی ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ شام کے بعد وہ میرے ساتھ ہوتی۔ میں شام کو کھانا بناتی تھی۔ صبح کا ناشتہ ریڈی میڈ ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا ملازمہ بناتی تھی۔ یہ بھی سادہ ہوتا تھا البتہ شام کو اور کچھ خاص بنانا ہوتا تو میں خود بناتی تھی۔ کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھتے۔ میں اگلے دن لیکچرز کی تیاری کرتی اور وہ اسکول کا ہوم ورک کرتی۔ دس بجے تک ہم سونے کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ اس وقت تک کیبل ٹی وی آ گیا تھا مگر میں نے نہیں لگوایا کیونکہ اس میں سارے ہی انڈین اور انگلش چینل آتے تھے

اور وہ بچوں کے لحاظ سے بالکل مناسب نہیں تھے۔ اینٹینا سے پی ٹی وی اور ایس ٹی این دیکھ لیتے تھے۔ یا پی ٹی وی کے کچھ چینل جو اینٹینا سے آتے تھے۔

لاشعوری طور پر میں سنبل کی وہ پرورش کر رہی تھی جو مجھے ملی تھی اور اندر سے میری خواہش تھی کہ وہ میرے نقش قدم پر نہ چلے۔ اس لیے میں نے گھر کا ماحول بھی ایسا رکھا تھا۔ لیکن میں بھول گئی تھی کہ سوسائٹی کی اپنی تربیت ہوتی ہے۔ آپ جہاں رہتے ہیں اگر وہاں لوگوں سے گھلتے ملتے ہیں تو آپ خود بہ خود ان کے معیار اپناتے جاتے ہیں۔ بڑوں کے مقابلے میں بچے کہیں زیادہ اثر قبول کرتے ہیں۔ ایسا ہی سنبل بھی کر رہی تھی۔ وہ جس اسکول میں پڑھتی تھی وہاں سارے بچے ہائی سوسائٹی کے آتے تھے۔ وہ ان میں گھلتی ملتی اور کھیلتی تھی ان کی باتیں سنتی اور انہیں ذہن نشین کرتی تھی۔ اسی طرح اسے کوٹھی کے آس پاس بھی ہائی سوسائٹی کا ماحول ملا ہوا تھا تو میری تربیت کے ساتھ ساتھ اس نے یہ سب سیکھا۔ شعوری طور پر وہ وہی کرتی تھی جو میں نے اسے سکھایا تھا لیکن لاشعوری طور پر وہ سوسائٹی کی تربیت پر عمل کرتی تھی۔ جب وہ ساتویں کلاس میں تھی تو اس نے پہلی بار ایک لڑکے کو دوست بنایا اور باقاعدہ مجھ سے ملوایا۔

"ماما... یہ میرا دوست اظہر ہے۔"

اظہر تقریباً سنبل کا ہم عمر اور چھوٹا نظر آنے والا دبلا پتلا سا لڑکا تھا اس لیے مجھے اس دوستی میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی لیکن میں نے بعد میں سنبل کو سمجھایا کہ وہ اب بڑی ہو رہی ہے اور اسے لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کو ہی دوست بنانا چاہیے۔ اس نے فرماں برداری سے کہا۔ "ٹھیک ہے ماما اب میں کسی لڑکے کو دوست نہیں بناؤں گی لیکن اظہر تو میرا دوست بن گیا ہے نا۔"

"اظہر اچھا لڑکا ہے مگر آپ اس سے بھی ایک فاصلہ رکھو...."

سنبل جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن ابھی میں اسے بہت سی باتیں کھل کر سمجھا نہیں سکتی تھی۔ قد کاٹھ اور حسن و دلکشی میں وہ باپ پر گئی تھی۔ ابھی سے بہت ہی پیارے نقوش تھے۔ جسم بھرا بھرا تھا اور وہ جو لباس پہنتی اس پر بہت اچھا لگتا تھا۔ میں روز اس کی نظر اتارتی تھی۔ وہ میرے کہنے پر دوپٹہ لینے لگی تھی اگرچہ انداز لاپروایانہ ہوتا تھا مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ دوپٹہ لے رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ وہ مزاج میں بھی باپ پر گئی ہے۔ اس میں ایک طرح کا اعتماد اور خود پسندی تھی۔ اپنے معاملے میں وہ ذاتی رائے کو اہمیت دیتی تھی۔ اگر میری بات اس کی رائے کے خلاف ہوتی تو وہ بہ مشکل ہی اسے مانتی تھی مگر ساتھ ہی وہ مجھ سے بحث تکرار سے گریز کرتی تھی بالکل اپنے باپ کی طرح اور بعد میں بھی اپنی من مانی کر جاتی تھی۔ جیسے جیسے وہ جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی اس میں یہ اعتماد اور خود پسندی بھی بڑھ رہی تھی۔

میری ترقی ہو گئی تھی اور اب میں سینئر ٹیچر ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ میں بھی شامل تھی اور کالج رجسٹرار بھی تھی۔ اس لیے دوپہر ایک بجے چھٹی والی رعایت ختم کر دی گئی تھی۔ اب میں تین بجے باقی اسٹاف کے ساتھ ہی آف کرتی تھی اس لیے سنبل کے لیے اسکول کی وین لگوا دی اور وہ وین میں آنے جانے لگی تھی۔ اس کے بڑے ہونے کے بعد مجھے اس کی اتنی فکر نہیں رہی تھی۔ اسکول وین اسے کوٹھی کے دروازے سے لیتی تھی اور واپسی میں دروازے پر اتارتی تھی۔ ملازمہ گھر میں موجود ہوتی تھی۔ جب میں کالج سے آتی تو وہ اپنے معمولات میں لگی ہوتی اور جب شام کو فارغ ہوتی تو ہم ماں بیٹی ساتھ وقت گزارتے تھے۔

عماد علیحدگی کے چند مہینے بعد ہی واپس چلا گیا۔ اس کا ماسٹر مکمل ہو گیا تھا اور اس کے بعد وہ سال میں ایک بار آتا جب سنبل کی سالگرہ ہوتی وہ اس سے ملتا اور اس کے لیے تحفے تحائف لاتا تھا اسے باہر لے جا کر شاپنگ کراتا اور سنبل دو تین دن اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے خوشی ہوتی تھی کہ سال میں ایک بار سہی اسے باپ کا پیار اور توجہ تو ملتی تھی۔ میں نے سنبل کو کبھی نہیں بتایا کہ اس کے باپ نے اسے مسترد کر دیا تھا اسی طرح جب وہ بڑی ہوئی تو عماد نے بھی اپنے رویے سے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ اسے بیٹی پسند نہیں ہے۔ وہ اس سے بہت زیادہ محبت تو نہیں کرتا تھا لیکن اسے توجہ دیتا اور اس کی فرمائشیں پوری کرتا تھا۔ اب وہ آتا تو میں اس کے انداز میں بیٹی کے لیے محبت محسوس کرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی واحد بیٹی تھی۔ پہلی بیوی سے اس کے مزید دو بیٹے ہوئے تھے مگر کوئی بیٹی نہیں تھی۔ شاید اسی وجہ سے اب وہ سنبل کی طرف زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ وہ سنبل کے اکاؤنٹ میں جو رقم جمع کراتا تھا میں اسے بہت ضرورت کے وقت ہی چھیڑتی تھی اس لیے وہ رقم مسلسل بڑھتی رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ یہ رقم اس کی اعلیٰ تعلیم اور پھر شادی پر خرچ ہو۔ گزارے کے لیے میری تنخواہ اور فکس ڈیپازٹ سے آنے والی آمدنی کافی تھی۔ میں نے

آمدنی اور اخراجات میں ایک توازن رکھا تھا جس سے مجھے آسانی ہوئی تھی۔

سنبل جس اسکول میں تھی وہ اے لیول تک تھا۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے خاصا قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ اب وہ نوجوان لڑکی لگنے لگی تھی۔ اس لیے میں اسے سمجھانے لگی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ میری بات غور سے سنتی تھی اور مجھے یقین دلاتی کہ وہ اس پر عمل کرے گی۔ اب وہ اظہر سے ایک حد میں رہ کر ملتی تھی اور وہ بھی بس باتوں کی حد تک۔ وہ نہ تو اس کے ساتھ کھیلتی تھی اور نہ اس کے گھر جاتی تھی۔ اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ سنبل میری بات سمجھ رہی ہے اور اس کے مطابق عمل کر رہی ہے۔ سولہ سال میں اس نے اے لیول کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور اسی لیے اسے اس نجی یونیورسٹی میں آسانی سے داخلہ مل گیا جہاں داخلہ آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ یہاں صرف مارکس ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ یہاں داخلے کے لیے مالی طور پر مضبوط ہونا بھی ضروری تھا اور سنبل کے لیے مخصوص اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ وہ آرام سے ماسٹر تک پڑھ سکتی تھی۔ اس نے ہیومن ریسورس میں بی بی اے آنرز کا انتخاب کیا تھا۔

مگر جب سنبل نے اکبر کو مجھ سے ملوایا اور اس میں اپنی والہانہ دلچسپی کو بھی نہیں چھپایا تو میں پریشان ہو گئی تھی۔ اتفاق سے اکبر کا تعلق بھی جنوبی پنجاب کے ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ وہ بھی تعلیم کے لیے لاہور آیا تھا اور سنبل کے شعبے میں تھا۔ ظاہر ہے وہ پہلے سے پڑھ رہا تھا لیکن اس کے اور سنبل کے درمیان راہ و ربط حال میں ہی پروان چڑھا تھا۔ سنبل کو میری طرح فائن آرٹس سے دلچسپی تھی اور اس نے یونیورسٹی میں ایک ڈرامے میں کوئی کردار ادا کیا تھا۔ اکبر بھی اس ڈرامے میں شامل تھا اور دونوں میں وہیں سے میل ملاقات بڑھی تھی۔ جب سنبل معاملہ میرے علم میں لائی وہ دونوں محبت کے تمام مراحل طے کر چکے تھے اور ایک دوسرے کا ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کس حد تک ایک دوسرے کے پاس آ چکے تھے۔ اس لیے جب سنبل نے مجھ سے کھل کر بات کی اور اس نے اقرار کیا کہ اکبر سے محبت کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تب میں نے ڈھکے چھپے انداز میں پوچھ لیا کہ اس محبت میں وہ ان حدوں کو پار تو نہیں کر گئی جن کے بارے میں میں اسے شروع سے سمجھاتی آئی تھی۔ سنبل شرم سے سرخ ہو گئی تھی اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"مام کیسی باتیں کر رہی ہیں ہم کبھی اکیلے میں نہیں ملے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یہ تم نے اچھا کیا سنبل ورنہ... خیر یہ بتاؤ کہ کیا وہ سنجیدہ ہے؟"

اس بار سنبل شرمائی نہیں تھی مگر اس نے زیادہ برا منایا تھا۔ "ماما وہ سنجیدہ ہے تب ہی تو بات یہاں تک پہنچی ہے۔"

"ابھی تم پڑھ رہی ہو اور آنرز مکمل ہونے میں بھی ڈھائی سال کا وقت ہے۔ اس کے بعد ہی میں تمہاری شادی کا سوچ سکتی ہوں۔"

وہ بے چین ہو گئی اور اس نے بے ساختہ کہا۔ "ماما وہ اتنا انتظار نہیں کر سکتا ہے۔"

"کیونکہ اس کی ڈگری مکمل ہونے والی ہے؟" میں نے طنز کیا۔ "اسے اپنی تعلیم کی فکر ہے تمہاری تعلیم کی فکر نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے ماما...."

"یہی بات ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم جانتی ہو میں تعلیم کو کتنی اہمیت دیتی ہوں۔ اب میرا ارادہ پی ایچ ڈی کرنے کا ہے۔"

"ماما تعلیم انسان اپنے لیے حاصل کرتا ہے۔" اس نے دبے لہجے میں کہا۔ "تو وہ کبھی بھی حاصل کر سکتا ہے آپ نے بھی تو شادی کے بعد ماسٹر مکمل کیا تھا۔"

بات مجھ پر آئی تو میں جھینپ گئی۔ سنبل نے چالاکی سے بات مجھ پر رکھ دی تھی۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ "لیکن اس سے مجھے جو دشواری پیش آئی وہ میں ہی جانتی ہوں، تم میرے پیٹ میں تھیں اور میں نے فائنل دیا تھا۔"

"ماما ضروری نہیں ہے جو آپ کے ساتھ ہوا وہی میرے ساتھ بھی ہو۔" سنبل کا لہجہ اچانک بدل گیا اور میں اس بدلے ہوئے لہجے کو خوب پہچان رہی تھی۔ کیونکہ کبھی میرا بھی لہجہ اپنے گھر والوں سے ایسا ہی بدل گیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں ان کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ ایک بار میں ہمت کر کے اپنے گھر تک گئی تو مجھے پتا چلا کہ ابو کا انتقال ہو گیا تھا اور میرے بھائی وہ گھر بیچ کر کہیں جا چکے تھے۔ بہنوں کا پتا تھا مگر میں ان کے سامنے جانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دھتکار دیں گی۔ ماں باپ نہیں رہے تھے جو اولاد کی غلطی بہرصورت معاف کر

ہی دیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہی تاریخ پھر دہرائی جائے۔ میں سنبل کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرسکتی تھی جو میرے گھر والوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اس معاملے کو اس طرح ہینڈل نہ کروں جیسے میرے گھر والوں نے کیا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا لیکن پھر بھی یہ بہت جلدی ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔"ابھی مجھے اس سے ملنے دو.... پھر تمہارے بابا بھی ملیں گے اور تم جانتی ہو اصل فیصلہ تو انہوں نے کرنا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ اسی لہجے میں بولی۔"لیکن میں آپ کو بتارہی ہوں میرا فیصلہ اکبر ہے۔"

"ایسا کرو تم اسے یہاں بلاؤ تب تک میں تمہارے بابا سے بھی بات کرلیتی ہوں۔" میں نے سوچ کر کہا۔"اب میں اس سے تمہارے نقطۂ نظر سے ملوں گی اور بات کروں گی۔ پہلے تو میں اسے تمہارا کولیگ سمجھی تھی۔"

اس کے چہرے پر امید آئی' اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔"پلیز بابا، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"میں سمجھتی ہوں میری جان، میں نے تمہارے بابا سے پسند کی شادی کی تھی اس لیے میں تمہاری کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ تم بے فکر رہو تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔"

سنبل خوش ہوگئی کہ میں مان رہی تھی۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ صاف لگ رہا تھا وہ وہی غلطی کرنے جارہی تھی جو میں نے کی تھی اور اس کا انجام وہی ہونا تھا جو میرا ہوا تھا۔ عماد کتنا برا سہی لیکن اس نے میرا استحصال یوں نہیں کیا تھا کہ میں کہیں کی نہ رہتی۔ پھر اس نے میرے اور سنبل کے لیے سب کیا۔ ہماری مالی سپورٹ کی۔ ضروری نہیں تھا کہ اکبر بھی ایسا ہی نکلتا۔ مجھے اس سے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ سنبل پر دباؤ ڈال کر شادی سے پہلے سب کچھ نہ کر گزرے۔ شاید اس صورت میں وہ پلٹ کر سنبل کو پوچھتا بھی نہیں اور وہ برباد ہو جاتی۔ اس لیے جہاں میں ایک طرف سنبل کو دلاسہ دے رہی تھی کہ اس کی خواہش پوری کروں گی' دوسری طرف اسے دبے لفظوں میں سمجھا رہی تھی کہ اپنی حرمت کا خیال رکھے۔ کسی کمزور جذباتی لمحے میں آکر اس نے اسے گنوا دیا تو پھر وہ بے وقعت ہوکر رہ جائے گی۔ وہ بھی سن لیتی اور کبھی انجان بن جاتی۔

وہ اکبر کو لے کر آئی۔ میں نے اسے ڈنر پر بلایا تھا اور اس دوران میں نے اس سے اس کے بارے میں ممکنہ حد تک معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اکبر کو بھی میں نے یہی تاثر دیا کہ وہ مجھے پسند آیا ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ سنبل کم سے کم آنرز مکمل کرلے اس کے بعد میں اس کی شادی کروں۔ اکبر نے بھی وہی جواب دیا کہ تعلیم تو شادی کے بعد بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ سنبل نے کون سے گھر کی ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ وہ پڑھ سکتی تھی۔ میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ اس شادی کے لیے اس کے بابا کی مرضی ضروری ہے۔ اس پر اکبر کے جو تاثرات آئے تھے مجھے لگا اسے یہ بات پسند نہیں آئی ہے' اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اسے کہنے کی ضرورت نہیں تھی' سنبل اس کی مٹھی میں تھی۔ دوسری چیز جو میں نے بہت واضح محسوس کی کہ وہ سنبل سے مخلص نہیں تھا۔ یہ محبت نہیں تھی اسے صرف سنبل کے حسن اور جوانی سے دل چسپی تھی۔

ایک مہینے بعد عماد نے آنا تھا کیونکہ سنبل کی اٹھارویں سالگرہ تھی۔ مگر میں اتنا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ سنبل کے پاس اس کا موبائل نمبر تھا۔ میں نے نہ تو کبھی دیکھا اور نہ کبھی مانگا تھا۔ مہینے میں ایک دو بار عماد اسے کال کر لیتا تھا یا وہ اسے کال کرلی تھی۔ میں نے چپکے سے اس کے موبائل سے عماد کا نمبر نکالا اور اگلے دن اسے کالج سے کال کی۔ خلع کے بعد یہ میرا اس سے پہلا از خود رابطہ تھا اس لیے وہ میری آواز سن کر ذرا حیران ہوا تھا۔"ایمل تم؟"

"ہاں میں.... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے؟"

"کیسی مدد کی۔" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"عماد تم چاہتے ہو کہ جو تم نے میرے ساتھ کیا وہی کوئی دوسرا تمہاری بیٹی کے ساتھ کرے؟"

اسے ایک لمحے کو چپ لگی تھی پھر اس نے کہا۔"ہوا کیا ہے کھل کر بات کرو۔"

میں نے اسے کھل کر بتایا کہ اس کی بیٹی بھی اسی راہ پر چل نکلی ہے جس پر کبھی میں چلی تھی۔ اس نے میرے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کیا تھا۔ لیکن اکبر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سنبل کو صرف مطلب براری کے لیے استعمال کرے گا اور پھر اسے ایک طرف پھینک کر بھول جائے گا۔ وہ میری طرح مضبوط بھی نہیں تھی اور سچی بات ہے جو میں نے کیا تھا میرے ساتھ اتنا برا بھی نہیں ہوا تھا' سنبل سنبھل نہیں سکے گی۔ دوسری طرف وہ میری طرح ضد پر آچکی تھی اور کوئی بات

سننے کو تیار نہیں تھی۔ عماد نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔"تم چاہتی ہو کہ میں اس سے بات کروں؟"

"وہ تمہاری نسبت میری زیادہ سنتی ہے لیکن وہ بالکل تیار نہیں ہے۔" میں نے کہا۔"میں نے اس لیے کال کی ہے تم اکبر کے حوالے سے کچھ کرو۔"

"میں کیا کروں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے اکبر جلال کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔"اس کا تعلق بھی جنوبی پنجاب سے ہے اور یقیناً اس کا خاندان بہت معروف ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو اور کوئی ایسا پوائنٹ تلاش کرو جسے سنبل کے سامنے رکھ کر میں اسے اس غلطی سے باز رکھ سکوں۔ نہ تو سنبل میری طرح ہے اور نہ اکبر تمہاری طرح۔ مجھے ڈر ہے کہ سنبل سے کوئی ایسی غلطی نہ ہوجائے جس کے بعد وہ ہم سے آنکھیں ملانے کے قابل بھی نہ رہے۔"

عماد ہل گیا تھا۔ اس نے کہا۔"تم فکر مت کرو میں سمجھ گیا۔ اب میں اسے دیکھ لوں گا۔"

میرا نہیں خیال تھا کہ عماد اسے کسی اور طرح سے بھی دیکھے گا۔ دو دن بعد سنبل گھر میں تھی۔ اچانک اس کے کمرے سے رونے اور چلانے کی آواز آئی۔ میں بھاگی تو وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔"سنبل کیا ہوا خیریت ہے نا...... کس کی کال تھی؟"

"ماما.... ماما۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔"اکبر کا ایکسی ڈینٹ ہوگیا ہے وہ اسپتال میں ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔" میں نے کہا اور میرا ذہن فوراً ہی عماد کی طرف گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اسے دیکھ لے گا۔ سنبل نے اسپتال کا بتایا تو میں اسے ساتھ لے کر روانہ ہوگئی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ خود چلی جاتی۔ اسپتال پہنچ کر پتا چلا کہ اکبر ایک مارکیٹ میں اپنی گاڑی سے اترا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی اسے ٹکر مارتی گزر گئی۔ یہ حادثہ تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور کمر بھی متاثر ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگ کا آپریشن کر دیا گیا تھا۔ وہ خطرے میں نہیں تھا مگر اسے دو ہفتے تک اسپتال میں رکنا تھا۔ اسے بے ہوش دیکھ کر سنبل خود بے ہوش ہونے لگی تھی لیکن سچی بات ہے مجھے اطمینان ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام عماد نے کرایا تھا۔ سنبل کے

بارے میں جان کر وہ بے چین ہوگیا تھا وہ اس کی بیٹی اور اس کی عزت تھی وہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی عزت سے کھیل کر چلا جائے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید اکبر زندہ نہیں ہوگا مگر اس کی حالت دیکھ کر مجھے لگا کہ فی الحال عماد نے اسے سنبل سے دور رکھنے کا بندوبست کیا تھا۔

سنبل آنے کے لیے تیار نہیں تھی، میں اسے بہ مشکل واپس لائی کیونکہ اس کے گھر والے آنے والے تھے اور سنبل کا ان کے سامنے آنا مناسب نہیں تھا۔ یہ بات سنبل بھی سمجھتی تھی کیونکہ اس کے مطابق اکبر اپنے گھر والوں سے چھپ کر اس سے شادی کرتا۔ اس کے خاندان میں باہر شادی کا رواج نہیں تھا۔ بہت مجبوری میں رشتہ کیا جاتا تو صرف ہم پلہ خاندان میں اور وہ بھی لڑکی کا رشتہ لیا جاتا تھا، اپنی بیٹیوں کو وہ گھر بٹھا کر بوڑھا کر دیتے تھے مگر ان کا کہیں رشتہ نہیں کرتے تھے۔ اسی سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کس ذہن کے لوگ ہوں گے۔ میں نے اسی رات جب سنبل سوگئی تو عماد سے رابطہ کیا اور اس سے اکبر کے بارے میں پوچھا تو اس نے اعتراف کرلیا کہ یہ اسی کا کام تھا اور اس نے اکبر کو سنبل سے دور رکھنے کے لیے کرایا تھا۔ کرنے والے پروفیشنل لوگ تھے ان سے جتنا کہا گیا تھا انہوں نے اتنا ہی کیا تھا۔

"میں مہلت چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا پوائنٹ تلاش کر سکوں جس کا تم نے کہا تھا۔"

"اب مجھے اطمینان ہے سنبل اس سے محفوظ رہے گی۔"

"تم فکر مت کرو اگر یہ ایسے نہیں مانا تو دوسرا راستہ بھی ہے۔" عماد کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔"اگر ایک حادثہ اسے زخمی کر سکتا ہے تو کسی دوسرے حادثے میں وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت بھی ہوسکتا ہے۔"

"نہیں اس کی نوبت نہ آئے تو بہتر ہے۔" میں نے گھبرا کر کہا تھا۔"سنبل کو شک ہوگیا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔"

"اسے شک نہیں ہوگا میں جن سے کام لوں گا وہ مکمل کام کرتے ہیں شک شبے کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔"

ایک ہفتے بعد اکبر اپنے بنگلے پر منتقل ہوگیا مگر وہ ابھی بیڈ پر تھا اور اس کے پاؤں کا زخم مہینے میں جا کر ٹھیک ہوتا۔ اگر وہاں اس کے رشتے دار نہ آگئے ہوتے تو سنبل وہاں جانے کے لیے تیار تھی۔ خود اکبر نے اسے روک

دیا کہ وہ نہ آئے ورنہ اس کے گھر والوں کو سنبل کے بارے میں پتا چل گیا تو ان کی شادی مشکل ہو جائے گی۔ تب سنبل مانی تھی۔ وہ بیتابی سے انتظار کر رہی تھی کہ اکبر کے گھر والے واپس جائیں تو وہ اس کے پاس پہنچ جائے اور میں اسے وہاں اکیلے میں جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھی ساتھ ہی یہ بھی جانتی تھی اسے روکا تو وہ بغاوت پر اتر آئے گی۔ میں شدت سے منتظر تھی کہ عماد کچھ معلوم کرے تاکہ میں سنبل سے اس بارے میں دوٹوک بات کر سکوں۔ اس حادثے کے تقریباً تین ہفتے بعد ایک شام سنبل نے خوشی سے جھومتے ہوئے مجھے بتایا کہ کل اکبر کے گھر والے واپس چلے جائیں گے اور وہ اس سے مل سکے گی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"ماما میں یونیورسٹی سے اس کے پاس جاؤں گی۔"

"بیٹا یہ مناسب نہیں ہے وہ وہاں اکیلا رہتا ہے۔"

"کیا مناسب ہے اور کیا نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "یہ میں نہیں جانتی۔ میں کل ضرور جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے تم گھر آنا پھر ہم دونوں چلیں گے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ اکیلے جائے گی اور مجھے اس کے انداز سے خطرے کی بو آ رہی تھی۔ میں نے عماد کو کال کی تو اس نے کہا۔

"میں تمہیں ہی کال کرنے والا تھا۔"

"عماد وہ جانے پر تلی بیٹھی ہے وہ کل جائے گی اس کے پاس۔"

"مجھے معلوم ہے کل اس کے گھر والے جا رہے ہیں۔ وہ وہاں ضرور جائے لیکن ان کے جانے سے پہلے اور اسے تم لے کر جاؤ گی۔"

"اس طرح بات بگڑ جائے گی کیونکہ سنبل نہیں مانے گی۔"

"یہ تمہارا کام ہے کہ اسے کس طرح تیار کرتی ہو لیکن تم دونوں لازمی کل صبح اس کے بنگلے پہنچ جاؤ، اسی صورت میں سنبل اس کے چنگل سے نکل سکتی ہے۔" عماد نے کہا اور پھر اس نے مجھے جو بتایا اسے سن کر میں تیار ہو گئی تھی۔ اگلی صبح جب سنبل تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئی تو میں نے اس سے کہا۔ "سنبل تم میرے ساتھ چلو گی۔"

"آج آپ مجھے ڈراپ کریں گی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ میں نے تردید نہیں کی۔ سنبل یونیورسٹی پوائنٹ سے جاتی تھی۔ ہم ساتھ روانہ ہوئے لیکن جب یونیورسٹی کے بجائے ڈیفنس کی طرف مڑے جہاں اکبر کا بنگلہ تھا تو سنبل چونکی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "ماما یہ کہاں جا رہی ہیں۔"

"ہم اکبر کے بنگلے کی طرف جا رہے ہیں۔"

"کیوں ماما... وہاں اس کے گھر والے ہوں گے اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو اکبر کے لیے مشکل ہو جائے گی۔"

"تم جانتی ہو وہاں کون ہے؟"

"اکبر کی ماما اس کی پھپھی اور اس کا بھائی ہے۔"

"نہیں اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں، میں تمہیں ان سے ملوانے لے جا رہی ہوں۔"

"ماما واپس چلیں۔"

"سنبل اگر تم محسوس کرو کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو تمہیں اختیار ہوگا مجھے جو چاہے سزا دے لو لیکن میں تمہیں وہاں ضرور لے جاؤں گی۔"

سنبل کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے جس وقت ہم وہاں پہنچے اس وقت اکبر کے گھر والے وہاں سے نکل رہے تھے۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اس سے پہلے چوکیدار روکتا میں گاڑی اندر لے گئی تھی۔ پورچ میں اکبر سمیت اس کی ماں، بھائی اور پھپھی تو تھیں لیکن ان کے علاوہ ایک خوب صورت اور کمسن لڑکی تھی جس کی گود میں چند مہینے کا بچہ بھی تھا۔ اکبر وہیل چیئر پر تھا۔ وہ میرے ساتھ سنبل کو دیکھ کر چونکا اور پھر اس کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا تھا۔ میں نے نیچے اتر کر سنبل کو نیچے آنے کو کہا۔ وہ سب تعجب سے ہمیں دیکھ رہے تھے اور سنبل اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس کی گود میں بچہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "میں تمہیں اس سے ملانے لائی ہوں، یہ ہے مسز اکبر جلال اور یہ جو تم گود میں دیکھ رہی ہو یہ اکبر جلال کا بیٹا ہے۔"

"آپ.... آپ...." اکبر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ سنبل نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا میں سمجھ گئی کہ کامیاب رہی تھی۔ وہ خاموشی سے واپس کار میں جا بیٹھی۔ میں نے فاتحانہ نظروں سے اکبر جلال کی طرف دیکھا اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے نکل آئی۔ میں نے اپنی بیٹی کو بچا لیا تھا۔

بے حس

جناب مدیر محترم

السلام علیکم

دورِ حاضر کا ایک ایسا بو دیتا ہوا زخم قارئین کے سامنے لا رہا ہوں جس کی سڑاند کو اگر نہ روکا گیا تو سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔ معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہی میں اس تحریر کو پیش کر رہا ہوں تاکہ والدین ہوشیار رہیں اور جوش و جذبات میں ظفر جیسا جرم کوئی اور نہ کر بیٹھے۔

شاہد صدیقی

(کراچی)

یہ گلی اس سوسائٹی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ پوری سوسائٹی میں یہ واحد گلی تھی جس کے سارے پلاٹ آباد تھے۔ باقی سوسائٹی میں آبادی تھی مگر بہت سے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ یہاں رہنے والے بھی کھاتے پیتے لوگ تھے۔ چھوٹے پلاٹ ہونے کے باوجود غریب غربا یہاں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ان میں سے ایک پلاٹ میں نے لے کر اس پر دو بیڈ روم کا مکان بنوا لیا تھا۔ میری شادی دس سال پہلے نادیہ سے ہوئی تھی اور اب ہمارے چار بچے ہیں۔ صبح دفتر جاتے ہوئے میں بچوں کو اسکول چھوڑ کر جاتا ہوں اور چھٹی کے وقت ظفر انہیں اسکول سے لے آتا تھا۔ ظفر کون ہے آپ کو جلد پتا چل جائے گا کیونکہ وہی اس کہانی کا مرکزی کردار

ہے۔ اسکول سوسائٹی کے ساتھ ہی مین روڈ پر ہے۔ پہلے بچے وین سے جاتے تھے لیکن جب سے اسکول وین میں آگ لگنے کے واقعات ہوئے ہیں ہم نے ڈر کر وین چھڑوا دی تھی۔

گلی میں معقول اور مناسب قسم کے لوگ رہتے تھے۔ آپس میں ملنا جلنا تھا اور دکھ درد میں ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ میرے گھر کے سامنے ظفر احمد کا گھر تھا۔ ظفر اسٹیٹ ایجنٹ تھا اور خاصا کامیاب اسٹیٹ ایجنٹ تھا۔ اس کی سوسائٹی کے ساتھ ہی ایجنسی تھی۔۔ اور وہ زیادہ تر بڑے سودے کراتا تھا۔ ایک ہی سودے میں لاکھوں کما لیتا تھا۔ اس نے بھی یہاں پلاٹ لے کر اس پر یہ خوب صورت مکان بنوایا تھا۔ شادی شدہ تھا۔ مگر دو سال پہلے اس کی بیوی اپنڈکس پھٹ جانے سے اچانک انتقال کر گئی تھی۔ ظفر کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ بیوی کی واحد نشانی ظفر کی چھ سال کی بچی سونیا تھی۔ ظفر کی اس میں جان تھی۔ وہ جوان تھا عمر پینتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ دبلے جسم اور کسی قدر چھوٹے قد کا لیکن خوش شکل آدمی تھا اگر چاہتا تو اسے دوسری بیوی مل سکتی تھی مگر سونیا کی خاطر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

ظفر احمد مرنج و مرنجاں قسم کا شخص تھا۔ بیوی کے بعد وہ اکیلا ہی سونیا کی پرورش کر رہا تھا۔ گھر کے کاموں اور سونیا کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ایک ادھیڑ عمر عورت کو ملازم رکھا تھا جو صفائی ستھرائی سے لے کر کھانا بنانے تک سارے کام کرتی تھی۔

سونیا چھ سال کی اور پہلی کلاس میں تھی۔ وہ بھی اسی اسکول میں تھی جس میں میرے بچے پڑھتے تھے۔ صبح سونیا میرے بچوں کے ساتھ جاتی تھی۔ دوپہر میں ظفر جا کر سونیا کے ساتھ میرے بچوں کو لے آتا تھا۔ وہ اپنا کام کرتا تھا اس لیے آرام سے آجاتا تھا۔ یوں ہمارے اشتراک سے بچوں کے آنے جانے کا مسئلہ حل ہوا تھا۔ کام سے ظفر کی واپسی تک سونیا ملازمہ رضیہ کے ساتھ رہتی تھی۔

یہ سردیوں کے دن تھے اور سردی بھی بہت شدید قسم کی تھی۔ اس لیے سورج ڈوبنے سے پہلے گلی میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ سردی میں، میں دفتر سے آنے کے بعد باہر نہیں جاتا تھا اور کھانے کے بعد لاؤنج میں چہل قدمی کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی میں رات کے کھانے کے بعد لاؤنج میں ٹہل رہا تھا اور ٹی وی پر۔۔۔ خبریں دیکھ رہا تھا۔ نادیہ بچوں کو سلا رہی تھی۔ ٹھیک نو بجتے ہی بچے اپنے بستروں پر چلے جاتے تھے۔ یہ نادیہ کا وضع کیا ہوا اصول تھا اور اس معاملے میں وہ آمنہ کو بھی کوئی رعایت نہیں دیتی تھی حالانکہ وہ ہمارے ساتھ ہی سوتی تھی۔ بیٹوں اور فاطمہ کا کمرا الگ تھا۔ آمنہ کو نادیہ نو بجے ساتھ لے جاتی اور سلا کر ہی آتی تھی۔ اچانک کال بیل بجی تو میں چونکا۔ اس وقت کون آسکتا ہے؟ میں نے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو مجھے ظفر دکھائی دیا اور پریشان دکھائی دیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ "کیا حال ہیں؟... خیریت تو ہے نا؟"

"شاہد بھائی سونیا غائب ہے۔" اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

میں چونکا۔ "غائب ہے؟... کب سے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں مغرب سے ذرا پہلے تھکا ہوا آیا تھا۔ اس لیے لیٹ گیا اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو سونیا گھر میں نہیں تھی۔ گلی سے باہر تک دیکھ آیا ہوں مگر کہیں نظر نہیں آئی، مجھے خیال آیا کہ وہ کہیں تمہارے ہاں...."

"سونیا یہاں نہیں آئی، ایک منٹ میں نادیہ سے پوچھ کر آتا ہوں۔" میں نے کہا اور اندر آیا۔ اس نے آمنہ کو سلا دیا تھا اس لیے جب سونیا کے غائب ہونے کا سنا تو میرے ساتھ ہی چلی آئی۔ اس نے ظفر سے کہا۔

"ظفر بھائی آج سونیا ہمارے ہاں نہیں آئی اور مغرب سے بچے بھی اندر ہی ہیں۔"

"میرا خیال ہے دوسرے گھروں میں معلوم کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور اندر سے جیکٹ پہن کر آگیا۔ اس دوران میں ظفر دوسرے گھروں کے دروازے بجا کر گھر والوں سے سونیا کے بارے میں معلوم کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور کچھ ہی دیر میں سارا محلہ نکل آیا تھا۔ سونیا کہیں نہیں تھی۔ اتفاق سے گلی میں سارے ہی فیملی والے لوگ رہتے تھے۔ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی فرد نکل آیا اور طے ہونے لگا کہ بچی کی تلاش کے لیے کیا کیا جائے۔ سب سے پہلے تو مسجد میں اعلان کرانے کا فیصلہ ہوا۔ مسجد کمیٹی کے عرفان صاحب گلی میں رہتے تھے، یہ کام انہوں نے اپنے ذمے لیا اور ظفر سے سونیا کا حلیہ اور لباس پوچھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد باقی محلے والوں نے سونیا کو آس پاس تلاش کرنے کا سوچا۔ سوسائٹی کے بڑے پلاٹوں میں سے بہت سے خالی پڑے ہوئے تھے اور ان پر جھاڑیاں اگ آئی

تھیں۔

لوگ گھروں سے ٹارچیں اور ایمرجنسی لائٹس لے آئے اور ان کی مدد سے جھاڑیوں کے درمیان سونیا کو تلاش کرنے لگے۔ میں ظفر کے ساتھ تھا۔ وہ رہ رہ کر سونیا کو پکار رہا تھا۔ اس کی آواز بعض اوقات بھرا جاتی تھی اور قدم لڑکھڑانے لگتے تھے۔ سونیا اس کی اکلوتی اولاد ہی نہیں اس کی کل کائنات بھی تھی۔ ہم ایک امید کے ساتھ نکلے تھے۔ سوسائٹی بہت بڑی نہیں تھی، اس میں مشکل سے دس بارہ گلیاں اور دو قطاریں تھیں۔ ہم پھیل کر تلاش کر رہے تھے۔ جو فرد مل رہا اس سے پوچھ رہے تھے۔ مگر نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ حد یہ کہ لوگ سوسائٹی کے مین گیٹ تک پہنچ گئے اور وہاں موجود گارڈز سے بھی پوچھ لیا۔ انہوں نے بتایا کہ اگر گاڑی میں بچی کو لے جایا گیا ہے تو وہ کہہ نہیں سکتے۔ ہاں کوئی پیدل فرد آج کسی بچی کو ساتھ لے کر نہیں نکلا ہے۔

"شاہد بھائی۔" ظفر نے مجھ سے کہا۔ "اگر اللہ نہ کرے میری سونیا نہ ملی تو مجھے آپ کی مدد چاہیے ہوگی۔"

"ظفر یار کیوں مایوسی کی بات کرتے ہو، سونیا مل جائے گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ایسا تو نہیں ہے کہ تم سے سونیا نے کسی چیز کے لیے کہا ہو اور تم نے منع کیا ہو وہ خود لینے چلی گئی ہو۔"

"نہیں شاہد بھائی، ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ کہے اور میں انکار کر دوں۔" ظفر نے جواب دیا۔ "لیکن ہوسکتا ہے وہ مجھے سوتا پا کر خود چلی گئی ہو۔"

سوسائٹی کی چار دیواری کے باہر جن لوگوں کے پلاٹس مین روڈ پر کھل رہے تھے ان میں سے بعض نے ان میں دکانیں بھی بنائی تھیں۔ ہم باہر آئے اور دکانوں سے پوچھنے لگے۔ اگرچہ اس کا امکان کم ہی تھا کہ ایک چھ سال کی بچی یہاں آئے مگر وہ آبھی سکتی تھی۔ سڑک پر جہاں تک دکانیں کھلی تھیں ہم نے سونیا کا معلوم کیا اور پھر ناکام لوٹ آئے۔ سوسائٹی میں تلاش کرنے والے بھی ناکام رہے تھے۔ مسجد میں اعلان ہوا۔ اس پر بھی کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس میں ظفر کا موبائل نمبر بھی دیا گیا تھا کہ اگر کوئی سامنے آئے بغیر کچھ بتانا چاہتا ہے تو وہ کال کرکے بتا دے۔ بارہ بجے میں اور گلی کے ایک صاحب رضا بھائی ظفر کو لے کر مقامی تھانے گئے۔ پہلے تو تھانے کے افراد نے کوئی توجہ نہیں دی تھی مگر جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مستعد ہو گئے۔ فوری ایف آئی آر کاٹی گئی اور اسی وقت ایک موبائل ہمارے ساتھ کر دی گئی تھی۔

پولیس والے صبح تک تفتیش کرتے رہے۔ سوسائٹی کے گارڈز سے خاص طور سے پوچھ گچھ کی گئی کیونکہ دو گارڈز گیٹ پر ہوتے تھے تو دو سوسائٹی کی گلیوں میں گشت کرتے تھے۔ پولیس کا اپنا انداز ہوتا ہے اور سامنے والے کو مشکوک سمجھ کر پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ پولیس کو ایک گارڈ مشکوک لگا تھا اور وہ اسے ساتھ لے گئے۔ گلی کے لوگوں سے بھی پوچھا تھا مگر ان میں سے کوئی مشکوک نہیں تھا۔ فجر کے قریب میں گھر چلا گیا تھا۔ مشکل سے دو گھنٹے سویا ہوں گا کہ باہر شور اٹھا۔ نادیہ نے مجھے اٹھایا۔ "شاہد باہر دیکھیں یہ شور کیسا ہے، اللہ خیر کرے۔"

میں باہر آیا تو گلی میں سب ہی نکلے ہوئے تھے اور وہ گلی کے سرے کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے لپکا۔ سڑک پار بڑے پلاٹ میں جھاڑیاں تھیں اور ان کے نیچے بہت لوگ موجود تھے۔ مجھے ظفر کے چلّانے کی آواز آئی، وہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ میرا دل بیٹھ گیا ایسا لگا کوئی سانحہ ہو گیا ہے۔ میں لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا ظفر تک پہنچا تو وہ مٹی میں لت پت سونیا کی لاش سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ لوگ اسے لاش سے الگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لاش زمین میں دفن تھی کیونکہ وہاں چھوٹا سا گڑھا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ سوسائٹی میں صفائی کرنے والے اور کچرا اٹھانے والے نے اس پلاٹ سے کچرا سمیٹتے ہوئے زمین سے نکلا بچی کا ہاتھ دیکھا اور شور مچانے لگا۔ اس کے شور پر گارڈز آگئے۔ آس پاس والوں کو اطلاع ہوئی اور کسی نے ظفر کو بتایا۔ اسی نے آکر زمین سے سونیا کی لاش کھینچ کر نکالی تھی۔

لاش پر باقاعدہ مٹی بھی نہیں ڈالی گئی تھی۔ چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں اسے ٹھونس کر اوپر سے چھپانے کے لیے جتنی مٹی ڈال دی گئی تھی اور وہ آسانی سے نکل آئی۔ میں اور دوسرے لوگ ظفر کی چیخیں سن کر آبدیدہ ہو گئے تھے اور اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے سونیا کی لاش اس سے لی اور میں نے تمام افراد کو وہاں سے ہٹنے کو کہا مگر لوگ جانے کو تیار نہیں تھے۔ جب ظفر سے لاش لی تو میں نے ایک ہی نظر میں بہت سمجھ لیا تھا اور میرے اندر اندیشہ سرسرایا کہ یہ زیادتی کا کیس ہے۔ میں نے لاش کو وہیں ڈالا جہاں سے ظفر نے اٹھایا تھا اور اسے پیچھے لے

آیا۔ وہ مستقل سسک رہا تھا۔ ''میری گڑیا... میری گڑیا۔''

کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے میں پولیس آگئی اور اس کے ساتھ ہی میڈیا والے بھی آگئے۔ میں ظفر کو اپنے گھر لے آیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس سے بات کرے۔ پولیس کے آنے سے ایک اچھا کام یہ ہوا کہ غیر متعلقہ افراد جو لاش کے تقریباً پاس پہنچ گئے تھے ان کو پیچھے ہٹا دیا۔ ضروری کارروائی کے بعد سونیا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ ظفر بھی ساتھ گیا تھا۔ میں گھر آیا تو نادیہ ٹی وی پر دیکھ رہی تھی جس پر ہیڈ لائنز چل رہی تھیں جن میں مختلف خبریں دی جا رہی تھیں۔ ایک چینل بتا رہا تھا کہ بچی کو اغوا کے بعد زیادتی کا نشانہ بنا کر قتل کیا گیا اور دوسرا چینل اسے اجتماعی زیادتی کا کیس بتا رہا تھا۔ زیادتی کا پتا تو پوسٹ مارٹم سے ہی چلتا لیکن میں نے دیکھا تھا کہ سونیا کے گلے پر نشانات تھے جیسے کسی نے اس کا گلا دبایا ہو۔ شاید اسی سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ بچے جاگ گئے تھے اور سہمے ہوئے تھے۔ ان کے اسکول کا وقت نکل گیا تھا اور میرے دفتر جانے کا بھی اس لیے میں نے کال کر کے چھٹی کا کہہ دیا اور خود اسپتال روانہ ہو گیا۔ پولیس سرجن نے چند گھنٹوں میں پوسٹ مارٹم مکمل کر لیا تھا اور اس کی ابتدائی رپورٹ بھی آگئی تھی۔

رپورٹ کے مطابق سونیا کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی اور اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ موت کے وقت کو کم سے کم بارہ گھنٹے گزر چکے تھے گویا اس کے ساتھ جو ہوا تھا وہ شام چھ سے رات آٹھ بجے کے درمیان دو گھنٹے میں ہوا تھا۔ وہ گھر سے نکلی اور اس کے بعد کسی درندے کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے جھاڑیوں میں لے جا کر اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ شاید سونیا چلائی تھی تو اس نے گھبرا کر اس کا گلا دبا دیا اور جب وہ مر گئی تو اسے چھپانے کے لیے اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ قاتل کا تعلق یقیناً اسی سوسائٹی سے ہے۔ باہر سے آکر ایسا کام کرنا ممکن نہیں تھا۔

ظفر نے خود پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ اس کی دھاڑیں رک گئی تھیں لیکن آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ میں اور محلے کے کچھ اور لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اسپتال کی طرف سے لاش شام کے وقت ریلیز کی گئی تھی۔ ظفر اسے مردہ خانے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ پھر موسم بھی بہت سرد تھا اس لیے ہم اسے گھر لے آئے۔ امید تھی کہ اگلے روز تدفین تک لاش خراب نہیں ہوگی۔ ظفر کے اور اس کی مرحوم بیوی کے رشتے دار آگئے تھے اور اب وہ اسے سنبھال رہے تھے۔ اگلے دن صبح دس بجے تدفین تھی۔ میں دفتر گیا اور دو گھنٹے کی چھٹی لے کر تدفین میں شریک ہوا تھا۔ وہیں میری ملاقات کیس کے تفتیشی افسر انسپکٹر ریاض علی شاہ سے ہوئی۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ اچھا پولیس افسر تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''یہ کسی قریبی آدمی کا کام ہے۔ وہ دیں کہیں رہتا ہے۔ اسے ظفر سے کوئی پرخاش تھی یا بچی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوگئی تھی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے دوسری بات قرین قیاس لگ رہی ہے کیونکہ ظفر بہت ہی مرنج و مرنجان قسم کا شخص ہے۔ اس کا کسی سے جھگڑا نہیں ہے۔ مگر کیا کہا جا سکتا ہے۔ آج کل لوگوں میں قوت برداشت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ ذرا سی بات پر دشمنی ہو جاتی ہے۔ نوبت قتل تک پہنچ جاتی ہے اس لیے آپ ہر زاویے سے تفتیش کریں۔''

''مجھے آپ کی مدد بھی چاہیے ہوگی؟''

''میں ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ میرے محلے اور پڑوسی کا معاملہ ہے۔ آپ مجھ سے رابطے میں رہیں، میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔''

مجھے واپس دفتر جانا تھا اس لیے میں نے ریاض سے کہا کہ وہ کسی پیش رفت کی صورت میں مجھے آگاہ کرے اور پھر ظفر سے مل کر وہاں سے چلا آیا۔ دو دن سے دفتر نہ آنے کی وجہ سے کام بڑھ گیا تھا اور اس وجہ سے میں رات گئے گھر پہنچا۔ نادیہ نے بتایا کہ پولیس نے محلے کے ایک ایک فرد سے بات کی اور اس سے اس کے معمولات کے بارے میں بھی پوچھا۔ جن سے پوچھ گچھ ہوئی تھی وہ سارے مرد تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس پر کچھ لوگوں کے موڈ خراب ہوں گے اور شکن بہ جبیں ہوں گے کہ ان پر شک کیا جا رہا ہے مگر پولیس کی گاڑی شک کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے۔ نہا دھو کر کھانا کھا کر میں ظفر کے پاس آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اکیلا تھا اور آنے والے سارے رشتے دار جا چکے تھے۔ میں نے پوچھا تو اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں نے خود ان سے کہہ دیا مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے وہ سب چلے گئے۔''

''ٹھیک ہے لیکن ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم تمہیں کبھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''آپ ہی لوگوں کا تو سہارا ہے مجھے۔'' ظفر نے کہا

اور پھر پھوٹ کر رو دیا تھا۔ میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔ چپ کراتا رہا۔ آج کا کھانا ہمارے گھر سے آیا تھا مگر اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ رو دھو کر جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو میں نے رکھا ہوا کھانا گرم کر کے زبردستی اسے کھلایا۔ پھر چائے کے ساتھ اسے نیند کی دو گولیاں دیں اور جب وہ سو گیا تو میں واپس گھر آیا۔ اس کی حالت دیکھ کر دل دکھ رہا تھا اور اس کے دکھ کا کوئی مداوا بھی نہیں تھا۔ وقت ہی اس کے زخم پر مرہم رکھ سکتا تھا۔

اگلے دن اتوار تھا اور میں صبح ہوتے ہی ظفر کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ جاگ گیا تھا اور اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ محلے کی خواتین نے مل کر طے کیا تھا کہ وہ ظفر کے گھر میں قرآن خوانی کریں گی۔ انتظام نادیہ کے سپرد تھا۔ ہم نے ناشتہ ساتھ کیا اور اسی دوران میں ریاض آگیا تھا۔ اس نے رپورٹ دی۔ ''سر کل میں نے اس گلی کے پندرہ افراد سے پوچھ گچھ کی، یہ سب جوان یا نوجوان ہیں۔ مگر کوئی مشکوک فرد یا بات سامنے نہیں آئی۔ تمام افراد صاف ہیں اور انہوں نے اپنی مصروفیات کی تفصیل بتائیں۔ اس کی تصدیق بھی کرائی۔ ان میں سے چار اس وقت یہاں نہیں تھے۔ باقی گیارہ میں سے دو مغرب پڑھنے گئے تو عشا کی نماز تک مسجد میں رہے۔ تین اپنے گھر والوں کے ہمراہ باہر نکلے تھے اور باقی چھ گھر میں رہے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے اب آپ کی تفتیش کا دائرہ اس گلی سے باہر جائے گا۔''

''بالکل آج میں اسی لیے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے پہلے آپ سے مل لینا مناسب سمجھا۔ آپ جانتے ہیں یہاں آس پاس کون کون رہتا ہے؟''

سونیا کی لاش جس پلاٹ سے ملی تھی اس کے ساتھ والا پلاٹ بھی خالی تھا اور دوسرا ساتھ والا پلاٹ صرف اسٹرکچر کے ساتھ تھا۔ اس لائن میں کل دس پلاٹ تھے اور ان میں سے پانچ پر گھر بنے ہوئے تھے۔ یہ سب دولت مند اور اوپری طبقے کے لوگ تھے۔ جن کا ماحول اور ملنا جلنا محدود ہوتا ہے اس لیے کسی سے میری واقفیت نہیں تھی۔ بس اتنا جانتا تھا کہ فلاں گھر کا مالک فلاں ہے اور اس میں ممکنہ طور پر اتنے افراد رہتے ہیں۔ میں نے ریاض کو یہ ساری معلومات مہیا کر دیں۔ ساتھ ہی اسے مشورہ دیا کہ وہ گارڈز سے معلوم کرے کیونکہ انہیں سب پتا ہوتا ہے۔ جس گارڈ کو پولیس مشکوک سمجھ کر لے گئی تھی وہ بے قصور پایا گیا تھا۔ ریاض کے جانے کے بعد ظفر نے مایوسی سے کہا۔ ''مجھے نہیں لگ رہا سونیا کا قاتل پکڑا جائے گا اور پکڑا بھی گیا تو اسے سزا ہو گی۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم اتنے مایوس کیوں ہو... ٹھیک ہے ہماری پولیس اتنی مستعد نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ مجرم پکڑے نہ جائیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ممکن ہے پولیس اسے پکڑ لے لیکن اگر وہ کسی بڑے گھر سے نکل آیا تو بچ جائے گا۔''

''یقین رکھو قاتل بچے گا نہیں۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''اس کا تو مجھے پورا یقین ہے۔ وہ بچے گا نہیں۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی خاندان سے ہو۔''

ریاض علی شاہ شام تک وہیں رہا تھا۔ اس دوران میں وہ صرف لنچ کے لیے گیا تھا اور واپس آیا تھا۔ شام تک اس نے اچھا خاصا کام کر لیا تھا اور پھر اس نے مجھے رات میں کال کی۔ ''سر میں نے ایک مشکوک بندہ چنا ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''لاش والے پلاٹ کے دائیں طرف کا پہلا گھر ہے۔ اس کا مالک مراد اصغر وڈیرہ ہے۔ وہ زیادہ تر اپنی زمین اور حویلی میں ہوتا ہے۔ اس کے دو بیٹے یہاں ہوتے ہیں۔ بڑا بیٹا شہباز مراد شادی شدہ ہے اور یہاں چاول صاف کرنے والی فیکٹری چلا رہا ہے۔ اس سے چھوٹا بشیر مراد ابھی اسکول میں پڑھ رہا ہے۔''

''آپ کو کس پر شک ہے؟''

''بشیر پر۔'' ریاض نے کہا۔ ''ان کے گھر کا ماحول ٹھیک نہیں ہے۔ ملاقات کے کمرے میں شراب کی بوتلیں رکھی تھیں۔ دو ملازم ہیں، ایک باہر کے کام کرتا ہے اور گیٹ پر ہوتا ہے دوسرا اندر کے کام کرتا ہے کھانا وہی بناتا ہے۔''

''شہباز پر کیوں شک نہیں ہے؟''

''سر وہ بیوی کے ساتھ دو دن سے گاؤں گیا ہوا ہے۔ میں نے تصدیق کر لی ہے۔ یہ لڑکا بشیر تب سے یہاں اکیلا رہ رہا ہے۔''

''شک کی وجہ؟''

''ایک تو اس نے صاف نہیں بتایا کہ اس روز چھ سے رات آٹھ تک وہ کہاں تھا۔ اس کے ملازموں کا کہنا ہے وہ گھر پر نہیں تھا۔ مگر اس کی گاڑی گھر میں موجود تھی۔ گاڑی کے بغیر وہ کہیں نہیں جاتا ہے۔ سوسائٹی کے گارڈز نے بھی

اس کی تصدیق کی ہے۔عمر سولہ سترہ سے زیادہ نہیں ہے لیکن دیکھنے میں پورا ہٹا کٹا مرد لگتا ہے۔وزن زیادہ ہے، دو قدم چل کر اس کا سانس پھول جاتا ہے۔گاڑی کے بغیر گلی کے کونے تک نہیں جاتا۔"

"اس نے کچھ تو بتایا ہوگا؟"

"اس کا کہنا ہے کہ وہ گلیوں میں گھوم رہا تھا اور پارک کی طرف چلا گیا تھا۔"

"اس موسم میں؟"

"یہی تو شک کی بات ہے سر.... پھر اس کی شہرت بھی اچھی نہیں ہے۔کئی بار اس کی گاڑی میں لڑکیاں آئی گئیں اور ایسا بھی ہوا کہ لڑکیاں رات کو آئیں اور یہ انہیں صبح چھوڑنے گیا۔مختلف اوقات میں گارڈز نے اس کے ساتھ مختلف لڑکیوں کو دیکھا ہے۔"

"بندہ مشکوک ہے۔"

"مگر مسئلہ یہ ہے کہ کوئی گواہ نہیں ہے اور نہ ہی دوسری کوئی شہادت ہے سر، اگر یہی بندہ ہے تو اسے اپنا کام کرنے کا موقع نہیں ملا، آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات....؟ ورنہ ڈی این اے ٹیسٹ سے ثابت ہو جاتا کہ قاتل یہی ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا۔میں نے گہری سانس لی۔"ہاں بچی زیادتی سے بچ گئی تھی۔"

"مٹی لگنے اور پھر شاید اس کے باپ کے ہاتھ لگنے سے گلے پر فنگر پرنٹ بھی نہیں رہے۔بس ایک چھوٹا سا انگوٹھے کا سرا ملا ہے۔"

یہ انکشاف تھا میں نے کہا۔"تو اسے میچ کر کے دیکھ لو۔"

"وہ تو کر لیں مگر یہ ثبوت کے طور پر پیش نہیں ہو سکے گا۔جتنے میچنگ پوائنٹ چاہیے ہوتے ہیں اس کے آدھے بھی میچنگ کے لیے نہیں ملیں گے۔"

"پھر بھی تفتیش آگے بڑھانے کے لیے اتنا بھی کافی ہے۔"

"میں نے نمونہ لے لیا ہے۔کل تک میچ ہو جائے گا۔" ریاض نے کہا۔"اس نے میرے سامنے گلاس میں پانی پیا تھا میں نے وہ چھپر کر لیا۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔"

"میں کل رابطہ کروں گا۔"

اگلے دن میں نے دفتر سے خود ریاض سے رابطہ کیا۔اس نے بتایا کہ فنگر پرنٹ رپورٹ آگئی تھی اور انگوٹھے کا نشان میچ کر گیا تھا۔مگر اسے بہ طور شہادت پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس بنیاد پر وارنٹ نکلوا لے۔ایک بار بندہ ہاتھ آجائے تو خود بھی بہت کچھ اگل دے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"بس ایک بار ہاتھ آجائے۔" ریاض نے تائید کی۔"مگر پارٹی اونچی ہے اوپر والوں کا دباؤ آئے گا۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے کہا۔"تم کام جلدی اور پکا کرنا۔ایف آئی آر کاٹ کر اسے فوری پیش کر کے ریمانڈ لے لینا۔اس کے بعد اوپر والے بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

"آپ بے فکر رہیں، میں ایسا ہی کروں گا۔آج رات وہ حوالات میں گزارے گا۔"

مجھے بھی یہی امید تھی۔میں نے فوری طور پر یہ خبر ظفر کو سنائی۔میں نے یقین سے کہا تھا کہ بشیر پکڑا جائے گا۔مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔جس وقت پولیس وارنٹ لے کر بشیر کی کوٹھی پہنچی تو وہ گھر میں نہیں تھا۔وہ گاڑی لے کر نکلا ہوا تھا۔پولیس نے دونوں ملازموں کو حراست میں لے کر اپنے بندے وہاں بٹھا دیے تھے تاکہ وہ بشیر کو خبردار نہ کر سکیں پھر ان سے اس کا موبائل نمبر لے کر اسے کال کی مگر اس کا موبائل نمبر بند جا رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ اسے قبل از وقت خبر ہو گئی تھی اور وہ فرار ہو گیا تھا۔رات گئے اس کی گاڑی سوسائٹی کے باہر اس حالت میں کھڑی پائی گئی کہ اس کے دروازے ان لاک تھے مگر چابیاں اندر جھول رہی تھیں۔اس کے گھر والوں تک خبر پہنچ گئی تھی اور اگلے روز تک مراد اور شہباز آگئے تھے۔انہوں نے رپورٹ کرائی کہ ان کے بیٹے کو اغوا کیا گیا ہے مگر پولیس کا موقف تھا کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے فرار ہوا ہے۔گاڑی کا اس طرح پایا جانا اس کی طرف سے ڈراما تھا تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔

میں ریاض کی بات سے متفق تھا کہ یہ لوگ مل کر ڈراما کر رہے ہیں۔انہیں خطرہ محسوس ہو گیا تھا کہ بشیر کو گرفتار کر لیا جائے گا اور اسے گرفتاری سے بچانے کے لیے انہوں نے اسے کہیں غائب کر دیا تھا۔اسی دن پولیس نے ان کے مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مارے تھے۔مگر بشیر ان میں سے کسی پر نہیں ملا۔ایسا لگ رہا تھا کہ اسے گاؤں یا کسی اور جگہ بھیج دیا گیا تھا۔اس رات جب ریاض نے مجھے کال کی تو اس نے بتایا۔"اوپر سے دباؤ آنا شروع ہو گیا ہے۔

مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ اس معاملے میں زیادہ سرگرمی نہ دکھاؤں۔"

"یہ تو ہونا تھا۔" میں نے کہا۔"میں نے اپنے جاننے والوں سے بات کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ بندہ ہاتھ آجائے تو وہ تمہاری بیک کریں گے۔اب اسے تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے یہ اسے باہر بھجوا دیں گے۔"

"اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل نہیں کیا جا سکتا؟"

"ہو سکتا ہے بہ شرط کہ بات میڈیا پر آجائے۔" ریاض نے کہا۔"اوپر والوں نے مجھے اس معاملے کی میڈیا کوریج سے بھی روک دیا ہے۔یہ کام ظفر کر سکتا ہے۔"

"میں اس سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور ظفر کے گھر پہنچا۔رات کے دس بج رہے تھے اور سردی کی وجہ سے سناٹا تھا۔میں نے کال بیل بجائی تو خاصی دیر بعد ظفر اندر سے نکلا اس کے چہرے پر وحشت تھی۔خلافِ توقع وہ مجھے اندر نہیں لے کر گیا۔اس نے دروازے پر پوچھا۔

"جی شاہد بھائی....آپ اس وقت؟"

"سوری میں نے ڈسٹرب کیا۔" میں نے معذرت کی اور پھر اسے ریاض کی تحقیق اور مشورے سے آگاہ کیا۔بشیر کے بارے میں اسے پہلے ہی بتا دیا تھا اور اس وقت اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔"اگر اس معاملے کو میڈیا پر دیا جائے تو بشیر کو ملک سے فرار سے روکا جا سکتا ہے۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔"پولیس پکڑ لے تب بھی وہ چھوٹ جائے گا۔"

مجھے ظفر سے اسی بات کی توقع تھی۔وہ جھمیلوں اور مشکلوں میں پڑنے والا آدمی نہیں تھا۔اس قسم کے کیس میں لڑنا پڑتا ہے بہت دھکا خواری ہوتی ہے اس کے بعد کہیں جا کر انصاف ملتا ہے یا اس کی امید بندھتی ہے۔مگر اس وجہ سے آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا ہے۔میں نے اصرار کیا۔"یار کوشش تو کرنی چاہیے۔"

"اچھا۔" وہ بے دلی سے بولا۔"لیکن میرا کوئی میڈیا میں جاننے والا نہیں ہے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو....کل یہاں میڈیا اور کئی چینلز والے آجائیں گے اور تمہیں ان سے اپیل کرنی ہے کہ سونیا کے قاتل کو سزا دلوانے کے لیے تمہاری مدد کریں۔"

"سونیا کا قاتل۔" اس کے چہرے پر وحشت بڑھ گئی تھی۔"ہاں اسے سزا ہونی چاہیے۔ٹھیک ہے آپ کل میڈیا والوں کو بلا لیں۔" اس نے کہا اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا۔اس نے تین دن سے کپڑے نہیں بدلے تھے۔سونیا والے واقعے کے بعد سے شاید اس نے شیو بنانا تو ایک طرف رہا منہ بھی نہیں دھویا تھا۔اس کی صورت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔میں واپس آگیا۔میری سرکاری حیثیت کی وجہ سے یہ مناسب نہیں تھا کہ میں سامنے آتا لیکن میں نے ایک جاننے والے صحافی کے توسط سے ظفر کے لیے انتظام کر دیا۔تین چار بڑے چینلز کے رپورٹرز اس کے گھر آئے تھے۔میں نے اسے صبح ہی سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔میں پھر دفتر چلا گیا اور وہیں مجھے نادیہ نے بتایا کہ ظفر نے گلی میں اپنے گیٹ کے سامنے میڈیا والوں سے بات کی تھی۔وہ کسی کو اندر لے کر نہیں گیا تھا۔یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔بلکہ گلی میں ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ میڈیا نے محلے والوں سے بھی تاثرات لیے تھے اور سب نے زور دیا تھا کہ سونیا جیسی معصوم بچی کے درندہ صفت قاتل کو سزا ہونی چاہیے۔

میڈیا بشیر کی کوٹھی پر بھی پہنچا تھا مگر اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ملازمین بھی کوٹھی بند کر کے چلے گئے تھے۔مگر اسی شام مراد نے اپنی ڈیفنس والی کوٹھی پر پریس کانفرنس کی اور الزام لگایا کہ اس کے بیٹے کو اغوا کیا گیا ہے۔اس کا کچھ پتا

شمارہ جون 2014ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش.... آپ کا انتخاب

☆ اول: موت و حیات.....شائلہ شمسی (فیصل آباد)

☆ دوم: ان دیکھا سودا......اشرف (لاہور)

☆ سوم: ہم مجرم......عزیز صفی پوری (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

نہیں ہے۔ اسے خطرہ ہے کہ اس کے بیٹے کو قید رکھ کر ان پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ مقدمے کی پیروی نہ کریں۔ پولیس نے بشیر کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف اغوا اور قتل کا چالان پیش کرکے عدالت سے اس کے وارنٹ گرفتاری حاصل کر لیے تھے۔ دوسری طرف عدالت نے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ مراد نے میڈیا کو بشیر کی پیدائش اور دوسرے تعلیمی سرٹیفکیٹس اور کاغذات دکھائے جن کے مطابق وہ سترہ سال اور بیس دن کا تھا یعنی قانونی لحاظ سے ابھی بچہ تھا۔ اس پر ایک رپورٹر نے معنی خیز انداز میں سوال کیا کہ کیا وہ سچ مچ ابھی بچہ ہی ہے؟ اس پر سب ہنس دیئے تھے اور مراد چراغ پا ہو گیا۔ اس نے رپورٹر سے بدتمیزی کی اور اس وجہ سے پریس کانفرنس بدمزگی پر ختم ہوئی تھی۔

میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ ثبوت اور گواہی نہ ہونے سے بشیر کو سزا ہونا ممکن نہیں۔ صرف انگوٹھے کا سرے کا نشان میچ کر جانا واضح ثبوت نہیں تھا اور میچنگ پوائنٹس پورے نہ ہونے سے اسے عدالت کی طرف سے بہ طور ثبوت تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس صورت میں بشیر مراد کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے اور عدالت کا سامنا کرے مگر شاید وہ ڈر گیا تھا۔

اس دن میں جلدی آ گیا تھا اس لیے شام کے وقت ہی ظفر سے ملاقات ہوئی تھی وہ ویسا ہی مرجھایا ہوا اور مایوس تھا۔ اس نے سپاٹ سے انداز میں بتایا کہ اس نے میڈیا والوں سے کیا کہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم دیکھنا اب بشیر پکڑا جائے گا۔“

”وہ نہیں پکڑا جائے گا۔“ ظفر نے یقین سے کہا۔ ہم باہر ہی کھڑے تھے۔ آج بھی ظفر مجھے اندر نہیں لے کر گیا تھا۔

”یار اتنا مایوس نہیں ہوتے ہیں، اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“

میں نے گھر آ کر نادیہ کو ظفر کی کیفیت بتائی تو اس نے انکشاف کیا۔ ”اس نے ملازمہ کو بھی نکال دیا ہے اور اتوار کے دن قرآن خوانی کے بعد سے کہیں نہیں جا رہا بس گھر میں ہوتا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”ملازمہ آج میرے پاس آئی تھی۔ اسے کام کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ماسی لگی ہوئی ہے اس لیے میں نے معذرت کر لی البتہ کسی کو ضرورت ہوگی تو بتا دوں گی۔“

”شاید تب ہی وہ تین دن سے مجھے اندر نہیں لے جا رہا ہے گھر کی حالت اس قابل کہاں ہوگی کہ کسی کو بٹھا سکے۔“

”اکیلا آدمی ہے گھر کہاں گندہ ہوگا۔ ہاں گرد مٹی جمع ہوگی تو وہ جھاڑی جا سکتی ہے۔“ نادیہ نے کہا پھر اسے آمنہ نے آواز دی تو وہ اس کے پاس چلی گئی۔ رات اس کیس کی کوریج اور ٹاک شو سے مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ بشیر کو مجرم سمجھ رہے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے سے سزا بھی مشکل سمجھ رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ظفر بھی مایوس تھا۔ اسے پتا تھا کہ ثبوت اور گواہی نہ ہونے سے بشیر عدالت سے چھوٹ جائے گا۔ تب ہی وہ پریس کانفرنس کے لیے بھی مشکل سے تیار ہوا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ پہلے بیوی مری اور اب اکلوتی بچی۔ اس کا ردعمل فطری تھا اور اس وقت اس سے بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ تین چار دن بعد اس سے بات کروں گا۔ اسے سمجھاؤں گا کہ حادثات زندگی کا حصہ ہیں اور ان کی وجہ سے زندگی کو یوں ترک نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال اسے چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔

اگلے دن دفتر میں کام زیادہ تھا اور پھر ایک میٹنگ آ گئی اس کی وجہ سے میں رات خاصی دیر سے واپس آیا تھا۔ گلی میں داخل ہوا تو مجھے ظفر اپنے گیٹ کے سامنے کیاری کی منڈیر پر ٹکا نظر آیا۔ اس وقت سردی عروج پر تھی اور وہ یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے شکن زدہ پتلون کے ساتھ پوری آستین کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور یہ لباس سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ سردی تو کیا اسے ساری دنیا کی فکر نہ ہو۔ میں نے گاڑی کنارے پر لگائی اور اتر کر اس کے پاس آیا۔ مجھے پورے گرم لباس اور جیکٹ میں بھی سردی لگ رہی تھی۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ ”کیا حال ہیں ظفر؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اتنی سردی میں یوں باہر بیٹھے ہو۔ کچھ گرم چیز لے لیتے۔“

”مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔“ اس نے بے چینی سے جواب دیا۔ ”گرمی لگ رہی تھی اس لیے باہر آ گیا۔“

”اس موسم میں گرمی؟“ میں نے تشویش سے کہا۔ ”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے، یہ باہر کا موسم کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اصل موسم آدمی کے اندر ہوتا ہے اور میرے اندر اس وقت گرمی کا موسم ہے۔“ اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”سوری مجھے ذرا کچھ کام ہے۔“

اس سے پہلے میں کچھ کہتا وہ اندر جا چکا تھا اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں گھر آ گیا۔ ظفر کا رویہ انوکھا تھا۔ اس نے بہت عجیب فلسفیانہ بات کی تھی حالانکہ وہ اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ میں نے کبھی اسے فلسفہ بولتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ بہت سیدھے الفاظ میں بات کرتا تھا۔ بہر حال وہ ایک بڑے سانحے سے گزرا تھا۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے اور یہ سانحے ہی ہوتے ہیں جو انسان کو اندر سے بدل دیتے ہیں۔ ظفر جیسے سیدھے سادے لوگ بھی فلسفہ بولنے لگتے ہیں۔ آج سونیا کے واقعے کو پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا مگر کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ بشیر بدستور غائب تھا اور اس کے گھر والے واویلا مچا رہے تھے کہ اسے غائب کیا گیا ہے۔ مگر ان پر کوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔ ریاض نے بتایا کہ ایک پولیس پارٹی اس کی حویلی بھی گئی تھی مگر وہ وہاں بھی نہیں ملا۔

میں اگر جلد گھر آ جاؤں تو مغرب اور عشا کی نمازیں سوسائٹی کی مسجد میں پڑھتا ہوں۔ لیکن اس دن عشا بھی نکل گئی تھی۔ اگلے دن میں دفتر سے آ رہا تھا تب مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں اور میں نے گاڑی مسجد کے سامنے روک دی۔ جماعت ہونے والی تھی اس لیے جلدی سے وضو کرکے صف میں آ گیا۔ سلام اور دعا کے بعد دوسروں سے سلام دعا کی۔ گلی کے کئی افراد نماز کے لیے آئے تھے۔ ہم ایک طرف بیٹھ گئے اور لازمی طور پر گفتگو کا رخ ظفر کی طرف مڑ گیا۔ عرفان صاحب بولے۔ ”مجھے تو بے چارے کی حالت دیکھ کر ترس آتا ہے، کوئی سنبھالنے والا بھی نہیں ہے۔“

”جوان آدمی ہے، بیوی کے بعد صرف بچی کی خاطر دوسری شادی نہیں کی اور اب بچی بھی نہیں رہی۔“ ایک اور صاحب نے کہا۔

”میرا تو خیال ہے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔“ میں نے تجویز پیش کی۔ ”پہلے ظفر کو معمول کی زندگی کی طرف لانا چاہیے اور اس کے بعد ہم اس کی دوسری شادی کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس کی عمر ہی کیا ہے مشکل سے پینتیس سال کا ہے۔ ابھی شادی کرے گا تو اللہ اور اولاد بھی دے گا۔ اس کا زخم بھر جائے گا۔“

”تجویز تو اچھی ہے۔“ عرفان صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

”ابھی ہم میں سے ہر ایک دن میں ایک دو بار اسے چیک کرے اور کچھ نہیں تو سلام کر لے یا نماز کے لیے چلنے کی دعوت دے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہد صاحب۔“ عرفان صاحب بولے۔ ”میں ابھی عشا کے وقت ظفر کے پاس جاتا ہوں۔ ویسے وہ نماز والا بندہ نہیں ہے، اسے بس جمعہ میں دیکھا ہے لیکن اس وقت اس کا دل بدلا ہوا ہے، شاید اللہ اسی سبب اسے نماز کی ہدایت دے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”لیکن بہتر ہوگا یہ بات ایسے کریں کہ اسے جبر نہ لگے۔“

”آپ بے فکر رہیں میں بات کر لوں گا۔“ عرفان صاحب نے کہا۔

میں مسجد سے گھر آیا تو نادیہ نے مارکیٹ چلنے کو کہا۔ ”بچوں کی کچھ چیزیں لینی ہیں۔“

میں نے چینج کیا اور چائے پی کر نادیہ اور آمنہ کو لے کر روانہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ عشا تک واپس آ جائیں گے مگر دیر ہو گئی اور جب ہم مارکیٹ سے واپس آئے تو جماعت ہو چکی تھی۔ اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ عرفان صاحب کی ظفر سے کیا بات ہوئی ہے۔ پھر کچھ تھکن بھی تھی اس لیے ظفر کی طرف بھی نہیں گیا۔ سچی بات ہے جب سے اس کا رویہ بدلا تھا اور وہ دروازے پر کھڑے بات کر رہا تھا، میں اس کی طرف جانے کا سوچ کر جھجکتا تھا۔ اس کے انداز سے صاف لگتا تھا کہ وہ رواداری میں بات کر رہا ہے اور اسے میرا آنا اور بات کرنا گراں گزر رہا ہے۔ سونیا کی وفات کے دو دن تک محلے والوں نے اسے کھانا بھیجا تھا مگر تیسرے دن جب ہمارے برابر والے فضل صاحب کے گھر سے کھانا بھجوایا تو ظفر نے ٹرے واپس بھیج دی تھی اور ساتھ ہی کہلوا دیا کہ اب کھانا نہ بھیجا جائے۔ یہ بات مجھے اگلے دن مسجد میں معلوم ہوئی۔ میں مغرب کے بعد گھر آیا تھا اس لیے عشا کی نماز کے لیے گیا تھا۔ وہاں پہلے ہی ظفر پر بات ہو رہی تھی۔ عشا کی جماعت کھڑی ہونے والی تھی اس لیے فی الحال گفتگو چھوڑ دی گئی اور جماعت و نماز کے بعد ہم سب ایک جگہ جمع ہوئے۔ عرفان صاحب بہت سنجیدہ تھے انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

”میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ شخص اتنا بدتمیز اور روکھا نکلے گا۔“

”کیا ہوا؟“

”میں کل گیا تھا اس کے پاس۔“ وہ کسی قدر برہمی سے بولے۔ ”پہلے تو دروازہ نہیں کھول رہا تھا۔ میں نے چار بار بیل بجائی تو دروازہ کھولا اور کھولتے ہی بولا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ بہرحال میں نے غصہ ضبط کر کے اس سے سلام دعا کی۔ خیر خیریت پوچھی اور پھر نماز کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور بولا۔ ”اس وقت موت کا فرشتہ بھی لینے آئے تو نہ جاؤں۔“

”استغفر اللہ! نماز کے لیے منع کر دیا اور وہ بھی اس انداز میں۔“ نعمانی صاحب بولے۔ وہ دیندار آدمی تھے اس لیے دین کے معاملے میں جذباتی ہو جاتے تھے۔

میں نے ملائمت سے کہا۔ ”نعمانی صاحب ظفر کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا صدمہ بہت بڑا ہے اور ایسے میں آدمی کے منہ سے الٹا سیدھا نکل جاتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ عرفان صاحب نے کہا۔ ”مجھے اس وقت غصہ آیا تھا مگر اب خیال آتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کفار کی تلخ ترش بھی خنداں پیشانی سے برداشت کرتے تھے، یہ تو ہمارا مسلمان بھائی اور پڑوسی ہے۔“

”ٹھیک ہے آج میں اور سہیل صاحب جائیں گے۔“ نعمانی صاحب بھی نرم پڑ گئے۔ ”ہمیں اپنی سی کوشش تو کرنی چاہیے۔“

”کل میں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میرے ساتھ کوئی اور جانا چاہے تو بتا دے میں جاتے ہوئے اسے بھی بلا لوں گا۔“

”میں چلوں گا۔“ عرفان صاحب بولے۔

”ٹھیک ہے پھر آپ دونوں آ کر بتایئے گا کہ آج کیا ہوا۔“ نعمانی صاحب بولے تو ہم سب اٹھ گئے۔ میں گھر آیا اور کھانا کھا کر بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ان کی اسکول رپورٹس دیکھ رہا تھا کہ سہیل صاحب اور نعمانی صاحب آ گئے۔ میں ان کو نشست گاہ میں لے آیا۔ وہ دونوں سنجیدہ تھے اور مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ ظفر نے ان کے ساتھ بھی ویسا ہی روکھا رویہ رکھا ہو گا۔ چند منٹ بعد انہوں نے تصدیق کر دی۔ سہیل صاحب نے کہا۔

”اس نے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر لگائی کہ مجھے فکر ہونے لگی تھی۔“

”اور اس نے دروازہ کھول کر کیا کہا؟“ نعمانی صاحب طنزیہ انداز میں بولے۔ ”اسے سن کر آپ کی فکر غصے میں نہیں بدل گئی؟“

”صحیح کہا آپ نے۔“ سہیل صاحب بولے۔ ”اس وقت مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔ مگر اب سوچ رہا ہوں تو اس پر ترس آ رہا ہے۔ آپ نے اس کی حالت نہیں دیکھی۔“

اس پر نعمانی صاحب نے دین کے حوالے سے ایک چھوٹی سی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ظفر جیسے لوگ جو مصیبت کے وقت اللہ سے رجوع نہیں کرتے ہیں اللہ ان کو ایسے ہی پریشان حال رکھتا ہے۔ میں ان سے متفق نہیں تھا مگر میں نے بحث نہیں کی اور پوچھا۔ ”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”ہم نے حال احوال پوچھا تھا۔ پھر اسے کہا کہ وہ اپنی معمول کی زندگی کی طرف واپس آئے۔“ سہیل صاحب بولے۔

”اس نے کیا جواب دیا؟“

”اس نے بدتمیزی سے کہا کہ وہ معمول کے مطابق ہے اور بالکل ٹھیک ہے، اس کی فکر نہ کی جائے اور نہ ہی اسے تنگ کیا جائے۔“ نعمانی صاحب بولے۔

”بس یہی بات ہوئی؟“

”نہیں، میں نے کہا کہ ٹھیک ہے اسے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیا سے کٹ کر گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے۔ تب اس نے عجیب سی بات کی۔“ سہیل صاحب نے کہا۔ ”اس نے کہا اوہو آپ شاید یہ کہہ رہے ہیں کہ میں صبح کام پر جاؤں شام کو واپس آؤں اور لوگوں سے گھلوں ملوں یہی ناں؟ ٹھیک ہے تو آپ ایک دو دن بعد آیئے گا پھر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“

مجھے بھی یہ بات عجیب سی لگی تھی۔ ایک دن بعد کسی کو اس سے شکایت نہیں رہے گی۔ ایک دن یعنی کل اتوار تک وہ کیا کرتا۔ سہیل صاحب اور نعمانی صاحب کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہوئے تھے۔ نادیہ کپ اٹھانے آئی اور مجھے غور و فکر میں دیکھا تو پوچھا۔ میں نے اسے ظفر کی بات بتائی۔ وہ بھی حیران ہوئی تھی۔ ”یہ ایک دن والی کیا بات ہوئی؟“

”یہی تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کل تک وہ کیا کرے گا۔“

نادیہ نے سوچ کر پوچھا۔ ”سونیا کے انتقال کو کتنے دن ہو گئے ہیں۔“

”آج نو دن ہو گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی لاش ملے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔“

”اور وہ کتنے سال کی تھی؟“

”چھ سال کی...دو دن پہلے تو وہ چھ سال کی ہوئی تھی۔“

”تو کیا ظفر بھائی اس کا سوگ چھ دن تک منائیں گے۔“

”لیکن آج تو نو دن سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔“

”ہاں لیکن اس کی تدفین کو تو سات دن ہوئے ہیں اور پھر دو دن لوگ بھی ان کے گھر میں رہے تھے۔ اگر وہ سونیا کا سوگ اکیلے میں منانا چاہتے ہیں تو ان کو ابھی پانچ دن ملے ہیں اور اس لحاظ سے ایک دن باقی ہے۔“

نادیہ کی سوچ اور منطق نے مجھے حیران کیا تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی اور شاید آ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر یہ ایک قیاس تھا اصل حقیقت کا علم نہیں تھا۔ مگر میں نے نادیہ سے اتفاق کیا۔ ”ہاں یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ تب ہی اس نے ایک دن بعد معمول پر آنے کی بات کی ہے۔“

”ایک عجیب بات اور میں نے دیکھی۔ آج دن میں کم سے کم دو بار ایسا ہوا کہ ظفر بھائی گھر سے باہر آئے اور کچھ دیر ٹہلنے کے بعد اندر چلے گئے۔ بچوں کا کہنا ہے کہ گلی میں کھیلتے ہوئے انہوں نے بھی ظفر بھائی کو اسی طرح باہر آ کر ٹہلتے اور پھر اندر جاتے دیکھا تھا۔“

”آج میں بھی آیا تو وہ باہر منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ بات نارمل نہیں لگ رہی۔“

”چلیں ظفر بھائی نے ایک دن کی بات کی ہے دیکھتے ہیں کہ وہ اس کے بعد کیا کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے ابھی انہیں چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ پہلے ہم محلے والوں نے فیصلہ کیا تھا کہ روز کوئی نہ کوئی ظفر کو چیک کرتا رہے گا۔ آج نعمانی صاحب اور سہیل صاحب گئے تھے، کل میں اور عرفان صاحب جاتے۔ اب میں ان لوگوں کو منع کر دوں گا۔ ہم پرسوں دیکھیں گے کہ ظفر کیا کرتا ہے۔“

”اگر وہ معمول پر نہیں آئے؟“

”تب ہم مداخلت کریں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمارا کوئی پڑوسی یوں بے حال ہو اور ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ بلکہ ہم تو سوچ رہے ہیں کہ اس پر دوبارہ شادی کے لیے زور دیں۔ بیوی آئے گی تو اسے سنبھال لے گی اور قسمت میں ہوا تو اللہ مزید اولاد بھی دے گا۔“

”یہ آپ نے اچھا سوچا۔“ نادیہ خوش ہو گئی۔ ”میری تو دلی خواہش ہے کہ وہ پھر سے گھر بسا لیں۔“

”دیکھو ابھی تو وہ اس کیفیت سے نکلے اس کے بعد ہی اس سے بات کی جا سکتی ہے۔“

اگلی صبح میں گھر سے نکلا تو ظفر دروازے پر کھڑا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی جلدی سے اندر چلا گیا اور دروازہ بھی بند کر لیا۔ مجھے افسوس ہوا۔ مگر میں اس کی کیفیت کے پیش نظر اسے قصوروار نہیں سمجھ رہا تھا۔ شاید وہ ابھی کسی سے سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دن مجھے حسب معمول چھٹی کے کام نمٹانے تھے۔ سارے ہفتے کا سودا اور رہ جانے والے کام کرنے تھے۔ پھر کچھ دوستوں سے ملنا تھا۔ اس لیے میں صبح کا نکلا تو شام کو گھر آیا۔ نادیہ نے رپورٹ دی کہ آج ظفر زیادہ باہر نہیں نکلا۔ اسے بھی تجسس تھا اس لیے وہ موقع بہ موقع گیٹ کا چکر لگا کر دیکھتی رہی تھی۔ میں اس کے زنانہ تجسس پر ہنس دیا تھا مگر وہ سنجیدہ رہی۔ اس نے کہا۔ ”ظفر بھائی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے دوپہر میں دیکھا تو ان کے ہاتھ پر چوٹ سے خون نکل آیا تھا اور وہ بے پروا لگ رہے تھے۔“

”ہو سکتا ہے اسے چوٹ لگ گئی ہو اور وہ جس کیفیت میں ہے اس نے پروا نہ کی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے بھی مرد ذرا لاپروا ہی ہوتے ہیں، یاد ہے ایک بار خراب گاڑی ٹھیک کرتے ہوئے مجھے چوٹ آئی تھی اور میں نے بس رومال لپیٹ لیا تھا۔ گھر آ کر تم نے دیکھا تو ہنگامہ کر دیا تھا۔“

نادیہ کو یاد آیا اور وہ ہنس دی تھی۔ ”آپ نے ٹھیک کہا مرد بے پروا ہوتے ہیں۔“

ہمارا گھر ایک منزلہ تھا، ابھی ضرورت نہیں تھی کہ دوسری منزل بنوائی جاتی لیکن میں نے اوپر ایک کمرا بنوا لیا تھا کہ کسی ہنگامی موقع پر کام آتا مگر فی الحال وہ صرف کباڑ رکھنے کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ میری گاڑی میں دو اسٹپنیاں پڑی تھیں، میں روز سوچتا تھا کہ آج نکال دوں گا۔ مگر پھر ذہن سے نکل جاتا یا اتنا تھکا ہوتا کہ اس سردی میں اوپر جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مگر آج میں نے سوچ لیا کہ انہیں رکھ کر ہی آؤں گا۔ گزشتہ روز نادیہ نے منجمد گوشت کی چیزیں لی تھیں اور وہ سیٹ پر رکھنے سے اس میں نمی آ گئی تھی۔

میں ایسی چیزیں ڈکی میں رکھتا ہوں جن سے سیٹ خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ رات کے کھانے کے کچھ دیر بعد میں اٹھا اور باہر آ کر ڈکی سے اسٹپنی نکالی۔ سیڑھیاں پارکنگ سے اوپر جا رہی تھیں۔ میں وہیں سے ایک ایک کر کے انہیں اوپر لے گیا۔

پھر نیچے آ کر گیٹ بند کر کے اوپر آیا اور سیڑھیوں کے پاس سے انہیں اٹھا کر کمرے میں رکھنے لگا۔ جب دوسرا ٹائر بھی رکھ کر آ رہا تھا تب میں نے دیکھا ظفر چھت پر ٹہل رہا تھا اور اس وقت بھی اس نے وہی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ نو دن میں اس کی شیو بڑھ کر باقاعدہ داڑھی لگنے لگی تھی اور سر کے بے ترتیب بال بتا رہے تھے کہ اس نے کنگھا کرنے کی زحمت نہیں کی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے وہ بار بار عجیب سے انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ میری چھت پر روشنی نہیں تھی اور آسمان پر بھی بس تارے تھے۔ ظفر کی چھت پر روشنی تھی اس لیے وہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چار دیواری تک گیا تاکہ دیکھ سکوں کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے اور وہ اس سے کیا کر رہا ہے۔ نزدیک جانے پر مجھے اس کے ہاتھ میں موجود پلاس نظر آ گیا مگر اس کی حرکت سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ بہت مضطرب انداز میں ٹہلتے ہوئے یہ حرکت کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے رکا اور کچھ دیر اوپر خلا میں گھورتے رہنے کے بعد وہ سیڑھیوں سے نیچے چلا گیا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔

میں نیچے آیا اور کچھ دیر بعد میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی۔ ہم لوگوں کو معمولات زندگی نے اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ ہمارے آس پاس کچھ ہو رہا ہو تو ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ میں بھی اس معاشرے کا حصہ ہوں اس لیے میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ حالانکہ مجھے غور کرنا چاہیے تھا کہ ظفر ایسا کیوں کر رہا ہے؟ ہمارے ہاں صدمات میں لوگ ایسا رویہ نہیں دکھاتے ہیں، چاہے ان کی اکلوتی اولاد ہی کیوں نہ قتل کر دی جائے۔ ان کا رویہ بہت غیر معمولی تھا۔ اگر ہم غور کرتے تو شاید سمجھ بھی۔

میں نیچے آیا اور لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ نادیہ بچوں کو سلانے لے گئی تھی اور ٹی وی چل رہا تھا۔ میری نظر ٹی وی پر مرکوز تھی۔ اچانک ہی اس پر سونیا کیس سے متعلق خبر آئی۔ بشیر کے باپ کو دکھایا جا رہا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ارے ظالمو...میرا بیٹا مجرم ہے تو اسے پولیس کو دو۔ عدالت میں پیش کرو...خدا رسول ﷺ کی قسم جو میں اس کی پیروی کروں، پر اسے یوں غائب مت کرو۔“

اس کا انداز اتنا دردناک اور بے ساختہ تھا کہ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا ہے۔ اگرچہ میرا جو پیشہ ہے اس میں دل کی گواہی معتبر شمار نہیں ہوتی ہے مگر اس وقت مجھے یقین آ گیا اور پھر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو بشیر کہاں ہے؟ اس کا جواب میرے ذہن میں آیا تو میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ نادیہ اندر تھی میں نے اسے نہیں بتایا اور خاموشی سے باہر آیا۔ سردی کی وجہ سے جیسے سب منجمد تھا اور آج ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی جسم کو کاٹ رہی تھی۔ میں ظفر کے مکان تک آیا اور بیل بجانے جا رہا تھا کہ رک گیا۔ مجھے لگا کہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا ہے، میں نے اسے دھکیلا تو وہ کھلا ہوا ملا۔ شاید ظفر آنے جانے کے دوران آخری بار اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔ اس کی چند سال پرانی سوک کار اندر ہی کھڑی تھی۔ میں لاؤنج کے دروازے تک آیا اور اسے دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ بڑے کمرے اور لاؤنج میں روشنیاں بند تھیں مگر ایک بیڈ روم سے روشنی دکھائی دے رہی تھی اور یہ سونیا کا بیڈ روم تھا۔ دوسرا بیڈ روم بھی تاریک تھا۔ میں دبے قدموں آگے آیا۔ اندر جھانکا تو معلوم ہوا روشنی اصل میں واش روم کے کھلے دروازے سے آ رہی تھی۔

میں ذرا آگے آیا تھا کہ دو انسانی پاؤں دکھائی دیے۔ وہ فرش پر پڑے تھے اور فرش پر خون ہی خون تھا۔ پاؤں بھی خون آلود تھے اور ان سے رسیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے میں آگے آ رہا تھا جسم نمایاں ہو رہا تھا اور اس کی جو حالت تھی وہ بیان تو کیا دیکھنے کے لائق بھی نہیں تھی اس کے باوجود مجھے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ اندر ہر طرف خون ہی خون اور لوتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بالآخر مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیا اور وہ بھی دیکھنے والا نہیں تھا۔ مگر وہ زندہ تھا اس کا ہلتا سینہ بتا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ ظفر کموڈ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنے خون آلود ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔ اس کے سامنے پلاس پڑا ہوا تھا اور فرش پر دانت بکھرے ہوئے تھے۔ ان دانتوں کو پلاس سے نکالا گیا تھا۔ اب میں جان گیا تھا کہ ظفر چھت پر پلاس سے کس کام کی خیالی مشق کر رہا تھا۔ اس نے میری موجودگی محسوس کر لی اور میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”آپ نے دیکھ لیا شاہد بھائی۔“

”ظفر یہ سب تم نے کیا ہے؟“ میں نے محتاط انداز

میں پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے تھکے لہجے میں اعتراف کیا اور پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس کے لباس پر بھی جا بہ جا خون کے دھبے تھے۔ میں بے ساختہ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آ کر سونیا کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور اس کے سرہانے تکیے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میری گڑیا صرف چھ سال کی تھی۔"

اب میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے آخری دن کے حوالے سے کیا کہا تھا۔ نادیہ سمجھ رہی تھی وہ سونیا کے چھ سالوں کے حوالے سے چھ دن تک اس کا سوگ منا رہا تھا مگر وہ یہ چھ دن کسی اور طرح سے گزار رہا تھا۔ میں نے اپنا موبائل نکالا اور ایمبولینس سروس کے ایک ادارے کو کال کر کے یہاں ایمبولینس بھیجنے کو کہا۔ ظفر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے توجہ بھی نہیں دی تھی۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "ظفر تم نے یہ سب کیسے کیا؟"

"بہت آسانی سے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ ہی میری گڑیا کا قاتل ہے یہ جان لینے کے بعد میں گھر میں رک نہ سکا اور گھر سے نکل کر اس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا پھر جیسے ہی اس کی کار نظر آئی میں نے اسے وہیں روکا اور گن پوائنٹ پر یہاں لے آیا۔"

"تمہارے پاس گن ہے؟" میں چونکا۔

وہ ہنسا اور اس نے دراز کھول کر اس میں رکھا ہوا سیاہ رنگ کا پستول نکالا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے پستول الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔ "کھلونا ہے.... میں سونیا کو مارکیٹ لے کر گیا تھا وہاں اسے پسند آ گیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا کھلونا نہیں لیا مگر یہ اسے اچھا لگا تھا بالکل اصلی لگ رہا ہے نا۔"

میں حیران رہ گیا۔ دیکھنے میں وہ بالکل اصلی لگ رہا تھا۔ ہاں جب ہاتھ میں پکڑا تب پتا چلا کہ نقلی ہے۔ پلاسٹک کا بنا ہوا پستول ہے۔ ظفر مسکرایا۔ "وہ بھی اصلی سمجھا تھا.... اتنے بڑے جسم کے مالک کے اندر چڑیا کا سا دل تھا۔ اصل میں وہ مجرم تھا اس لیے ہمت ہار گیا۔ میری منت سماجت کرتا رہا کہ اسے شوٹ نہ کروں اور آرام سے میری گاڑی کی ڈکی میں آ گیا اس طرح میں چوکیدار کی نظروں سے بچتا ہوا واپس سوسائٹی میں آ گیا۔ میں اسے یہاں لے آیا اور واش روم میں باندھ دیا۔"

میں نے واش روم کی طرف دیکھا۔ "ظفر تم نے یہ سب کیسے کیا، میں تمہیں بالکل بھی ایسا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔"

"میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "یہ صرف سونیا کے لیے کیا ہے۔ وہ صرف چھ سال کی تھی۔ اس نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ انسان کیسا درندہ ہوتا ہے۔ اس نے آج تک صرف محبت دیکھی تھی جب اس نے انسان کا یہ روپ دیکھا تو اسے مرتے ہوئے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ شاید جسم سے زیادہ اس کی روح کو تکلیف ہوئی ہو گی۔"

"اس لیے تم نے اسے چھ دن تک یہاں رکھا.... اسے چھ دن سے اذیتیں دے رہے تھے۔"

"ہاں میں نے پیروں سے شروع کیا تھا اور آج آخری دن تھا۔ سونیا کے چھ سال اس کے چھ دن، میں چاہتا تھا کہ یہ بھی اتنی ہی تکلیف محسوس کرے جتنی میری بچی نے مرتے وقت کی ہوگی۔ شاہد بھائی اگر آپ مجھ سے کہیں کہ آپ کے ہاتھ پر چاقو سے معمولی سا کٹ لگا دوں تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا لیکن اس کے ساتھ یہ سب کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "ظفر تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ میں پولیس میں نہیں ہوں لیکن ہوں تو قانون کا محافظ، اس لیے مجبور ہوں میرے دوست۔ میں تمہیں قانون کے نام پر گرفتار کرتا ہوں۔"

جس وقت میں اسے باہر لا رہا تھا ایمبولینس پہنچ گئی تھی۔ میں نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ پولیس کی آمد سے پہلے سارا محلہ جمع ہو گیا تھا مگر میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ البتہ لوگوں نے بشیر کے نیم مردہ وجود کو ایمبولینس میں جاتے دیکھا تھا۔ پھر پولیس آ کر ظفر کو ساتھ لے گئی۔ اس پر اغوا، حبس بے جا اور تشدد سمیت سات مقدمات بنے تھے۔ بشیر بچ گیا تھا مگر ایک ایسی زندگی جسے موت سے بھی بدتر کہا جا سکتا تھا۔ اس کے پیروں اور ہاتھوں سمیت بیس جگہ سے ہڈیاں توڑ دی گئی تھیں۔ پیٹ اور سینے پر بے شمار کٹ تھے۔ اسے جلایا گیا تھا۔ اس کے بیس دانت نکال دیے گئے تھے اور اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دی تھیں۔ زبان کی نوک کاٹ دی تھی۔ اس نے ظفر کے سامنے سونیا کے قتل کا اعتراف کیا تھا مگر ثبوت اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے عدالت نے اسے بری کر دیا۔ ظفر نے جو کیا اس کا اعتراف کر لیا اور عدالت نے اسے قید کی سزا سنائی تھی۔ جب اسے عدالت سے لے جایا جا رہا تھا تو وہ بہت خوش تھا۔

● ●

درد

محترم معراج رسول
السلام علیکم
یہ صرف ایک واقعہ نہیں ایک احساس ہے جسے ہر ایک کو محسوس کرنا چاہیے۔ ساس کا اپنا ظرف تھا بہو کا اپنا، اب فیصلہ آپ کریں کہ ان دونوں میں ظرف کا بڑا کون ٹھہرا۔

صدرالدین امین بھایانی
(اٹلانٹا، جارجیا)

"بھائی، کریم آباد لے چلو گے؟"

میں شام کے وقت لیاقت آباد سپر مارکیٹ کے قریب اپنے رکشے میں بیٹھا سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ عموماً مجھے سواری کے حصول میں کچھ زیادہ انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی لیکن اُس روز میں کافی دیر سے اپنے مخصوص ناکے پر سواری کے انتظار میں کھڑا شیشے کے پار کہیں دور خلاؤں میں گھورتا ہوا سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اُس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ لہجہ اور آواز بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا!

یہ آج سے کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے نیا نیا رکشا چلانا شروع کیا تھا۔ خیر ارادہ تو میرا کچھ اور ہی تھا۔ ویسے بھی اُس وقت تو میں پڑھ ہی رہا تھا۔ میٹرک کے امتحانات سر پر تھے۔ ایک روز اچانک ابا کی کمر میں ایسا

رباعی

اے رنگ سخن دری جمانے والو
پھل غیر کے پیڑوں کا اڑانے والو
تحصیل تو روشنی کی ناممکن ہے
پانی سے چراغوں کو جلانے والو

شاعر: ظفر کمالی

درد اٹھا کہ وہ بستر سے ہی جا لگے۔ ابا کی کمر کے درد کا قصہ تو میں ہوش سنبھالتے ہی سنتا آیا تھا۔ ابا سارا سارا دن رکشا چلا کر جب رات دیر گئے گھر آتے تو جو پہلی بات اُن کی زبان سے نکلتی وہ کمر کے درد کی شکایت ہوتی۔ ”ہائے...! شوکت کی ماں... ہائے...! یہ کمر کا درد تو کسی دن میری جان لے کر ہی چھوڑے گا! سارا سارا دن کھڑی کمر رکشا چلا چلا کر تو میری کمر کا دھڑن تختہ ہو کر رہ گیا ہے۔“

پھر اماں دیر تک اُن کی کمر پر کسی سیانی محلہ والی کے بتائے تیل کی مالش کرتیں۔ اگلے روز وہ صبح صبح اپنی کمر سہلاتے رکشا لے کر نکل پڑتے اور رات دیر گئے پھر درد کی دھائیاں دیتے واپس آ کر اماں سے مالشیں کرواتے۔ مالش سے کچھ افاقہ تو نہ تھا، ہاں البتہ اتنا اطمینان ضرور ہو جاتا تھا کہ چلو کوئی نہ کوئی علاج تو ہو رہا ہے نا! اماں اکثر اپنی جھولی پھیلائے، آنکھوں میں آنسو لیے ابا کے درد کے درماں کی دعائیں مانگتیں۔ لیکن شاید اماں کی دعاؤں میں بھی اُس تیل کی طرح کوئی اثر نہ تھا جس کی نہ جانے کتنی ہی بوتلیں وہ ابا کی کمر پر انڈیل چکی تھیں۔

ابا کے بہت سے دوستوں نے انہیں مشورے بھی دیے کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا کر ذرا لگ کر علاج کروا لو۔ لیکن جس گھر میں کھانے والے سات منہ اور کام کرنے والے صرف دو ہی ہاتھ ہوں وہاں ڈاکٹر اور اُس کی لکھی ہوئی مہنگی دواؤں کا بھلا کیا کام؟

ابا کو اس ہر وقت کے کمر درد نے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ شاید اس میں اُن کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ جب کوئی تیس بتیس سال دن رات بلاناغہ رکشا کی پتھر جیسی سخت سیٹ پر بیٹھ کر کراچی کی ٹوٹی پھوٹی کھنڈر سڑکوں کے جھٹکے برداشت کرتا بے ہنگم ٹریفک کے شور اور دھوئیں سے آلودہ فضا میں بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے رکشا چلائے گا تو اُس کی کمر اور مزاج کا حشر تو آخر وہی ہونا تھا نا جو ابا کا ہوا۔

ابا جیسے ہی گھر میں داخل ہوتے، ہم سب بچے بانسے ادھر اُدھر ہو لیتے۔ اگر کوئی شامت اعمال کا مارا ابا کے ہتھے چڑھ گیا تو سمجھو جیسے قیامت ہی آ گئی۔ دو چار کرارے ہاتھ جڑ دینا تو روز کا معمول تھا۔ ہم بچوں کے ساتھ ساتھ اماں کی بھی شامت آتی۔ وہ بے چاری خواہ کتنا ہی اچھا کھانا کیوں نہ پکا لے، کپڑے کتنے ہی صاف ستھرے کیوں نہ دھو لے اور گھر کے کونے کونے کو جھاڑ پونچھ کر کتنا ہی کیوں نہ چمکا دے۔ ابا ہر کام میں کیڑے نکال کر جلی کٹی سنانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ابا کی کمر کا درد بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا اور مزاج بھی مزید چڑچڑا ہوتا چلا گیا۔

آخر آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ رکشا لے کر نکل تو جاتے لیکن چند ہی گھنٹوں بعد کمر تھامے ہائے ہائے کرتے واپس چلے آتے۔ اُن کے گھر آتے ہی ہم سب بچے گلی کی راہ لیتے اور جب تک یہ یقین نہ ہو جاتا کہ ابا سو گئے ہیں، کوئی بھی گھر واپس نہ آتا۔ پھر اُس روز تو کچھ ایسا درد اٹھا کہ ابا ہمیشہ کے لیے چارپائی کے ہی ہو کر رہ گئے۔

میں گھر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اُس وقت میری عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس تو ضرور رہی ہو گی۔ میرے پیچھے دو چھوٹے بھائیوں کے علاوہ دو بہنیں اور تھیں۔ اماں نے خود تو کچھ نہ کہا البتہ اُن کے چہرے پر پھیلتے تاریک سائے، آنکھوں میں تیرتی بے چارگی، گھر کے حالات اور ابا کی مستقل معذوری نے مجھے خود سے ہی رکشے کی پتھریلی سیٹ پر عین اُس وقت سوار ہونے پر مجبور کر دیا، جب میٹرک کے امتحانات میں کوئی چند ماہ رہ گئے تھے۔

سو وہ دن اور آج کا دن، میں رکشا چلا کر اپنے خاندان جس میں ایک عدد بیوی اور دو بچوں کا اضافہ ہو چکا ہے، کی کفالت میں مصروف عمل ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میں بھی جب رات دیر گئے گھر پہنچتا ہوں تو ابا کی طرح میری بھی کمر میں درد اور زبان پر ہائے ہائے ہی ہوتی ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ میرا مزاج بھی اب کوئی ابا سے کم چڑچڑا نہیں رہ گیا۔ میرے گھر واپس آتے ہی بہن بھائی اور بچے کونے کھدروں میں جا دبکتے ہیں۔ اماں اور بیوی تو اب جیسے میری کڑوی کسیلی اور جلی کٹی باتوں کی اِس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہہ دوں، انہیں تو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ باقی رہ گئے ابا تو وہ بے چارے چند سالوں تک چارپائی پر پڑے رہے اور پھر ایک روز خاموشی سے اللہ کو پیارے ہو گئے...!

مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ جمعرات کا دن تھا۔ مجھے رکشا چلانا شروع کیے ابھی کوئی دو ایک ماہ ہی گزرے ہوں گے۔ میں صبح سویرے اپنی مقررہ جگہ کھڑا سواری کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”بھائی، بلال کالونی لے چلو گے؟“

مڑ کر دیکھا تو سیاہ برقعہ میں لپٹی، نکلتے ہوئے قد کی ایک دبلی پتلی سی عورت کھڑی نظر آئی۔ آواز سے عمر کچھ پچیس تیس سال کے لگ بھگ جان پڑتی تھی۔ میرے سر ہلانے پر خاموشی سے رکشے میں بیٹھ گئی۔ منزل مقصود پر پہنچے تو کرایہ ادا کرتے ہوئے بولی ”بھائی، کیا تم شام چار بجے واپس آ کر مجھے وہیں چھوڑ سکتے ہو جہاں سے میں سوار ہوئی تھی“۔

میں نے دھیرے سے سر ہلا دیا اور وہ مزید کچھ کہے بنا اُس چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئی جہاں اُس کے کہنے پر میں نے رکشا روکا تھا۔

اُس تنگ سی گلی میں رکشے کے کھڑے ہونے کے بعد بمشکل ایک سائیکل یا کسی راہگیر کے گزرنے کی جگہ ہی بچ رہی تھی۔ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک موسموں کی چیرہ دستیوں کا شکار، رنگ و روغن اور مرمت سے عاری ایک دوسرے سے جڑے مکانات اپنے مکینوں کی غربت و افلاس کی داستان بیان کر رہے تھے۔

میں نے باقی وقت قرب و جوار کی سواریاں بھگتانے میں صرف کر دیا اور چار بجنے سے ذرا پہلے اُسی مکان کے سامنے رکشا لا کھڑا کیا۔ وہ حسب وعدہ عین وقت پر گھر سے برآمد ہوئی اور چپ چاپ رکشے میں بیٹھ گئی۔

جب میں نے اُسے واپس چھوڑا تو کرایہ ادا کر چکنے کے بعد مجھ سے بولی ”بھائی، تم مجھے جمعرات کی جمعرات صبح بلال کالونی لے جا کر شام کو پھر واپس یہیں چھوڑ دیا کرو“۔

میں نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اگلی جمعرات کو صبح آٹھ بجے اِسی مخصوص جگہ پر آنے کا کہہ کر چل دی۔

کم و بیش پانچ چھ سالوں تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ پھر اچانک اُس نے آنا بند کر دیا۔ میں یہ سوچ کر دو ایک گھنٹے وہاں کھڑا رہا کہ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ شاید آج کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہو۔ بحرحال اُس نے نہ آنا تھا اور وہ نہ آئی۔ اُن گزرے برسوں میں نہ تو اُس نے مجھ سے کبھی کوئی بات کی اور خود میں بھی یہ جرأت ہی کر سکا کہ اُس کے

بارے میں کچھ پوچھ ہی لوں۔ دن، مہینے، سال گزرتے گئے۔ آج ایک بار پھر میں نے وہی آواز دوبارہ سنی۔ میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو۔۔ وہی تھی اور ہمیشہ کی طرح سے سیاہ برقعے میں ملبوس رکشے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ میں نے فوراً سر ہلا دیا۔ وہ رکشے میں سوار ہوگئی۔ رکشا اپنی پوری رفتار کے ساتھ سڑک پر دوڑا چلا جا رہا تھا. لیکن شاید وہ بھی میری سوچوں کی رفتار کا ساتھ دینے سے قاصر دکھائی دیتا تھا۔ میرے ذہن میں کئی سوالات نے سر اٹھایا۔

''آخر یہ خاتون ہے کون؟''

''برسوں پہلے وہ جمعرات کے جمعرات اُس اُجڑے، بے رنگ و روغن مکان میں کیا کرنے جایا کرتی تھی؟''

''پھر اچانک وہ کہاں غائب ہوگئی؟''

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں رکشے کو اُسی وقت سڑک کے کنارے روک کر اِن سارے سوالوں کے جواب طلب کرلوں۔

کریم آباد کے ایک گنجان آباد محلے میں تازہ تازہ سفیدی کیے مکان کے سامنے اُس نے رکشا رکوایا اور اپنے بٹوے سے کرائے کی رقم نکالنے لگی۔ میرا دھیان کرائے سے زیادہ اپنے اُن سوالات کی جانب تھا جن کے جواب جاننے کے لیے میں بے چین ہو رہا تھا۔ ابھی میں اُسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ اُس نے کرایہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور مڑ کر گھر کی جانب چل دی۔

میں اپنی طبیعت پر جبر کر کے مڑا۔ رکشے کا انجن بند ہو چکا تھا۔ میں نے جھک کر ایک ہاتھ سے ایکسیلیٹر اور دوسرے سے انجن سے منسلک ڈنڈے نما لیور کو تھاما اور زور لگا کر اُوپر کی جانب کھینچا۔ درد کی ایک انتہائی تکلیف دہ لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی پورے جسم میں دوڑ گئی۔ شدتِ درد سے میں چیخ اٹھا۔

''ارے بھائی کیا ہوا۔ تم ٹھیک تو ہونا؟'' وہ خاتون جو کہ دروازے تک پہنچ چکی تھی میری درد بھری چیخ سُن کر دوڑتی ہوئی آئی اور مجھے سڑک پر تکلیف کی شدت سے سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر بولی۔

''جی... باجی وہ... اِس کمر کے درد نے پریشان کر رکھا ہے...'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں دھیرے سے جواب دیا۔

یہ سُن کر وہ مجھے اپنے ہاتھ سے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے واپس مڑی اور گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ چند لمحات کے بعد گھر کے دروازے سے لگ بھگ چالیس پینتالیس سال کا صحت مند سا چوڑے چکلے ہاتھوں اور کاندھوں والا ایک مرد برآمد ہوا۔ میں اُس کے سہارے دھیرے دھیرے چلتا دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے بغیر چھت والے صحن میں بچھی چارپائی پر اُس نے مجھے لٹا دیا۔

''ہاں اب بتاؤ کہ تمہیں یہ کمر کا درد کب سے ہے؟'' اُس نے چارپائی کے سامنے رکھے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اُسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ میری بات سُن کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اندر کمرے میں جا کر ایک بڑی سی لکڑی کی پیٹی لے آیا۔ پیٹی کو چارپائی کے سامنے رکھ کر جب اُسے کھولا تو مجھے خیال آیا کہ شاید یہ کوئی جرّاح ٹائپ شخص ہے کیونکہ پیٹی میں مختلف رنگوں کے مرہم، تیل سے بھری بوتلیں اور پٹیاں لگانے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ پہلے اُس نے میری کمر پر تیز کڑوی بُو والے سیاہ تیل سے کافی دیر تک مالش کی۔ پھر روئی کے موٹے موٹے پھاہوں پر ایک چوڑے منہ کی بوتل سے کوئی سیاہی مائل سبز مرہم نکال کر لگایا اور پھر درد کے مقام پر رکھ کر پیٹ اور کمر کے ساتھ کس کر پٹیاں باندھ دیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا تیل اور کیسا مرہم تھا جو اُس نے میری کمر پر لگایا۔ آیا وہ اُس کے چوڑے اور مضبوط ہاتھوں کی بھرپور مالش تھی یا پھر اُس تیل اور مرہم کا کمال؟ لیکن سچ تو یہ تھا کہ میرے درد میں واضح طور پر کمی آ چکی تھی۔

ابھی میں اِسی سوچ میں گم تھا کہ وہی عورت اپنے ہاتھ میں چائے کا پیالہ لیے اندر سے برآمد ہوئی۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی چادر میں لپیٹ کر سر کو اچھی طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک نور اور پاکیزگی تھی۔ چائے کا پیالہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی ''لو بھائی، یہ گرم گرم چائے پی لو۔ اِس میں میرے شوہر کی بتائیں چند بوٹیاں بھی شامل ہیں۔ اِس کے پینے سے تمہاری تھکان اور کمر کا درد جاتا رہے گا۔''

چائے کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے میں نے سوچا کہ میں پوچھ ہی لوں کہ آخر وہ ماجرا کیا تھا؟ لیکن اُس کا شوہر سامنے ہی بیٹھا ہے۔ کیا خبر اُسے اُس قصے کا پتا ہی نہ ہو۔

اور میرے کچھ کہنے سے ان کے تعلقات بگڑ جائیں۔ یہ سوچ کر میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا۔ ''جی بہت شکریہ، باجی...''

وہ اپنے شوہر کے برابر رکھے مونڈھے پر بیٹھ گئی اور میرے چہرے پر پھیلی کشمکش کو بھانپ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بھائی، ویسے میں نے تمہیں اُسی وقت پہچان لیا تھا جب میری آواز سن کر تم چونک کر مڑے تھے۔''

''اچھا! باجی تو تم نے مجھے پہچان لیا؟''

''بھائی، یہ کیسے ممکن ہے کہ تم میری آواز سُن کر مجھے پہچان لو اور میں تمہیں دیکھ کر بھی نہ پہچان سکوں۔ یہی نہیں بلکہ میں تمہارے چہرے پر پھیلی اِس کشمکش کو بھی پڑھ چکی ہوں۔''

''جی کیسی کشمکش؟'' میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں، کیا تم یہ نہیں سوچ رہے کہ میں کئی سالوں تک بلال کالونی کے اُس مکان میں کیوں جاتی رہی؟'' اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا معنی خیز تبسم تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی فقط اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔

''میرا نام مہربانو ہے اور یہ ہے میرا شوہر اسلم جرّاح۔'' اتنا کہہ کر اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی شوہر کی طرف دیکھا۔ جواباً وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''میری اسلم سے ملاقات اُس کی جراحی کی دکان میں ہوئی تھی۔''

''جراحی کی دکان میں...'' جیسے ہی وہ سانس لینے کو رکی۔ میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں، جب میں وہاں اپنے سابقہ شوہر کی لگائی چوٹوں کی مرہم پٹی کے لیے گئی تھی۔''

''سابقہ شوہر...'' اب یہ میرے لیے ایک اور جھٹکا تھا۔

''میرا سابقہ شوہر اپنی ماں کی لگائی بجھائی پر اِس قدر بے رحمی سے میری پٹائی کیا کرتا کہ میرے نیل پڑ جاتے۔ ایک روز ایک محلہ والی ترس کھا کر مجھے اسلم جرّاح کے پاس لے گئی۔''

''لیکن باجی، وہ تم کو پیٹتا کیوں تھا؟'' میں نے چائے کا خالی پیالہ زمین پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اُس کی ماں کا یہ ارمان تھا کہ وہ جلد از جلد دادی بن جائے۔ پہلے دو ایک برس تو وہ کچھ نہ بولی، لیکن جب شادی کے چار سال بعد بھی ہمارے کوئی بچہ نہ ہوا تو اُس نے اپنے بیٹے کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ تمہاری بیوی تو بانجھ ہے۔ وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ میرا شوہر اپنی ماں کی باتیں سن کر مجھے تو کچھ نہ کہتا لیکن دل ہی دل میں جلتا کڑھتا رہتا۔ جب اُس نے دیکھا کہ اُن باتوں کا بیٹے پر کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا تو جب وہ کام سے تھکا ہارا گھر واپس آتا، اُس کے سامنے میری جھوٹی شکایتیں لگانا شروع کر دیتی۔ چند روز تک تو وہ یہ باتیں سنتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی ماں کی باتوں میں آ کر مجھ پر ہاتھ اُٹھانا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک روز ساس نے میرے کردار پر اُسی

تہمت دھری کہ غصے میں آ کر اُس نے مجھے طلاق دے دی اور کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔"

"مہربانو کے حالات سے تو میں پہلے ہی سے واقف تھا۔ جو خاتون اِسے میرے پاس لے کر آئی تھی۔ اُس کی زبانی مجھے طلاق ہونے کی خبر بھی مل گئی۔ کوئی چھ ماہ بعد میں نے مہربانو کے گھر رشتہ بھجوایا اور آج ماشاءاللہ مہربانو میری بیوی اور میرے تین بچوں کی ماں ہے۔" اسلم جرّاح پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔

"باجی تو پھر تمہارے سابقہ شوہر نے دوسری شادی کی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں...!، مجھے طلاق دلواتے ہی اُس کی ماں نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیٹے کی دوسری شادی کروادی۔ لیکن شادی کے تین سال گزر جانے کے بعد بھی اُن کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُس نے ایک بار پھر وہی کھیل کھیلنا چاہا۔ لیکن اِس بار صیاد خود اَپنے جال میں آپ پھنس گیا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"میرے سابقہ شوہر کی یہ نئی بیوی اپنی ساس سے بھی زیادہ تیز نکلی۔ ایک روز وہ شوہر کو لے کر اپنے میکے حیدرآباد ایسی گئی کہ پھر مڑ کر واپس ہی نہ آئی۔ سُنا ہے کہ وہاں اُس کے گھر والوں نے اُس کے شوہر کو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروا دیا تھا اور وہ اپنی بوڑھی ماں کی روز روز کی شکایتوں سے بے زار ہو کر اُسے بھول بھال کر بس وہیں کا ہو رہا۔"

"اور اُس کی ماں کا کیا ہوا؟" میں نے مزید بے تابی سے پوچھا۔

"اپنے بیٹے کی جدائی اور نافرمانی کا اُس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ بیمار ہو کر اپنے بستر سے جا لگی۔ محلے والے ترس کھا کر کھانا کھلا دیا کرتے۔ ایک روز یہ بات اسلم کو اُسی محلہ والی عورت نے بتائی۔ اسلم نے اُس کا تذکرہ مجھ سے کیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسلم سے کہا کہ کیا میں کسی روز اُس سے جا کر مل سکتی ہوں؟ اسلم بولا تم اُسے شرمندہ کرنے کی خاطر وہاں جانا چاہتی ہو؟ لیکن بات یہ تھی کہ مجھے اِس پر رحم آ رہا تھا کہ وہ اِس بڑھاپے اور بیماری کی حالت میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ یہ سُن کر اسلم نے مجھے خوشی خوشی وہاں جانے کی اجازت دے دی اور کچھ رقم بھی دے دی۔ میں جمعرات کی جمعرات وہاں جاتی۔ اُسے نہلاتی دھلاتی، گھر صاف کرتی اور سودہ سلف لا کر ڈھیر ساری کھانے کی چیزیں بنا کر واپس چلی آتی۔ پھر چند سالوں بعد اِس کا انتقال ہو گیا۔"

"باجی اُس عورت نے اپنے بیٹے سے تم کو بے جا طلاق دلوا دی۔ تمہیں تو اُس سے بدلہ لینا چاہیے تھا اور پھر کوئی رشتہ بھی تو باقی نہ رہ گیا تھا جو تم وہاں جا جا کر اُس کی خدمتیں کرتی رہیں۔"

"تھا ایک رشتہ...! درد کا رشتہ...!"

"درد کا رشتہ...؟"

"ہاں درد کا رشتہ...! ہمارے درمیان درد ہی کا تو رشتہ تھا! ہمارا درد ایک سا ہی تو تھا! مجھے اُس کے کہنے پر اُس کے بیٹے نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور وہی بیٹا خود اِس کی ارمانوں سے لائی بہو کے کہنے پر اُسے چھوڑ کر چلا گیا!"

"اور باقی رہ گئی بات بدلہ لینے کی تو میرے خیال میں یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ جس کا جیسا ظرف تھا اُس نے وہی کیا۔" مہربانو باجی نے جیسے ہی اپنی بات ختم کی اسلم بول پڑا۔

اُس روز میں مہربانو کے گھر سے نکلا تو شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ دل کچھ بوجھل سا ہو رہا تھا۔ مزید سواریاں اٹھانے کا بالکل بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ رکشے کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ گھر کے عین دروازے پر میرا پانچ سالہ بیٹا وحید کھیل رہا تھا۔ اُس کے سارے کپڑے مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اُس نے میرا رکشا دیکھا فوراً گھر کی طرف بھاگا۔

"وحید...! اِدھر آؤ...!" میں نے اُسے بھاگتے دیکھ کر حسبِ معمول زور سے آواز لگائی۔

وحید مڑا اور دھیرے دھیرے میری طرف بڑھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے سے خوف نمایاں تھا۔ جب وہ میرے بالکل قریب پہنچا تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اُسے ڈر تھا کہ روز کی طرح سے خاک آلودہ کپڑوں کو دیکھ کر میں اِس کے گالوں پر زوردار تھپڑ نہ رسید کر دوں۔ میں اُس کی طرف جھکا اور اپنا دایاں ہاتھ کھول کر اوپر اُٹھایا۔ میرا ہوا میں لہراتا ہاتھ دیکھ کر اُس کی بڑی بڑی آنکھیں بھر آئیں اور مارے خوف کے لرزنے لگا...!

میں نے اپنے ہاتھ سے اِس کے خاک آلود لباس کو اچھی طرح سے جھاڑ کر صاف کر دیا۔ پھر گود میں اٹھا کر اِس کے سُرخ و سفید چہرے جہاں اب خوف کی جگہ حیرت نے لے لی تھی کو چومتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا...!

بدلہ

محترم معراج رسول
آداب
میں پیشے سے وکیل ہوں صبح شام ایسے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ زیرنظر واقعہ بھی حیران کردینے والا ہے۔ یہ عقل سے ماوریٰ واقعہ ہے لیکن گواہ میں خود ہوں۔

محمد ندیم ایڈووکیٹ
(کراچی)

کبھی کبھی پیشہ ورانہ زندگی میں کچھ ایسے واقعات سامنے آجاتے ہیں کہ سوائے حیران ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

میں ایک بار اپنے مرشد سعید صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے فرمایا۔ "یہ جو کائنات ہے، یہ بھید کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اگلے موڑ پر اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگلی طرف موت اس کا انتظار کر رہی ہے یا زندگی۔ یا کچھ اور۔"

"اور یہ جو کچھ اور ہے۔ دراصل یہی کچھ اور ہے۔ خوابوں کا ایک سلسلہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ خواب سے جاگے تو خواب میں آئے۔ خوابوں کا سرمایہ خواب۔ صرف حقیقت آنکھیں ہیں۔ ورنہ ساری دنیا خواب۔"

میں مرشد کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ کیسے بھید کیسے خواب۔

پھر بعد میں میرے ساتھ جو واقعہ ہوا تو پتا چل گیا کہ یہ دنیا واقعی بھیدوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہے۔

میں اپنے بارے میں یہ بتا دوں کہ میں پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ آپ نے وکیلوں کے بارے میں بہت کچھ الٹی سیدھی باتیں سن رکھی ہوں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلا دوں کہ میں ان چند وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو گناہ گار کو بے گناہ ثابت کر کے اپنی فیس لیتے ہیں۔ بلکہ اگر کوئی واقعی مجرم ہو تو میں اس کا کیس ہی ہاتھ میں نہیں لیتا۔ اور اگر کوئی بے گناہ ہو تو اس کو اس مصیبت سے نجات دلانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہوں۔ اور میرا خدا میرا پورا ساتھ دیتا ہے۔

اس واقعے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مجھے ایک شخص کی عیادت کے لیے ایک مضافاتی بستی داؤد گوٹھ جانا پڑ گیا۔

داؤد گوٹھ شہر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ کلومیٹر۔ لیکن چونکہ وہاں آبادی کا زیادہ دباؤ نہیں ہے۔ اسی لیے اس کی مرکزی شاہراہ پر ٹریفک بھی بہت کم ہوا کرتی ہے۔ وہ بیمار شخص اسی گوٹھ میں رہا کرتا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی مرکزی شاہراہ پر ایک طرف کھڑی کر دی۔ اس کا انجن بند کر دیا اور اسی وقت ایک پولیس موبائل میری گاڑی کے پاس آکر رک گئی۔

"اوہو ندیم صاحب ہیں۔" کسی نے موبائل سے آواز لگائی۔

میں نے موبائل کی طرف دیکھا۔ میرا ایک واقف کار انسپکٹر تنویر موبائل سے اتر کر گاڑی کی طرف آرہا تھا۔ ہم دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔

"یار، اس طرف کہاں سے آنکلے۔" تنویر نے پوچھا۔

"بھائی، یہاں عدالت کا ایک کارندہ رہتا ہے، رحیم اللہ۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ بہت بیمار ہے تو اس کو دیکھنے آگیا ہوں۔"

"ہاں ہاں، جانتا ہوں اس کو۔" تنویر نے کہا۔ "بے چارہ واقعی بہت بیمار ہے لیکن پہلے ہمارے تھانے سے ہوتے جائیں۔ آج ہمارے سب انسپکٹر کے گھر سے حلیم آیا ہے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ تم پہنچو میں رحیم اللہ کو دیکھ کر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نے گاڑی تو کھڑی کر دی ہے۔ وہ سامنے والا کچا راستہ سیدھا اسی کے مکان پر جاتا ہے۔"

میں اسی کچے راستے پر چلتا ہوا رحیم اللہ کے مکان پر آگیا۔ وہ بے چارہ مجھے دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔

"ارے وکیل صاحب، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھ غریب کو دیکھنے اتنی دور آجائیں گے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو بھائی۔ کون امیر کون غریب۔" میں نے کہا۔ "میں بھی تمہاری طرح ایک مزدور ہوں۔ یہ بتاؤ اب کیسے ہو۔"

"اب تو پہلے سے بہت بہتر ہوں وکیل صاحب۔" اس نے بتایا۔

"بس جلدی سے ٹھیک ہو کر اپنا کام شروع کر دو۔" میں نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو، ان سے پھل وغیرہ کھا لینا۔"

وہ انکار کرتا رہا۔ لیکن میں نے اس کی جیب میں نوٹ ڈال دیے۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں اس کے گھر سے باہر آگیا۔ ابھی اس کے گھر سے کچھ ہی دور چلا ہوں گا کہ میں نے شور سنا۔ کچھ لوگ ڈنڈے لاٹھیاں اٹھائے ایک طرف دوڑتے جا رہے تھے۔ شاید وہ کسی کا تعاقب کر رہے تھے۔ کیونکہ اسی قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ "وہ اس طرف جا رہا ہے۔ ادھر سے گھیرو۔"

"وہ ادھر ہے اس طرف۔ میں نے خود دیکھا ہے۔"

میں نے ایک بوڑھے کو پکڑ لیا۔ جو بے چارہ اس دوڑتے ہوئے مجمع کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ "بابا کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا۔ "کیا کوئی چور آگیا ہے؟"

"نہیں صاحب جی، یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔"

میرے معلوم کرنے پر اس بوڑھے نے جو کچھ بتایا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ دو برس پہلے ایک کمبل پوش اس علاقے میں آیا اور وہ ایک کھیلتے ہوئے بچے کو اپنے ساتھ

لے گیا۔ شام کے وقت اس بچے کی لاش ایک درخت کے پاس پڑی ملی تھی اور اسے سانپ نے کاٹا تھا۔ اس کے بعد والے سال بھی ایسا ہی ہوا۔ کمبل پوش آیا اور ایک بچے کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کی لاش بھی اسی درخت کے پاس ملی تھی اور اس کو بھی سانپ نے کاٹا تھا۔ اس سال بھی وہ یہاں آیا لیکن بچے کو لے جانے میں ناکام رہا۔ کیونکہ کچھ لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب سب اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

تو یہ تھی وہ کہانی جو مجھے اس بوڑھے نے بتائی۔ حیرت انگیز صورت حال تھی۔ بہرحال میں اپنی گاڑی کے پاس آگیا۔ گاڑی اپنی جگہ موجود تھی۔ ویسے بھی ایسے علاقوں میں گاڑی وغیرہ کی چوریاں نہیں ہوا کرتیں۔

میں نے اس وقت ایک عورت کو دیکھا جو سڑک سے کچھ فاصلے پر بڑی بے چینی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ میں اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس کے لباس وغیرہ سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس علاقے کی نہیں ہوسکتی تھی۔

بہرحال مجھے اس سے کیا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ گاؤں والے بھی اب دکھائی نہیں دے رہے تھے جو کسی پُراسرار آدمی کا پیچھا کر رہے تھے۔ نہ جانے وہ کس طرف نکل گئے ہوں گے۔

دس منٹ کے بعد میں اس علاقے کے تھانے پہنچ گیا جہاں انسپکٹر تنویر میرے انتظار میں تھا۔ "آؤ یار، کہاں رہ گئے تھے۔ تمہارا حلیم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔"

"بھائی، ادھر گاؤں والے کسی بندے کو پکڑنے کے چکر میں اس کے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔" میں نے بتایا۔ "پتا ہے وہ ہر سال ایک بچے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔"

"ہاں یار، سنا تو میں نے بھی ہے۔ اس کی ایف آئی آر بھی لکھی ہوئی ہے۔ آپ رہنے دیں جی۔ ان علاقوں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔"

ابھی ہم حلیم کھا ہی رہے تھے کہ ایک پولیس والے نے آکر بتایا۔ "بڑی سڑک پر ایک گاڑی والے نے ایک بندے کو کچل کر مار دیا ہے۔"

"یہ لو وکیل صاحب، یہ نئی کہانی آگئی۔ تم تو حلیم کھاؤ میں چلتا ہوں۔ دیکھوں تو سہی کس نے کس کو مار دیا ہے۔ اگر لمبا چکر ہوا تو مجھے لاش لے کر اسپتال جانا ہوگا۔"

"تم میری فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں حلیم کھا کر نکل رہا ہوں۔"

☆☆☆

یہ معمولی واقعہ تھا جس کی طرف میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ بلکہ اپنی مصروفیات میں اس واقعہ کو بھولتا جا رہا تھا کہ ایک دن دفتر میں ایک عورت مجھ سے ملنے کے لیے آگئی۔

وہ ایک خوبصورت جوان عورت تھی۔ لیکن بہت اداس اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"تشریف رکھیں محترمہ۔" میں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ پڑھی لکھی بھی ہے اور اسے مینرز بھی آتے ہیں۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے زبان کھولی۔ "وکیل صاحب، خدا کے لیے میرے شوہر کو بچالیں۔ میں آپ کی شہرت سن کر آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"دیکھیں محترمہ، بچانے والی ذات تو خدا کی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "انسان تو صرف کوشش ہی کرسکتا ہے۔"

"اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"تو فرمائیں۔ کیا ہوا ہے آپ کے شوہر کے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں مرڈر کے ایک کیس میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اوہ! یہ تو سنجیدہ معاملہ ہے۔ کس کے مرڈر کا الزام ہے ان پر۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا بتاؤں۔ میں بھی ان ہی کے ساتھ تھی۔"

"یعنی جس وقت آپ کے شوہر نے کسی کا مرڈر کیا اس وقت آپ بھی ان کے ساتھ تھیں۔"

"جی ہاں، اور میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ شاہد نے کسی انسان کو نہیں مارا بلکہ اس نے ایک سانپ کو مارا تھا۔" اس نے بتایا۔

"سانپ کو۔"

"جی ہاں۔ خدا گواہ ہے انہوں نے سانپ کو مارا تھا۔" اس عورت نے بتایا۔

"محترمہ، بہتر یہی ہے کہ آپ ذرا تفصیل سے بتائیں کہ ہوا کیا تھا۔"

"ہم دونوں کبھی کبھی شہر سے باہر لانگ ڈرائیو پر نکل

جاتے ہیں۔" اس نے بتانا شروع کیا۔ "اس دن بھی ہم شہر سے باہر داؤد گوٹھ کی طرف نکل گئے تھے۔"

"داؤد گوٹھ۔" میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں رحیم اللہ کی عیادت کے لیے گیا تھا۔

"ہم مزے مزے سے چلے جا رہے تھے کہ اچانک سڑک پر ایک سانپ لہراتا ہوا دکھائی دے گیا۔ میرے شوہر نے کہا کہ یہ خطرناک سانپ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کو کچل دیا جائے۔ میرے شوہر نے سانپ کو کچل دیا۔ لیکن وہ پہلی بار میں مرا نہیں تھا بلکہ صرف زخمی ہوا تھا۔ میرے شوہر نے گاڑی ریورس کی اور دوبارہ کچل دیا۔ اتنی دیر میں پولیس پہنچ گئی اور ہم نے دیکھا کہ سڑک پر سانپ تو نہیں البتہ ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔"

"بہت الجھی ہوئی کہانی ہے۔" میں نے ضروری باتیں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لی تھیں۔ "ٹھیک ہے، میں یہ کیس لینے سے پہلے آپ کے شوہر سے ملوں گا۔"

"ضرور۔" اس عورت نے کہا۔ "وہ داؤد گوٹھ تھانے کے لاک اپ میں ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ وہ تھانہ تنویر ہی کا تھا۔ اسی تھانے میں اس دن میں نے حلیم کھایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ واقعہ بھی اسی دن کا ہوگا جب میں نے کچھ لوگوں کو ڈنڈے لاٹھیاں لیے کسی کے تعاقب میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

یہ بھی ایک دلچسپ کیس معلوم ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے اس عورت سے کیس لینے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن شرط وہی تھی کہ اگر وہ میری نگاہوں میں مجرم ثابت ہوا تو میں یہ کیس نہیں لڑوں گا۔ وہ کوئی اور وکیل کر لے۔"

☆☆☆

میں ایک بار پھر داؤد گوٹھ کے تھانے میں تنویر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"کمال ہو گیا وکیل صاحب! یہ کیس بھی آپ ہی کے پاس پہنچ گیا۔" اس نے کہا۔

"کیا کروں بھائی، مصیبتیں مجھ ہی کو تلاش کرتی ہوئی آتی ہیں۔"

"ویسے ایک بات بتاؤں۔ مجھے بھی وہ بندہ جھوٹا نہیں معلوم ہوتا۔" تنویر نے کہا۔ "اس کا بیان ہے کہ اس نے کسی بندے کو نہیں بلکہ سانپ کو مارا تھا۔"

"کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب آپ سے ملاقات تو کروانا ہوگی نا وکیل صاحب۔" تنویر ہنس پڑا۔ "آپ ویسے تو واپس نہیں جائیں گے۔"

اس عورت کا شوہر شاہد لاک اپ میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو وہ خوش ہو گیا۔ "جی ہاں، میں نے بھی آپ کا نام سن رکھا ہے۔" اس نے کہا۔ "خدا کے لیے اس مصیبت سے نجات دلوائیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کم بخت سانپ انسان کیسے بن گیا۔ یا ہو سکتا ہے کہ میں واہمے کا شکار ہو گیا ہوں۔ وہ انسان ہی ہو۔ بہرحال میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"چلیں، آپ وکالت نامہ پر سائن کریں۔" میں نے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔ "اس کے بعد دیکھتا ہوں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

شاہد سے سائن کرا کے میں تنویر کے پاس واپس آ گیا۔ وہ اس وقت گاؤں کے کسی آدمی سے الجھا ہوا تھا۔ وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ "انسان کا بندہ بن جا۔ شرم کر، اتنا کڑیل جوان ہو کر عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

"صاحب، وہ بھی تو زبان چلاتی ہے۔" اس نے کہا۔

"اوئے مرد بن۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو اسے مارنا شروع کر دے۔ اب جا، بھاگ جا۔ آئندہ کوئی شکایت ملی تو بند کر دوں گا۔"

گاؤں والا جان بچا کر بھاگ نکلا۔

اس کے جانے کے بعد تنویر نے کہا۔ "دیکھ لیا وکیل صاحب۔ ان علاقوں میں دن بھر یہی ہوتا رہتا ہے۔ میں بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھگا دیتا ہوں۔"

"چلو، یہ تو تم خدمتِ خلق کر رہے ہو۔"

"ہاں جی، اب بتائیں، کیسا لگا وہ بندہ۔"

"بندہ تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی نگاہوں نے دھوکا ہی کھایا ہو۔ اس نے انسان کو سانپ سمجھ لیا ہو۔"

"کچھ عجیب کہانی ہے وکیل صاحب۔ بندہ بھی جھوٹا نہیں معلوم ہوتا۔ دوسری طرف گاؤں والے بھی جھوٹ نہیں بول رہے۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ اس نے ایک بندے کو کچل کر مارا تھا اور اپنی گاڑی ریورس بھی کرتا رہا تھا۔"

"پتا نہیں کیا بھید ہے جی۔"

"ہاں، اس مرنے والے کی لاش کہاں ہے۔" میں

نے پوچھا۔

"مردہ خانے میں ہے وکیل صاحب۔ پوسٹ مارٹم کے لیے جا رہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "اب بتائیں، کیا خیال ہے اس کیس کے بارے میں۔"

"کیس تو لڑوں گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ مجھے وہ آدمی بے گناہ معلوم ہو رہا ہے۔"

☆☆☆

تھانے سے واپسی پر میں نے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ عورت سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے پاس کھڑی ہوئی دکھائی دی۔

وہ ایک جوان عورت تھی۔ اس نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس کے سراپے نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ایک جوان جسم کی عورت ہے۔

وہ ایک درخت کے پاس اکیلی کھڑی۔

میری گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ تیزی سے سڑک پر آ گئی اور اسی وقت اس کا چہرہ بھی دکھائی دے گیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی کشش تھی جو بہت کم دکھائی دیتی ہوگی۔

بے اختیار ہو کر میں نے گاڑی کی رفتار ہلکی کر دی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور جس تیزی سے سڑک کی طرف آئی تھی اسی تیزی سے واپس بھی چلی گئی۔

میں کچھ دیر وہیں رک کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن وہ درختوں کے درمیان جا کر کہیں گم ہو گئی تھی۔ بہرحال میں نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔

آفس پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف تنویر تھا جو بہت پریشان محسوس ہو رہا تھا۔ "یار وکیل صاحب میرے ساتھ تو ایک عجیب تماشا ہو گیا جی۔"

"اب کیا ہو گیا۔"

"اس بندے کی لاش ہی غائب ہو گئی۔" اس نے بتایا۔

"کیا...!" میں چونک پڑا۔ "لاش غائب ہو گئی۔ کس طرح، کہاں سے، کب غائب ہو گئی۔"

"وکیل صاحب میں خود آپ کے پاس آ رہا ہوں جی۔" اس نے بتایا۔ "آ کر ساری کہانی سناؤں گا۔ اس وقت تو میرا دماغ ہی گھوم رہا ہے۔"

میں بہت حیران تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ لاش تو پولیس نے اپنی کسٹڈی میں رکھوائی تھی پھر غائب کیسے ہو گئی...۔ لاش اگر واقعی غائب ہو گئی تھی تو بے چارہ تنویر بے پروائی اور غفلت کے الزام میں پھنس سکتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد تنویر میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ بہت حواس باختہ ہو رہا تھا۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ دو گلاس پینے کے بعد اس کے اوسان بحال ہوئے تھے۔

"وکیل صاحب عجیب کہانی ہے جی۔" اس نے بتایا۔ "پوسٹ مارٹم کے لیے جب لاش کو بکس سے نکالا گیا تو لاش غائب تھی اور اس کی جگہ......" وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"ہاں ہاں بتاؤ، رک کیوں گئے؟"

"وکیل صاحب اس بندے کی لاش کی جگہ ایک سانپ مرا پڑا تھا۔" اس نے بتایا۔

"سانپ!" میں اچھل ہی پڑا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسا ہی ہوا ہے جی۔ اس چکر میں میری تو نوکری ہی خطرے میں پڑ گئی ہے۔" اس نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہے کہ اس نے سانپ کو مارا تھا۔"

"پتا نہیں کیا چکر ہے جی۔ کون ان باتوں کا یقین کرے گا۔"

"تنویر، چلو حافظ سعید صاحب کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کون ہیں۔"

"ایک بہت بڑی روحانی شخصیت۔" میں نے بتایا۔ "حالانکہ آج کے دور میں ہمیں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن واقعات تو ہمارے سامنے ہی تھے۔ ہم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے؟"

☆☆☆

حافظ سعید احمد صحیح معنوں میں ایک اللہ والے شخص تھے۔ میں اپنی مصروفیات کے باوجود کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا اور ان کی دعائیں لے کر واپس آتا۔

ان کا کوئی آستانہ وغیرہ نہیں تھا۔ ان کا اپنا کپڑوں کا کاروبار تھا جس میں اللہ نے بہت برکت دے رکھی تھی۔ بہت کم لوگ ان کے رتبے سے واقف تھے۔ میں بھی ان چند خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔

ہم دونوں جب ان کے پاس پہنچے تو وہ نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔ تنویر تو... دیکھتے ہی ان سے متاثر

ہو گیا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے سعید صاحب کو ساری کہانی سنا دی۔

سعید صاحب یہ سب سن کر بہت بے چین سے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر تک نہ جانے کیا کیا پڑھتے رہے۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر بولے۔

"ہمارے خدا نے اس کائنات میں اتنے بھید سمو دیے ہیں کہ انسان کا علم ناقص ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان میں سے ایک بھید یہ ہے۔ انتہائی حیرت انگیز بھید۔ لیکن خدا نے اپنی عنایتوں سے یہ راز مجھ پر ظاہر کر دیا ہے۔"

"حضرت، کیا تھا یہ سب۔" میں نے پوچھا۔

"بس آپ دونوں حضرات کچھ دیر خاموش بیٹھے رہیں۔ میں کچھ پڑھ رہا ہوں۔"

ہم دونوں خاموش بیٹھے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ انہوں نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں اور زیرِ لب کچھ بولتے جا رہے تھے۔

میرا خیال ہے کہ ان کا یہ عمل پندرہ بیس منٹ جاری رہا ہوگا کہ دروازہ کھلا اور ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اس عورت کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کو میں نے گوٹھ سے واپس آتے ہوئے درخت کے پاس دیکھا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ تنویر اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا یا اس کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن خود میری یہ کیفیت تھی کہ میری دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

اس عورت کے جسم سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ عجیب سی مسحور کر دینے والی خوشبو۔ میرے تجربے میں ایسی خوشبو کبھی نہیں آئی ہوگی۔

وہ کمرے کے وسط میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سعید صاحب کی طرف دیکھا۔ "کیوں بلایا ہے مجھے۔"

"تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" سعید صاحب دھیرے سے بولے۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی کہ تم نے راستے سے بلا لیا۔" اس نے کہا۔

"اور وہ منزل کیا ہے تیری۔" سعید صاحب نے پوچھا۔

"وہ آدمی جس نے میرے ساتھی کو مارا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس کی خوشبو پالی ہے میں نے۔"

"لیکن اس نے تو ایک سانپ کو مارا تھا۔"

"وہی تو میرا ساتھی تھا۔" اس نے کہا۔

"وہ گاؤں کے بچوں کو کیوں مار رہا تھا۔"

"اس لیے کہ گاؤں کے بچوں نے ہمارے دو بچوں کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ کیا بگاڑا تھا ہمارے بچوں نے۔ وہ دونوں تو ایک طرف ایک دوسرے سے کھیل رہے تھے۔"

"انہوں نے تو سانپ سمجھ کر مارا ہوگا۔"

"کچھ بھی ہو۔ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا تھا۔" اس نے کہا۔ "ہمارے دو پیارے بچے مر گئے۔ اس لیے میرا ساتھی ہر سال اسی تاریخ کو ان بچوں کو مار رہا تھا۔"

"دیکھ، جو کچھ ہوا غلط فہمی میں ہوا ہے۔ جانے دے اب اس بات کو۔"

"نہیں، میں اپنے ساتھی کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے کہا۔ "اور اب میں جا رہی ہوں۔"

پھر وہ اتنی تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی کہ ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ خود سعید صاحب بھی گھبرائے ہوئے تھے۔

"اب کیا ہوگا حضرت۔" میں نے پوچھا۔

"جاؤ جلدی۔ اس آدمی کو بچاؤ اس کی جان خطرے میں ہے۔" سعید صاحب نے کہا۔

اتنا سنتے ہی تنویر اور میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم اس تھانے کی طرف جا رہے تھے جہاں شاہد کو لاک اپ میں رکھا گیا تھا۔

لیکن ہمیں بہت دیر ہو چکی تھی۔ شاہد کو کسی سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ اتنا زہریلا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

تو یہ تھا وہ پُراسرار کیس جس کے کچھ اہم حصے میری نگاہوں کے سامنے سے بھی گزرے تھے... آج بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سب آخر کیا تھا۔

کیا کچھ بھید ایسے ہی ہوتے ہیں جن کی کوئی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ کیا جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ حقیقت ہے یا جو اس کے پیچھے ہے وہ حقیقت ہے۔

خواب سے جاگے تو خواب ہی دیکھا۔ خوابوں کا سرمایہ خواب۔

صرف حقیقت آنکھیں ہیں۔ ورنہ ساری دنیا خواب۔

بھیڑیا

جناب ایڈیٹر سرگزشت

آداب!

یہ کسی اور کی نہیں میری اپنی روداد ہے۔ ایک مظلوم وبے کس عورت کے جال میں پھنس کر میں نے بھی بہت کچھ کھویا پھر بھی مجھے ہمدردی ہے اس مظلوم عورت سے۔ ایسا کیوں یہ آپ میری روداد پڑھ کر پتا کرسکتے ہیں۔

ندیم

(راولپنڈی)

وہ مجھے محلے کی مسجد کے سامنے والے ایک درخت کے پاس چپ چاپ کھڑا ہوا دکھائی دیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں متمول صورت اور خوش لباس نظر آیا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں اس سے بات کروں۔ لیکن کسی سے گفتگو کا کوئی جواز تو ہونا چاہیے۔ پھر جب میں اس کے برابر سے گزرنے لگا تو یہ مشکل اس طرح حل ہو گئی کہ خود اسی نے مجھے آواز دے کر روک لیا تھا۔ "بھائی جان، ذرا ایک منٹ میری بات سن لیں۔"

میں رک گیا۔ "جی فرمائیں۔"

"جناب، کیا آپ کسی مفتی سے واقف ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"مفتی!"

"میرا مطلب ہے کوئی عالمِ دین جو مجھے صحیح مشورہ دے سکے۔" اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس مسجد کے پیش امام صاحب عالمِ دین ہیں۔" میں نے بتایا۔

"ہاں، یہی تو... لیکن..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "بات یہ ہے کہ میں ان سے مطمئن نہیں ہوسکا ہوں۔ اگر آپ کی نالج میں کوئی اور ہوں تو پلیز بتا دیں۔ میں اس وقت سخت پریشان ہوں۔"

مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ یقیناً کسی پرابلم میں تھا۔ پھر مجھے مولانا قاسمی صاحب کا خیال آگیا۔ وہ میری جان پہچان کے تھے اور میں ان کے بارے میں کہہ سکتا تھا کہ وہ عالم دین ہیں۔

"جی ہاں، ایک ہیں۔ مولانا قاسمی صاحب۔" میں نے بتا دیا۔

"وہ کہاں ملیں گے۔"

"رحمانیہ مسجد میں۔" میں نے کہا۔ "اس وقت وہ اپنے حجرے میں ہوں گے۔ ان کا حجرہ مسجد کے ساتھ ہی ہے۔"

"پلیز، کیا آپ وہاں تک لے چلیں گے۔ میں اس شہر میں نیا آیا ہوں اس لیے مجھے نہیں معلوم۔"

"کوئی بات نہیں۔ آئیں چلتے ہیں۔ پیدل ہی کا راستہ ہے۔"

میں اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔ لیکن اس کی سنجیدگی اور اداسی دیکھ کر میں بھی خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مسجد آگئی۔ قاسمی صاحب اپنے حجرے میں ہی تھے۔

مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ "ارے بھائی، آپ سے تو ملنا ہی نہیں ہوتا۔" انہوں نے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں قاسمی صاحب۔ مجھے فرصت نہیں ملتی۔ ویسے اس وقت میں ان صاحب کو آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔"

"ضرور، فرمایئے۔"

میں نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ میں نے سوچا کہ میں حجرے سے باہر چلا جاؤں۔ نہ جانے اس کا کیا مسئلہ ہے۔ میرے سامنے بیان کرنا پسند کرے یا نہ کرے۔

شاید اس نے بھانپ لیا اس لیے جلدی سے بولا۔ "ارے صاحب، آپ بھی بیٹھیں۔ یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

پھر اس نے بتایا کہ اس کا نام جمیل ہے وہ لاہور سے کراچی آیا ہے۔ کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے ایک مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ دو دن پہلے اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ اس نے غصے میں آکر بیوی کو طلاق دے دی اور اب شرمندہ ہے۔ رجوع کرنا چاہتا ہے۔

یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ اس معاشرے میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ روزانہ اس معاملے میں نہ جانے کتنے فتوے جاری کیے جاتے ہیں۔ عدالتوں میں درجنوں مقدمات چلتے رہتے ہیں۔

مولانا صاحب نے اسے سمجھانا شروع کردیا تھا۔ "بھائی غصہ اسی لیے حرام ہوتا ہے کہ یہ آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ اب تم نے جو کیا ہے۔ اس کی سزا تو ملنی ہے نا۔"

"کیا دوبارہ رجوع کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں، سوائے حلالہ کے اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

مولانا صاحب نے اسے حلالہ کے مسائل سمجھائے۔

"اب ایک سوال اور کرنا تھا۔" اس نے کہا۔ "اس شہر میں ہم دونوں تنہا ہیں۔ یعنی ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ ایسی صورت میں وہ عدت کہاں گزارے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے۔"

"اسی مکان میں۔ جو ہم نے کرائے پر لیا ہے۔"

ایسی مجبوری کی صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ دونوں الگ کمروں میں رہیں۔" مولانا صاحب نے کہا۔ "کوشش یہ کریں کہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے نہ آئیں۔"

"جی ہاں، یہ تو ممکن ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر بتایا۔ "کیونکہ ایک کمرا مکان کے گیٹ کے ساتھ ہے۔ میں اس میں رہ سکتا ہوں۔"

"ہاں، تو پھر اسے عدت گزارنے دیں۔ خدا آپ جیسوں کو نیک ہدایت دے۔"

وہ سر جھکائے مولانا صاحب کی باتیں سنتا رہا۔

میں اس کی کشمکش کو سمجھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اور میں مولانا صاحب کے حجرے سے باہر آگئے۔ وہ اس وقت بہت اداس ہو رہا تھا۔ شاید شرمندگی کے شدید احساس نے اسے پریشان کرکے رکھ دیا تھا۔

"اچھا بھائی، مجھے اجازت دیں۔" میں نے باہر آکر کہا۔

"شاید اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" وہ اپنے آپ سے بولا۔ "کچھ نہیں ہوسکتا۔ پتا نہیں کیا ہوگیا تھا مجھے۔ پاگل ہوگیا تھا میں۔"

"جمیل صاحب۔" میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "مجھے اجازت دیں۔"

"پلیز، دو منٹ میرے ساتھ رک جائیں۔" اس نے التجا کی۔ "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔ میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔"

"میں آپ کی پریشانی سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسا کریں، آپ میرے گھر چلیں۔ میں بھی اسی محلے میں رہتا ہوں۔ کچھ دیر رک کر چلے جایئے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اس وقت مجھے واقعی کسی سہارے کی ضرورت ہے۔"

میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ ایک منزلہ چھوٹا لیکن خوبصورت مکان۔ میں نے یہ مکان بہت شوق سے بنوایا تھا اور اس کی آرائش بہت آرٹسٹک انداز میں کی تھی۔ کوئی بھی شخص میرے مکان میں آکر اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے بھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تعریفی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کردیا۔

"بہت خوبصورت مکان ہے آپ کا۔" اس نے کہا۔ "مکان کی سجاوٹ یہ بتا رہی ہے کہ آپ اعلیٰ ذوق کے مالک ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ لیکن جمیل صاحب، اصل ذوق اسی وقت سامنے آتا ہے جب اس کی تکمیل کے لیے پیسے بھی ہوں۔"

"یہ بات تو ہے۔" اس نے تائید کی۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ماشاءاللہ......"

"ہاں خدا کا شکر ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنا بزنس ہے اور وہ ٹھیک ہی جا رہا ہے۔ خیر، آپ بتائیں آپ کے ساتھ کیا ہوا۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ظاہر ہے یہ اس کا گھریلو معاملہ تھا اور میں اتفاقاً اس میں انوالو ہوگیا تھا۔ پھر اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کا نام جمیل ہے۔ لاہور سے تعلق ہے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کی پسند تو کچھ اور تھی۔ لیکن والدین نے زبردستی اس کی شادی مدیحہ سے کرادی۔ جس کے بارے میں اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی زبان دراز ثابت ہوگی۔

وہ مدیحہ کو اس لیے لاہور سے کراچی لے آیا تھا کہ شاید یہاں آکر اس کی عادت بدل جائے۔ لیکن اس کی زبان درازی قائم رہی۔ اس کے باوجود وہ مدیحہ سے محبت کرتا رہا اور آج بھی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ گرچہ غصے میں آکر اسے طلاق دے چکا ہے۔

"جمیل صاحب، کیا ضروری ہے کہ حلالہ کے بعد جب وہ دوبارہ آپ کے پاس آئے تو اس کا مزاج بدل چکا ہو۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں شاید اس کے بغیر رہ نہیں سکوں گا۔ چاہے وہ جیسی بھی ہو۔ زندگی بھر اس کی بدمزاجی برداشت کرتا رہوں گا۔" پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ندیم صاحب، محبت تو شاید اسی کا نام ہے، کیوں؟"

"ہاں بھائی، محبت اسی کا نام ہے۔"

"آپ کی بیوی بچے کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جمیل صاحب، حالات ایسے رہے کہ میں ابھی تک شادی نہیں کر پایا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اوہ!"

کچھ دیر بعد وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ میں اس کے بارے میں سوچتا ہی رہا۔ اچھا خاصا معقول آدمی۔ ذرا سی غلطی نے اس کا کیا حال کردیا تھا۔

کئی دنوں کے بعد اس سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا۔ "ندیم صاحب، میں آپ کے پاس آنا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی۔"

"کس بات کی ہمت۔"

"یہی خیال آیا کہ آپ پتا نہیں کیا خیال کریں۔" اس نے کہا۔

"ارے، مجھے کیا خیال کرنا ہے۔ بلکہ مجھے تو خوشی ہوتی۔ چلیں گھر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں، آج آپ میرے غریب خانے پر چلیں گے۔" اس نے کہا۔ "وہ بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ قریب ہی ہے۔"

"چلیں تو پھر آپ ہی کے یہاں چلتے ہیں۔"

اس نے جیسا بتایا تھا اس کا مکان ویسا ہی تھا۔ اس کا کمرا گیٹ کے ساتھ ہی بالکل الگ تھلگ تھا۔ اندر دو کمرے اور تھے۔

اس کے کمرے کا اثاثہ بہت مختصر تھا۔

ایک چارپائی، ایک میز دو کرسیاں اور ایک کونے میں رکھا ہوا ایک سوٹ کیس۔

"بس ندیم صاحب، اسی طرح زندگی گزر رہی

ہے۔" اس نے کہا۔" آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"ارے نہیں بھائی رہنے دیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ پہلی بار آئے ہیں۔ اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔"

"لیکن آپ چائے کا بندوبست کس طرح کریں گے۔"

"وہ...وہ بات یہ ہے کہ میں مدیحہ کو آواز دے کر چائے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ وہ میرے سامنے تو نہیں آتی لیکن چائے کی ٹرے لاکر دروازے پر رکھ دیتی ہے۔ اس طرح کم از کم چائے مل جاتی ہے۔"

میں نے اسے پھر روکا۔ لیکن اس نے دروازے کے باہر جاکر چائے کے لیے آواز لگا دی تھی۔ "پلیز، دو کپ چائے بھیج دیں۔ میرے مہمان آئے ہیں۔"

چائے کا بول کر وہ کمرے میں آگیا۔" ندیم صاحب، میں سموسے لے کر آتا ہوں۔"

"ارے نہیں بھائی، یہ آپ نے کیسا تکلف شروع کر دیا۔"

"پلیز، میری خوشی کے لیے۔" اس نے کہا۔" بس دس منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

وہ بہت ہی مہمان نواز ثابت ہو رہا تھا۔

وہ چلا گیا۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ کتابیں بھی تھیں جن سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے۔

اسی دوران دروازے پر دستک کے ساتھ کسی عورت کی آواز آئی۔" چائے لے جائیں۔"

میں چونک گیا۔ یہ اس کی سابقہ بیوی تھی جو چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ میں نے بلند آواز میں بتایا۔" جمیل بازار تک گئے ہیں۔"

"اچھا تو آپ لے جائیں۔" اس نے کہا۔

میں نے ٹرے لینے کے لیے دروازہ کھول دیا اور میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ گرچہ وہ بہت سادہ لباس میں تھی اس کے باوجود اس کی خوبصورتی دیکھنے والی تھی۔

کھلتا ہوا رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ گول چہرہ اور دلکش سراپا۔ بدقسمت تھا جمیل جس نے ایسی عورت کو طلاق دے کر اپنی زندگی سے الگ کر دیا تھا۔

میں نہ جانے کب تک اسے دیکھتا ہی رہتا۔ اگر اس کی آواز چونکا نہیں دیتی۔" یہ لیں، ٹرے لے لیں۔"

میں نے شرمندہ ہو کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لی اور کمرے میں واپس آگیا۔ اس کی ایک جھلک نے مجھے پاگل سا کر دیا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات آنے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد جمیل بھی سموسے لے آیا تھا۔ سموسے کھانے اور چائے پینے کے دوران میں بس ہوں ہاں ہی کرتا رہا تھا۔ کچھ کہنے سننے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

خود جمیل نے میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔" کیا بات ہے ندیم صاحب، آپ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں۔"

"ارے نہیں، بس یوں ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کے لیے کوئی ٹیبلیٹ لے آؤں۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بس اب چائے پی کر گھر جاؤں گا۔ کوئی آنے والا ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب، لیکن آپ سے ملاقات ہوتی رہنی چاہیے۔ آپ کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو اتنا سنبھال لیا ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، جب جی چاہے۔"

گھر آنے کے بعد بھی میں مدیحہ کے تصور سے جان نہیں چھڑا سکا۔ وہ چاند سا چہرہ نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ جمیل بے وقوف آدمی تھا۔ اگر مدیحہ زبان دراز بھی تھی تو پیار سے نرمی سے اس کی زبان درازی ختم کروائی جا سکتی تھی لیکن اس نے تو طلاق ہی دے دی تھی اور اب پچھتا رہا تھا۔

دو چار دنوں کے بعد پھر جمیل سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرے گھر آیا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ پریشان اور تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔" ندیم صاحب، میں تو یہ حماقت کر کے بری طرح پچھتا رہا ہوں۔ کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"کیا کسی اور سے بھی فتویٰ لیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔" میں نے اس چکر میں شہر کی تمام مسجدیں اور مدرسے چھان لیے ہیں۔ لیکن ہر جگہ سے یہی سننے کو ملا ہے کہ میں بغیر حلالہ کے اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔ اب بتائیں، میں کہاں سے اور کس سے اس کا حلالہ کرواؤں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکتا اس کی آنکھوں میں

ایک چمک آگئی جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو۔" ندیم صاحب، اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں تو کیا آپ میری بات مان لیں گے۔"

"کیا!" میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"ہاں ندیم صاحب، میں نے اتنے دنوں میں آپ کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ آپ ایک شریف اور قابلِ بھروسا انسان ہیں۔ اور یہ راز آپ اپنے سینے میں رکھیں گے۔"

"دیکھیں جمیل صاحب، آپ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"کوئی الجھن نہیں۔" اس نے کہا۔" سیدھا سادا شرعی معاملہ ہے۔ ہم کوئی ناجائز کام نہیں کر رہے۔ یہ قانونی اور شرعی دونوں اعتبار سے درست ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ آپ ایک رات کے بعد میری امانت مجھے واپس کر دیں گے۔"

میری اس وقت عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اس عورت کا ساتھ صرف ایک رات کے لیے نصیب ہو رہا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ ایک رات تو بہت ہے۔ اس کے ساتھ ایک لمحہ گزارنا بھی قیمتی ہوتا۔

"بھائی ندیم صاحب، پلیز مجھے مایوس نہ کریں۔ خود سوچیں، اگر میں کسی انجان کو پکڑ لیتا ہوں تو وہ نہ جانے کیسا نکلے۔ مدیحہ اچھی خاصی خوبصورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بعد میں طلاق دینے سے انکار کر دے۔ پھر میں تو کہیں کا نہیں رہوں گا۔"

"تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ سو فیصد، اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں تو شاید اس وقت سے تیار تھا جب میں نے مدیحہ کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن ظاہر ہے میں اس کے سامنے اپنی بے تابی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے کچھ دیر سوچنے میں لگا دی۔ اس کے بعد رضامندی ظاہر کر دی۔" ٹھیک ہے جمیل صاحب، آپ کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے جوش میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"جمیل صاحب، ایک بات بتائیں کیا ضروری ہے کہ وہ بھی اس کے لیے تیار ہو جائے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو تیار ہی بیٹھی ہے صاحب۔" اس نے کہا۔" مجھ سے زیادہ وہ شرمندہ ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ پھر سے میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہے اور اسے اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔ اسے احساس ہو گیا ہے کہ بیوی کو کس انداز سے زندگی گزارنا چاہیے۔ اسی نے لکھا ہے کہ میں حلالہ کے لیے کسی سے بات کر لوں کیونکہ اب اس سے برداشت نہیں ہو رہا۔ اور وہ یہ چاہتی ہے کہ عدت ختم ہوتے ہی یہ کام ہو جائے۔"

"اب عدت ختم ہونے میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"صرف تین دن۔" اس نے بتایا۔" اس کے بعد وہ آزاد ہوگی۔"

"آپ ایک بار اس سے میرے بارے میں پوچھ کر دیکھ لیں۔" میں نے کہا۔

"پوچھنا کیا ہے ندیم صاحب، وہ بے چاری تو دن گن رہی ہے۔"

پھر اس نے حساب لگا کر تاریخ بتا دی کہ اس تاریخ کو خاموشی کے ساتھ اسی گھر میں مدیحہ اور میرا نکاح ہو جائے گا۔ وہ نکاح کے لیے کسی مولوی صاحب کو بھی ڈھونڈ لائے گا۔

چونکہ یہ ایک طے شدہ نکاح ہوگا۔ اسی لیے کسی گواہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

سب کچھ میرے اور اس کے درمیان طے ہو گیا۔

اس نے چاہے کچھ بھی سوچا ہو۔ لیکن میرا ارادہ اب کچھ اور تھا۔ میں اتنی جلدی ایک ہی رات کے بعد اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ میں اس عورت کے ساتھ گزرنے والے لمحوں کو طول دینا چاہتا تھا۔ جتنا بھی ہو سکے۔ یوں سمجھ لیں کہ میرے دل میں بے ایمانی آچکی تھی۔

جمیل میرا کیا بگاڑ لیتا۔ میں تو قانونی اور شرعی طور پر اس عورت کا شوہر ہو چکا ہوں گا۔ اب میری مرضی کہ میں اسے طلاق دوں یا نہ دوں۔

میں پوری کوشش کروں گا کہ ایک ہی رات میں مدیحہ کو اپنے قابو میں کر سکوں۔ ایک رسم ہوتی ہے منہ دکھائی کی۔ میں اس میں مدیحہ کو زیورات کا ایک سیٹ دے دوں گا۔ اسے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ اگر وہ میری جیون ساتھی بنی رہی تو زندگی بہت خوشگوار گزر سکتی ہے۔

انسان کتنا خود غرض اور تو تا چشم ہوتا ہے۔ اس کا

احساس خود مجھے اپنے خیالات سے ہو رہا تھا۔لیکن میں اپنی اس خواہش کے سامنے مجبور ہو کر رہ گیا تھا۔

حسن میں کتنی طاقت ہوا کرتی ہے۔یہ طاقت قدموں کو اکھاڑ دیتی ہے اور انسان معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔میں بھی معلق ہو گیا تھا۔جمیل نے مجھ پر بھروسا کیا تھا اور میں اسی کے بھروسے کو ٹھیس پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے یہ بیس دن کس طرح گزارے ہوں گے یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میں نے منہ دکھائی کی رسم کے لیے ایک قیمتی سیٹ بھی خرید لیا۔اور یہ تو بہرحال سوچ ہی لیا تھا کہ میں اسے اتنی جلدی طلاق نہیں دوں گا۔

آخر وہ شام بھی آ ہی گئی جب میں نکاح کے لیے اس گھر میں پہنچا تھا۔جمیل نے ایک نکاح خواں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا جو اپنے ساتھ دو گواہان کو لے کر آئے تھے۔

جمیل ہی نے چائے اور ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔بہت خوش اسلوبی کے ساتھ پچیس ہزار مہر کے عوض یہ نکاح ہو گیا۔

کیا نکاح تھا؟ پتا نہیں ایسے پلانٹڈ نکاحوں کی کیا اہمیت ہوا کرتی ہے۔لیکن مجھے اس وقت یہ سب کہاں سوچنا تھا۔یہ مرحلہ ختم ہوا تو میں مدیحہ کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

میں نے دن میں ہی اپنے کمرے کو تھوڑا بہت ڈیکوریٹ کروا دیا تھا۔مدیحہ نے گرچہ بہت ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا۔اس کے باوجود وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اس کے سامنے سونے کا سیٹ رکھتے ہوئے کہا۔"مدیحہ یہ کیسا عجب ساتھ ہے جو ختم ہونے کے لیے بنایا گیا ہے۔"

"کوئی ضروری تو نہیں ہے۔" اچانک وہ دھیرے سے بولی۔

"کیا!"

"ہاں ندیم صاحب! کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ ساتھ ایک رات یا ایک ہفتے کا ہو۔یہ ہمیشہ کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔"

"مدیحہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" اس نے کہا۔"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ خوش تھی؟ نہیں بھی خوش نہیں رہی۔لیکن نبھائے جا رہی تھی کیونکہ میرے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔"

"لیکن وہ تو یہ کہہ رہا تھا کہ تم دوبارہ اس کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو رہی ہو۔"

"جھوٹ کہتا ہے وہ۔ایسے آدمی کے پاس کون جانا پسند کرے گا جو ذرا سی بات پر بھڑک جاتا ہو۔خود دیکھ لیں اس نے ذرا سی بات پر مجھے طلاق دے دی تھی اور اب میرا حلالہ کروا دیا۔"

"مدیحہ اگر تم اس کے پاس نہیں جانا چاہتیں یہ تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔"میری مرضی ہے میں تمہیں طلاق دوں یا نہ دوں۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں ندیم صاحب۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔"اس دن جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی کا ساتھی آپ جیسا ہونا چاہیے تھا۔اب آپ کی مرضی ہے۔آپ یا تو طلاق دے کر مجھے اس کے حوالے کر دیں یا پھر ہمیشہ کے لیے مجھے اپنا بنا لیں۔"

"مدیحہ، میری جان۔" میں خوشی سے نہال ہوتا جا رہا تھا۔"میرے لیے اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو گی کہ تم جیسی عورت میری زندگی کی ساتھی بن جائے۔"

"ندیم صاحب' ایک بات بتاؤں۔آپ سے زیادہ یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔"

"کمال ہے۔اس نے تمہارے بارے میں یہ کہا تھا کہ تم حد درجہ زبان دراز اور غصے کی تیز ہو۔لیکن میں تو تم کو بالکل مختلف پا رہا ہوں۔"

"اس کمینے نے بے وجہ طلاق دے دی تھی ندیم صاحب۔اور اب اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے الزام لگا رہا ہے۔اب میں آپ کے سامنے ہوں۔آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

"میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔" میں نے کہا۔"تم ہرگز ویسی نہیں ہو جیسا تمہارے لیے بتایا گیا تھا۔"

"شکریہ۔" وہ مسکرا دی۔"کوئی تو مجھے سمجھنے والا ملا۔"

وہ رات بہت خوبصورت تھی۔

مدیحہ میری بیوی بن کر میرے ساتھ تھی۔اس وقت میں نے اس خیال ہی کو ذہن سے جھٹک دیا تھا کہ صبح جب جمیل میرے پاس آئے گا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔

نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا تھا۔آنکھ کھلی تو مدیحہ بستر پر نہیں تھی۔البتہ ملحقہ غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں ایک آسودگی اور سرشاری کے عالم میں لیٹا ہوا اس کے بارے میں سوچتا رہا لیکن جب بہت دیر ہونے لگی تو میں نے غسل خانے کے دروازے پر دستک دی۔دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔

میں اندر آ گیا شاور کھلا ہوا تھا۔اس کے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔میں شاور بند کر کے جلدی سے باہر آ گیا۔

"مدیحہ!" میں نے اسے آوازیں دیں۔

پھر احساس ہوا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔میری الماری بھی کھلی ہوئی تھی۔میں نے جلدی سے الماری دیکھ ڈالی۔اس میں سے میرے پرائز بانڈز غائب تھے۔میں نے پچھلے دنوں بینک سے دو لاکھ روپے نکلوائے تھے وہ بھی نہیں تھے۔

میں نے مدیحہ کے لیے سونے کا جو سیٹ خریدا تھا۔وہ بھی غائب تھا۔خدایا! کیا مطلب تھا اس کا۔میں سر پکڑ کر رہ گیا۔میرا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

پھر میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔میری گاڑی موجود تھی اور ان کم بختوں کا گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔

گھر پہنچا تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔پتا چلا کہ دونوں سویرے ہی مکان خالی کر گئے تھے اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کہاں گئے ہوں گے۔

میرے خدا! اتنا بڑا دھوکا۔اتنا بڑا فراڈ۔صرف ایک رات کے عوض وہ مجھ سے لاکھوں لے گئی تھی۔لاکھوں۔

پرائز بانڈز۔دو لاکھ کی نقد رقم۔سونے کا سیٹ۔کم از کم سات آٹھ لاکھ کی چوٹ ہو گئی تھی۔یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ فراڈ اس انداز سے بھی ہو سکتا ہے۔

وہ دونوں تو کسی بھی طور پر کرمنل نہیں معلوم ہوتے تھے۔پڑھے لکھے لوگ۔مہذب باتیں۔اور وہ لڑکی مدیحہ۔اتنی خوبصورت۔اتنی اسمارٹ اور اس کا ایسا گھناؤنا چہرہ۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں پولیس میں ان کے خلاف رپورٹ کروا دیتا لیکن نہ جانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا۔اس لڑکی کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔

رپورٹ درج کروانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔وہ لوگ خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گئے ہوں گے۔ان کی سازش بہت مکمل تھی اور بہت سلیقے سے ترتیب دی گئی تھی۔

شاید اس آدمی جمیل نے بہت دنوں تک میری نگرانی کی ہو گی۔تب جا کر اس نے یہ ڈراما ترتیب دیا تھا۔اس کا مجھ سے ملنا۔فتویٰ لینے کے لیے میرے ساتھ جانا۔مجھے اپنے گھر لے جانا اور سموسے لینے کے بہانے گھر سے چلے جانا۔تاکہ اس دوران وہ لڑکی میرے سامنے آ جائے اور میں اسے دیکھ کر دیوانہ ہو جاؤں۔

وہ تھی ہی ایسی۔

یہ حادثہ ایسا تھا کہ شرمندگی سے میں کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔سب میرا ہی مذاق اڑاتے۔اسی لیے میں خاموشی سے اس نقصان کو پی گیا۔یہ اور بات ہے کہ سینے میں آگ سی لگ رہی تھی۔

پھر ایک دن اچانک وہی لڑکی دکھائی دے گئی۔وہی مدیحہ۔میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔وہی تھی اور اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

وہ ایک خوش پوش اجنبی تھا۔مدیحہ اس کے ساتھ ایک دکان سے باہر آ رہی تھی۔میں نے انہیں دیکھا اور ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔دونوں ٹھٹک گئے تھے۔اس لڑکی کی رنگت اڑ گئی تھی۔شاید اس نے سوچا نہیں ہو گا کہ کبھی مجھ سے مڈبھیڑ بھی ہو سکتی ہے۔

"اوہو! تم نے اب اس بے چارے کو اپنا شکار بنا لیا۔" میں نے کہا۔

"جی...!" وہ سٹپٹا گئی تھی۔"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔"

"عالیہ! کون ہے یہ۔" اس کے ساتھ والے آدمی نے اس سے پوچھا۔

"بہت خوب! تو اب تمہارا نام عالیہ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔"کیا ہر نئے شوہر کے ساتھ اپنا نام بھی بدل لیتی ہو۔"

"کیا بدتمیزی ہے۔" وہ آدمی غصے سے تقریباً چیخ پڑا تھا۔"یہ تم نے میری بیوی کے ساتھ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔"

"بھائی صاحب! آپ کی بیوی کا اصل چہرہ جب آپ کے سامنے آئے گا تو آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔" میں نے کہا۔"اس کا نام عالیہ نہیں مدیحہ ہے اور میں اس کا شوہر ہوں۔اگر کہیں تو میں نکاح نامہ اور دوسرے کاغذات بھی دکھا سکتا ہوں۔اس کے علاوہ جب یہ دلہن بنی ہوئی تھی تو میں نے اپنے موبائل سے اس کی تصویریں بھی اتاری تھیں۔اگر کہیں تو وہ تصویریں بھی دکھا دوں۔"

"مجھے دکھاؤ۔" وہ غصے سے غرایا۔

میں نے اپنا موبائل اس کے سامنے کر دیا جس میں

اس لڑکی کی کئی تصویریں تھیں۔ میں نے اپنی شادی کی یادگار کے طور پر جو تصویریں کھنچی تھیں وہ اس وقت کام آرہی تھیں۔

وہ آدمی ان تصویروں کو دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ ''یہ تو واقعی عالیہ کی تصویریں ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ۔ یہ جھوٹ ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''میں تو اس آدمی کو جانتی بھی نہیں ہوں۔ اس نے نہ جانے کہاں سے میری تصویریں اتار لی ہیں۔''

''بھائی صاحب! آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو نکاح نامہ بھی دکھا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے تو اس کے خلاف ایف آئی آر بھی لکھوادی ہے۔'' میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔

''عالیہ! یہ کیا چکر ہے۔'' وہ آدمی بھی اب نروس ہونے لگا تھا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' عالیہ نے کہا۔

''اس سے پوچھیں کہ جمیل کون ہے۔''

''بھائی صاحب! یہاں کھڑے ہوکر یہ سب باتیں مناسب نہیں ہیں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''میں ایک شریف آدمی ہوں۔ اس معاشرے میں میری عزت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ سب خاک میں مل جائے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر چلیں۔ میں آپ کو ساری کہانی سنا دیتا ہوں۔''

''نہیں نوید نہیں۔'' لڑکی نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''ہم اس کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ یہ کوئی بلیک میلر معلوم ہوتا ہے۔''

''محترمہ! بلیک میل اس کو کیا جاتا ہے جس کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہو یا جس سے تھوڑا بہت تعلق رہ چکا ہو۔ کوئی اجنبی کیوں بلیک میل کرنے لگا۔''

''ہاں عالیہ! یہ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''اگر تم سچی ہو تو پھر تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' ''میں اس آدمی پر کیس کردوں گا۔ اس کے ساتھ چل کر اپنی پوزیشن تو کلیئر کرو۔ ورنہ میں پاگل ہوکر رہ جاؤں گا۔''

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ ویسے آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ دوسرا مہینہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''او خدا! یعنی اس نے مجھ سے نکاح کیا اور میرے پاس سے فرار ہوکر آپ سے شادی کرلی۔'' میں نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ اس لڑکی نے اپنی گردن جھکالی تھی۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ اس کا رنگ اس طرح زرد ہورہا تھا جیسے ابھی بے ہوش ہوکر گر جائے گی۔

وہ اس کے باوجود بھی میرے ساتھ چلنا نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن اس کا موجودہ شوہر اس پر چلنے کے لیے زور ڈال رہا تھا۔ بہرحال میں ان دونوں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔

میں نے ان دونوں کو بٹھانے کے بعد اپنے موبائل کو نکالتے ہوئے کہا۔ ''اب میں پولیس کو بلانے جارہا ہوں۔ وہی اس معاملے کو ہینڈل کرے گی۔ ایف آئی آر تو درج ہوہی چکی ہے۔''

''نہیں! پولیس کو نہ بلائیں۔'' لڑکی اچانک بول پڑی۔ ''میں سب کچھ سچ بتا دیتی ہوں۔''

''عالیہ۔'' اس کے شوہر نے شکستہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔''

''ہاں! سچ ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''چلو۔ تو پھر بتانا شروع کرو۔''

پھر اس نے جو کچھ بتایا۔ وہ بہت بھیانک تھا۔ جمیل واقعی اس کا شوہر تھا اور وہ دونوں مل کر اسی قسم کی وارداتیں کیا کرتے تھے۔

جمیل ایک جوڑ توڑ والا آدمی تھا۔ اس نے اس لڑکی کے کئی شناختی کارڈز مختلف ناموں سے بنوا رکھے تھے۔ جبکہ اس کا نام جمیلہ تھا۔

وہ کئی بار جمیلہ سے مدیحہ، عالیہ اور نہ جانے کیا کیا بن چکی تھی۔ طریقۂ واردات ایک ہی جیسا تھا۔ کسی ایسے آدمی سے اس کی شادی کرائی جاتی جو اپنے گھر میں اکیلا ہو۔ ایک رات گزارنے کے بعد صبح اس کے گھر کا صفایا کردیا جاتا۔ موجودہ شخص کے ساتھ دو مہینوں تک رکے رہنے کی وجہ یہ تھی کہ نوید نے اس لڑکی کے لیے سونے کے زیورات کے چار سیٹ بنوائے تھے۔ جو دو چار دنوں میں بن کر آنے والے تھے۔ اور وہ اس کے لیے ایک بڑا بنگلا خریدنے والا تھا مگر لڑکی کا کہنا تھا کہ بنگلا وہ لاہور میں خریدے گی۔ اپنے بھائی کے توسط سے۔ وہ شخص رقم کے انتظام میں لگا ہوا تھا۔

وہ لڑکی اس سے پہلے کہ ان زیورات کو لے کر فرار ہوتی۔ میرے قابو میں آگئی تھی۔ یہ تھی اس کی کہانی۔ اس کی کہانی سن کر ہم دونوں ہی سر تھام کر بیٹھ گئے تھے۔ اور وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔

''واہ! کمال کی لڑکی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا کبھی تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرتا۔''

''بہت کرتا ہے۔'' وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔ ''میں رات رات بھر روتی رہتی ہوں۔ لیکن مجبور ہوں میں۔''

''ایسی بھی کیا مجبوری ہے۔'' نوید نے پوچھا۔

''مجبوری یہ ہے کہ میرا بچہ اس کے قبضے میں ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا؟'' اب ہم دونوں ہی چونک پڑے تھے۔ ''کیا کوئی اور کہانی بھی ہے۔''

''ہاں۔ اور یہ بہت دردناک کہانی ہے۔ اس سے آپ دونوں کو اندازہ ہوجائے گا کہ عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ اور جب وہ ماں بن جائے تو اس کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں۔''

میرے والدین نے اپنی زندگی میں میری شادی ایک بہت اچھے نوجوان سے کردی تھی۔ امتیاز نام تھا اس کا۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد والدین کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت اگر امتیاز نہیں ہوتا تو شاید میں بری طرح بکھر جاتی۔ اس نے میری دل جوئی کی۔ مجھے سہارا دیا۔ بہت پیار دیا ہے۔''

''اور اس پیار کی نشانی ایک بیٹا تھا خرم۔ بہت پیارا۔ میں اپنی یہ کہانی بہت مختصر کرکے بتا رہی ہوں۔ تاکہ آپ دونوں کو میری مجبوری اور بے کسی کا اندازہ ہوسکے۔ پتا نہیں میں اپنی قسمت میں کیا لکھوا کر آئی تھی۔ شاید کچھ لوگ پیدائشی بدنصیب ہوتے ہیں۔ میرا بھی شمار ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔''

''میں نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کی ہے۔ میرا مطالعہ بھی بہت اچھا ہے۔ ادبی ذوق بھی رکھتی ہوں۔ لیکن کیا فائدہ۔ آپ دونوں کی نگاہوں میں تو ایک طوائف ہوں نا۔ فرق یہ ہے کہ طوائفیں نکاح کا ڈراما نہیں کرتیں۔ لیکن میں یہ ڈراما کرتی رہتی ہوں۔''

''خیر تو جب ہمارا بچہ پیدا ہوا تو ہم دونوں ہی بہت خوش تھے۔ اولاد سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی ہے۔ لیکن شاید تقدیر کو میری خوشیاں پسند نہیں تھیں۔ اس لیے جب خرم تین سال کا ہوا تو امتیاز ایک حادثے میں انتقال کرگئے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ کیا رہا تھا میرے پاس۔ کچھ بھی نہیں۔ دوسری طرف امتیاز کے والدین کا رویّہ بھی بہت خراب ہوتا جارہا تھا۔ وہ مجھے منحوس سمجھنے لگے تھے۔ وہ مجھ سے میرے بچے خرم کو چھین کر مجھے گھر سے نکال دینے کا پروگرام بنا رہے تھے جس کا مجھے علم ہوگیا اور میں ایک رات بہت خاموشی سے اپنے بچے کو لے کر اس گھر سے نکل گئی۔ اب میں کہاں جاتی۔ میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔''

اتنا بتا کر اس نے پھر رونا شروع کردیا۔ ہم سب اس کی کہانی دکھ اور حیرت سے سن رہے تھے۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ۔

اس نے پھر آگے بتانا شروع کیا۔ ''سوائے دور کے رشتے کے ایک ماموں کے اور کوئی بھی نہیں تھا میرا جو میرا ساتھ دیتا۔ بہرحال میں اس گھر سے نکل کر ان ہی کے پاس پہنچ گئی۔ انہوں نے بہت بے دلی سے مجھے اپنے گھر کے اندر بلایا تھا۔'' وہ پھر سے رونے لگی ''ان کی ہزار باتیں سننی پڑ گئی تھیں۔ میں پاگل ہوگئی ہوں۔ سسرال کو چھوڑ کر بھاگ آئی ہوں۔ شوہر کا انتقال ہوگیا تو اس سے کیا ہوا۔ اس گھر میں دوسرے لوگ تو ہیں نا۔ وہ تو نہیں مرگئے۔ ہزار طرح کی باتیں۔ اگر میرے ساتھ یہ مجبوری نہیں ہوتی تو شاید میں ایک پل بھی وہاں نہیں رہتی۔'' اس نے توقف کیا۔ آنسو پونچھے پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ ''لیکن کیا کرتی۔ ڈھیٹ بن کر رہنا پڑا۔ بہرحال میں نے کس طرح وہاں دن گزارے ہوں گے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ انہوں نے جمیل کا رشتہ مجھ سے لگا دیا۔''

''کیا تم جمیل کو جانتی تھیں۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! بالکل نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ممانی کا بھتیجا تھا۔ دیکھنے میں انتہائی مہذب، پڑھا لکھا اور سلیقے کا انسان۔ لیکن انسان کے روپ میں شیطان۔ اندر سے بھیڑیا۔ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا۔ سفاک انسان، جب میری اس سے ملاقات کروائی گئی تو میں نے اسے پسند کرلیا کیونکہ اس کا ظاہر ہی ایسا تھا۔''

''اور تمہارا بچہ کہاں تھا۔'' نوید نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی تھا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ نوید نے میرے خرم کو بھی اپنا لیا تھا۔ وہ اس کے لیے کھلونے وغیرہ لے کر آتا۔''

''بہرحال کچھ دنوں کے بعد میری جمیل سے شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد میں جمیل کے پاس آکر رہنے لگی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ جمیل کو بھی خرم کے مستقبل کی فکر لگی رہتی ہے۔ وہ اکثر اس کے بارے میں باتیں کیا کرتا۔ منصوبے بناتا۔ اس کے لیے یہ کرنا ہے۔ وہ کرنا ہے۔''

''ایک دن اس نے کہا کہ کیوں نہ خرم کو کسی ہاسٹل میں داخل کرادیا جائے۔ جہاں اس کی شاندار تربیت بھی

ہوتی رہے گی اور تعلیم بھی حاصل کرتا رہے گا۔"

میں شاید اس کے لیے تیار نہیں ہوتی لیکن اس نے ایک ایسی بات کہی کہ مجھے مان لینا پڑا۔ اس نے کہا تھا کہ خرم کے ددھیال والے یعنی میری سسرال والے خرم اور مجھے پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ کسی بھی دن موقع پا کر اسے اٹھا لے جائیں گے۔"

میں بہت بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔ خرم میرے لیے سب کچھ تھا۔ اس کو میں کسی بھی حال میں ان لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے جمیل کی بات مان لی اور خرم کو ایک ہاسٹل میں داخل کروا دیا۔

"ہم دونوں ہی خرم کو ہاسٹل لے کر گئے تھے۔ پھر اس کے بعد آج تک خرم کا پتا نہیں چل سکا۔" وہ بری طرح رونے لگی تھی۔

"کیا مطلب! کہاں گیا تمہارا بیٹا۔" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی کہ وہ اب کہاں ہے۔ کس ہاسٹل میں ہے۔" اس نے بتایا۔ "ہاسٹل والوں نے بتایا کہ خرم کو اس کا باپ ہاسٹل سے نکال کر لے گیا تھا۔ ظاہر ہے میں نے جمیل کو خرم کا باپ ہی ظاہر کیا تھا۔ اسی لیے وہ جب کسی بہانے اسے ہاسٹل سے نکالنے گیا تو وہ لوگ انکار نہیں کر سکے۔ کیونکہ خود باپ آیا تھا۔"

"تو اب وہ کہاں ہے۔" نوید نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔ جب جمیل سے پوچھتی ہوں تو وہ کہتا ہے کہ اسے دوسرے ہاسٹل میں کروا دیا ہے۔ لیکن ایڈریس نہیں بتاتا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں اگر اس کے اشاروں پر نہیں چلی تو وہ زندگی بھر خرم سے میری ملاقات نہیں کروائے گا۔ بس یہ ہے میری مجبوری۔ ایک ماں اپنی اولاد کے لیے کیا نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی عزت تک نیلام کر دیتی ہے۔ جس طرح میں کر رہی ہوں۔"

ہم دونوں ہی اس کی کہانی سن کر دنگ رہ گئے تھے۔

اگر اس نے خود بیانی نہیں کی تھی تو پھر وہ واقعی مظلوم تھی۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک ماں تھی اور ماں کے لیے اس کی اولاد ہی سب کچھ ہوتی ہے۔

"کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں ہوگا اس وقت؟" میں نے پوچھا۔

"ہم نے محمود آباد میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔" اس نے بتایا۔ "خدا کے لیے میرے بچے کو اس کی قید سے چھڑوا لیں۔"

نوید نے میری طرف دیکھا۔ "میرا ایک دوست پولیس کا ایک بڑا آفیسر ہے۔ اگر کہیں تو اس کی مدد لی جائے۔"

"بالکل اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"مختصر یہ کہ ہم نے پولیس کی مدد لی اور اس مکان پر چھاپا مار دیا جہاں جمیل تھا۔

یہ بہت ہی مشہور کیس ثابت ہوا تھا۔ عدالت نے جمیل سے جب جمیلہ کے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا تو اس کم بخت نے یہ روح فرسا انکشاف کیا کہ وہ اسے قتل کر چکا ہے اور اس کی لاش کہیں پھینک دی تھی۔

خدا کی پناہ! کتنا بے رحم، بھیانک اور ظالم انسان تھا۔ درندوں سے بھی بدتر۔ وہ ایک اولاد کو ڈھال بنا کر اس کی ماں کو گندگی کی راہ پر چلاتا رہا جبکہ وہ اس اولاد کو پہلے ہی مار چکا تھا۔

جمیلہ کی حالت دیکھ کر اور اس کی کہانی سن کر عدالت کا ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔ خود جج کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

فاضل جج نے اس بے رحم شخص کے بارے میں اپنے فیصلے میں یہ لکھا تھا کہ یہ شخص اس قابل ہے کہ اسے بار بار سزائے موت دی جائے۔ لیکن افسوس ہم ایک بار سے زیادہ کسی کو پھانسی نہیں دے سکتے۔

عدالت نے اسے موت کی سزا سنا دی تھی۔

اس وقت نوید کا کردار قابل تعریف تھا۔ اس نے عدالت میں بیان دیا کہ وہ زندگی بھر کے لیے اس مظلوم لڑکی کا سہارا بننے کو تیار ہے۔

لیکن نوید کی محبت اور اس کا یہ خلوص بھی کسی کام نہیں آ سکا۔

عدالت کے فیصلے کے کچھ دنوں کے بعد جمیلہ بھی اپنے بیٹے سے جا ملی۔ وہ بے چاری تو اس وقت اپنا دل پکڑ کر رہ گئی تھی جب اسے یہ پتا چلا تھا کہ جمیل نے اس کے بیٹے کا خون کر دیا ہے۔ پھر وہ صحت یاب ہی نہیں ہو سکی۔ بستر سے جا لگی۔ بالآخر اسے بھی موت آ گئی۔

آخر کچھ لوگ اتنے بدقسمت کیوں ہوتے ہیں۔ ان کی قسمت میں اتنے دکھ کیوں لکھ دیے جاتے ہیں۔ خدا اپنے بھید خود ہی جان سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ دوسری دنیا میں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہ رہی ہو۔

وارث

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

آداب ونیاز

یہ میری پہلی تحریر ہے۔ دوسروں کی سچ بیتیاں پڑھتے پڑھتے شوق ہوا کہ اپنی حالات زندگی بھی قارئین کے سامنے پیش کروں۔ سو ٹوٹے پھوٹے انداز میں ہی صحیح لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس امید پر یہ کہ شاید سرگزشت میں جگہ پا لے گی۔

زرینہ

(لاہور)

میں اسپتال جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی کہ ساس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "اس بار بیٹا ہونا چاہیے ورنہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔" یوں لگا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ لڑکی ہونے پر طعنے تو ہمیشہ ملا کرتے تھے لیکن اتنی بڑی بات ساس نے پہلی بار کہی تھی۔ اس سے پہلے میری تین بیٹیاں تھیں اور چوتھی بار زچگی کے لیے اسپتال جا رہی تھی۔ اگر اس بار بھی بیٹی ہوئی تو کیا واقعی اس گھر کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔

یااللہ، یہ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا۔ میں چار بچیوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ کس کے سہارے زندگی بسر کروں گی۔ میں نے بے بسی سے اپنے شوہر راشد کی طرف دیکھا لیکن وہ پتھر کی بے جان مورتی کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان میں اپنی ماں کا سامنا کرنے، ان کی بات کا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے بوجھل قدموں سے گھر کی دہلیز پار کی اور باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

میری شادی کو دس سال ہو چکے تھے اور اس دوران میں تین بچیوں کی ماں بن چکی تھی۔ پہلی بیٹی آصفہ تو شادی کے ایک سال بعد ہی دنیا میں آ گئی تھی جبکہ فائزہ اور عائزہ تین تین سال کے وقفے کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ راشد کی ماں میری سگی خالہ تھیں اور مجھے بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں۔ راشد ان کے اکلوتے بیٹے تھے جبکہ دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ راشد کسی سرکاری محکمے میں معمولی سی پوسٹ پر تھے اور ان کی تنخواہ میں بمشکل گزارہ ہوتا تھا تاہم وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے اور انہوں نے کبھی مجھے کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ خالہ کا رویّہ بھی شروع میں تو بہت اچھا رہا لیکن پہلی بیٹی کی پیدائش پر ہی ان کا موڈ بگڑ گیا اور انہوں نے اسپتال میں ہی طعنے دینا شروع کر دیے۔ جیسے ہی نرس نے انہیں بچی کی پیدائش کے بارے میں بتایا، وہ سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے بولیں "کتنا ارمان تھا مجھے پوتے کا۔ ساری خوشی خاک میں مل گئی۔"

امی کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی اور وہ تیزی سے بولیں "نائلہ، جاہلوں والی باتیں مت کرو۔ لڑکا ہو یا لڑکی، دونوں ہی اللہ کی دین ہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا۔"

اس وقت تو میری ساس خاموش ہو گئیں لیکن گھر آنے کے بعد انہوں نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ ہر آنے گئے کے سامنے یہی رونا روتی رہتیں۔ میری پہلی اولاد کی کوئی خوشی نہیں کی۔ میں نے ہی راشد سے کہہ کر بچی کا عقیقہ کروایا اور عزیز و اقارب میں مٹھائی تقسیم کی۔ اس پر بھی انہوں نے بہت شور مچایا اور بولیں "ان فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ یہی پیسے سنبھال کر رکھتیں تو بیٹی کے جہیز میں کام آتے۔" میرا دل بہت برا ہوا لیکن راشد نے سمجھایا کہ ان کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دوں۔ وہ زبان کی کڑوی ضرور ہیں لیکن دل کی بری نہیں۔ میں وقتی طور پر بہل گئی۔ واقعی مجھے ان کی باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ راشد بچی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شام کو دفتر سے آنے کے بعد اسے گود میں لے کر ٹہلا کرتے اور اس کے لیے آئے دن اچھی اچھی چیزیں لے کر آتے۔ میری ساس کو یہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہمیشہ یہی کہتیں کہ بیٹیوں سے اتنا لاڈ پیار نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں ایک دن پرائے گھر جانا ہوتا ہے۔ یہ تو تمہارے پاس کسی کی امانت ہے۔

دوسری بار امید سے ہوئی تو ساس صاحبہ نے پہلے دن سے ہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ ان کی بے وقت کی راگنی سن کر میرے کان پک گئے اور ایک دن میرا ضبط جواب دے گیا۔ ویسے تو وہ صبح و شام پوتے کی رٹ لگائی رہتی تھیں لیکن اس روز کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئیں۔ ہوا یوں کہ میں ڈاکٹر سے معائنہ کروا کر واپس آئی تو وہ جیسے میرے انتظار میں ہی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ "کیا کہا ڈاکٹر نے؟"

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ سب ٹھیک ہے۔" وہ تنک کر بولیں۔ "میرا مطلب ہے کچھ بتایا نہیں کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی؟"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں خالہ" میں چڑ کر بولی۔ "وہ ڈاکٹر ہے کوئی نجومی نہیں جو پہلے سے بچے کی جنس کے بارے میں بتا دے۔"

"اے بی بی، مجھے اتنا بے وقوف مت سمجھو۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر معلوم بھی ہو جائے تو کیا ہو گا۔ ہم قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتے اور نہ ہی ابھی تک کوئی ایسا طریقہ دریافت ہوا ہے جس سے بچے کی جنس تبدیل کی جا سکے۔"

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولیں۔ "لگتا ہے کہ تمہیں بیٹے کی آرزو نہیں۔"

"جو چیز میرے اختیار میں نہیں۔ اس کی تمنا کیسے کروں۔ میں تو بس دعا ہی کر سکتی ہوں۔ آپ بھی یہی کیجیے۔ شاید اللہ میاں آپ کی سن لیں۔"

وہ دعا کیا کرتیں۔ انہیں تو میں نے کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ بس دن بھر تخت پر بیٹھی پان چباتیں یا دوسروں کی برائیاں کرتی رہتیں۔ ان کا پہلا نشانہ تو میں ہی تھی لیکن راشد نے مجھے منع کر رکھا تھا کہ ان کی کسی بات کا

جواب نہ دوں۔ اس لیے میں عموماً خاموش ہی رہا کرتی۔ تھک ہار کر وہ موضوع بدل دیتیں لیکن ان کے بولنے میں کمی نہیں آتی۔ میں باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہوں۔ ہر نماز کے بعد یہی دعا کرتی کہ اس بار مجھے بیٹا دے دے تاکہ روز روز کی بک بک سے میری جان چھوٹ جائے۔

لگتا تھا کہ قبولیت کی گھڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ دوسری بار بھی میرے یہاں بیٹی ہی پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ ساس صاحبہ کا ردِعمل انتہائی شدید تھا۔ وہ اسپتال میں ہی چلا چلا کر مجھے کوسنے لگیں۔ راشد نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کروایا اور گھر لے گئے لیکن میں جانتی تھی کہ اب وہ خاموش نہیں رہیں گی۔ نہ جانے میری غیر موجودگی میں راشد کو کیا پٹی پڑھائیں لیکن جب راشد انہیں چھوڑ کر واپس آئے تو بالکل نارمل تھے۔ انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھاما اور بولے۔ "سعدیہ، تم اماں کی باتوں کو دل پر مت لو۔ انہیں بولنے کا مرض ہے۔ پوتے کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہیں۔ اس لیے مایوسی کے عالم میں کچھ زیادہ ہی بول گئیں۔"

"ان سے زیادہ مجھے اور آپ کو بیٹے کی آرزو ہو گی لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے بس میں تو کچھ بھی نہیں، آپ انہیں یہ بات کیوں نہیں سمجھاتے۔"

"وہ سمجھنا چاہیں تب نا۔" راشد ہنستے ہوئے بولے۔ "وہ تو تمہیں ہی اس کا ذمے دار سمجھتی ہیں، خیر تم دل چھوٹا نہ کرو۔ کچھ دن بولیں گی پھر خود ہی چپ ہو جائیں گی۔"

اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آئی تو ساس نے مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ میں نے بھی انہیں چڑانے کے لیے پورے محلے اور خاندان میں مٹھائی بانٹی اور بڑی دھوم دھام سے بچی کا عقیقہ کیا۔ وہ چلاتی رہیں کہ ان چونچلوں میں کیوں پیسے ضائع کر رہی ہو۔ پہلے ایک تھی اب دو ہو گئی ہیں۔ ان کے جہیز کی فکر کرو۔ میں نے اپنے کان بند کر لیے تھے اور گونگی بہری بن گئی تھی۔ اب میری پوری توجہ اپنی بچیوں پر تھی اور میں ہر وقت انہی میں مگن رہتی۔ انہیں اچھے سے اچھا کھلاتی۔ اچھا پہناتی اور ہر وقت ان کے لاڈ پیار میں لگی رہتی۔ راشد کی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے میں نے ایک کمیٹی ڈال لی تھی تاکہ بچیوں کے اخراجات پورے کر سکوں۔

تین سال اسی طرح گزر گئے۔ میں ایک بار پھر امید سے تھی۔ اس مرتبہ بھی وہی کچھ ہوا جو پہلے ہوتا آیا تھا۔ ساس صاحبہ مجھ سے پوتا مانگ رہی تھیں اور میں مالکِ حقیقی کے سامنے سربسجود تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی بیٹے اور بیٹی میں فرق محسوس نہیں کیا اور میں اللہ میاں سے بیٹے کی دعا کر کے اپنی بیٹیوں کی تذلیل نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ساس صاحبہ کے رویّے نے مجھے اپنے رب سے بیٹے کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بار ان کے تیور بہت خطرناک تھے اور خطرہ تھا کہ اگر اس مرتبہ بھی بیٹی ہوئی تو کہیں میری ازدواجی زندگی میں کوئی بڑا بھونچال نہ آ جائے۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ تیسری بیٹی کی پیدائش پر ساس نے حسبِ معمول واویلا مچایا لیکن اب راشد کے تیور بھی بدل گئے تھے۔ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن انداز بتا رہے تھے کہ وہ بیٹی کے پیدا ہونے پر خوش نہیں اور اسے ایک بوجھ سمجھ رہے ہیں۔ جس طرح پہلے دو بیٹیوں کی پیدائش پر انہوں نے خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کیا تھا، اب وہ مفقود دکھائی دے رہی تھی۔ ساس نے تو میرا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ جیسے ہی میں اسپتال سے واپس آئی۔ ان کا رونا دھونا شروع ہو گیا۔ انہیں صرف یہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ راشد تین بیٹیوں کا جہیز کس طرح تیار کریں گے۔ وہ ساری عمر محنت کر کے جو کچھ کمائیں گے، یہ لڑکیاں سب اپنے ساتھ لے کر چلی جائیں گی۔ ان کی جگہ لڑکے ہوتے تو نہ صرف یہ کہ بڑھاپے میں باپ کا سہارا بنتے بلکہ ان کی بیویاں بھی جہیز سے گھر بھر دیتیں۔ انہیں یہ فکر بھی ستائے جا رہی تھی کہ اگر لڑکا نہ ہوا تو راشد کی نسل ان کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔ اس طرح کے کئی نکات وہ اپنی صبح شام کی تقریروں میں بیان کرتیں اور طنز کے تیروں سے میرا کلیجا چھلنی کرتی رہتیں لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ چاہے کچھ بھی کہتی رہیں۔ راشد خواہ کتنی ہی بے رخی کیوں نہ برتیں لیکن اپنی بیٹیوں کی پرورش، دیکھ بھال اور لاڈ پیار میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گی۔

وہ مسلسل راشد کے کان بھرتی رہتی تھیں۔ ایک دو مرتبہ اس موضوع پر ماں بیٹے میں زوردار جھڑپ بھی ہو گئی تھی۔ ایک روز راشد دفتر سے گھر آئے تو وہ حسبِ معمول بین کے انداز میں اللہ میاں سے شکوہ کر رہی تھیں۔ راشد کو دیکھتے ہی ان کے بین میں تیزی آ گئی اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر گڑگڑاتے ہوئے بولیں۔ "اے میرے مالک! ہم غریبوں کی فریاد سن لے۔ تیرے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے۔ اس گھر کو ایک وارث دے دے۔" راشد بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے اور میں جانتی تھی کہ اس وقت

انہیں چائے کی شدید طلب ہورہی ہوگی۔ میں ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ واپس آئی تو ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا اور وہ تیز لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"اماں، اب بس بھی کرو۔ میں تنگ آگیا ہوں ایک ہی بات سنتے سنتے۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے لیکن تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے لڑکا نہ ہونے میں سارا قصور ہم دونوں کا ہے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم اپنی بیوی کی طرف داری ضرور کرو گے۔ خدا جانے اس چڑیل نے کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ تمہیں اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

"اچھا تو پھر آپ ہی بتایئے میں کیا کروں۔ اس مسئلے کا کوئی حل ہے آپ کے پاس۔"

"بیٹا، اگر سنجیدگی سے سوچو گے تو کوئی حل بھی نکل آئے گا۔" انہوں نے ذو معنی انداز میں بات کی۔

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" راشد انجان بنتے ہوئے بولے۔

"وقت آنے پر سب سمجھ جاؤ گے۔" ساس صاحبہ نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

بڑی بیٹی اسکول جانے لگی تھی۔ صبح راشد اسے اپنے ساتھ لے جاتے جبکہ چھٹی کے وقت اسے گھر لانے کی ذمے داری میری تھی۔ ایک دن میں اسے اسکول سے لے کر آئی تو آپا صغیرہ کو ساس صاحبہ کے پاس بیٹھے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ رشتے کرانے کا کام کرتی تھی۔ اس کی آمد کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ اس گھر میں کوئی ایسا فرد نہ تھا جس کی شادی کا مسئلہ درپیش ہو پھر آپا صغیرہ یہاں کیا لینے آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ساس صاحبہ سے پوچھا تو وہ بولیں "پریشان ہے بے چاری۔ آج کل کام دھندا چل نہیں رہا۔ پان چھالیا تک کے لیے محتاج ہے۔ بہو بیٹا تو پوچھتے نہیں۔ میں نے دو سو روپے دے دیے۔"

مجھے ایک پوائنٹ مل گیا۔ انہیں چھیڑنے کے لیے بولی۔ "دیکھ لیا آپ نے، ایسے ہوتے ہیں بیٹے۔ خود عیش کررہا ہے اور ماں اپنی ضرورتوں کے لیے در در بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔"

"اس کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ اللہ نہ کرے کہ ہمارا پوتا ایسا ہو۔"

میں ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ دوسرے دن ہی ان کا جھوٹ سامنے آگیا۔ میں بچی کو لے کر اسکول سے گھر آرہی تھی کہ گلی کے نکڑ پر آپا صغیرہ مل گئی۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولی "اچھا ہوا تم مل گئیں۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ تم سے کس طرح بات کی جائے۔"

"خیریت تو ہے، مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔" میں تنک کر بولی۔

"بیٹی، اپنا گھر بچانے کی فکر کرو۔ تمہاری ساس راشد کی دوسری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ انہوں نے اسی لیے مجھے بلایا تھا کہ راشد کے لیے کوئی لڑکی دیکھوں۔ میں نے ان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔ میں گھر بناتی ہوں بگاڑتی نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے شوہر کو قابو میں رکھو۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"آپا تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں اگر اوپر والے نے میری قسمت میں لڑکیاں لکھ دی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"میں نے بھی یہی بات انہیں سمجھائی تھی لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انہیں تو بس پوتا چاہیے۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن تم اپنی جگہ ڈٹی رہو۔ دوسری شادی کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ بھلا کون تین بیٹیوں کے باپ کو اپنی لڑکی دینا پسند کرے گا۔"

آپا صغیرہ کی باتوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں جانتی تھی کہ خالہ کے دماغ میں جو بات آجائے وہ اسے پورا کرکے ہی چھوڑتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس روز جیسے ہی راشد گھر آئے میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور بولی۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ دوسری شادی کررہے ہیں۔ شوق سے کریں لیکن پہلے مجھے طلاق دینا ہوگی اور بچیاں بھی میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔"

"کیا اول فول بک رہی ہو؟ کس نے کہہ دیا کہ میں دوسری شادی کررہا ہوں۔"

"آپ تو ایسے انجان بن رہے ہیں جیسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ اُدھر خالہ جان آپ کے لیے لڑکیاں تلاش کررہی ہیں۔"

"بخدا مجھے کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی میں نے کبھی ایسا سوچا ہے۔ میں اماں سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔"

"نہیں۔ ابھی ان سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلاوجہ آپا صغیرہ کی شامت آجائے گی۔"

اس طرح بات آئی گئی ہوگئی اور مجھے اطمینان ہوگیا کہ کم از کم راشد اس سازش میں شریک نہیں ہیں۔ آپا صغیرہ نے کوئی ایک ماہ بعد شکل دکھائی۔ وہ اماں کے دیے ہوئے دو سو روپے واپس کرنے آئی تھی۔ خالہ نے جب اسے رشتے والی بات یاد دلائی تو وہ بولی "میں نے ایک دو جگہ بات چلائی تھی لیکن کوئی بھی راشد کو اپنی بیٹی دینے پر تیار نہیں ہے۔ دوسرے اس کی آمدنی بھی اتنی زیادہ نہیں کہ وہ دو بیویوں کا بوجھ برداشت کرسکے۔ اگر کوئی امیر کبیر شخص ہوتا تو شاید لوگ لالچ میں آکر رشتہ کر دیتے۔ میرا تو خیال ہے کہ تم راشد کی دوسری شادی کا خیال دل سے نکال دو۔"

"اے ہٹو، اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔" میری ساس تنک کر بولیں۔ "آخر کیا کمی ہے میرے راشد میں؟ تم دیکھنا میں اس کے لیے کیسی چاندی دلہن ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔"

"کوشش کرکے دیکھ لو لیکن کامیابی کی امید کم ہے۔" آپا صغیرہ نے منہ بناتے ہوئے کہا اور اپنی چادر اٹھا کر چل دی۔

چوتھی بار امید سے ہوئی تو خالہ نے اٹھتے بیٹھتے پوتے کی دہائی دینا شروع کردی۔ میں بھی ڈھیٹ بن کر ان کی بکواس سنتی رہتی۔ راشد سے گفتگو کے بعد مجھے یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ ساس صاحبہ چاہے کتنا زور لگالیں، وہ راشد کو دوسری شادی کرنے پر آمادہ نہیں کرسکتیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی میرے یا راشد کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا، اگر آپا صغیرہ نہ بتاتی تو مجھے پتا بھی نہ چلتا کہ ساس صاحبہ کیا سوچ رہی ہیں۔

بظاہر مطمئن ہونے کے باوجود میں اندر سے خوف زدہ تھی۔ اگر اس بار بھی لڑکی پیدا ہوئی تو میرا مستقبل کیا ہوگا۔ راشد کب تک اس صورتِ حال کو برداشت کریں گے۔ بہرحال وہ ایک مرد تھے اور ماں کی باتوں میں آکر کوئی بھی ایسا فیصلہ کرسکتے تھے جو میری تباہی کا سبب بن جاتا۔ پتھر پر بھی مسلسل پانی گرتا رہے تو اس میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ راشد تو پھر گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان تھے۔ وہ کب تک مزاحمت کرتے۔ ان کے دل میں بھی یقیناً بیٹے کی خواہش پل رہی ہوگی۔ اگر واقعی انہوں نے دوسری شادی کرلی اور مجھے اس گھر سے نکلنا پڑا۔ تو ان بچیوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ ماں باپ تو پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ بھائی اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ کبھی بہن کا حال معلوم کرنے آجاتا۔ میں خود ہی اس سے ملنے چلی جاتی تھی۔ بھاوج کا رویہ ایسا تھا کہ شاید وہ ایک دن کے لیے بھی رکھنے کو تیار نہ ہوتی۔ ان سب باتوں کو سوچ کر میرا دماغ خراب ہونے لگتا۔ تنگ آکر میں نے فیصلہ کرلیا کہ آخر وقت تک حالات کا مقابلہ کروں گی اور تقدیر کا ہر فیصلہ ہنسی خوشی قبول کرلوں گی۔

راشد نے مجھے اسپتال میں داخل کرایا اور خود کسی کام کا بہانہ بنا کر چلے گئے۔ زچگی میں ابھی کچھ وقت تھا، ایک نوجوان ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور تشویش آمیز لہجے میں بولی۔ "کیا بات ہے۔ تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو۔ بہت کمزور لگ رہی ہو۔ خون کی بھی کمی ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے مجھے غور سے دیکھا پھر بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو۔ تمہارے اندر خون کی بہت کمی ہے۔"

اس بار بھی میں خاموش رہی تو وہ بولی "کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔ اگر ذہن پر کوئی بوجھ ہے تو اسے اتار پھینکو۔ تمہاری ڈلیوری کا وقت قریب ہے۔ اس حالت میں تمہیں بالکل ریلیکس ہونا چاہیے۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے پہلی بار اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ مجھے دوسری ڈاکٹرز سے مختلف نظر آئی۔ خوب صورت اور کم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے سے انسان دوستی اور ہمدردی کا تاثر جھلک رہا تھا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ "ڈاکٹر کیا میڈیکل سائنس میں ابھی کوئی ایسا علاج دریافت نہیں ہوا جس کے ذریعے ہم اپنی مرضی کے مطابق لڑکا یا لڑکی پیدا کرسکیں۔"

"ایسا احمقانہ سوال کیوں پوچھ رہی ہو؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں ہر بار بیٹے کی آرزو لیے اسپتال آتی ہوں اور قدرت کی طرف سے مجھے بیٹی کا تحفہ مل جاتا ہے۔ اب تک تین بیٹیوں کو جنم دے چکی ہوں۔ اس بار ساس صاحبہ نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ اگر بیٹی ہو تو گھر مت آنا۔ شوہر صاحب بھی کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر آرہے ہیں تبھی

تو یہاں ڈال کر چلے گئے۔ اب میں یہ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوں کہ اگر اس مرتبہ بھی بیٹی ہوئی تو میرا اور میری بچیوں کا مستقبل کیا ہوگا۔"

"تمہارے سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہونا وہی ہے جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اللہ میاں سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ ویسے لڑکا ہو یا لڑکی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ عورت کو اتنا حقیر بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں بھی تو ایک لڑکی ہوں، اگر میں لڑکی نہ ہوتی تو کیا تمہاری ساس اور شوہر کسی مرد ڈاکٹر سے زچگی کرواتے۔" یہ کہہ کر اس نے گھڑی دیکھی اور بولی۔ "اوہو، بہت دیر ہوگئی۔ مجھے دوسرے مریضوں کو بھی دیکھنا ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد چکر لگاؤں گی۔"

وہ جانے لگی تو میں نے پوچھا۔ "کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں۔"

"ثمینہ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور لہراتی ہوئی چلی گئی۔

وہ ڈاکٹر مجھے بہت اچھی لگی اور میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اپنی ایک بیٹی کو میڈیکل کی تعلیم ضرور دلاؤں گی۔ ویسے تو میں ہمیشہ سے ہی لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں تھی لیکن اب میرا عزم اور پختہ ہوتا جارہا تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ میری ساس اور شوہر ان بچیوں کے ساتھ کیسا ہی رویّہ کیوں نہ رکھیں، میں ان کے لیے ڈھال بن جاؤں گی۔ چاہے مجھے محنت مزدوری ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن اپنی بچیوں کو اچھا کھلاؤں گی، اچھا پہناؤں گی اور انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کروں گی تاکہ وہ ڈاکٹر ثمینہ کی طرح معاشرے کے کارآمد فرد بنیں، انہیں کسی قسم کا احساسِ کمتری نہ ہو۔

ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر ثمینہ دوبارہ آگئی اور محبت سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "کیسی ہو سعدیہ۔"

"مجھ بدنصیب کا حال کیا پوچھتی ہو۔"

"اگر ایسی باتیں کرو گی تو میں چلی جاؤں گی۔ اللہ نہ کرے، تم بدنصیب کیوں ہونے لگیں۔ جس عورت کی تین پیاری پیاری بچیاں ہوں، اس کی قسمت پر تو ناز کرنا چاہیے۔"

مجھے اس کی چرب زبانی پر ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میری بچیاں بہت پیاری ہیں۔ تم نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں۔"

"اس لیے کہ تم خود بہت خوبصورت ہو، یقیناً بچیاں بھی تم پر گئی ہوں گی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ ایک گھنٹے بعد میری ڈیوٹی ختم ہوجائے گی اور ممکن ہے کہ تمہاری ڈلیوری رات کسی وقت یا کل صبح تک ہو۔ تم بالکل پریشان مت ہونا۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ خدا کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ تمہاری ساس کچھ بھی کہتی رہیں۔ شوہر کا رویّہ خواہ کیسا ہو۔ تمہیں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ اپنے لیے اور اپنی بچیوں کے لیے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر۔" میں نے سچے دل سے کہا۔ "لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے شاید تمہیں یہ نہیں بتایا کہ ساس صاحبہ راشد کی دوسری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ اگر اس بار بھی لڑکی ہوئی تو شاید وہ اس کام میں زیادہ دیر نہ لگائیں۔"

"اونہہ" اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ویسے تم اگر اسی طرح ڈرتی رہیں تو وہ اپنے بیٹے کی دوسری کیا تیسری اور چوتھی شادی بھی کردیں گی۔ تم نے سنا نہیں جو ڈر گیا وہ مرگیا۔ خیر تم ڈلیوری سے فارغ ہوجاؤ۔ پھر میں تمہیں اپنی ایک دوست سے ملواؤں گی۔ وہ وکیل ہے اور عائلی قوانین سے متعلق مقدمات کی پیروی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک این جی او کے لیے بھی کام کرتی ہے۔ وہ بتائے گی کہ ان حالات میں تمہیں کیا کرنا ہوگا۔"

ڈاکٹر ثمینہ کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی۔ یوں لگا جیسے اللہ میاں نے میری مدد کے لیے فرشتہ بھیج دیا ہو۔ میں اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کررہی تھی اور مجھ میں اپنے حق کے لیے لڑنے کا جذبہ بیدار ہورہا تھا۔ شام کو راشد لدے پھندے آئے۔ وہ میرے لیے بہت سارے پھل اور جوس وغیرہ لے کر آئے تھے۔ ان کا رویّہ دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ ساس صاحبہ کچھ بھی کہتی رہیں، راشد ان کی باتوں میں آنے والے نہیں ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ڈلیوری رات میں کسی وقت ہوگی تو وہ پریشان ہوگئے اور بولے "تمہارے پاس کسی کو ہونا چاہیے۔ میں اماں کو لے کر آتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "انہیں کیوں پریشان کرتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر، نرسیں اور آیا سب ہیں۔ وہ سنبھال لیں گی۔"

"ٹھیک ہے، میں صبح آؤں گا۔ امید ہے کہ اچھی خبر سننے کو ملے گی۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میں ان کے جملے پر سوچنے کے لیے اکیلی رہ گئی۔ میں خوب سمجھتی تھی کہ اچھی خبر

سے ان کی مراد کیا ہے۔ میں بھی شدت سے ایک بیٹے کی خواہش مند تھی لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ صرف دعا ہی کرسکتی تھی لیکن راشد کے لہجے سے ایسا لگا کہ وہ بھی اپنی ماں کے انداز میں سوچ رہے ہیں جیسے لڑکا پیدا نہ ہونے میں سارا قصور میرا ہی ہے اور اس بار بھی لڑکی ہوئی تو اس کا نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو آنے والے دنوں میں مجھے بدترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

وہ رات انہی اندیشوں میں سوتے جاگتے گزری۔ صبح چھ بجے مجھے لیبر روم لے جایا گیا اور ایک گھنٹے بعد نرس نے مجھے چوتھی بیٹی ہونے کی خوش خبری سنائی۔ شاید میں ذہنی طور پر یہ خبر سننے کے لیے تیار تھی۔ اس لیے میں نے فوری طور پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا بس خدا سے نومولود بچی کی صحت، سلامتی اور اچھے مستقبل کی دعا مانگی۔ اس کے بعد میں نے پُرسکون ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے معلوم تھا کہ آنے والا وقت بہت کٹھن ہوگا اور مجھے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہیے۔

نرس نے بچی کو تیار کرکے میرے پہلو میں لٹادیا۔ وہ میری تینوں بیٹیوں سے زیادہ خوبصورت اور نازک تھی۔ مجھے اس پر بے اختیار پیار آنے لگا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ میری فوج میں ایک اور سپاہی کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اسے دیکھ کر میرا عزم اور حوصلہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگیا اور میں نے اسی وقت تہیہ کرلیا کہ حالات خواہ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں، ساس کی بک بک اور شوہر کی بے رخی میں چاہے کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہوجائے لیکن میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ اپنی بچیوں کی اچھی پرورش اور بہتر مستقبل کے لیے بڑی سے بڑی سختی اور تکلیف برداشت کرلوں گی لیکن انہیں احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونے دوں گی۔

راشد اور ڈاکٹر ثمینہ کی آمد تقریباً ایک ساتھ ہی ہوئی۔ بچی کو دیکھ کر راشد کا منہ بن گیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے بس خاموشی سے میرے بیڈ کے ساتھ رکھی بینچ پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر ثمینہ بھی آگئی۔ اس نے آتے ہی بچی کو گود میں اٹھالیا اور چہچہاتے ہوئے بولی "ماشاء اللہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ کاش میں بھی ایسی ہی ہوتی۔"

اس کی شگفتہ بیانی پر میں مسکرادی لیکن راشد پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر ثمینہ نے ان کی بے رخی کو محسوس کیا اور بولی۔ "آپ ان کے شوہر ہیں؟"

راشد نے اثبات میں گردن ہلادی تو وہ بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بیٹی کی پیدائش پر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"

"جی جی۔ نہیں نہیں تو۔" وہ اٹک اٹک کر بولے۔

"کم از کم بچی کو گود میں تو لیں تاکہ یہ معصوم بھی باپ کی شفقت کے لمس سے آشنا ہوجائے۔"

راشد نے بادلِ ناخواستہ بچی کو گود میں لے لیا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ نے ان کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بچی کو لے لیا اور اس کی جگہ پر لٹاتے ہوئے بولی۔ "دیکھیے مسٹر راشد! مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا تو حق نہیں لیکن چہرے کے تاثرات سے آپ کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگاسکتی ہوں۔ بہرحال ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی بیگم کا خیال رکھیں۔ یہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہیں۔ خون کی کمی کی وجہ سے جسمانی نظام متاثر ہوسکتا ہے۔ اس لیے آپ کو ان کی صحت اور غذا کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ان کا ہر ہفتے چیک اپ ہوگا اور جب تک ان کی صحت مکمل طور پر بحال نہیں ہوجاتی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ یہ کوشش بھی کریں کہ انہیں ذہنی طور پر کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ معمولی سی ٹینشن بھی ان کے لیے خطرناک ہوسکتی ہے۔"

راشد بے دلی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو بولے "آپ کا بہت بہت شکریہ! میں ان سب باتوں کا خیال رکھوں گا۔" یہ کہہ کر وہ کھڑے ہوگئے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "چلتا ہوں دفتر کے لیے دیر ہورہی ہے۔ شام کو آؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادو۔"

"بچیوں کو لیتے آیئے، میرے بغیر اداس ہورہی ہوں گی۔"

"اچھا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے تو ڈاکٹر ثمینہ بولی۔ "میں نے پہلی ڈوز تو دے دی ہے۔ فی الحال ان کا دماغ درست کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"ڈاکٹر! کیا واقعی میری صحت اتنی خراب ہے کہ مجھے ہر ہفتے چیک اپ کے لیے آنا پڑے گا۔"

"ارے نہیں۔ یہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تاکہ تم سے رابطے میں رہوں۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ بس اپنی خوراک پر توجہ دو۔ پھل اور دودھ کا استعمال شروع کردو اور ساس کی

باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دو۔ میں نے اپنی وکیل دوست کو بھی بلایا ہے۔ وہ آج لنچ ٹائم میں آئے گی۔ تم اپنا مسئلہ تفصیل سے بتانا وہ ضرور کوئی نہ کوئی حل تجویز کرے گی۔

عارفہ یزدانی بھی ڈاکٹر ثمینہ کی طرح بہت پیاری، شفیق اور مخلص عورت تھی۔ وہ تقریباً ڈاکٹر ثمینہ ہی کی ہم عمر تھی اور اسی کی طرح غیر شادی شدہ تھی۔ اس نے بڑے سکون اور اطمینان سے میری بات سنی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہمارے معاشرے میں عام مسئلہ ہے۔ ہمارے یہاں لڑکی کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اس معاملے کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس کا ذمے دار عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے اور اسی کو سزا بھی بھگتنا ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی پیدائش کو بہانہ بنا کر مرد دوسری شادی کر لیتے ہیں یا ساری عمر اپنی عورتوں کو طعنے دیتے رہتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنے آپ کو شوہر اور سسرال والوں کے مقابلے میں محکوم، مجبور اور بے بس سمجھتی ہے اور اس میں کچھ قصور اس کے والدین کا بھی ہے جو ساری عمر اپنی بیٹی کو اطاعت و فرمانبرداری کا سبق پڑھاتے رہتے ہیں اور شادی کے وقت بھی ان کی یہی نصیحت ہوتی ہے کہ سسرال سے تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔ یہی سوچ ہماری عورتوں کو برباد کر رہی ہے اور وہ اپنے آپ کو شریکِ زندگی سمجھنے کی بجائے کنیز سمجھنے لگتی ہیں اور سسرال والوں کی ہر جائز و ناجائز بات ماننے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔''

''آپ جانتی ہیں کہ اگر عورت نافرمانی کرے تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہی خوف تو عورتوں کو لے ڈوبا ہے۔ طلاق دینا یا دوسری شادی کرنا اتنا آسان نہیں۔ دراصل ہمارے یہاں کی عورتوں کو اپنے حقوق کے بارے میں معلوم ہی نہیں۔ اسی لیے وہ مرد کی دھمکیوں سے ڈر جاتی ہیں۔''

''اگر یہی صورتِ حال میرے ساتھ پیش آئی تو میں کیا کروں گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''ساس صاحبہ نے گھر سے چلتے وقت کہا تھا کہ بیٹی پیدا ہو تو یہاں مت آنا۔ آپ ہی بتائیں اگر وہ اپنی بات پر قائم رہیں تو میں کہاں جاؤں گی۔''

''تمہارے شوہر کیا کہتے ہیں؟'' عارفہ نے پوچھا۔

''ابھی تک تو ٹھیک ہیں لیکن لگتا ہے کہ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر پائیں گے۔''

''ویری گڈ! تم فی الحال ساس کو بھول جاؤ اور بیٹی کو لے کر فاتحانہ انداز میں گھر جاؤ جیسے کوئی انعام جیت کر آئی ہو۔''

''اگر راشد نے ماں کے بہکائے میں آ کر دوسری شادی کا ارادہ کر لیا تو......؟''

''یہ اتنا آسان نہیں۔ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔''

''وہ مجھے طلاق بھی دے سکتے ہیں!'' میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''ہاں۔ اس کا امکان ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ بتاؤ تمہارا مہر کتنا ہے؟''

''ایک لاکھ۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت خوب اور تمہارے میاں کی تنخواہ؟''

''وہ ایک سرکاری محکمے میں معمولی سی پوسٹ پر ہیں۔ اس سال انکریمنٹ لگنے کے بعد دس ہزار ہوئی ہے۔''

''گزارہ ہو جاتا ہے۔''

میں نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ سمجھ سکتی ہیں کہ اس مہنگائی کے دور میں یہ پیسے کتنے دن چلتے ہوں گے۔''

''بس تو تم بے فکر ہو جاؤ جب تک تمہارے شوہر کی کوئی لاٹری یا انعامی بانڈ نہ نکل آئے وہ تمہیں طلاق نہیں دے سکتا بس تم اپنی جگہ پر مضبوط ہو جاؤ۔ وہ لوگ چاہے کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ڈالیں لیکن تم کسی قیمت پر دوسری شادی کی اجازت مت دینا ویسے بھی چار بیٹیوں کے باپ اور ایک کم حیثیت شخص کو کون اپنی بیٹی دے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہاری ساس یہ حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گی۔''

''وہ ایک کوشش کر چکی ہیں اور اس میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آیندہ بھی انہیں منہ کی کھانا پڑے گی۔'' وہ جاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہ تمہارا دردِ سر نہیں۔ بس میں نے جو کہا ہے اس پر قائم رہنا۔ تمہاری ساس یونہی بکتی جھکتی رہیں گی لیکن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ''اس پر میرا فون نمبر لکھا ہوا ہے اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو فوراً مجھ سے رابطہ کرنا۔''

''لیکن ہمارے گھر میں فون نہیں ہے۔'' میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ گھر کے قریب کوئی پی سی او تو ہوگا۔ تم وہاں سے فون کر سکتی ہو۔'' پھر وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔ ایک کلائنٹ کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ تمہیں طلاق ہوگی اور نہ شوہر صاحب دوسری شادی کریں گے۔ تم مزے سے اپنی بچیوں کے ساتھ رہو اور ساس کی جلی کٹی باتوں سے انجوائے کرو۔''

اس کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ مجھے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ساس جو چاہیں کرتی رہیں مجھے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں تب بھی میں راشد کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دوں گی۔ وہ کیا کر لیں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ راشد کو مجبور کریں کہ وہ مجھے طلاق دے دیں۔ اول تو وہ ایسا نہیں کر سکتے اور اگر انہوں نے کہیں سے پیسوں کا انتظام کر بھی لیا اور مجھے طلاق دے دی تو کیا ہوا۔ دنیا میں سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتیں طلاق یافتہ ہونے کے باوجود زندہ رہتی ہیں۔ میں بھی اپنا کوئی ٹھکانا بنا لوں گی۔ اپنی بچیوں کے بہتر مستقبل کی خاطر محنت مزدوری کر لوں گی لیکن کسی کے دباؤ میں آ کر ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتی!

شام کو جب راشد آئے تو تینوں بیٹیاں بھی ساتھ تھیں۔ ساس صاحبہ نے البتہ آنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ راشد کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ کسی الجھن میں مبتلا ہیں۔ وہ کسی کام سے باہر گئے تو بڑی بیٹی نے مجھے بتایا کہ دادی بہت غصے میں ہیں اور خوب چلا رہی ہیں۔ ہمیں بھی کئی مرتبہ ڈانٹ چکی ہیں۔ انہوں نے ابو سے صاف کہہ دیا ہے کہ آپ کو ماما کے گھر چھوڑ دیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور بولے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر دادی اور زور سے چلّانے لگیں۔ آج کھانا بھی نہیں پکا۔ ہم دن بھر بھوکے بیٹھے رہے۔ ابو دفتر سے آئے تو انہوں نے بازار سے کھانا لا کر کھلایا۔

میرا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ اگر میں نے بیٹی پیدا کر کے کوئی جرم کیا تھا تو اس کی سزا میری بچیوں کو کیوں مل رہی تھی۔ راشد واپس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ وہ ڈاکٹر سے بات کر کے مجھے ڈسچارج کروا دیں میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ بچیاں میرے بغیر اداس ہو رہی ہیں۔ اس پر وہ بولے۔ ''چھٹی تو وقت پر ہی ملے گی لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دفتر سے دو دن کی چھٹی لے لی ہے۔ میں گھر پر اپنی بیٹیوں کے پاس رہوں گا۔''

اسی دوران ڈاکٹر ثمینہ بھی راؤنڈ پر آ گئی۔ وہ میری بیٹیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بولی۔ ''سعدیہ تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں اللہ میاں نے اتنی پیاری پیاری بیٹیاں دی ہیں۔'' پھر اس نے راشد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نے ان بچیوں کی اچھی تربیت کر لی تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔''

راشد کچھ جھینپ سے گئے۔ میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر! مجھے چھٹی کب ملے گی؟''

''کمزوری بہت زیادہ ہے۔ تمہیں کم از کم مزید دو دن یہاں رہنا پڑے گا۔'' پھر راشد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہاں سے جانے کے بعد بھی ان کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ جیسا کہ میں پہلے آپ کو بتا چکی ہوں کہ انہیں ہر طرح کے ذہنی اور جسمانی دباؤ سے دور رہنے کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد راشد بولے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ یہ ڈاکٹر بار بار تمہارا خیال رکھنے پر زور دے رہی ہے اور گھر کا حال تم جانتی ہو۔ وہاں تمہیں کیا آرام مل سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم چند روز کے لیے اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤ۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''امی زندہ ہوتیں تو شاید چلی بھی جاتی لیکن بھائی کے گھر تو کسی صورت میں بھی نہیں جاؤں گی۔''

ان کے چہرے سے اندرونی جذبات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ وہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کی ماں نے حکم جاری کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں قدم نہ رکھوں۔ شاید اسی لیے راشد نے مجھے بھائی کے یہاں جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ چند دنوں میں ماں کا غصہ کم ہو جائے گا تو وہ مجھے گھر لے جائیں گے لیکن میں اپنی ساس کو ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ میری غیر موجودگی میں راشد کو ورغلا سکیں۔

انہیں خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ''آپ میرے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں۔''

وہ کچھ دیر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر بچیوں کو لے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر ثمینہ آئی تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بولی۔ ''تم ساس کی

باتوں کی بالکل پروا مت کرو۔ تمہیں اپنے ہی گھر جانا چاہیے۔ وہ تمہارا کیا بگاڑ لیں گی۔ دھکے دے کر تو گھر سے نہیں نکال سکتیں۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں اور عارفہ تمہاری خبر گیری کرتی رہیں گی۔''

''لیکن میں آپ لوگوں سے کس طرح رابطہ کروں گی۔ روز روز تو پی سی او جا کر فون نہیں کرسکتی۔''

''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میرے پاس تو تم ویسے بھی ہفتے میں ایک بار آیا کرو گی اور عارفہ بھی تم سے ملنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تلاش کرلے گی۔''

دو دن بعد مجھے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ راستے بھر یہی سوچتی رہی کہ نہ جانے ساس صاحبہ کا رویّہ کیسا ہو۔ وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں۔ گھر پہنچی تو وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تینوں بچیاں ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ راشد نے مجھے اشارہ کیا اور میں بچیوں کو لے کر سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بڑی بیٹی نے بتایا کہ دادی صبح سے رو رہی ہیں۔ ابو سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے اولڈ ہوم چھوڑ آؤ۔ میں اس منحوس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ یہ سن کر ابو کو غصہ آگیا اور وہ پیر پٹختے ہوئے گھر سے باہر چلے گئے۔

یہ سب سننے کے بعد میرے دل میں ان کی جو تھوڑی بہت عزت تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ مجھے ڈاکٹر ثمینہ اور عارفہ دونوں نے یہی بات سمجھائی تھی کہ ساس کی کسی بات کا جواب نہ دوں اور مکمل خاموشی اختیار کیے رکھوں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایک چپ سو سکھ برابر ہے لیکن مجھے لگا کہ یہ فارمولا اس گھر میں نہیں چلے گا۔ میری خاموشی کو کمزوری سمجھ کر ساس صاحبہ شیر ہوسکتی ہیں اور اگر طاقت کے نشے میں آکر انہوں نے کوئی بڑا فیصلہ کرلیا تو میرے لیے سنگین مشکلات پیدا ہوجائیں گی لہٰذا مجھے بھی تھوڑا سا جارحانہ انداز اپنانا ہوگا۔

چار پانچ دن تک گھر میں شدید کشیدگی رہی۔ ساس مجھ سے بات کرنے کی روادار بھی نہ تھیں۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنی ذمّے داریاں سنبھال لیں۔ پہلا معرکہ اس روز ہوا جب مجھے ڈاکٹر ثمینہ کے بتائے ہوئے شیڈول کے مطابق چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ ساس صاحبہ کو پتا چلا تو انہوں نے ہنگامہ کھڑا کردیا۔ راشد ٹیکسی لینے گئے ہوئے تھے۔ میں اپنی فائل اٹھائے ان کے آنے کا انتظار کررہی تھی کہ ساس صاحبہ کمرے سے برآمد ہوئیں اور ہاتھ نچاتے ہوئے بولیں۔ ''اے بی بی، اب بند کردو یہ چوچلے۔ کیوں میرے بیٹے کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ ہم نے بھی بچے جنے ہیں مگر یہ تماشا کبھی نہیں لگایا۔''

''میں اپنی خوشی سے نہیں جارہی۔ ڈاکٹر نے بلایا ہے۔ ہر ہفتے چیک اپ ہوگا۔''

''وہ تو اپنی فیس کھری کرنے کے لیے ایک سال تک بلاتی رہے گی۔ تم کیوں اس کی باتوں میں آکر بے وقوف بن رہی ہو۔ کچھ اپنے میاں کا ہی خیال کرلو۔ بے چارہ کولہو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک جتا رہتا ہے تب کہیں مٹھی بھر روپے ہاتھ آتے ہیں۔ اوپر سے چار لڑکیوں کا ساتھ۔ ہائے میرے بچے کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ فیس نہیں لے گی۔''

''کیوں؟ تمہاری رشتے دار لگتی ہے وہ۔''

''یہی سمجھ لیں۔ وہ میرے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔''

''پھر بھی ٹیکسی کا کرایہ اور دوائیں۔ ہزار بارہ سو تو خرچ ہو ہی جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں نہیں جاتی لیکن اگر کوئی پیچیدگی پیدا ہوگئی تو بات ہزاروں میں چلی جائے گی۔ تب کیا ہوگا؟''

یہ سن کر وہ خاموش ہوگئیں۔ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ اسی اثنا میں راشد ٹیکسی لے کر آگئے اور میں انہیں بڑبڑاتا ہوا چھوڑ کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔

میں نے ڈاکٹر کو ساری بات بتائی اور کہا کہ ان حالات میں میرے لیے ہر ہفتے آنا ممکن نہیں۔ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی اور بولی۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی کبھار تم سے ملنے آجایا کروں۔ اس طرح چیک اپ کے ساتھ تمہارے حالات سے باخبر بھی رہوں گی۔''

''آپ کیوں میرے لیے اتنا پریشان ہورہی ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔''

''پہلی بات تو یہ کہ مجھے تم سے ہمدردی ہوگئی ہے اور دوسری یہ کہ تمہاری ساس عورت ہوتے ہوئے صنفِ نازک کی توہین کررہی ہیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ انہیں ایسا سبق سکھایا جائے کہ آئندہ وہ لڑکی کے پیدا ہونے پر واویلا نہ کریں اور نہ ہی اپنے بیٹے کی دوسری شادی کے بارے میں سوچیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اور عارفہ تم سے رابطے میں رہیں اور تمہارے گھر والوں کو بھی معلوم ہوجائے کہ تم لاوارث اور بے سہارا نہیں ہو۔''

''میں کس زبان سے آپ دونوں کا شکریہ ادا کروں۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں اور میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''میں نے ساس صاحبہ کو بتادیا ہے کہ آپ میرے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتی تھیں لیکن میڈم عارفہ کس حیثیت میں میرے گھر آئیں گی؟''

''اسے میں اپنے ساتھ لے کر آؤں گی اور یہی ظاہر کیا جائے کہ ہم تینوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھا کرتے تھے۔''

یہ نام نہاد معائنہ ختم ہوا تو ڈاکٹر ثمینہ نے راشد کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور کہا کہ اب ہر ہفتے آنے کی ضرورت نہیں، مہینے میں ایک مرتبہ چیک اپ کافی ہوگا۔

ایک بار پھر زندگی اسی ڈگر پر چلنے لگی۔ ساس صاحبہ نے میرا جینا حرام کررکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے پوتے کی دوہائی دیا کرتیں۔ اگر کہیں سے لڑکے کی پیدائش کی خبر آتی تو ان کی آہ و بکا میں اور اضافہ ہوجاتا۔ وہ آسمان کی طرف منہ کرتیں اور دونوں ہاتھ پھیلا کر فریاد کرتیں ''یااللہ! مجھ دکھیا کی بھی سن لے۔ تیرے خزانے میں کون سی کمی آجائے گی اگر تو ہمیں بھی ایک پوتا دے دے۔ کیا اس خاندان کو کبھی وارث نصیب نہیں ہوگا۔ کیا میرے بیٹے کی نسل یہیں ختم ہوجائے گی۔

ان کی باتیں سن کر مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ ایک دن وہ اسی طرح بین کررہی تھیں کہ میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور بولی ''آپ کی کون سی لاکھوں کروڑوں کی جائداد ہے جو وارث کے لیے پریشان ہورہی ہیں۔''

''اے بی بی! جائداد نہیں تو کیا ہوا۔ بیٹے سے باپ کی نسل تو آگے بڑھتی ہے نا۔''

''ایک بات بتائیے۔ کیا راشد کو اپنے دادا کا نام معلوم ہے؟''

''ہاں۔''

''اور پردادا کا؟''

''وہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔''

''بس تو یہاں آکر نسل ختم ہوگئی۔ یہی کچھ راشد کے ساتھ بھی ہوگا۔ ان کے پڑپوتوں کو بھی نہیں معلوم ہوگا کہ ان کا پردادا کون تھا۔ یہ نسل وسل سب ڈھکوسلے بازی ہے۔ اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر کریں اور بہتری کی دعا مانگیں۔''

''تم کچھ بھی کہو لیکن مجھے ایک پوتا چاہیے اور اب میں راشد سے فیصلہ کن بات کروں گی۔''

''کیسی بات؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''یہی کہ اب اسے دوسری شادی کرلینی چاہیے۔ کیونکہ تم میں تو بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔''

ساس صاحبہ کے خطرناک عزائم کے بارے میں جان کر سناٹے میں آگئی۔ ویسے تو وہ ایک کوشش پہلے بھی کرچکی تھیں لیکن میرے سامنے کھل کر اس طرح اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ پانی سر سے اونچا ہوتا جارہا ہے اور مجھے فوری طور پر اس کا کوئی سدِباب کرنا ہوگا کیونکہ راشد ایک کمزور انسان تھے اور وہ ماں کے مقابلے میں زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ بہرحال وہ بھی ایک مرد ہی ہیں اور ان کے دل میں بیٹے کی آرزو پروان چڑھ رہی ہوگی

اگر زبان سے نہیں کہا تو دل میں ضرور سوچتے ہوں گے کہ کاش ان کا بھی ایک بیٹا ہوتا ویسے بھی دوسری شادی کرنے میں ان کا کیا بگڑ رہا تھا۔ نقصان تو میرا ہوتا۔ مجھ پر ایک سوکن آجاتی اور میری بچیاں باپ کی شفقت وتوجہ سے محروم ہوجاتیں۔

میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ ڈاکٹر ثمینہ نے کہا تھا کہ وہ چیک اپ کے بہانے مجھ سے ملنے آئے گی لیکن ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ پی سی او سے عارفہ کو فون کرکے اس صورتِ حال سے آگاہ کروں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوسرے روز ڈاکٹر ثمینہ خود ہی آگئی۔ اس کے ساتھ عارفہ بھی تھی۔ میری ساس ان دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئیں کیونکہ آج تک میرا کوئی عزیز رشتے دار، دوست یا سہیلی مجھ سے ملنے نہیں آئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر ثمینہ کا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ دونوں میرے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتی تھیں۔ میری ساس کو شاید یقین نہیں آیا اور وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”اے بی بی تم نے پہلے تو کبھی ان کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی یہ آج تک تم سے ملنے آئیں۔“

”اسکول ختم ہونے کے بعد ہمارا آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ وہ تو میں اس بار اسپتال گئی تو ڈاکٹر ثمینہ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ہی عارفہ کے بارے میں بتایا۔“

”اچھا تم اپنی سہیلیوں کی خاطر تواضع کرو۔ میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔“

ڈاکٹر ثمینہ نے اسٹیتھواسکوپ نکالا اور میرا معائنہ کرنے لگی پھر اس نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا اور تشویش آمیز لہجے میں بولی۔ ”کیا بات ہے کوئی ٹینشن ہے کیا؟ بلڈ پریشر تھوڑا سا زیادہ ہے۔“

”شکر ہے کہ تھوڑا سا ہی زیادہ ہے۔ ورنہ میری کنپٹیاں تو بری طرح سلگ رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی۔“

”بات کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔“ عارفہ بے چین ہوتے ہوئے بولی۔

”میں انہیں اپنے کمرے میں لے گئی اور ساس سے ہونے والی پوری گفتگو انہیں سنادی۔ وہ دونوں چند لمحے خاموش رہیں پھر عارفہ بولی۔ ”تمہارے شوہر نے تو ابھی ایسی کوئی بات نہیں کی؟“

”نہیں لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ زیادہ دیر اپنی ماں کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ اگر انہوں نے مجھ سے دوسری شادی کی اجازت مانگی تو مجھے کیا کہنا چاہیے۔“

”تمہاری جگہ میں ہوتی تو صاف انکار کردیتی۔“ عارفہ بولی۔ ”لیکن تمہارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا۔ البتہ تم کچھ کڑی شرائط عائد کرسکتی ہو۔ مثلاً یہ کہ تم سوکن کے ساتھ نہیں رہوگی۔ وہ تمہیں الگ گھر لے کردیں اور ہر مہینے بچیوں کے اخراجات کے لیے دیا کریں جو اُن کی تنخواہ کے نصف کے برابر ہو۔ یہ سنتے ہی ان کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی اور وہ کبھی دوسری شادی کا نام نہیں لیں گے۔“

”اور اگر انہوں نے طلاق کی دھمکی دی تو۔“

”وہ تمہیں کبھی بھی طلاق نہیں دیں گے کیونکہ وہ مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ تم پر دباؤ ڈال سکتے ہیں تاکہ تم انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دو۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس دباؤ کا مقابلہ کس طرح کرتی ہو۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ڈٹ جاؤ اور کسی صورت بھی ان کی خواہش پوری نہ ہونے دو۔“

وہ دونوں کچھ دیر بیٹھی میرا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ ان کے آنے سے بڑی ڈھارس ہوئی تھی اور لگ رہا تھا کہ میری حمایت کرنے والا بھی کوئی ہے۔ شام کو راشد آئے تو ساس صاحبہ نے یہ رپورٹ بھی انہیں دے دی۔ وہ خاصے حیران ہوئے کیونکہ دس سالہ ازدواجی زندگی میں پہلے کبھی کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ کمرے میں آئے اور بے یقینی کے انداز میں بولے۔ ”تم نے پہلے تو نہیں بتایا کہ ڈاکٹر ثمینہ اسکول میں تمہاری کلاس فیلو رہ چکی ہے۔“

”بس موقع ہی نہیں ملا اور یہ کوئی ایسی اہم بات بھی نہیں تھی۔“

”اور یہ عارفہ کون ہے؟“

”اماں نے نہیں بتایا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ ڈاکٹر ثمینہ سے جب اسے میرے بارے میں علم ہوا تو ملنے چلی آئی۔“

”اچھا، ان لوگوں سے میل جول بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ان سے حیثیت میں کم ہے۔“

”اگر کوئی میرے گھر آئے گا تو اسے منع تو نہیں کرسکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ یقین دلاسکتی ہوں کہ خود ان سے ملنے نہیں جاؤں گی۔“

وہ خاموش ہوگئے کیونکہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا لیکن انداز بتا رہے تھے کہ انہیں ان دونوں کا

آنا اچھا نہیں لگا۔ شاید وہ بھی اپنی ماں کی طرح یہی چاہتے تھے کہ مجھے پوچھنے والا کوئی نہ ہو اور میں اسی طرح ان لوگوں کے رحم و کرم پر پڑی رہوں۔ مجھے لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں لیکن ہمت نہیں ہو رہی۔ کہیں ماں کی باتوں میں آ کر وہ بھی دوسری شادی کے لیے تیار تو نہیں ہو گئے۔ مجھ سے تو وہ صاف صاف کہہ چکی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ بیٹے کو بھی راضی کرلیا ہو۔ سوچا کہ پوچھ لوں لیکن پھر خیال آیا کہ مجھے بات چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ان کے دل میں کچھ ہوگا تو وہ خود ہی کہہ دیں گے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے اور گھر کے ماحول میں تلخی بڑھتی گئی۔ ساس تو ویسے بھی مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی تھیں لیکن اب راشد کے رویّے میں بھی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ اکثر وہ شام کو دیر سے گھر آتے۔ بات بات پر جھنجلانے لگتے۔ پہلے وہ بچیوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ اکثر انہیں گھمانے پھرانے لے جاتے یا ان کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لایا کرتے لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا بلکہ وہ بچیوں کو ذرا ذرا سی بات پر جھڑکنے اور ڈانٹنے لگے تھے۔ پہلے وہ ان کی گود میں بیٹھ جاتیں۔ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولا کرتیں لیکن اب وہ سہمی سہمی رہنے لگی تھیں۔ ان کے دل میں عجیب طرح کا ڈر اور خوف بیٹھ گیا تھا۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اور میں نے ایک دن راشد کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ راشد اخبار پڑھ رہے تھے۔ بڑی بیٹی ہوم ورک کر رہی تھی۔ اسے کچھ پوچھنا تھا۔ باپ کے پاس گئی اور بڑے لاڈ سے بولی۔ ”ابو یہ سوال سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ذرا بتا دیں۔“

راشد نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ”اپنی ماں سے پوچھو۔“

”وہ کام کر رہی ہیں۔“ بچی نے معصومیت سے کہا۔

”کیا مصیبت ہے۔ دو منٹ سکون سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے بچی سے کاپی لی اور زمین پر پھینکتے ہوئے بولے ”دفع ہو جاؤ۔ خبردار جو مجھے دوبارہ تنگ کیا۔“

بچی رونے لگی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں کچن سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ بچیوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔ اس نے سوال ہی پوچھا ہے۔ کسی چیز کی فرمائش تو نہیں کی۔“

”تم بیچ میں مت بولو۔“ وہ چلّاتے ہوئے بولے۔ ”کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ اپنی اولاد کو کچھ کہہ سکوں۔“

”حق ہے لیکن اگر وہ کوئی بدتمیزی کریں۔ اس وقت تو اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔“

”اچھا، اچھا، میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“

ان کا رویّہ خاصا توہین آمیز تھا۔ میں نے بچی کو اشارے سے کمرے میں جانے کو کہا اور راشد کے قریب آ کر بولی۔ ”دیکھیں راشد، آپ کا یہ رویّہ ہم سب کے لیے ذہنی اذیت کا باعث ہے۔ خاص کر بچیوں پر اس کا بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ جو کچھ آپ کے دل میں ہے وہ کھل کر کہہ دیں تاکہ بات صاف ہو جائے۔“

”تم سے اماں نے کچھ نہیں کہا۔“ وہ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

”لیکن میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔“

”تو سنو سعدیہ بیگم! اماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ مجھے دوسری شادی کرلینی چاہیے۔“

مجھے راشد سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اتنی بڑی بات یوں آسانی سے کہہ دیں گے۔ بلکہ اب تک تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ دوسری شادی کا شوشہ میری ساس کے ذہن کی اختراع ہے۔ راشد بھی اس پر تیار نہیں ہوں گے لیکن ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ دوسری بیوی آپ کو بیٹا دے سکے گی۔“

”بالکل۔ کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے۔ بیٹے کے انتظار میں ساری زندگی ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتا۔“

”تو پھر کرلیں دوسری شادی۔ مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں۔“

”اس کے لیے تمہاری اجازت درکار ہے۔“

”وہ تو میں کبھی نہیں دے سکتی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ مجھے اپنی محبت کا بٹوارا منظور نہیں۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو سعدیہ۔“ وہ کچھ نرم ہوتے ہوئے بولے۔ ”تمہاری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھ جائے

گی۔“

”مجھے بہلانے کی کوشش مت کریں۔ کیا میں جانتی نہیں کہ دوسری عورت کے آجانے کے بعد پہلی اپنی قدر کھو بیٹھتی ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور تمہیں اس کی اجازت دینا ہوگی ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس کی ذمّے داری مجھ پر نہ ہوگی۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

”آپ کا جو دل چاہے کریں۔ میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔“

یہ کہہ کر میں پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس واقعہ کے بعد گھر کی فضا مزید کشیدہ ہو گئی۔ راشد نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی۔ ساس کا رویّہ مزید جارحانہ ہو گیا۔ وہ دن بھر مجھے کوستی رہتیں اور اب تو انہوں نے باقاعدہ میرے مرنے کی دعا مانگنا... شروع کر دی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ مسئلہ صرف اسی صورت حل ہو سکتا تھا کہ میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے عارفہ کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ کسی کام کا بہانہ کرکے گھر سے نکلی اور قریبی پی سی او سے فون کرکے اسے خود آنے کے لیے کہا۔

وہ دوسرے روز ہی آ گئی۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ کہنے لگی۔ ”چلو اچھا ہوا کہ راشد نے اپنے منہ سے یہ بات کہہ دی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے دوسری شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب یہ اعصاب کی جنگ ہے۔ وہ تم پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہیں گے۔ کبھی منت سماجت کریں گے۔ کبھی زور زبردستی اور دھمکی سے کام لیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اس دباؤ کا مقابلہ کس طرح کرتی ہو۔ اگر تم اسی طرح ڈٹی رہیں تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اور اگر انہوں نے کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش کی تو میں ان سے نمٹ لوں گی۔“

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ جیسے ہی واپس جانے کے لیے باہر نکلی۔ میری ساس نے اس کا راستہ روک لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولیں ”بیٹی، ذرا ایک منٹ کے لیے میری بات سنتی جاؤ۔“

عارفہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس نے اشارے سے مجھے کمرے میں جانے کے لیے کہا اور بولی ”جی فرمایئے آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

ساس صاحبہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے رازداری سے بولیں ”میرے کمرے میں آجاؤ۔“

کمرے میں جا کر انہوں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور عارفہ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں ”بیٹی! تم سعدیہ کی دوست ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ اپنی ضد سے باز آجائے۔ میرے بیٹے کو دوسری شادی کی اجازت دے، اسی میں ہم سب کا بھلا ہے۔“

”بہت مشکل ہے۔“ عارفہ گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”جب اس نے اپنے شوہر کی نہیں مانی تو وہ میری کیا سنے گی۔“

”اچھا تو پھر کوئی دوسرا راستہ بتاؤ۔ تم تو وکیل ہو۔ تمہارے پاس کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔“

عارفہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے اسی وقت میری ساس کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا اور معنی خیز انداز میں بولی۔ ”ٹھیک ہے، میں سعدیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ کل راشد کو لے کر تین بجے میرے دفتر آجائیں۔ وہاں اطمینان سے بات ہو سکے گی لیکن میں مشورے کی فیس لیتی ہوں۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ میری ساس خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل تین بجے آپ دونوں کا انتظار کروں گی۔“ پھر اس نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے ایک کارڈ نکالا اور بولی۔ ”اس پر میرا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ اگر اجازت ہو تو سعدیہ سے مل لوں۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ میری ساس کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

عارفہ دوبارہ میرے کمرے میں آئی اور اس نے مزے لے لے کر ساس سے ہونے والی ساری گفتگو مجھے سنا دی پھر بولی۔ ”تم دیکھنا میں ان دونوں کا کیسا تماشا بناتی ہوں۔ کل اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جائے گا پھر یہ لوگ کبھی دوسری شادی کا نام بھی نہیں لیں گے۔“

مجھے اپنی ساس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ پوتے کی آرزو نے انہیں عقل و ہوش سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ وہ میری سہیلی کو درمیان میں لے آئیں اور اس سے میری بربادی کا مشورہ مانگ رہی تھیں۔

دوسرے دن جو کچھ ہوا، اس کی رُوداد عارفہ نے مجھے بعد میں بتائی۔ اس روز راشد دفتر سے جلدی گھر آ گئے اور ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے ساس کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ عارفہ نے ان دونوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور بولی۔ ''مبارک ہو، سعدیہ تیار ہو گئی ہے۔''

''سچ! میری ساس خوشی سے اچھلتے ہوئے بولیں۔ کیا واقعی وہ تیار ہو گئی۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔''

''ہاں وہ مان گئی ہے لیکن اس کی ایک شرط ہے۔''

''ہم اس کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ بتائیں تو سہی۔'' راشد بے تابی سے بولے۔

''معاف کیجیے، میں جلدی میں غلط کہہ گئی۔ اس نے ایک نہیں بلکہ دو شرطیں عائد کی ہیں۔''

''چلیں دو ہی سہی۔'' راشد بولے۔ ''آپ وہ شرطیں بتائیں۔''

''پہلی شرط تو یہ کہ وہ آپ کو دوسری شادی کی اجازت اس وقت دے گی جب آپ اپنے لیے لڑکی تلاش کر لیں گے اور اس سے آپ کا رشتہ طے پا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے۔'' میری ساس جلدی سے بولیں۔

''گڈ! دوسری شرط ذرا مشکل ہے۔ آپ کو پکے کاغذ پر لکھ کر دینا ہوگا کہ اگر دوسری بیوی سے بھی آپ کے یہاں بیٹا نہ ہوا تو آپ ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اسے طلاق دے دیں گے۔ پھر آپ تیسری شادی کریں گے اور مراد پوری نہ ہوئی تو اسے بھی طلاق دینا ہوگی اور لڑکا پیدا ہونے تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا، چاہے آپ کو دس مرتبہ شادی کرنا پڑے۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' راشد بھڑکتے ہوئے بولے۔ ''شادی کرنا اتنا آسان ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' عارفہ بولی۔ ''جب آپ اولادِ نرینہ کی خاطر دوسری شادی کر سکتے ہیں تو تیسری، چوتھی اور پانچویں شادی کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔''

''کچھ بھی ہو۔ میں ایسی فضول شرط نہیں مان سکتا۔'' راشد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ''میں پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ سعدیہ سے ملی ہوئی ہیں اور ہمیں محض بے وقوف بنانے کے لیے بلایا ہے۔''

''ظاہر ہے وہ میری دوست ہے۔ میں اسی کے فائدے کے بارے میں سوچوں گی۔'' عارفہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''آپ کے لیے میرا مشورہ ہے مسٹر راشد کہ دوسری شادی کا خیال دل سے نکال دیں بالفرض سعدیہ نے اجازت دے دی تب بھی آپ اسے افورڈ نہیں کر سکیں گے۔ یاد رکھیے ایک چھت کے نیچے دو عورتیں نہیں رہ سکتیں۔ آپ کی زندگی عذاب بن کر رہ جائے گی اور آپ سکون کے لیے ترستے رہیں گے۔''

راشد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور گھر آ گئے۔ شاید عارفہ کی بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انہوں نے پھر کبھی دوسری شادی کی بات نہیں کی۔ ساس صاحبہ کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ بس ہر وقت آسمان کی طرف نظریں کیے کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتیں۔ شاید پوتے کے لیے ہی دعا مانگتی ہوں گی۔ ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی روگ انہیں گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ راشد نے انہیں کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن ان کی حالت بگڑتی چلی گئی۔

انہی دنوں میں پھر حاملہ ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے مزید اولاد کی خواہش نہیں تھی لیکن راشد کے دل میں ایک بار پھر امید کا دیا روشن ہو گیا۔ وہ باقاعدگی سے پانچ وقت نماز باجماعت پڑھنے لگے۔ میں تو خیر شروع سے ہی نماز کی پابند تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ساس صاحبہ نے میرے حاملہ ہونے کی خبر سن کر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی ہمیشہ کی طرح پوتے کے بارے میں جذباتی ہوئیں۔ بس دن بھر تخت پر نیم دراز لیٹی زیرِ لب کچھ پڑھتی رہتی تھیں پھر ایک دن وہ پوتے کی آرزو لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

ان کے انتقال کے دو ماہ بعد میں نے ایک خوبصورت سے بیٹے کو جنم دیا۔ راشد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ان کی سلطنت کا وارث دنیا میں آ چکا تھا لیکن وہ ہستی ہی نہ رہی جو اس کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ اس لمحے ایک انجانے دکھ نے مجھے گھیر لیا۔ قدرت کے فیصلے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں، کاش یہ لڑکا میری ساس کی زندگی میں آ جاتا تو ان کی دیرینہ آرزو پوری ہو جاتی۔ اس وقت مجھے اپنی ساس سے گہری ہمدردی محسوس ہوئی اور میں نے سچے دل سے ان کی تمام زیادتیوں کو بھلا دیا۔ پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ کبھی کسی خواہش کو روگ نہ بنائیں۔ دینے والی ذات اللہ کی ہے بس اسی سے دعا مانگیں۔

کالا علم

جناب ایڈیٹر صاحب

سلام عرض

ایک لکھاری کی حیثیت سے یہ میری پہلی کاوش ہے۔ غلطیوں کے لئے پیشگی معافی، یہ سچ بیتی ہماری ایک جاننے والی کی ہے امید ہے پسند آئے گی

دانیہ صدیقی
(کراچی)

حلیمہ چاچی ہمارے خاندان میں اپنی خوش اخلاقی اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے مشہور تھیں۔ یوں تو وہ ہمارے گھر کی ملازمہ تھیں لیکن انہیں ہمارے یہاں کام کرتے ہوئے بیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اسی لیے اب وہ ہمارے گھر کے فرد کی طرح ہی تھیں اور گھر والے احتراماً انہیں چاچی کہتے تھے۔ وہ میری امی سے لے کر میرے تین سالہ بھتیجے تک سب کی چاچی تھیں۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ میرے تایا جو عمر میں ان سے کم سے کم بھی پندرہ سال بڑے ہوں گے وہ بھی انہیں چاچی

کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ خاندان میں منگنی کی تقریب ہو یا عقیقے کی ہر جگہ حلیمہ چاچی کی موجودگی ضروری ہوتی تھی اور وہ بھی سارے کام ہنسی خوشی انجام دیتیں۔ مایوں میں گلگلے بنانے کی ذمّے داری ہو یا دلہن کی اماں کو ٹیک سنبھالنے میں دشواری ہو حلیمہ چاچی ماتھے پر بَل لائے بغیر ایمانداری سے سارے کام نمٹاتے جاتیں۔

حلیمہ چاچی کے شوہر نے انہیں بہت دکھ دیے تھے۔ امی بتاتی تھیں کہ ان کی شادی نہایت کم عمری میں ہی ان کے غریب والدین نے ان سے دوگنا بڑے شخص سے کردی تھی۔ شادی کے بعد اس کے کُن پتا چلے کہ وہ نشے کا عادی ہونے کے ساتھ ساتھ جوئے کی لت میں بھی مبتلا ہے۔ حلیمہ چاچی نے اس پر بھی صبر کیا اور لوگوں کے گھروں میں کام کرکے گھر چلاتی رہیں۔ ان کا شوہر نشے میں ان کو مارتا پیٹتا مگر یہ سارے دکھ درد خاموشی سے برداشت کرتیں۔ کبھی کبھار چوری چکاری کے مقدمے میں تھانے میں بند ہو جاتا تو یہ بنگلے والوں سے ادھار لے کر اس کی ضمانت کرواتیں۔ وہ بھی دو تین دن تک بیوی کا احسان مند رہتا۔ نماز پڑھنے مسجد جاتا، گھر کے کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹاتا اور شراب جوئے سے دور رہتا۔ ان دنوں حلیمہ چاچی اترائی اترائی گھومتیں کہ اپنے حسنِ سلوک سے وہ اپنے شوہر کو بالآخر راہِ راست پر لے ہی آئیں لیکن ان کے خوابوں کا یہ محل جلد ہی چکنا چور ہو جاتا اور ایک رات پھر اس کے ہاتھ میں کچی شراب کی بوتل آجاتی اور وہ ان کو ادھیڑ کر رکھ دیتا۔

حلیمہ چاچی کی دو بیٹیاں بھی تھیں جو اخلاق اور صبر میں بالکل اپنی ماں پر گئی تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے کرتوں میں ملبوس اور بڑی سی چادر میں خود کو لپیٹے وہ بھی اپنی ماں کی طرح گھر گھر کام کرتی تھیں۔ حلیمہ چاچی نے کوشش کرکے انہیں ایسے بنگلوں میں لگوایا تھا جہاں انہوں نے خود ایک عرصہ کام کیا تھا اور مالک و نوکر کے بیچ اعتماد کا رشتہ قائم تھا۔ ہر ماں کی طرح حلیمہ چاچی کا بھی خواب تھا کہ ان کی بیٹیاں جلد از جلد اچھے گھرانوں میں بیاہی جائیں اور انہیں وہ دکھ نہ اٹھانے پڑیں جو حلیمہ چاچی نے جھیلے تھے۔ ان کے شوہر کا آٹھ سال پہلے انتقال ہو چکا تھا لیکن اب بھی وہ اس کو یاد کرکے آبدیدہ ہو جاتیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی مغفرت کی دعائیں کرتیں۔ ہم لوگ حیران ہو کر بولتے۔ ”رہنے بھی دو چاچی، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ کون سے سکھ دیے اس نے تمہیں؟ جب تک زندہ رہا چار چوٹ کی مار دیتا تھا۔ گھر کا خرچہ تک تم چلاتی تھیں، ایسے شخص کی یاد میں کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو؟“ لیکن چاچی پر ہماری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ ویسے ہی زار و قطار آنسو بہائے جاتیں۔

ہمارے گھر ان کی چھوٹی بیٹی طاہرہ کام کرنے آتی تھی۔ وہ بھی بالکل اپنی ماں کی طرح سیدھی سادی اور کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ ان ماں بیٹیوں کی سب سے اچھی خوبی یہ تھی کہ دوسری کام کرنے والیوں کے برعکس یہ ہر وقت حالات کا رونا رو کر پیسے اور ہمدردیاں بٹورنے کے چکر میں نہیں رہتی تھیں بلکہ جو ان کے مالکان خوشی سے دے دیں رکھ لیتی تھیں اور مزید کی ہوس نہیں کرتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد چاچی کی بڑی بیٹی نعیمہ کا ان کے کسی رشتے دار کے توسط سے رشتہ آیا۔ لڑکا میٹرک پاس تھا اور اپنے باپ اور چچا کے ساتھ مل کر آٹو پارٹس کا کام کرتا تھا۔ جمشید روڈ پر ان کی اپنی دکان تھی جہاں یہ کام خود سنبھالتا تھا۔ رشتہ ہر لحاظ سے موزوں تھا چنانچہ چاچی نے صلاح مشورے کے بعد رشتے کے لیے ہامی بھرلی۔ شادی کے لیے کچھ تو انہوں نے پہلے سے جوڑ رکھا تھا اور کچھ مدد بنگلے والوں نے کردی۔ یوں نعیمہ کی شادی احسن طریقے سے انجام پا گئی۔ نعیمہ کی شادی کے موقع پر چاچی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں، بار بار دونوں ہاتھ پھیلا کر اوپر والے کا شکر ادا کرتی تھیں اور اپنی بیٹی کے اچھے نصیب کے لیے دعا گو تھیں۔

نعیمہ کی شادی کے بعد طاہرہ پر کام کا بوجھ بڑھ گیا کیونکہ اب وہ نعیمہ والے گھر بھی دیکھ رہی تھی۔ نعیمہ کے شوہر نے شادی کے بعد اسے کام کرنے سے منع کر دیا تھا چنانچہ اب اس کے گھر چاچی اور طاہرہ نے آپس میں بانٹ لیے تھے۔ ہر چیز معمول کے مطابق چل رہی تھی بس اتنا فرق آیا تھا کہ طاہرہ پہلے ہمارے گھر صبح نو بجے آکر کام نمٹا جایا کرتی تھی لیکن اب کام کی زیادتی کی وجہ سے اس نے اپنا وقت بڑھا کر دوپہر بارہ بجے کر لیا تھا۔

ایک دن طاہرہ خلافِ معمول کام پر نہیں آئی۔ ہم نے اسے طبیعت خرابی پر محمول کیا اور گھر کے کام خود نمٹا لیے۔ اس کے بعد مزید تین دن گزر گئے لیکن طاہرہ نہ کام پر آئی نہ اس کی کوئی اطلاع آئی۔ اب ہمارا فکر مند ہونا لازمی تھا کیونکہ ایک طرف تو گھر کے کام ٹھپ پڑے تھے اور دوسری طرف اس کی جانب سے بغیر اطلاع کی گئی اتنی طویل غیر حاضری بھی تشویش ناک تھی۔ طاہرہ ایک گلی چھوڑ کر اکرام صاحب کے بنگلے پر بھی کام کرتی تھی چنانچہ امی نے چھوٹے بھائی کو ان کے بنگلے پر بھیجا لیکن وہاں سے بھی یہی اطلاع آئی کہ

طاہرہ گزشتہ چار دنوں سے کام پر نہیں آئی اور نہ اس کی کوئی اطلاع ہے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ حلیمہ چاچی بھی طاہرہ کی طرح اچانک غائب ہو گئی تھیں اور ان کا بھی کوئی اتا پتا نہیں مل رہا تھا۔

آج طاہرہ اور حلیمہ چاچی کو غائب ہوئے دسواں روز تھا۔ گھر کی خواتین تو سنجیدگی سے دوسری کام والی رکھنے پر آمادہ ہو گئی تھیں اور ان کا یہ اقدام درست بھی تھا کیونکہ حلیمہ چاچی اور ان کی بچیوں کی طرف سے پہلے کبھی اتنی غیر ذمّے داری کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔ ہم سب ان کے لیے فکر مند بھی تھے لیکن ان کے گھر جانا بھی ممکن نہ تھا۔ وہ لیاری بستی کے نواح میں رہتی تھیں اور شہر کے حالات کے پیشِ نظر کوئی بھی وہاں جانے کا رسک لینے کو تیار نہ تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے، میں اور میری تایا زاد بہن ابھی ابھی گھر بھر کے کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تھیں۔ اتوار کی وجہ سے سارے لوگ گھر پر ہی تھے کہ اچانک حلیمہ چاچی آن پہنچیں۔ ایک لمحے میں ساری خواتین ان کے گرد جمع ہو گئیں، ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا۔ شکایتوں کا ایک انبار تھا جو حلیمہ چاچی صبر سے سر جھکائے سن رہی تھیں۔ جب سب نے اپنے دل ہلکے کر لیے تو دادی کو خیال آیا کہ کسی نے ابھی تک بے چاری سے پانی تک نہیں پوچھا چنانچہ دادی کے حکم پر سارا مجمع چھٹ گیا اور حلیمہ چاچی کو پانی کا گلاس پیش کیا گیا۔ حلیمہ چاچی کو دیکھ کر جہاں گھر بھر میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی تھی وہاں ہم سب ان کی اور طاہرہ کی بغیر اطلاع اتنی طویل غیر حاضری کی وجہ جاننے کے لیے بھی متجسس تھے۔

سب سے پہلا سوال چچی جان کی طرف سے آیا۔ ”کہاں رہ گئی تھیں چاچی آپ؟ طاہرہ کا بھی کچھ اتا پتا نہیں۔ سب خیریت تو ہے ناں؟“

ان کا اتنا پوچھنا تھا کہ حلیمہ چاچی منہ پر دوپٹا رکھ کر پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔ یہ بھی ہم لوگوں کے لیے ایک انوکھی بات تھی کیونکہ ان جیسی صابر اور بہادر خاتون نے کڑے سے کڑے وقت کو بھی ہنستے مسکراتے جھیلا تھا۔ کبھی شکایت کا ایک لفظ اپنی زبان پر نہیں لائی تھیں۔ حالات سے دلبرداشتہ ہو کر ایک آنسو نہیں بہایا تھا۔ آج وہی ہم سب کے سامنے آنسوؤں کے دریا بہا رہی تھیں۔

کچھ دیر رونے کے بعد جب ان کا دل ہلکا ہوا تو بولیں۔ ”کیا بتاؤں چھوٹی دلہن، اس طاہرہ نے تو میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ پچھلے دو روز سے قسم لے لو جو ایک کھیل بھی اُڑ کر میرے منہ میں گئی ہو۔ خدا ایسی بے حیا اور بے غیرت اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے۔“ وہ پھر زور شور سے آنسو بہانے لگیں۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں حیرت کا یہ دوسرا جھٹکا تھا جو ہم لوگوں کو طاہرہ کے بارے میں ان کے خیالات جان کر لگا۔ طاہرہ جیسی نیک اور تابعدار لڑکی جس کے شفاف کردار کی گواہی ہم لوگ آنکھیں بند کرکے دے سکتے تھے۔ اس نے آخر ایسا کیا کیا ہوگا جو اس کی ماں یوں ناچاری کی تصویر بنی دونوں ہاتھ پھیلائے اسے کوسنے اور بددعائیں دے رہی تھی۔ ہم بے صبری سے ان کے آنسو رکنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ اپنے ان خیالات کے پس منظر پر کچھ روشنی بھی ڈال سکیں۔

اس کے بعد حلیمہ چاچی نے کوئی گھنٹے بھر میں روتے دھوتے اپنی داستان مکمل کی جو اپنے طرز کی ایک انوکھی داستان تھی۔ قارئین کی آسانی کے لیے میں یہ قصہ مختصراً اپنے الفاظ میں سناتی ہوں۔

اس روز حلیمہ چاچی نے کام سے چھٹی کی تھی اور گھر کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آج طاہرہ کو دیکھنے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ یہ لوگ نعیمہ کے پڑوس میں ہی رہتے تھے اور اسی کی شادی میں طاہرہ انہیں پسند آگئی تھی۔ ان کا بیٹا دبئی میں کسی فیکٹری میں ملازم تھا اور کچھ دنوں بعد کراچی آنے والا تھا۔ اس کے گھر والے چاہ رہے تھے کہ اس مرتبہ وہ آئے تو اس کی شادی کردی جائے۔ اسی لیے وہ رشتے کے سلسلے میں حلیمہ چاچی سے ملنا چاہ رہے تھے۔ ان لوگوں نے نعیمہ سے اس بارے میں بات کی تو اس نے خوشی خوشی اپنی ماں کو آگاہ کر دیا۔ یہاں نعیمہ نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس کی سسرال میں ابھی یہ بات کسی کو نہ پتا چلے جہاں اس کی دو بن بیاہی نندیں پہلے سے ہی کسی اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ہر لحاظ سے ایک بہترین رشتہ تھا اور نعیمہ دل کی گہرائی سے چاہتی تھی کہ اس کی ماں کے سر سے طاہرہ کا بوجھ بھی اتر جائے اور بہن بیاہ کر اس کے پڑوس میں آجائے۔

طاہرہ کام نمٹا کر گھر پہنچی تو ماں نے اسے تیار ہونے کا حکم دیا۔ طاہرہ اپنی فرمانبردار فطرت کے باعث کسی چون چرا کے بغیر تیار ہو گئی اور دونوں ماں بیٹی آنکھوں میں ڈھیروں سپنے سجائے مہمانوں کا انتظار کرنے لگیں۔ انتظار کی گھڑیاں جب طول پکڑنے لگیں تو چاچی نے نعیمہ سے فون پر استفسار کیا۔ وہ اپنی سسرال میں منعقد کسی دعوت میں شریک تھی اسی لیے وہ بھی ماں کو تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ آخر خدا

خدا کر کے مقررہ وقت سے تین گھنٹے اوپر مہمانوں کی آمد ہو ہی گئی۔ حلیمہ چاچی پر انہوں نے پہلی ہی دفعہ میں کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ ایک تو وقت سے اتنا اوپر تشریف لائے تھے اوپر سے مرد حضرات یوں گردنیں اکڑائے بیٹھے تھے گویا کسی ریاست کے مہاراجا ہوں۔ خواتین کی باتوں سے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے لڑکی کا ہاتھ مانگنے نہیں بلکہ بازار سے من چاہی قیمت پر کوئی چیز خریدنے نکلی ہوں، نیز ان کی حرکات و سکنات بھی کافی مشکوک سی تھیں، گھر کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ لڑکے کی بڑی بہن نے تو حد ہی کر دی، باتوں ہی باتوں میں ان کے پیچھے باورچی خانے تک چلی آئی اور فریج کھول کر اس کا جائزہ لینے لگی۔

حلیمہ چاچی نے تو پہلی ہی نظر میں ان لوگوں کو طاہرہ کے لیے مسترد کر دیا تھا لیکن گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارت بھی ضروری تھی اسی لیے اپنی ملنسار عادت سے مجبور حلیمہ چاچی نے خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ناگواری سے دل پر پتھر رکھ کر طاہرہ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا جو پہلے ہی ان کی ..... اونچی آواز سے کی جانے والی گفتگو سے پریشان کمرے میں بیٹھی تھی۔ طاہرہ کا جائزہ انہوں نے یوں لیا جیسے قصائی بکرے کو ذبح کرنے سے قبل نظروں سے تولتا ہے۔ ان کے ساتھ آئے لڑکے کے دونوں بھائی اور بہنوئی بھی عجیب نظروں سے مسلسل طاہرہ کو گھور رہے تھے۔ حلیمہ چاچی اندر ہی اندر کٹ رہی تھیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح ان لوگوں کو ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیں اور خود کو اور اپنی بیٹی کو ان کی نظروں سے محفوظ کر لیں۔

ادھر لڑکے کی ماں اور بہن طاہرہ کو خود سے چمٹائے بیٹھی تھیں اور وہ ان کے بیچ یوں پھنسی بیٹھی تھی کہ چاچی کے مسلسل اشاروں کے باوجود وہاں سے اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ دونوں خواتین اسے اپنے ہاتھ سے یوں زبردستی مٹھائی اور سموسے کھلا رہی تھیں جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک یہ عذاب ان کے سر لڑکے والوں کی صورت مسلط رہا۔ گھڑی نے ساڑھے گیارہ بجائے تو وہ لوگ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور جاتے جاتے بھی دونوں خواتین نے زبردستی طاہرہ کو گلے سے لگایا اور ہونے والی بہو کو باطل نظروں سے محفوظ رکھنے والا وظیفہ پڑھ کر دَم بھی کیا۔ حلیمہ چاچی بے بسی سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھیں لیکن۔۔۔ فی الحال ان کو روکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ہاں یہ ان کے بس میں ضرور تھا کہ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس گھر میں نہ دیں اور اس کا تہیہ تو وہ ان لوگوں کو دیکھتے ہی کر چکی تھیں۔

مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد دونوں ماں بیٹی دیر تک ان کی باتیں یاد کر کر کے ہنستی رہیں۔ نعیمہ سے ان کی بات نہ ہو سکی کیونکہ وہ ابھی تک اپنے گھر نہ لوٹی تھی۔ اس رات حلیمہ چاچی کو انسانی رویوں کے متعلق سوچتے سوچتے نیند بھی دیر سے آئی اس لیے قدرتی طور پر صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ کام سے انہوں نے گزشتہ روز بھی چھٹی کی تھی اس لیے کسلمندی کے باوجود بستر سے کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے طاہرہ کو چائے بنانے کے لیے آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر سمجھ گئیں کہ وہ صبح اٹھ کر کام پر روانہ ہو گئی ہے۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ کچن میں پہنچیں تو طاہرہ کو اندر پٹرے پر بیٹھا دیکھ کر چونک گئیں۔ طاہرہ سر جھکائے فرش پر کوئلے سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ انہوں نے غور کیا تو کچے فرش پر انہیں طاہرہ کا نام لکھا نظر آیا۔ چاچی پانچ جماعتیں پاس تھیں اور کوشش کر کے اخبار وغیرہ بھی پڑھ لیا کرتی تھیں۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی انہوں نے آٹھویں تک تعلیم دلوائی تھی۔ فرش پر طاہرہ کے نام کے ساتھ ایک انجان نام لکھا دیکھ کر وہ چونک گئیں، نام پڑھنے کے لیے وہ ذرا سا آگے ہوئیں تو طاہرہ انہیں دیکھ کر ڈر گئی اور جلدی جلدی فرش کو اپنے دوپٹے سے رگڑ کر صاف کرنے لگی لیکن حلیمہ چاچی کی عقابی نظروں نے وہ نام تاڑ لیا جو فرش پر طاہرہ کے نام کے ساتھ جابجا تحریر تھا۔ یہ نام تھا ماجد، جو چاچی کے لیے بالکل انجانا تھا۔ چاچی نے اس نام کے بارے میں طاہرہ سے پوچھا تو وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ اس کی معنی خیز خاموشی نے چاچی کے کان کھڑے کر دیے اور وہ اس سے ماجد نامی شخص کے بارے میں باز پرس کرنے لگیں مگر طاہرہ نے ان تمام سوالوں کے جواب ایک لمبی خاموشی کی شکل میں دیے۔ یہ چاچی کے لیے مزید پریشانی کی بات تھی۔ بچیوں کو مارنے پیٹنے کی وہ قائل نہ تھیں اس لیے فی الحال طاہرہ کو جلدی کام پر روانہ ہونے کی تلقین کر کے وہ خود بھی کام پر روانہ ہو گئیں۔

کام پر بھی سارا دن چاچی اپنے دماغ کے گھوڑے دوڑاتی رہیں لیکن ماجد نامی کوئی بندہ ان کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ شام کو جب وہ تھکی ہاری گھر واپس لوٹیں تو گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور دروازہ بھی کھلا پڑا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اسی لیے چھ بجے ہی گلیوں میں گھپ اندھیرا چھا جاتا تھا۔ طاہرہ تو روز پانچ بجے تک گھر واپس آ جاتی تھی پھر

آج کہاں رہ گئی تھی؟ چاچی ہولتے ہوئے دل کے ساتھ طرح طرح کے اندیشے لیے گھر میں داخل ہوئیں اور جیسے ہی بتی جلائی تو سامنے ہی طاہرہ کو بیٹھا ہوا پا کر اچھل گئیں۔ وہ جو اب تک یہ سمجھ رہی تھیں کہ طاہرہ پہنچی ہی نہیں ہو گی وہ ان کے سامنے ہی بیٹھی تھی اور اس کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج کام پر بھی نہیں گئی تھی کیونکہ اس نے کل رات والے کپڑے ابھی تک پہنے ہوئے تھے۔ حلیمہ چاچی کو اسے یوں گھر سے بے نیاز بیٹھا دیکھ کر غصہ آ گیا اور وہ اسے بے نقط سنانے لگیں۔ ایک تو ویسے ہی ماجد نامی بندے کو سوچ سوچ کر صبح سے ان کا دماغ خالی ہو گیا تھا اوپر سے طاہرہ کی بہکی بہکی حرکتیں انہیں مزید تشویش میں مبتلا کر رہی تھیں۔

جب ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو انہوں نے نعیمہ کو فون کر کے بلوا لیا کہ شاید ماں کے سامنے تو مارے شرم کے طاہرہ کچھ نہیں بول رہی مگر بہن تو اس کی سہیلی ہے ضرور کچھ نہ کچھ اگلوا کر چھوڑے گی۔ نعیمہ ماں کے بلاوے پر دوڑی چلی آئی۔ جب چاچی نے اسے گزشتہ شام بیتنے والے واقعات سنائے تو وہ بھی خوب شرمندہ ہوئی کہ زیادہ دیکھے بھالے بغیر اس نے کیسے ناشائستہ لوگوں کو اپنی بہن کے رشتے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس دوران طاہرہ بالکل معمول کے مطابق بہن کے آنے کی خوشی میں کچن میں مصروف تھی جیسے صبح کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ چاچی نے دھیمے لہجے میں جب نعیمہ کو ماجد کے قصے سے آگاہ کیا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ وہ اپنی بہن کو اچھی طرح جانتی تھی، اس سے اس قسم کی لغو باتوں کی توقع رکھنا بھی ناممکن تھا لیکن ماں بھی تو جھوٹ نہیں بول رہی تھی، اس کا پریشان چہرہ اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔ نعیمہ نے انہیں تسلی دی کہ آج رات وہ یہیں رک کر طاہرہ کے دل کو ٹٹولے گی۔ اس نے چاچی کو ایک نیا راستہ دکھایا کہ اگر فرض کریں کوئی ماجد نامی لڑکا موجود ہے اور اپنی طاہرہ کو پسند ہے تو وہ اپنے میاں راشد سے کہہ کر چھان پھٹک کروا لے گی پھر اگر لڑکا مناسب ہوا تو آگے بات چلا لیں گے۔

کھانا کھانے کے بعد حلیمہ چاچی تو کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں لیکن چھوٹے سے لاؤنج کم ڈرائنگ روم سے دونوں بہنوں کی باتوں کی آوازیں رات گئے تک آتی رہی تھیں۔ اگلے دن جب حلیمہ چاچی اٹھیں تو کچن سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں، وہ سمجھیں کہ طاہرہ کام پر روانہ ہونے سے قبل حسبِ معمول ناشتا تیار کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب نعیمہ نے ناشتے کے لیے کمرے میں جھانکا تو وہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئیں اور طاہرہ کے بارے میں استفسار کیا۔ جواب میں نعیمہ نے بتایا کہ رات کو دونوں بہنیں اچھی بھلی باتیں کر کے سوئی تھیں لیکن صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو طاہرہ کو شدید بخار میں مبتلا پایا اسی لیے وہ ناشتا... بنانے کھڑی ہو گئی۔ چاچی نے جا کر طاہرہ کو دیکھا تو نعیمہ کی بات درست ثابت ہوئی۔ طاہرہ واقعی تیز بخار کے زیر اثر بے سدھ پڑی تھی۔ دونوں نے اسے جلدی جلدی ڈبل روٹی کے نوالے کھلا کر دوا دی۔ نعیمہ جو واپس جانے والی تھی بہن کی حالت اور ماں کی پریشانی کا سوچ کر رک گئی۔ چاچی بھی اس روز طاہرہ کی حالت کے پیش نظر کام پر نہیں گئیں۔

طاہرہ کا بخار کوئی شام کے قریب جا کر ٹوٹا تو چاچی نے سکھ کی سانس لی ورنہ انہوں نے تو ساتھ والوں سے بات بھی کر لی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو طاہرہ کو ان کے رکشے میں قریب واقع کلینک تک لے جائیں گی لیکن اب اللہ کے کرم سے بخار اتر گیا تھا اور کلینک لے جانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد نعیمہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ رخصت ہو گئی تو گھر میں دونوں ماں بیٹی پھر سے تنہا ہو گئیں۔ دن بھر پریشانی میں وہ نعیمہ سے ماجد کے بارے میں پوچھ بھی نہ سکی تھیں۔ بہرحال اب تو وہ جا چکی تھی اس لیے چاچی نے اس گفتگو کو بعد کے لیے اٹھا رکھا۔ طاہرہ کا بخار اب مکمل طور پر اتر گیا تھا اور وہ گہری نیند میں تھی۔ دن بھر کی تھکی ہاری چاچی بھی دو منٹ کمر سیدھی کرنے کو لیٹیں تو ان کی بھی آنکھ لگ گئی۔

رات کے ایک بجے کا عمل ہو گا کہ اچانک چاچی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے پلٹ کر طاہرہ کے پلنگ کی جانب دیکھا تو اسے خالی پایا، چاچی گھبرا کر اسے باتھ روم میں دیکھنے گئیں، وہ وہاں بھی موجود نہ تھی۔ ایسے میں انہیں دروازے کی طرف سے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں جیسے کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ گھر میں جوان بیٹی کا ساتھ اور شہر کے بگڑتے حالات کے پیش نظر چاچی گھر کو اندر سے تالا لگا کر رکھتی تھیں جس کی چابی ان کے تکیے کے نیچے ہوتی تھی۔ انہوں نے جھٹ تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا تو چابی نہ پا کر ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ لرزتے ہاتھوں سے بتی جلائی تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ دروازے کے پاس طاہرہ کھڑی چابی اور تالے سے الجھ رہی تھی۔ اندھیرا ہونے کے باعث وہ چابی کو تالے میں ٹھیک سے نہیں لگا پا رہی تھی، بتی کے روشن...

ہوتے ہی وہ اچھل کر پلٹی اور چابی کو اپنے پیچھے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ حلیمہ چاچی ابھی تک دل کو تھامے اسے ہی گھورے جا رہی تھیں۔ جب ان کی دھڑکنیں کچھ سنبھلیں تو انہوں نے آگے بڑھ کر آؤ دیکھا نہ تاؤ کھینچ کر ایک تھپڑ طاہرہ کے گال پر جڑ دیا۔

”منحوس اپنے مرحوم باپ کی عزت نیلام کرنے کہاں جا رہی تھی؟ بتا کون ہے وہ خبیث جس سے تُو راتوں کو چھپ چھپ کر ملنے جاتی ہے۔“ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کو مارتی بھی جا رہی تھیں۔ پہلے تو طاہرہ چپ چاپ پٹتی رہی پھر اچانک اس نے غرا کر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور سخت لہجے میں بولی۔

”امی بہت ہو گیا، میں دو دنوں سے ایک ہی بات دُہرا رہی ہوں کہ میں ماجد کے بغیر نہیں رہ سکتی اور آپ ہیں کہ میری بات سنجیدگی سے نہیں لے رہیں۔ آج میں اسی کے پاس جا رہی تھی، اگر اب بھی آپ کو میری بات پر شک ہے تو نتائج کی ذمے دار خود ہوں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گئی جبکہ چاچی وہیں اپنا سر تھامے بیٹھی رہ گئیں۔ ان کی فرمانبردار اور خاموش مزاج بیٹی جس طرح ان کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی تھی وہ انہیں چکرا دینے کو کافی تھا۔ اب تو یہ ماجد نامی بندہ ان کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا جو نجانے کیسے طاہرہ کے دل میں ایسا بس گیا تھا کہ طاہرہ نہ صرف اس کی خاطر ایسا سنگین قدم اٹھانے جا رہی تھی بلکہ اپنی ماں سے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے سخت لہجے میں بات بھی کی تھی۔

چاچی کی نیند اُڑ چکی تھی جبکہ طاہرہ چادر اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر یوں سو رہی تھی گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ صبح ہوتے ہی چاچی نے بے صبری سے نعیمہ کا نمبر ملایا۔ اس نے چاچی کی بے وقت کال کو گھبرائے ہوئے انداز میں ریسیو کیا اور جب اسے طاہرہ کی پچھلی رات کی حرکت کا علم ہوا تو وہ الجھ کر رہ گئی۔ ”مگر امی میں نے طاہرہ کو ماجد کے بارے میں کریدا تھا، اس نے صرف اتنا بتایا کہ وہ اسے اچھا لگتا ہے اور وہ صرف اسی سے شادی کرے گی۔ جب میں نے اس کی رہائش اور خاندان وغیرہ کے متعلق سوالات کیے تو کہنے لگی، تم لوگ سب جانتے ہو پھر بھی انجان بن رہے ہو۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس نے بتا کر نہ دیا، بس ایک ہی رَٹ لگا رکھی تھی کہ تم جان بوجھ کر مجھے تنگ کر رہی ہو اس لیے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اس کے بعد راشد کا فون آ گیا تو میں ان سے باتوں میں لگ گئی جبکہ طاہرہ کچھ دیر بعد سو گئی اور اس کے بعد کی کہانی تو آپ کو بھی پتا ہے۔“

چاچی اور نعیمہ شدید پریشانی کے عالم میں تھے۔ طاہرہ کچھ بتانے کو تیار نہ تھی اور چاچی اپنے آس پڑوس سے لے کر دور قریب کے رشتے داروں اور یہاں تک کہ بنگلوں میں بھی کسی ماجد نامی شخص کو نہیں جانتی تھیں۔ اس روز چاچی کام پر نہیں گئیں کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ ان کے پیچھے طاہرہ کل رات والی حرکت پر دوبارہ نہ عمل کر بیٹھے۔ اس وقت تو ان کے جاگ جانے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تھی لیکن آج اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھی چپ چاپ ماں کو گھر کے کام کرتے دیکھ رہی تھی لیکن ان کی مدد کو نہ آ رہی تھی۔ شام ہوتے ہوتے اس نے چاچی کے سر میں رو رو کر درد کر دیا، اس کی ایک ہی رَٹ تھی۔ ”امی میری شادی ماجد سے کروا دو، میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔“ چاچی نے لاکھ سر پٹخا لیکن اس کے منہ سے ماجد کے بارے میں کوئی معلومات نہیں اگلوا سکیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طاہرہ خود بھی ماجد کو ٹھیک سے نہیں جانتی تھی مگر اپنی اندھی محبت کے ہاتھوں گھر سے بھاگ جانے کو تیار تھی۔ چاچی اس معاملے میں بالکل گھن چکر بن کر رہ گئی تھیں، کام کا ناغہ الگ ہو رہا تھا لیکن طاہرہ کی حالت کے پیش نظر اسے اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

مزید دو دنوں میں طاہرہ کی حالت کسی جل بن مچھلی کی طرح ہو گئی تھی۔ ہر آہٹ اور ہر دستک پر ”میرا ماجد آ گیا“ کہہ کر لپکتی، کھانا پینا نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔ کبھی رو کر اور کبھی غصے سے اپنی شادی ماجد سے کرنے پر اصرار کرنے لگتی۔ چاچی کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے نعیمہ کو تین دنوں کے لیے اپنے گھر بلوا لیا، وہ اپنے میاں راشد کے ہمراہ رہنے آ گئی۔ اس بیچ نعیمہ کی پڑوسن کا فون بھی آیا جو رشتے سے متعلق چاچی کا جواب جاننا چاہ رہی تھیں، چاچی نے انہیں مزید مہلت مانگ کر ٹرخا دیا۔

اس رات طاہرہ اپنے بہنوئی کی موجودگی کے باوجود ساری شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی اور ایسا واویلا مچایا کہ خدا کی پناہ۔ غریبوں کی بستی تھی گھر سے گھر ملے ہوئے تھے، جلد ہی سارے محلے میں طاہرہ اور ماجد کے معاشقے کے قصے پھیل گئے اور اگلے ہی دن یہ خبر بچے بچے کی زبان پر تھی کہ شکل سے معصوم نظر آنے والی طاہرہ گُنوں کی پوری ہے۔ چاچی گھر سے باہر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ طاہرہ کو روئی کی طرح دھنک دیا، پیار سے سمجھایا۔ اپنی ممتا کے واسطے دیے

لیکن اس کی اب بھی وہی ضد تھی کہ میری شادی ماجد سے کروا دو ورنہ گھر سے بھاگ جاؤں گی۔“

چاچی کی کہانی ہم حیرت سے منہ کھولے سن رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ طاہرہ جیسی اللہ میاں کی گائے محبت کے معاملے میں ہماری فلمی ہیروئنوں کو بھی مات دے سکتی ہے۔ امی کو تو یہ سب سن کر بھی طاہرہ کی پاکدامنی پر ذرا شک نہ ہوا اور بولیں۔ ”کچھ بھی ہو چاچی، طاہرہ جیسی نیک بچی سے ایسی کسی بات کی توقع رکھنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ ضرور یہ سب اس نامراد ماجد کا کیا دھرا ہے جس نے تمہاری بیٹی کو ورغلایا ہے اور اب بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہوگا۔“ امی کی بات میں وزن تھا۔ ایسا ممکن تھا کہ ماجد نامی اس شاطر آدمی نے طاہرہ سے پہلے محبت کا کھیل کھیلا ہو اور اب اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بلیک میل کر رہا ہو یا طاہرہ کو اپنی محبت کے جھوٹے جال میں پھانس کر اسے یہ سب کرنے کی ترغیب دے رہا ہو اور یہ بھی اس کے منصوبے کا ایک حصہ ہو کہ گھر والوں کا ذہن ماجد نامی شخص کی طرف الجھا رہے اور وہ کسی دن ان کا کوئی دور کا رشتے دار بن کر ان سے ٹکرا جائے اور معاملات آسانی سے حل ہوتے چلے جائیں۔ غرض ہم سب کے ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے اور ہم وقتاً فوقتاً ان کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ چاچی بیٹھیں ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھ رہی تھیں اور کبھی اثبات تو کبھی نفی میں یوں سر ہلاتی تھیں جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی اور طاہرہ کی ”غیر معینہ تعطیلات“ کا اعلان کر کے اٹھ گئیں جبکہ ان کے جانے کے بعد رات گئے تک ہمارے یہاں طاہرہ کا موضوع زیر بحث رہا بلکہ یہ موضوع کئی دنوں تک سب کی دلچسپی کا محور رہا پھر رفتہ رفتہ اس واقعے پر بھی وقت کی دھول جمتی گئی اور طاہرہ اور ماجد والا قصہ ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں دب گیا۔

حلیمہ چاچی اور طاہرہ کو کام سے چھٹی لیے یہ ساتواں مہینا ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسری کام والی رکھ لی تھی جس کو پہلے سے ہی مطلع کر دیا گیا تھا کہ جس دن طاہرہ کام پر واپس آئی، اسے یہاں کام چھوڑنا پڑے گا لیکن اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد طاہرہ کا کام پر واپس آنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس روز غضب کی گرمی تھی، ایسی شدت کی لو چل رہی تھی کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا اور رہے بجلی کی غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ نے زندگی عذاب کی ہوئی تھی۔ دادی کی طبیعت گرمی سے گھبرا رہی تھی چنانچہ ہم ساری کزنز دادی کے کمرے میں ہی باتیں کر کے ان کا دل بہلا رہی تھیں کہ اچانک کال بیل بجی۔ قرعۂ فال میرے نام نکلا کہ میں جا کر اسی جھلستی ہوئی لو میں گیٹ کھولوں۔ میں آنے والے کو دل ہی دل میں کوستی ہوئی گیٹ تک پہنچی لیکن گیٹ کھولنے پر اپنے سامنے حلیمہ چاچی کو پا کر میری ساری کوفت ہوا ہو گئی اور مجھے اس وقت خوشگوار حیرت کا ایک جھٹکا لگا جب حلیمہ چاچی کے ہمراہ چادر میں لپٹی طاہرہ کو کھڑا پایا۔ میں نے فوراً سلام جھاڑا اور دونوں کو سیدھے دادی کے کمرے میں لے گئی۔ آن کی آن میں یہ خبر پورے گھر میں پھیل گئی کہ حلیمہ چاچی طاہرہ کے ساتھ آئی ہیں۔ ساری خواتین ایک مرتبہ پھر ان دونوں کے گرد جمع ہو گئیں۔ حلیمہ چاچی تو ویسی ہی تھیں بس طاہرہ کافی کمزور ہو گئی تھی، اس کی آنکھوں کے گرد بڑے بڑے حلقے بھی واضح ہو رہے تھے۔

پچھلی دفعہ کے برعکس حلیمہ چاچی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور ایک آسودہ سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو حال احوال پوچھا جاتا رہا پھر حسب سابق چچی جان سے برداشت نہ ہو سکا۔ ”چاچی اب ذرا اس راز سے پردہ اٹھا ہی دو جس نے ہمیں پچھلے سات ماہ سے تجسس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ طاہرہ تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک نظر آ رہی ہے اور تم بھی پچھلی دفعہ کے مقابلے مطمئن ہو۔ آخر اس ماجد والے قصے کا کیا بنا؟“

ماجد کا ذکر آتے ہی طاہرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آ گئے۔ چاچی کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو عجیب سے تاثرات پھیلے پھر انہوں نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا اور مسکرا کر بولیں۔ ”بس چھوٹی دلہن، اللہ کبھی اپنے بندوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ اس کے بندے دوسروں کو کوئی بھی نقصان پہنچاتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم سب کی ڈور اس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور وہ جب تک نہ چاہے کوئی کسی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔“

چاچی کی یہ ذومعنی بات ہمارے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ چنانچہ اب کی بار محاذ دادی نے سنبھالا جو حلیمہ چاچی کو دیکھ کر تجسس کے مارے اپنی بیماری بھی بھول گئی تھیں۔ ”ارے کچھ بتاؤ گی بھی کہ کیا ہوا؟ پچھلی بار تو تم طاہرہ کو منہ بھر بھر کے کوسنے اور بددعائیں دے رہی تھیں پھر یہ کایا کیسے پلٹ گئی؟“

دادی کے پوچھنے پر حلیمہ چاچی نے آخرکار دھیرے

وطن کے سجیلے جوان......

1914ء میں ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہونے والے طفیل محمد کو جنہیں 1943ء میں سولہ پنجاب رجمنٹ میں کمیشن ملا تھا اور اب وہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے مشرقی پاکستان میں تعینات تھے۔ انہیں حکم ملا کہ وہ بھارتی فوج کی اس نفری کو جس نے لکشمی پور کے علاقے میں گھس کر اپنے مورچے قائم کر لیے ہیں انہیں پیچھے دھکیلا جائے۔ 7 اگست کو انہوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں کو محاصرے میں لے لیا۔ بھارتیوں نے گولیاں برسا دیں۔ میجر طفیل کے جسم میں کئی گولیاں پیوست ہو گئیں مگر انہوں نے زخم کی پروا کیے بغیر دستی بم نکالا اور دانتوں سے پن کھینچ کر اس مورچے پر دے مارا جہاں بھارتی چھپے بیٹھے تھے۔ مشین گن مع سات دشمن کے اڑ گئی۔ پھر وہ ادھر مڑے جدھر ایک اور مورچہ تھا جہاں سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایک دستی بم اس مورچے پر مارا وہ مورچہ بھی ختم ہو گیا۔ تبھی ان کی نظر دشمن کی چوکی کے کمانڈر پر پڑی جو ان کے جوانوں پر فائرنگ کرتا ہوا دوڑا آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلے اور اسے اڑنگا مار کر زمین پر گرایا پھر اپنی آہنی ٹوپی کو ہاتھ میں لے کر اس کے چہرے پر وار کرنے لگے۔ دشمن نے مزید کئی گولیاں ان کے جسم میں اتار دیں۔ بری طرح زخمی ہوتے ہوئے بھی وہ اس وقت تک قیادت کرتے رہے جب تک دشمن سے تمام مورچے خالی نہ کرا لیے۔ اس بہادری کے صلے میں انہیں قوم کی جانب سے نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا

دھیرے دھیرے اس راز سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔ ”اس روز آپ کے گھر سے نکلی تو میرے ذہن میں آپ لوگوں کی کہی ہوئی باتیں ہی گھوم رہی تھیں جنہیں سن کر میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ طاہرہ کو ضرور وہ ماجد نامی فراڈیا بلیک میل کر رہا تھا اور وہ ہمارے سامنے شرمندگی کے باعث اس کا اقرار نہیں کر پا رہی تھی۔ اس خیال نے میرے سوچ کے زاویے کو تھوڑا سا مثبت کر دیا تھا۔ طاہرہ اب میری نظروں میں ظالم کی جگہ مظلوم ہو گئی تھی جس کی نیک نامی اس کلموہے ماجد کی وجہ سے داؤ پر لگی تھی۔ میں انہی خیالوں میں ڈوبتی ابھرتی جب گھر پہنچی تو ایک نیا ڈراما میرا منتظر تھا۔ گھر کے اندر سے شور شرابے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پڑوسنیں بھی متجسس نظروں سے اپنے گھروں کے دروازوں سے سن گن کی امید میں جھانک رہی تھیں۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی تو میرے داماد راشد نے دروازہ کھولا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور شرٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ اندر سے طاہرہ کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو رو رو کر ماجد کو بلا رہی تھی۔ میں فوراً گھر میں داخل ہوئی، ہمارا گھر الٹا پڑا تھا اور صحن میں طاہرہ ایک کرسی سے دوپٹے کی مدد سے بندھی ہوئی چیخ رہی تھی جبکہ نعیمہ اسے گلاس کی مدد سے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے ہکا بکا کھڑا دیکھ کر راشد نے بتایا کہ آپ کے جانے کے بعد میں بھی قریب ہی رہنے والے اپنے ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ گھر پر صرف یہ دونوں بہنیں تھیں۔ طاہرہ بالکل نارمل برتاؤ کر رہی تھی چنانچہ نعیمہ بھی میرے جانے کے بعد کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہی پھر نہانے گھس گئی۔ نہانے سے قبل اس نے عقلمندی یہ کی کہ طاہرہ کی نظر بچا کے گھر کے دروازے پر تالا ڈالا اور چابی اپنے ساتھ باتھ روم لے گئی۔ طاہرہ نے جو میدان صاف دیکھا تو اپنے پروگرام پر عملدرآمد کرنے کی ٹھانی لیکن جب گھر کے دروازے پر تالا جھولتا دیکھا تو غصے سے پاگل ہو گئی۔ پہلے تو چیختی چلاتی رہی پھر نعیمہ کو برا بھلا کہنے لگی۔ اتنی دیر میں نعیمہ بھی جلدی جلدی نہا کر باہر نکل آئی اور مجھے فوراً گھر واپس آنے کا ایس ایم ایس کر کے طاہرہ کے پاس پہنچی جو اسے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی اور مارنے دوڑی۔ نعیمہ نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی تو کسی چیز سے الجھ کر گر گئی۔ طاہرہ اس کے اوپر سوار ہو گئی اور جنونی انداز میں اس کا گلا دباتے ہوئے چابی کا مطالبہ کرنے لگی۔ اتنی دیر میں، میں تیزی سے گھر پہنچ چکا تھا اور ان دونوں کی آوازیں صاف سن سکتا تھا۔ میں چیخ چیخ کر

یہ تیرے پُراسرار بندے

25 اکتوبر 1944ء کو راولپنڈی کے گاؤں پنڈ ملتان میں پیدا ہونے والے محمد محفوظ نے 1962ء میں پاک آرمی جوائن کی۔ 1971ء کی جنگ شروع ہوئی تو اس وقت لانس نائیک محفوظ 15 پنجاب رجمنٹ کی اے کمپنی سے وابستہ تھے جو واہگہ اٹاری سیکٹر میں متعین تھی۔ 17 اور 18 دسمبر کی درمیانی رات کو یہ کمپنی پل کنجری نامی گاؤں پر قبضہ کرنے آگے بڑھی۔ لانس نائیک محفوظ کی پلاٹون نمبر 3 اس حملے میں ہراول دستے کے طور پر سب سے آگے تھی۔ لہٰذا اسے دشمن کے مورچوں سے گولیوں کی زبردست بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ آگے بڑھتے ہوئے جب ان کی کمپنی دشمن کی پوزیشن سے کوئی ستر گز کے فاصلے پر پہنچی تو دشمن نے فائرنگ میں شدت پیدا کر دی۔ یو ں ہی دشمن کی توپوں نے بھی گولے برسانے شروع کر دیے مگر وہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ جب دشمن کا گولا عین ان کی مشین گن کو اڑاتا ہوا گزرا تو وہ مزید غضبناک ہو گئے۔ اپنے ساتھی کی ہلکی مشین گن اٹھائی اور دشمن کے مورچے میں گھس گئے۔ تبھی ایک گولی ہاتھ میں لگی اور مشین گن چھوٹ کر گر گئی۔ وہ نہتے ہو گئے انہوں نے خالی ہاتھ سے دشمن کے ایک سپاہی کا گلا پکڑ کر دبانا شروع کر دیا۔ دوسرے بھارتیوں نے ان پر سنگینوں سے حملہ کر دیا اور وہ اسی مورچے میں شہید ہو گئے۔ جنگ بندی کے بعد ایک بھارتی آفیسر نے کہا کہ ”ہم نے زندگی میں اس جیسا غضبناک آدمی نہیں دیکھا۔ آج بھی اس کا چہرہ یاد آتا ہے تو میں چونک جاتا ہوں۔“ قوم کی جانب سے انہیں نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔

نعیمہ سے طاہرہ کو چابی دینے کا کہنے لگا جو نعیمہ نے آخر اسے تھما دی۔ چابی ملتے ہی اس نے نعیمہ کو چھوڑا اور تالا کھولنے لپکی۔ دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی باہر نکلی میں نے اسے دبوچ لیا اور واپس گھر کے اندر لے آیا۔ اس دوران اس نے خود کو چھڑانے کی دیوانہ وار کوششوں میں میری شرٹ کے بٹن تک نوچ ڈالے۔ جب طاہرہ کسی طرح قابو میں نہیں آئی تو بڑی مشکلوں سے میں نے اور نعیمہ نے مل کر اسے کرسی سے باندھ دیا۔ اس ہاتھا پائی میں نعیمہ بیچاری کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔

اس دوران طاہرہ لگاتار ہم سے منتیں کر رہی تھی کہ اسے ماجد کے پاس جانے دیا جائے یا ماجد کو یہاں بلا لیا جائے۔ پانی اب سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا اور طاہرہ کی بے قراری اب سمجھ سے بالاتر ہوتی تھی۔ ماجد کا کوئی اتا پتا اس کے پاس نہیں تھا لیکن وہ اس کے پاس جانے کے لیے یوں بے تابی دکھا رہی تھی جیسے وہ گھر کے سامنے ہی بانہیں پھیلائے اس کا منتظر کھڑا ہو۔ چاچی نے بتایا کہ اس کے بعد انہوں نے اپنے گھر کے آس پاس رہنے اور گزرنے والے لڑکوں پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ کوئی لڑکا اگر ان کے گھر کے سامنے کھڑا بھی ہو جاتا تو یہ اس سے باز پرس کرنے لگتیں۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے محلے میں چاچی کی جگہ نفسیاتی بڑھیا کے نام سے جانی جانے لگیں۔ لیکن انہیں ان سب باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ انہیں اپنی بیٹی عزیز تھی جسے وہ کسی بلیک میلر یا سڑک چھاپ عاشق کے حوالے کرنے کو ہرگز تیار نہ تھیں۔

ماجد کے فراق میں طاہرہ کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ اپنے پلنگ پر پڑی ہر وقت ماجد کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی۔ چاچی زبردستی کپڑے بدلواتیں تو بدل لیتی، کھانا کھلاتیں تو بمشکل آدھی روٹی کھا کر کھانے سے منہ موڑ لیتی۔ ایک ماہ اسی پریشانی میں گزرا، اس پورے عرصے میں ماجد کا نام سن سن کر چاچی کے کان پک گئے تھے۔ گھر کے دروازے پر ہر وقت تالا پڑا ہوتا، چاچی کو کسی ضرورت کی شے کی خریداری کے لیے گھر سے باہر جانا ہوتا تو وہ کوشش کرتیں کہ جب طاہرہ سو رہی ہو تو وہ باہر جائیں۔ اس کے سامنے تالا کھولنا اپنی شامت کو آواز دینے کے برابر تھا جس کا تجربہ انہیں ایک دو مرتبہ ہو چکا تھا۔ چاچی کے جاننے والوں نے انہیں طاہرہ کو کسی اچھے نفسیاتی معالج کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تو سبھی جان گئے تھے کہ ماجد نامی شخص کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ وہ طاہرہ کے بیمار ذہن کی پیداوار ہے لیکن چاچی ڈاکٹر کی اتنی مہنگی فیس

انور ڈ نہیں کر سکتی تھیں، ویسے بھی ان دونوں کے یوں گھر بیٹھ جانے سے چاچی کی جمع پونجی تیزی سے خرچ ہو رہی تھی اور وہ جلد گھر بیٹھے روزی کمانے کا کوئی حل بھی تلاش کرنا چاہ رہی تھیں۔ محلے والے بھی چونکہ اب طاہرہ کا مسئلہ سمجھ گئے تھے اسی لیے اس کے کردار کے بارے میں اُڑتی منتی افواہوں نے بھی اب دم توڑ دیا تھا۔ اکثر محلے کی خواتین طاہرہ کی حالت دیکھنے اور چاچی سے ہمدردی کا اظہار کرنے ان کے گھر آتیں اور اس آڑ میں طاہرہ کی بے قراری کی داستانیں اپنے گھر والوں کو سنا کر مضحکہ اُڑاتیں۔ چاچی ان کی نیتوں سے واقف تھیں لیکن حالات کے آگے بے بس تھیں۔ اس مرتبہ قدرت نے انہیں اولاد کے ذریعے امتحان میں ڈالا تھا جس پر وہ حسبِ عادت صبر و شکر سے کام لے رہی تھیں۔

اس بیچ انہیں اپنی پڑوسن کے توسط سے گھر بیٹھے پیسے کمانے کا موقع بھی مل گیا۔ اس پڑوسن کا میاں بریانی کا ٹھیلا لگاتا تھا، اس کے ساتھ اس نے آلو چھولے بھی رکھنے کا سوچا۔ اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو اسے چاچی کا خیال آگیا چنانچہ باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ آلو چھولے اسے چاچی سپلائی کریں گی اور اس سے ہونے والی آمدنی کا چالیس فیصد وہ روزانہ کی بنیاد پر پابندی سے پہنچا دیا کرے گا۔ اس طرح چاچی کم از کم پیسوں کی طرف سے کچھ مطمئن ہوگئیں۔ اس دوران نعیمہ کی پڑوسن کا جواب کے سلسلے میں تین مرتبہ فون آچکا تھا اور چاچی کے صاف انکار کے باوجود وہ مُصر تھیں کہ طاہرہ کے لیے ان کے بیٹے سے بہتر کوئی رشتہ نہیں آسکتا اور چاچی ان کو منع کر کے سخت کفرانِ نعمت کی مرتکب ہو رہی ہیں۔ جب وہ چاچی سے کسی طرح نہ ٹلیں تو مجبوراً چاچی نے نعیمہ کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ اپنی پڑوسن سے بالمشافہ ملاقات کر کے نرم الفاظ میں انہیں چاچی کا انکار پہنچا دے۔

ایک حیرت انگیز بات جو چاچی نے طاہرہ میں نوٹ کی تھی کہ جب بھی نعیمہ کی پڑوسن کا فون آتا، طاہرہ کے چہرے پر جیسے بہار سی آجاتی لیکن جب وہ ان کا اصرار اور اپنی ماں کا مسلسل انکار سنتی تو بجھ سی جاتی۔ چاچی نے نعیمہ کو یہ بات بتائی تو اس نے اسے چاچی کا وہم جانا اور سمجھا بجھا کر ان کو مطمئن کر دیا۔ گزشتہ چند دنوں سے طاہرہ پر عجیب قسم کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اچھی بھلی بیٹھی ہوتی کہ اچانک مچل اٹھتی اور چاچی کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر منتیں کرتی: ”امی، میرا ماجد مجھے لینے آگیا ہے، اب تو مجھے اس کے پاس جانے دیں۔“

وہ روتی دھوتی ان کے پیروں میں گر جاتی۔ اس کے لہجے میں اتنا درد ہوتا کہ چاچی بھی اس کے ساتھ آنسو بہانے لگتیں۔ طاہرہ کے رونے دھونے اور چیخ و پکار سے تنگ آس پڑوس والوں نے چاچی کو مشورہ دیا کہ اسے خواب آور گولیاں استعمال کروائی جائیں تاکہ وہ اپنے گھروں میں سکون سے رہ سکیں۔ مرتیں کیا نہ کرتیں کے مصداق چاچی نے طاہرہ کو ایک گولی دن میں اور ایک رات میں کھلانی شروع کر دی جس کے زیرِ اثر وہ سوتی رہتی اور بالفرض جاگ بھی رہی ہوتی تو دواؤں کے زیرِ اثر اس کا ذہن مفلوج رہتا۔ چاچی اس کی حالت پر خون کے آنسو روتیں مگر اس کے حق میں دعا کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔

اسی پریشانی میں شب و روز گزر رہے تھے کہ نعیمہ نے ایک تحیر انگیز اطلاع دی۔ اس کی پڑوسن کا بیٹا آج کل چھٹیوں پر دبئی سے آیا ہوا تھا، یہ وہی لڑکا تھا جس کا رشتہ طاہرہ کے لیے آیا تھا۔ وہ خبر جس نے چاچی کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا دیا وہ یہ تھی کہ موصوف کا نام ”ماجد“ تھا۔ یہ وہی نام تھا جس کی بدولت پچھلے تین ماہ سے چاچی کا چین سکون برباد ہو کر رہ گیا تھا، ان کی سعادت مند اور ہونہار بچی پورے خاندان اور محلے میں پگلی کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ نعیمہ نے مزید بتایا کہ ماجد کی تشریف آوری پندرہ دن پہلے ہی ہو گئی تھی لیکن اسے آج صبح اپنے دیور کی زبانی پتا چلا کیونکہ راشد آج کل کام کے سلسلے میں اپنے بڑے بھائی کے پاس فیصل آباد گیا ہوا تھا اور نعیمہ نے پڑوسن کی عادات کو دیکھتے ہوئے خود ہی ان سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا اسی لیے انہیں یہ اطلاع اتنی دیر سے ملی۔ نعیمہ کے بتانے پر چاچی نے طاہرہ پر پڑنے والے دوروں کا حساب لگایا تو ان کی عقل دنگ رہ گئی، طاہرہ کو ٹھیک اسی دن سے یہ دورے پڑنے شروع ہوئے تھے جس دن ماجد کراچی پہنچا تھا۔

اب آہستہ آہستہ چاچی پر سارے بھید عیاں ہونے لگے تھے، کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ جس دن ماجد کے گھر والے ان کے گھر آئے، اس کے اگلے دن سے ہی طاہرہ کے برتاؤ میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ ان لوگوں کا عجیب طرح سے گھورنا، سارے گھر کا جائزہ لینا پھر جاتے جاتے طاہرہ پر کچھ پڑھ کر دَم کرنا اور صاف انکار کے باوجود فون کر کر کے رشتے کے لیے اصرار کرنا۔ حلیمہ چاچی اپنا سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ آج تک انہوں نے صرف جادو ٹونے اور کالے علم

کا نام سنا تھا لیکن یہ خیال ان کا دل بٹھائے دے رہا تھا کہ ان کی معصوم بیٹی اس کا شکار ہو گئی ہے۔ اگر وہ طاہرہ کو ان کے سامنے نہ بلاتیں، کوئی بھی بہانہ کر دیتیں تو آج ان کی پھول سی بچی اس اذیت سے نہ گزرتی۔ جب چاچی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو جانماز بچھا کر اپنے رب کے حضور کھڑی ہوگئیں اور گڑگڑا کر اپنی بچی کی صحت یابی کی دعا مانگتی رہیں۔ دعا مانگ کر چاچی کا دل کچھ ہلکا ہوا تو انہوں نے معاملے پر ٹھنڈے دل سے نئے سرے سے غور کرنا شروع کیا۔ سوچتے سوچتے ان کے دماغ میں اچانک زبیدہ خالہ کا نام آیا۔ زبیدہ خالہ ان کی دور کی خالہ ہوتی تھیں۔ ضعف العمری کے باعث وہ دیکھنے کی صلاحیت سے بھی معذور ہو چکی تھیں لیکن اس عمر میں بھی ان کی یادداشت غضب کی تھی۔ نعیمہ کی شادی پر وہ اپنی طبیعت خرابی کے باعث نہ آسکی تھیں۔ وہ شروع ہی سے جھاڑ پھونک اور روحانی علاج کے ذریعے دوسروں کے کام آتی تھیں۔

چاچی نے پہلی فرصت میں ان کے گھر فون کیا۔ جواباً ان کے بیٹے نے بتایا کہ پچھلے کچھ دنوں سے زبیدہ خالہ شدید علیل ہیں وہ کل ہی تین دن اسپتال رہ کر... آئی ہیں اور... فی الحال سو رہی ہیں۔ چاچی کو یہ سن کر کچھ مایوسی ہوئی مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اگلی ہی شام نعیمہ کی مدد سے سوتی جاگتی کیفیت میں جتلا طاہرہ کو لیے زبیدہ خالہ کے گھر جا پہنچیں۔ ان کے بیٹے نے جو بتایا تھا اس کے مقابلے میں زبیدہ خالہ کی حالت زیادہ تشویشناک تھی، اگر زندگی صرف آتی جاتی سانسوں کا نام ہے تو وہ زندہ تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی تھی۔ نعیمہ اور چاچی ان کی یہ حالت دیکھ کر مایوس ہو گئیں۔ ان کی بہو کو جب چاچی کی آمد کی وجہ پتا لگی تو اس نے انہیں زبیدہ خالہ کی ایک شاگرد رحیمہ بی بی کا پتا دیا جو اسی محلے میں رہتی تھی۔ بقول اس کے وہ زبیدہ خالہ کی پکی شاگردوں میں سے ہے، خود زبیدہ خالہ بھی اپنے پاس علاج کی غرض سے آئے لوگوں کو اب انہی کے پاس بھیجتی تھیں۔ چاچی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو جیسے ایک اور تنکے کا سہارا مل گیا۔ وہ اپنی بچی کو آج کل گلی کوچوں میں بیٹھے اپنی دکان چمکاتے نام نہاد عاملوں کے ہاتھوں میں نہیں سونپنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ طاہرہ کو لے کر اس پتے پر پہنچ گئیں جو زبیدہ خالہ کی بہو نے بتایا تھا۔ ان کے گھر پر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی اور لوگ.... اپنی باری کے انتظار میں گھنٹوں سے بیٹھے تھے .... چاچی اور نعیمہ بھی طاہرہ کو لیے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

غرض اس روز کوئی دو گھنٹے طویل صبر آزما انتظار کے بعد طاہرہ کا نمبر آیا۔ رحیمہ بی بی نے غور سے چاچی کی زبانی طاہرہ کی کیفیت سے جڑا ہر واقعہ سنا اور کچھ سوالات بھی کیے۔ اس کے بعد انہوں نے طاہرہ کا ہاتھ تھام کر کچھ دیر مراقبہ کیا اور چاچی کو یہ اندوہناک اطلاع دی کہ ان کا شک سو فیصد درست ہے اور طاہرہ واقعی کسی کی شدید نظرِ بد کے زیرِ اثر ہے البتہ انہوں نے چاچی کو یہ اطمینان دلایا کہ طاہرہ ان کے مستقل علاج سے ان شاء اللہ جلد صحت یاب ہو جائے گی اور ماجد نامی وہ کردار اس کے ذہن سے صاف ہو جائے گا۔ چاچی کو بہت عرصے بعد کوئی خوشی کی خبر ملی تھی۔ وہ اور نعیمہ خوشی... خوشی طاہرہ کو لیے گھر واپس آگئے۔ اندھیرا ہو جانے کے باعث چاچی نے اکیلی نعیمہ کو واپس سسرال نہیں جانے دیا اور رات اپنے پاس ہی روک لیا جو اُن کے حق میں اچھا ہی ثابت ہوا کیونکہ اس رات وہ طاہرہ کو تھکن کے باعث خواب آور گولی کھلانا بھول گئیں اور نتیجتاً آدھی رات کو طاہرہ نے ان دونوں کو سوتا پا کر باورچی خانے سے چھری حاصل کر لی اور سینے میں گھونپ لی اس نے ایک خط بھی تحریر کیا تھا جس میں اس نے اپنے اس عمل کا ذمے دار چاچی کو ٹھہرایا جو اسے ماجد کے پاس جانے سے روک رہی تھیں (نعیمہ کو یہ خط اگلے روز چولہے کے پاس رکھا ملا تھا)

چاچی رات کو باتھ روم جانے کو اٹھیں تو صحن میں کسی چیز سے اُلجھ کر اس پر جا گریں۔ چاچی کے گرنے سے جو شور ہوا تو نعیمہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے جب بتی جلائی تو صحن کا منظر دیکھ کر بدحواس ہو کر جو چیخی تو پھر چیختی ہی چلی گئی۔ فرش پر طاہرہ بے سُدھ پڑی تھی اور اس کے اوپر چاچی گری ہوئی تھیں، ان کی قمیص پر خون کے دھبے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ وہ خون دراصل طاہرہ کا تھا جو اس کے سینے سے نکل رہا تھا اور طاہرہ پر گرنے کی وجہ سے چاچی کی قمیص پر بھی لگ گیا۔ پڑوسیوں کے دروازہ بجانے پر نعیمہ نے گرتے پڑتے دروازہ کھولا۔ اس کے بعد کے معاملات پڑوسیوں نے ہی سنبھالے، ایمبولینس منگوائی گئی اور طاہرہ کو اس میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا۔ چاچی کو گرنے کی وجہ سے گھٹنے پر ہلکی سی چوٹ آئی تھی جو ٹکور کرنے سے بہتر ہو گئی البتہ طاہرہ پندرہ دنوں تک اسپتال میں داخل رہی۔ ڈاکٹروں نے تو ایک موقع پر جواب دے دیا تھا مگر یہ شاید چاچی کے نیک اعمال تھے اور طاہرہ کی مظلومیت کہ

قدرت کو ان پر رحم آ گیا اور طاہرہ جزوی طور پر صحت مند ہو کر اپنے گھر واپس آ گئی۔

اپنی بہن کی یہ حالت دیکھ کر نعیمہ تو غصے سے بپھری اسی وقت اپنی پڑوسن سے دو دو ہاتھ کرنے جا رہی تھی۔ چاچی کے بہت سمجھانے بجھانے پر وہ کچھ قابو میں آئی۔ اس دوران نعیمہ کی ساس بھی طاہرہ کو دیکھنے اسپتال آئیں اور جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ نعیمہ نے ان کے علم میں لائے بغیر ان لوگوں کو طاہرہ کے رشتے کے لیے بھیجا تھا تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بقول ان کے وہ لوگ شروع ہی سے پُراسرار حرکتوں میں ملوث تھے اور ان کے گھر میں جانوروں کی ہڈیاں، ٹوٹی ہوئی چپلیں اور مور کے پر وغیرہ بھی لٹکے ہوئے ہیں۔ گھر کی اندرونی دیواروں پر بھی انہوں نے عجیب و غریب زبان میں کچھ حروف بھی کندہ کر رکھے ہیں نیز ان کے ملنے جلنے والے بھی انہی کی طرح مشکوک کردار کے حامل ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان سے ملنے بارہ بجے کے بعد ہی آتے ہیں اور ان کے بارے میں سارے محلے کی یہ متفقہ رائے تھی کہ یہ لوگ کالا جادو کرنے کرانے والے لوگ ہیں۔ پڑوسی ہونے کے ناتے تھوڑی بہت بات چیت رکھنی پڑتی ہے، راشد کے ولیمے میں بھی بحالتِ مجبوری ان لوگوں کو دعوت نامہ دیا گیا تھا۔ نعیمہ نئی نئی شادی ہو کر آئی تھی اور ان کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی چنانچہ اس نے آسانی سے چارا نگل لیا۔ مزید بیوقوفی اس نے اپنی سسرال میں کسی سے اس کا ذکر نہ کر کے کی، یہاں تک کہ راشد بھی رشتے والی بات سے لاعلم تھا۔ اگر نعیمہ صرف اس سے بھی ذکر کر دیتی تو راشد اسے سختی سے منع کر دیتا اور چاچی کو بھی یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ظاہر ہے، ان لوگوں کو بھی اس بات کا علم تھا کہ منفی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے سبب کوئی شریف والدین سیدھے طریقے سے تو ان کو اپنی بیٹی نہ دیتے اسی لیے انہوں نے ٹیڑھا راستہ اپنایا اور طاہرہ ان کے چنگل میں بری طرح پھنس گئی۔

طاہرہ اب بے حد کمزور ہو چکی تھی لیکن ماجد کا نام اب بھی اس کی زبان پر تھا۔ چاچی بے بسی سے طاہرہ کی یہ حالت دیکھتیں اور صبر کے گھونٹ پیتیں پھر کچھ عرصے بعد اس کی حالت کچھ سنبھلی تو وہ اسے دوبارہ رحیمہ بی بی کے پاس لے گئیں جنہوں نے آہستہ آہستہ اپنے روحانی علاج کے ذریعے طاہرہ کو ماجد کے شکنجے سے آزاد کروایا۔ چاچی نے بتایا، اس عمل کے دوران طاہرہ بہت تکلیف سے گزری۔ ایک دن چھوڑ کر وہ خاتون اسے دم کیا ہوا پانی پلاتیں جسے پی کر کچھ دیر کو اس کی حالت غیر ہو جاتی پھر اسے قے آتی جس میں انہوں نے اپنی آنکھوں سے طاہرہ کو اس روز کھلائی جانے والی مٹھائی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیکھے جو اُن ماں بیٹی نے طاہرہ کو زبردستی کھلائی تھی۔ رحیمہ بی بی کے مطابق دراصل اس مٹھائی پر عمل کیا گیا تھا جو اُن دونوں خواتین نے چاچی کی نظر بچا کر ٹرے میں رکھی ہوئی مٹھائی میں شامل کر دی تھی اور کامیابی سے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے وہی مٹھائی انہوں نے طاہرہ کو کھلا دی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جب تک یہ مٹھائی طاہرہ کے معدے میں رہتی وہ ماجد کے نام کی مالا جپتی رہتی اور بعد میں چاچی مجبوراً اپنی بدنام بیٹی کا ہاتھ ان کے بیٹے کے ہاتھ میں دے دیتیں لیکن مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا ہے اور اسی کے کرم سے طاہرہ اور چاچی ان کے پھیلائے ہوئے جال سے بال بال بچ گئیں۔

طاہرہ کا علاج اس وقت تک جاری رہا جب تک اس کا معدہ اس عمل کی ہوئی مٹھائی سے خالی نہیں ہو گیا۔ اس دوران اس کی حالت بھی بہتری کی طرف گامزن تھی اور آہستہ آہستہ ماجد کا بھوت اس کے سر سے اترتا جا رہا تھا۔ آخر کار طاہرہ پوری طرح سے صحت یاب ہو گئی۔ حیرت انگیز طور پر طاہرہ کے دل میں ماجد کے لیے جتنی محبت تھی رفتہ رفتہ وہ نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ شاید یہ علاج کا اثر تھا کہ ماجد اب اس کے نزدیک دنیا کی سب سے قابلِ نفرت شخصیت میں سے ایک تھا۔

چاچی کی رُوداد مکمل ہو چکی تھی۔ کمرے میں موجود ساری خواتین اس حیرت انگیز کہانی کے زیرِ اثر عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ خود میں بھی طاہرہ کو دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تو واشگاف الفاظ میں جادو کرنے اور کرانے والے پر جنت حرام قرار دے دی ہے پھر کیوں اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے اور دینِ اسلام کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس قبیح فعل میں مبتلا ہیں جو سیدھے سیدھے ان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ جادو اور کالے علم کا سہارا لے کر ہی وہ کامیابی کی سیڑھی چڑھنا چاہتے ہیں اور دنیا کی ہر خوشی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آخر ان نام نہاد مسلمانوں کو دوسروں کی زندگی برباد کر کے اور خود کو دوزخ کا ایندھن بنا کر کیا خوشی ملتی ہے۔ ہے کوئی جواب؟

تاوان

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم

یہ آج کے دور کا المیہ ہے۔ لوگ ایک چہرے پر کئی چہرے سجائے ہوئے ہیں۔ وقار بھی ملمع شدہ چہرے کی وجہ سے طوبیٰ کو پہچان نہ سکا اور جال میں پھنستا چلا گیا۔ امید ہے یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔

عافر شاہین

(ملتان کینٹ)

وقار ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا برش سے اپنے بال سیٹ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دھیمی آواز میں گنگنا بھی رہا تھا۔ اس نے براؤن کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی رنگت صاف تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور پیشانی کشادہ تھی۔ قد بھی دراز تھا۔

وقار کا تعلق متمول گھرانے سے تھا۔ اس کے والد زمیندار تھے۔ آبائی گاؤں میں زمینیں تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے والد کی ملتان میں کاٹن فیکٹری بھی تھی۔ وقار ایف اے پاس تھا۔ ایف اے کرنے کے بعد اس کا دل آگے پڑھنے کو نہیں چاہا تھا اس لیے اس نے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ متمول ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کام بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت دوستوں سے ملنے اور پارٹیوں میں شرکت کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس کی ایک بہن بھی تھی جس کا نام فرحت تھا۔ فرحت اس سے چار سال چھوٹی تھی۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ والد تو اسے میٹرک کے بعد نہیں پڑھانا چاہتے تھے لیکن فرحت کی ضد اور شوق کی وجہ سے انہوں نے اسے مزید پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اب وہ بی اے کی طالبہ تھی۔

وقار کی امی اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے

خاندان کی لڑکیوں کی تصویریں بھی اسے دکھائی تھیں لیکن وقار نے کسی بھی لڑکی کو پسند نہیں کیا اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرے گا۔

آج وقار اپنی گرل فرینڈ طوبیٰ سے ملنے جارہا تھا۔ اس کی اور طوبیٰ کی ملاقات موبائل فون پر ہوئی تھی۔ ایک دن اس کے نمبر پر ایک رانگ کال آگئی۔ کال کرنے والی لڑکی نے اپنا نام طوبیٰ بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی سہیلی کو کال کررہی تھی کہ اس کے سیل فون کا نمبر مل گیا اور یوں ان کے درمیان دوستی ہوگئی۔ طوبیٰ نے وقار کو بتایا تھا کہ اس کے دو بھائی ہیں جو بزنس کرتے ہیں۔ وہ تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ان دونوں کی دوستی کو ایک ماہ ہوگیا تھا۔ چند روز پہلے طوبیٰ نے وقار کو بتایا تھا کہ وہ بھی ملتان کی رہنے والی ہے۔ وقار نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو طوبیٰ نے ہامی بھرلی اور آج شام پانچ بجے گرین ہوٹل میں ملنے کا وقت طے ہوا تھا۔

بال سیٹ کرنے کے بعد وقار نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور اپنے سوٹ پر پرفیوم چھڑکنے کے بعد اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو وقار نے بے اختیار چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''آجائیں۔'' وقار نے کہا تو دروازہ کھلا اور اس کی بہن فرحت اندر داخل ہوئی۔

''اوہ! کیا بات ہے بھائی جان، آج تو آپ کسی فلم کے ہیرو لگ رہے ہیں۔ کہیں جارہے ہیں؟'' فرحت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں ایک فرینڈ سے ملنے جارہا ہوں۔'' وقار نے جواب دیا۔

''فرینڈ سے یا...... گرل فرینڈ سے۔'' فرحت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے تیار ہونے سے تو یہی لگتا ہے کہ آپ گرل فرینڈ سے ہی ملنے جارہے ہیں۔''

''فرحت۔!'' وقار نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

''بھائی جان، مجھے بتادیں۔ فکر مت کریں میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔'' فرحت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے وہ خوش نصیب ہے کون؟''

''میں اسے ابھی نہیں جانتا۔'' وقار نے کہا۔ ''ہماری فون پر ہی بات ہوتی ہے۔ آج پہلی بار اس سے ملاقات کررہا ہوں۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔'' فرحت نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم...... نہیں...... تم نہیں جاسکتیں۔'' وقار نے جواب دیا۔

''اچھا چلیں، میں آپ کے ساتھ نہیں چلتی۔ اس کا نام ہی بتادیں بلکہ ہوسکے تو آپ اس کی سیل فون سے تصویر ہی بناتے لائیے گا تاکہ میں امی سے بات کرسکوں۔''

''اس کا نام طوبیٰ ہے۔'' وقار نے بتایا۔

''طوبیٰ۔ واہ کیا خوبصورت نام ہے۔'' فرحت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سنو، اس سلسلے میں امی جان سے بات کرنے کی ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وقار نے کہا۔ ''میں پہلے طوبیٰ سے بات کرلوں پھر تمہیں بتاؤں گا تو تم امی سے بات کرنا۔''

''اچھا اچھا، نہیں کروں گی بات...... مگر ایک شرط ہے۔'' فرحت نے کہا۔

''شرط! تمہاری کیا شرط ہے؟'' وقار نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ میری ہونے والی بھابی سے جلد ملاقات کرائیں گے۔'' فرحت نے کہا تو وقار نے طویل سانس لیا۔

''اوکے، اوکے، میں وعدہ کرتا ہوں۔ اب مجھے اجازت۔ طوبیٰ پہنچ چکی ہوگی اور میرا انتظار کررہی ہوگی۔'' وقار نے مسکراتے ہوئے کہا تو فرحت ایک سائیڈ پر ہوگئی اور وقار مسکراتا ہوا کمرے سے نکل کر پورچ میں آگیا جہاں اس کی نئے ماڈل کی شاندار کار کھڑی تھی۔ وقار اپنی کار میں سوار ہوا اور گھر سے نکل کر اس ہوٹل کی طرف بڑھ گیا جہاں طوبیٰ سے ملنا تھا۔ بیس منٹ کی مسافت کے بعد وقار گرین ہوٹل پہنچ گیا۔ اس نے کار پارکنگ میں کھڑی کی اور کارڈ لے کر وہ اسے جیب میں رکھتا ہوا ہوٹل کے ہال کی طرف بڑھ گیا۔ چونکہ اس نے ہوٹل میں اپنی میز ریزرو کرادی تھی اس لیے اس کی میز خالی پڑی تھی۔ وقار اپنی میز پر جاکر بیٹھ گیا اور طوبیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ اسی لمحے ایک ویٹر آیا تو وقار نے اسے کہا کہ وہ تھوڑی دیر تک آرڈر دے گا۔ طوبیٰ نے اسے بتایا تھا کہ اس نے نیلے گلابی کلر کا سوٹ پہنا ہوا ہوگا اس لیے وقار ہال میں داخل ہونے والی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا لیکن کافی دیر گزر گئی اور طوبیٰ نہ آئی تو وقار کو بے چینی سی ہونے لگی۔ اسے ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ وہ بار بار گھڑی پر وقت دیکھ رہا تھا اور جب چھ بج گئے اور طوبیٰ نہ آئی تو وقار پریشان ہوگیا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور طوبیٰ کو کال

کرنے لگا۔ دوسری طرف بیل مسلسل جارہی تھی۔

''ہیلو طوبیٰ!'' رابطہ ہوتے ہی وقار نے کہا۔ ''کہاں ہوئی بھئی، میں ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔''

''سوری ڈیئر! میں آج نہیں آسکوں گی۔'' طوبیٰ نے کہا تو وقار چونک پڑا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' وقار نے پوچھا۔

''دراصل میرے بڑے بھائی کی سسرال والے آگئے ہیں۔ میں ان کے لیے امی کے ساتھ کھانا بنارہی ہوں۔'' طوبیٰ نے مجبوری بتائی۔ ''اس لیے میں آج نہیں آسکتی۔ میں تمہیں کال کرکے بتانا چاہتی تھی لیکن .... موقع ہی نہیں ملا۔ پلیز مائنڈ مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر تم کب ملوگی؟'' وقار نے پوچھا۔

''ہم کل ملیں گے۔ تم میرے کالج آجانا اور مجھے وہیں سے پک کرلینا۔'' طوبیٰ نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کل تمہارے کالج آجاؤں گا۔'' وقار نے کہا۔

''وقار۔!'' طوبیٰ نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم ناراض تو نہیں ہونا۔''

''نہیں، میں ناراض نہیں ہوں۔'' وقار نے جواب دیا۔

''تھینک یو! اوکے۔ پھر کل ملاقات ہوگی۔ تم بارہ بجے تک آجانا۔'' طوبیٰ نے کہا اور پھر رابطہ منقطع ہوگیا تو اس نے سیل فون آف کرکے جیب میں رکھ لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کار میں سوار اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو فرحت اس کے سامنے آگئی۔ وقار کا منہ لٹکا دیکھ کر وہ چونکی۔

''ارے بھائی، آپ کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔'' فرحت نے کہا۔ ''لگتا ہے میری بھابی خوبصورت نہیں ہیں۔ اس لیے آپ اداس دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے پگلی۔'' وقار نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ ''وہ آج نہیں آسکی۔''

''کیوں؟'' فرحت نے چونک کر کہا تو وقار نے اسے طوبیٰ کے نہ آنے کی وجہ بتائی اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆..........☆..........☆

دوسرے دن وقار مقررہ وقت پر طوبیٰ کے کالج کے سامنے پہنچ گیا اور طوبیٰ کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ چونکہ وقار نے طوبیٰ کو اپنی کار کا کلر بتادیا تھا اس لیے تھوڑی دیر کے بعد وقار نے ایک لڑکی کو دیکھا جو کالج سے نکل کر اس کی کار کی طرف آرہی تھی۔ اس لڑکی کے چہرے پر نقاب تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں۔ لڑکی کا قد متناسب تھا۔ وہ اسمارٹ تھی۔ اس لڑکی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وقار سمجھ گیا کہ یہی طوبیٰ ہے چنانچہ وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ لڑکی اس کے قریب پہنچ گئی۔ لڑکی کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت تھیں۔

''ہیلو! آر یو وقار؟'' لڑکی نے مترنم لہجے میں کہا تو وقار چونکا۔

''اوہ یس۔ میں وقار ہوں۔'' وقار نے جواب دیا۔

''آئی ایم طوبیٰ۔'' لڑکی نے کہا تو وقار کے چہرے پر چمک ابھر آئی۔

''کیسی ہو طوبیٰ؟'' وقار نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ کیا ہم یہیں کھڑے باتیں کریں گے یا کہیں چل کر بیٹھیں گے۔'' طوبیٰ نے کہا تو وقار گھبرا گیا۔

''اوہ سوری، بیٹھو۔'' وقار نے جلدی سے کہا اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے سائیڈ سیٹ کا دروازہ کھول دیا تو طوبیٰ کار میں بیٹھ گئی۔

''کہاں چلیں؟'' وقار نے طوبیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کسی پارک میں چلتے ہیں۔'' طوبیٰ نے کہا تو وقار نے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر اس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔

وقار کی کیفیت عجیب ہورہی تھی کیونکہ وہ پہلی بار کسی لڑکی سے مل رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ حالانکہ جب وہ طوبیٰ سے فون پر بات کرتا تھا تو اس وقت وہ گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوتا تھا جتنا اس سے مل کر ہورہا تھا۔ طوبیٰ پُراعتماد انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیا اپنا چہرہ نہیں دکھاؤ گی؟'' وقار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا میرا چہرہ دیکھنا ضروری ہے؟'' طوبیٰ نے الٹا سوال کیا تو وقار گڑبڑا گیا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو ویسے ہی کہا ہے۔'' وقار نے کہا۔

''دراصل میرا تعلق مذہبی گھرانے سے ہے اس لیے شادی سے پہلے میں اپنا چہرہ تمہیں نہیں دکھاسکتی۔'' طوبیٰ نے کہا۔

''اوہ۔!'' وقار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔ پھر تم بتاؤ میں اپنے والدین کو تمہارے گھر کب بھیجوں۔''

''میں تمہیں بہت جلد بتادوں گی۔'' طوبیٰ نے شرماتے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر وقار نے ایک جنرل اسٹور سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لیں اور پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ طوبیٰ نے وقار سے کہا۔

''وقار! کار روکنا۔''

''کیوں، کیا ہوا؟'' وقار نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تم کار روکو تو سہی۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' طوبیٰ نے کہا تو وقار نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔ جیسے ہی اس نے کار روکی، طوبیٰ نے بجلی کی سی تیزی سے پرفیوم کی چھوٹی سی ایک شیشی نکال کر وقار کے چہرے پر اسپرے کیا، دوسرے ہی لمحے وقار کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا چلا گیا اور پھر اس کا سر سیٹ کی پشت سے لگ گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆..........☆..........☆

وقار کو ہوش آیا تو اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا سر دائیں طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پڑا رہا پھر جب اس کا شعور جاگا تو اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش مگر کرسی سے بندھا ہونے کی وجہ سے وہ صرف کسمسا کر رہ گیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہ بے اختیار چونک پڑا۔ وہ اس وقت ایک کمرے میں کرسی کے ساتھ رسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس آدمی کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ گھنی مونچھیں اور گھنی داڑھی سے اس کی شکل خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی مانند سرخ تھیں۔ اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں دو بدمعاش ٹائپ نوجوان کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

''کک۔کک۔کون ہو تم...... اور...... اور میں کہاں ہوں۔'' وقار نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''طوبیٰ کہاں ہے؟''

اس آدمی نے وقار کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے سیل فون نکالا تو وقار بے اختیار چونک پڑا۔ یہ سیل فون اسی کا تھا۔ اس آدمی نے سیل فون آن کرنے کے بعد کال ملا دی۔

''لو...... اپنے والد سے بات کرو۔'' اس آدمی نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور سیل فون وقار کے کان سے لگا دیا۔ وقار کو دوسری طرف بیل جانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ پھر کال اٹینڈ کر لی گئی۔

''ہیلو۔ہیلو......'' دوسری طرف سے وقار کو اپنے والد کی آواز سنائی دی۔

''ابو۔ابو... میں وقار... میں کہاں ہوں۔ یہ لوگ کون ہیں۔'' وقار نے تیزی سے کہا۔

''وقار بیٹا پریشان مت ہو۔ ان لوگوں نے تمہیں تاوان کے لیے اغوا کیا تھا۔ میں نے ایک کروڑ ادا کر دیا ہے اب یہ تمہیں جلد ہی گھر چھوڑ جائیں گے۔'' اس کے ابو نے جواب دیا تو وقار چونک پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وقار کوئی بات کرتا، اس آدمی نے سیل فون ہٹا کر اپنے کان سے لگا لیا۔

''اب تمہیں اپنے بیٹے سے بات کر کے تسلی ہو گئی ہو گی۔ تمہارا بیٹا شام تک گھر پہنچ جائے گا۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''اور ہاں، میں تمہیں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں، اگر تم نے پولیس کو بتایا تو تمہیں اپنے بیٹے کی لاش ملے گی۔''

''نن۔نن۔نہیں۔نہیں، میرے بیٹے کو کچھ مت کہنا۔ میں پولیس کو نہیں بتاؤں گا۔'' وقار کے ابو نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس آدمی نے کہا اور پھر سیل فون آف کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''ہمیں تم لوگوں نے اغوا کیا ہے؟'' وقار نے اس آدمی سے پوچھا۔ ''طوبیٰ کہاں ہے۔ کیا تم نے اس کے گھر والوں سے بھی تاوان لیا ہے؟''

وقار کی بات سن کر وہ آدمی بے اختیار ہنس پڑا۔

''نہیں۔ طوبیٰ ہماری ساتھی ہے۔''

''کیا!'' وقار حیرت سے بولا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھیلتی چلی گئیں۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''مسٹر وقار، ہمارا ایک گینگ ہے اور ہمارے گینگ میں متعدد لڑکیاں ہیں جو موبائل فون پر تم جیسے بھولے بھالے اور احمق لڑکوں سے دوستیاں کر کے انہیں جال میں پھنساتی ہیں اور پھر انہیں بے ہوش کر کے اپنے ٹھکانے پر لے آتی ہیں اور اس طرح ہم ان نوجوانوں کے والدین سے ان کے...... بدلے تاوان وصول کرتے ہیں۔'' اس آدمی نے جواب دیا۔ ''چونکہ تمہارے والد نے بھی تمہارا تاوان ادا کر دیا ہے اس لیے اب تمہیں شام تک چھوڑ دیا جائے گا۔''

وقار نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی موبائل فون پر جس لڑکی سے دوستی ہوئی تھی وہ لڑکی اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس کر اسے بے وقوف بنائے گی۔ حالانکہ وہ طوبیٰ سے شادی کرنے کی حد تک سنجیدہ تھا۔

نہیں انکل نہیں

جناب مدیر اعلیٰ
سلام مسنون
یورپ کو محفوظ ترین اور ترقی کا ضامن علاقہ قرار دینے والے بے خبر ہیں کہ وہاں کیسے کیسے درندہ صفت لوگ چھپے بیٹھے ہیں. پاکستان کی پاک سرزمین پر یورپ کو ترجیح دینے والے اس سچ بیانی کو ضرور ملاحظہ کریں

شہناز احمد
(لاہور)

جب سارہ کے لیے رضا کا رشتہ آیا تو اُسے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔

رضا حسن ماموں کے بیٹے تھے۔ خوش شکل مگر بے حد سوبر، پڑھاکو۔ تھوڑا سا اپنے آپ میں ہی رہنے والے۔ ابھی اسے پتا چلا کہ رضا کو کیلی فورنیا کی مشہور یونیورسٹی میں اسکالرشپ مل گیا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے میں تین چار سال لگ جائیں گے۔ اس لیے یہ طے پایا کہ نکاح کر کے وہ سارہ کے پیپر وغیرہ لے جائیں گے اور بعد میں اُسے بلا لیں

کے۔ مگر سارہ کو جہاں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ امریکا جانے کا موقع مل رہا ہے۔ وہاں تھوڑی سی جھجک یہ تھی کہ رضا نے کبھی اشارے، اشارے میں بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ماموں زبردستی تو نہیں کر رہے۔ اُس نے سوچا۔

لیکن یہ پریشانی امی نے اپنے بھولپن میں دور کردی۔ ''حسن بھائی کہہ رہے تھے کہ رضا نے خاندان میں صرف سارہ کے لیے ہاں کی ہے۔ اور کسی کے لیے نہیں۔''

چلو، یہ بھی مرحلہ حل ہوا۔ شرم بھی آئی اور خوشی بھی۔ کچھ لوگ صحیح ہی کہتے ہیں۔ رشتے آسمانوں پہ لکھے ہوتے ہیں۔ جٹ منگنی، پٹ نکاح اور پھر وہ ضروری کاغذات لے کر امریکا روانہ ہوگئے۔

سارہ کا بی اے کا رزلٹ آچکا تھا۔ اب وقت صرف رشتے داروں، سہیلیوں کو ملنے میں گزر رہا تھا۔

رضا بھی کبھی فون کرتے۔ ''چھوٹا سا اپارٹمنٹ لے لیا ہے۔ لون لے کر ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی لے لی ہے۔''

چھ ماہ گزرنے کے بعد اُسے اطلاع ملی کہ اس کو امریکا جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ خوشی اور اداسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔

اپارٹمنٹ فرنشڈ تھا۔ مگر اسٹوڈیو تھا۔ یعنی بالکل ننھا سا۔ سب کچھ ایک ہی کمرے میں ختم۔ شروع میں تو بہت لطف آتا تھا۔ اُسے صاف کرنے، چیزیں سیٹ کرنے میں۔ لیکن بعد میں بوریت شروع ہوگئی۔

مسئلہ یہ تھا کہ رضا عادت سے مجبور، پھر پڑھائی کا پریشر۔ بالکل بھی کسی سے دوستی نہ تھی۔

ان کے اپارٹمنٹ میں دو تین مرتبہ انڈین نظر آئے تھے لیکن یہ وہ وقت تھا جب ملک دولخت ہوا تھا۔ کسی انڈین کی دوستی تو کیا اُسے دیکھنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ رضا کے کہنے پر L.A کی لائبریری کی ممبر بنی۔ وہاں دنیا جہان کی کتابیں، رسالے، اخبار اور پھر ہر عمر کے لوگوں کی رونق۔ اُسے کافی عرصے کے بعد لطف آیا کیونکہ کتابوں میں اس کی جان تھی۔ اب وہ بوریت کی شکایت نہیں کرتی تھی۔ ایک دن ایک ہم عمر لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ ڈھیلی ڈھالی لمبی چٹیا۔ سادہ سی پینٹ اور قمیص۔ نام پوچھا تو زوریہ بتایا۔

آپس میں بات چیت چلی تو پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ کہاں سے ہے؟

زوریہ بہت ہی دلچسپ شخصیت کی مالک تھی۔ باتیں خوب کرتی۔ ہر موضوع پر پورا عبور رکھتی تھی۔

دونوں اچھی دوست بن گئی تھیں۔ سارہ کا دل بھی خوب لگ گیا۔ کچھ مہینوں میں اس کے شوہر کا کانٹریکٹ ختم ہوا تو وہ ملنے آئی۔ دونوں ہی اداس تھیں۔

اس دن پتا چلا کہ وہ دلّی کے کسی سکھ گھرانے کی تھی۔

رضا کی تعلیم ختم ہوئی اور ان کو نوکری مل گئی۔ بہت اچھی تو نہ تھی کیونکہ تجربہ کوئی نہ تھا۔ بس کم از کم تنخواہ ملنے لگی۔

وہ اپارٹمنٹ چھوڑ کر انہوں نے ایک بیڈروم کا ذرا بڑا گھر لے لیا۔ سارہ کے بے بی ہونے والا تھا۔ ان کو زیادہ جگہ کی ضرورت تھی۔

زارا پیدا ہوئی تو زندگی میں جیسے بہار آگئی۔ دونوں ہی بہت انجوائے کرتے تھے۔ مگر سوشل لائف تو ابھی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

کبھی کبھی سارہ کو لگتا کہ اس کا اندازہ رضا کے متعلق صحیح تھا۔ کوئی دوست نہیں، نہ کہیں جاتے تھے نہ کوئی ملنے آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ تینوں سیر کے لیے نکل جاتے۔ اور بس۔

پاکستان میں بہن کی شادی کی خبر ملی تو نہ جاسکی۔ ان کے خیال میں شادی پر جانا پیسے کا زیاں تھا۔

تین سالوں میں صرف ایک دفعہ گئے جب حسن ماموں کا انتقال ہوا تھا۔

زارا اسکول میں داخل ہوچکی تھی۔ اس نے ایک دو دوست بھی بنالی تھیں۔

سارا کو لگتا تھا کہ وہ ایک مکمل ''ہاؤس وائف'' بن کر رہ گئی ہے۔ صفائی ستھرائی۔ کھانا بنانا۔ زارا کو اسکول سے لانا لے جانا اور سودا سلف کی خریداری میں ہی الجھ کر رہ گئی تھی۔ اپنے آپ کو بالکل سنوار نہ سکی۔

انہیں امریکا میں رہتے اتنا عرصہ ہوگیا تھا کہ وہاں کی شہریت کے لیے درخواست دی تو فوراً ہی منظور ہوگئی اور اب دونوں ہی وہیں کے ہوکر رہ گئے۔

سالہا سال سے اپارٹمنٹ کا کرایہ دے رہے تھے۔ سارہ نے کئی مرتبہ رضا سے کوئی چھوٹا موٹا گھر خریدنے کا کہا تو انہوں نے انکار کردیا۔ ''تمام عمر اس ملک میں گزارنا ہے کیا۔ ایک نہ ایک دن اپنے ملک واپس جانا ہے۔''

یہ بڑی بودی دلیل تھی۔ کیونکہ اس وقت گھروں کی قیمت کا 10% دے کر گھر میں داخل ہوسکتے تھے۔ باقی قسطوں میں، بیچنے کے ٹائم پر آسانی سے گھر بک بھی جاتا تھا۔

☆☆☆

وہ دن اس کو اچھی طرح سے یاد تھا۔

میر صادق جو ٹیپو سلطان شہید کا وزیر تھا' میسور کی چوتھی لڑائی کے دوران تمام راز انگریزوں کو بھجواتا رہا۔ انگریزوں نے اپنا فوجی منصوبہ اسی کے مشوروں کی روشنی میں تیار کیا۔ اسی کی راہ پر چل کر پورنیا جو ریاست کا دیوان تھا' وہ بھی انگریزوں کے ساتھ سازش میں شریک ہوگیا۔ اس نے تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے فوج کو عین میدان جنگ سے واپس بلالیا اور سلطان میدان میں تنہا ہوگیا۔ اس کے باوجود سلطان نے شجاعت کے جوہر دکھائے۔ اس کے جاں نثار ایک ایک کرکے کٹ رہے تھے مگر وہ بے جگری سے لڑتا رہا اور لڑتے ہوئے ہی جام شہادت نوش کیا۔ اس کی شہادت کے ساتھ ہی برصغیر کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا اور اس وسیع و عریض سرزمین پر غلامی کے خلاف آواز بلند کرنے والا کوئی نہ رہا۔

صبح رضا اور زارا جانے کے لیے تیار ہوئے۔ رضا کو دیر ہورہی تھی۔ کوئی خاص کلائنٹ آنے والا تھا اور مرضی کی قمیص پریس نہ تھی۔ وہ غصے میں بریف کیس میں اہم کاغذات ٹھونستے ہوئے بولے۔ ''تم سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔''

''بائے بابا۔'' زارا نے باپ کو آواز دی۔

''بائے میری جان''۔ انہوں نے سارہ کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

اُسے افسوس سے زیادہ غصہ بھی آیا کہ اگر پہلے قمیص کا بتادیتے تو پریس کردیتی۔ افسوس یہ ہوا کہ ناشتا نہ کرکے گئے۔

ناشتے کے برتن سمیٹ کر کچن میں لے جارہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

کس کا ہوسکتا ہے۔ ابھی صرف دس بجے تھے۔

''مسز حسن؟'' امریکن لہجے میں کسی نے پوچھا۔

اس کا دل دھڑکا۔ ''جی بول رہی ہوں۔''

''ہمیں آپ کو اطلاع دینی تھی کہ مسٹر رضا حسن کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ میں ان کا کولیگ مائیک جانسن بول رہا ہوں۔ ہم ان کو میموریل اسپتال لے کر آئے ہیں۔ وہ اس وقت I.C.U میں ہیں۔ آپ فوراً پہنچ جائیں۔ آپ کو راستہ آتا ہے؟'' کوئی تیز تیز بول رہا تھا۔

سارہ کے تن بدن سے جیسے جان نکل گئی۔

''رضا کو ہارٹ اٹیک؟'' اس کا دماغ ماؤف ہورہا تھا۔

''مسز حسن! پلیز آپ حوصلہ رکھیں اور فوراً آجائیں۔ اگر ڈرائیو نہیں ہے تو ٹیکسی پکڑلیں۔'' اب وہ گھبرا گھبرا کر بول رہا تھا۔

''جی اچھا۔ میں پہنچ رہی ہوں۔'' وہ ہوش میں آگئی۔

جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے۔ پرس پکڑا۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ لاک کیا اور باہر آگئی۔

اللہ تعالیٰ سے بدستور وہ دعا کرکے رضا کی سلامتی مانگ رہی تھی۔ ''میرا تو اُن کے علاوہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔''

ٹیکسی اسپتال کے اندر رکی تو ایک امریکن لڑکا لپک کر اس کی طرف آیا۔

''مسز حسن! میں مائیک جانسن ہوں۔ میں نے ہی فون کیا تھا۔ جلدی کریں۔''

''رضا کہاں ہیں؟'' مارے پریشانی کے اس کے منہ سے بات نکل نہیں رہی تھی۔

''وہ I.C.U میں ہیں۔ چلیں وہیں چلتے ہیں۔''

وہ بھاگم بھاگ وہیں پہنچے۔

کچھ کولیگ ڈاکٹر کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ پریشان پریشان سے۔

''جلدی کیجیے اُن کی حالت ٹھیک نہیں۔'' کسی نے جیسے اس کو I.C.U میں دھکیل دیا۔ رضا کو آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ پاس مونیٹرز تھے جن کی تاریں ان کے جسم سے اٹیچ تھیں۔

''رضا..... یہ کیا ہوگیا۔'' وہ پاگل سی ہوگئی۔

''سارہ..... پلیز میری بات غور سے سن لو۔'' وہ بالکل مدھم آواز میں بول رہے تھے۔

''رضا آپ اچھے ہوجائیں گے۔'' آنسو اور الفاظ گڈمڈ ہورہے تھے۔

''غور سے سنو۔ سارہ، میں نے اپنی لائف انشورنس کروائی تھی۔ ایک سال ہوگیا ہے۔'' اُن کی سانس رک رک کر آرہی تھی۔ بات بھی مشکل سے سمجھ میں آرہی تھی۔

''میرے جانے کے بعد وہ تم دونوں کو مل جائے گی۔''

"رضا...... پلیز ایسا نہ کہیں۔ آپ اچھے ہو جائیں گے۔" چیخیں جیسے سینے سے نکلنے کو بے تاب تھیں۔

"پلیز، میری بات سنو۔ یہ پیسے تم دونوں کے کام آئیں گے۔ زارا کا خیال رکھنا......" یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔

مونیٹر کی لائن بالکل سیدھی ہوگئی۔ اگر نرس اس کو آگے بڑھ کر نہ سنبھالتی تو وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر گئی ہوتی۔

ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اتنا جوان، ہینڈسم رضا حسن، اچھا شوہر، بہترین باپ۔ اچانک یوں چلا جائے گا۔ وہ اس حادثے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔

وہ تو عملی زندگی میں شاید کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ رضا ہر کام خود کرتے تھے۔ اس کو کسی فیصلے میں شامل نہیں کیا۔ کچھ بھی کرنے نہ دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال وہ دن میں کئی مرتبہ دہرا چکی تھی۔ رضا کی لاش کو پاکستان نہیں لے جا سکی۔ کچھ مسلمان بھائیوں نے اسلامک سینٹر سے آکر مدد کردی تھی۔ وہیں لوکل قبرستان میں تدفین ہوگئی۔ زارا بھی مرجھا کر رہ گئی۔ آفس والے پرسے کے لیے آئے تو مائیک جانسن نے اُسے انشورنس کمپنی سے بات کرنے کو کہا۔ کیس بالکل سیدھا سادہ تھا۔ ایک خطیر رقم کیش کی صورت میں اُسے مل گئی۔ اتنی بڑی کہ اس میں ایک گھر بہ آسانی خریدا جاسکتا تھا۔

زندگی بھی کچھ کام کیے بغیر گزر سکتی تھی۔

کتنی عجیب بات تھی۔ جب ضرورت تھی تو رقم نہ تھی۔ اب رقم تھی تو اس بات کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اب گھر کس کے لیے خریدنا تھا۔ کس کے رہنے کے لیے؟

☆☆☆

کسی عزیز کے جانے کے بعد وقت گزارا نہیں جاتا بس گزر جاتا ہے۔ دن، رات کے سلسلے چلتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ زندگی جذبات، احساسات سے عاری ہو جاتی ہے۔

وہ پاکستان واپس جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ امی، ابا یوں ایک دوسرے کے پیچھے چلے گئے تھے جیسے کوئی ریس لگی ہو۔ حرا شادی کے بعد انڈونیشیا چلی گئی تھی۔

رضا کو گزرے چھ ماہ ہوگئے تھے کہ ہیوسٹن سے خط آیا۔ انجم کا خط۔ اس کی بچپن کی دوست جو کافی عرصے سے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہیوسٹن میں سیٹل تھی۔ اُسے رضا کی وفات کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ملنے آرہی ہے۔ دراصل اسے سان فرانسسکو میں میٹنگ پر جانا تھا۔

سارہ نے یہ خبر زارا کو بتائی۔ وہ خوش ہوگئی۔ دونوں نے مل کر گھر صاف کیا۔ گروسری خریدی۔ کھانے بنائے اور انجم کو ائرپورٹ لینے چلی گئیں۔ دونوں سہیلیاں کافی عرصے کے بعد ملی تھیں۔ گلے لگتے ہی دونوں کے آنسو نکل آئے۔ انجم سارہ کی محلے دار بھی تھی اور رضا کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔

انجم بہت اچھی شخصیت کی مالک تھی۔ دل موہ لینے والی مسکراہٹ اور خوش مزاج۔ دونوں تقریباً پوری رات باتیں کرتی رہیں۔

"میں کیا کروں گی انجو؟ مجھے کسی کام کا کوئی تجربہ نہیں۔ کوئی نوکری، بزنس کچھ بھی نہیں۔ زندگی کیسے گزرے گی؟ ابھی زارا صرف گیارہ برس کی ہے۔ اس کی پڑھائی۔ کالج سوشل لائف۔ کیا بنے گا؟" وہ بار بار کہتی رہی۔

انجم سیریس ہو کر اس کی باتیں سنتی رہی۔

اگلے دن ایک چکر ڈزنی لینڈ کا بھی لگایا۔ کافی عرصے کے بعد زارا بھی خوش تھی۔ رات زارا کے سو جانے کے بعد انجم نے کہا۔ "تم شہر کیوں نہیں بدل لیتیں۔ اگر پاکستان فی الحال نہیں جانا چاہتیں تو کم از کم کسی دوسرے شہر میں جاکر رہو۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ ایک تو غم نے تم دونوں کو نڈھال کر رکھا ہے۔ دوسرے اس شہر کے ماحول نے۔ یہاں کی فضا میں آلودگی بہت ہے۔ میں کوئی تین سال بعد آئی ہوں اور مجھے الرجی کی شکایت ہوگئی ہے۔ ناک، آنکھوں میں کھجلی شروع ہوگئی ہے۔"

"ہاں تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ہوا میں آلودگی دھوئیں کی وجہ سے ہے۔ یہ سب بے تحاشا کاروں کے دھوئیں سے ہو رہا ہے۔ لوکل گورنمنٹ کوشش کر رہی ہے کہ تدارک ہو سکے۔ مجھے بھی کئی کئی دن ناک بند ہونے سے سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے۔"

"تو چلو۔ پھر یہ طے ہے کہ پرسوں جب میں سان فرانسسکو کے لیے نکلوں تو تم دونوں بھی میرے ساتھ کار میں چلو۔ ہم راستے میں رکتے رکاتے پورا وسطی کیلی فورنیا دیکھ سکیں گے۔ سنا ہے راستے میں ساحل سمندر اور خوبصورت مقامات ہیں۔" انجم نے جوش سے کہا۔

دونوں اچھل سی گئیں۔ زبردست آئیڈیا۔ لمبی

کراچی

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کراچی میں موسم ہر لحظہ روئی کے بھاؤ بدلتا ہے۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک ہی عمارت کے کرایہ دار ایک ہی منزل سے دوسری منزل پر تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے جاتے ہیں۔ یہاں آپ دسمبر میں ململ کا کرتا یا جون میں گرم پتلون پہن کر نکل جائیں تو کسی کو ترس نہیں آئے گا۔ اہلِ کراچی "واللہ اعلم بالصواب" قسم کے موسم کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ اگر یہ دو تین گھنٹے تبدیل نہ ہو تو وحشت ہونے لگتی ہے اور بڑی بوڑھیاں اس کو قربِ قیامت کی نشانی سمجھتی ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ اچھے خاصے لحاف اوڑھ کر سوئے اور صبح پنکھا جھلتے ہوئے نکلے۔ دوپہر تک لو لگنے کے سبب بالا ہی بالا اسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔ بعض اوقات تو کہرا اتنا ہوتا ہے کہ توارِدوں کو کراچی کا اصل موسم نظر ہی نہیں آتا۔

(مشتاق احمد یوسفی کی "چراغ تلے" سے انتخاب)

ڈرائیو۔ ویسے بھی لمبا ویک اینڈ تھا۔ تین چھٹیاں۔

زارا تو فوراً تیاری میں لگ گئی۔

کار رینٹ پر لی گئی تو منیجر نے بتایا کہ چونکہ L.A سے سان فرانسسکو چار سو میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کو راستے میں کسی ہوٹل میں قیام کرنے سے تھکاوٹ نہ ہوگی۔

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فون پر ان کے لیے کمرے کی بکنگ کروادی۔ "وسطی کیلی فورنیا میں کئی شہر آتے ہیں جو سمندر سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر ہیں۔ خوبصورت، صاف ستھرے، ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ۔ میں نے بکنگ بھی ان میں سے ایک شہر میں کروائی ہے۔"

اس کا شکریہ ادا کرکے صبح جب گاڑی L.A سے نکالی تو واقعی ایک اور ہی دنیا آباد تھی۔ کھیت میلوں میل تک پھیلے۔ صاف و شفاف تازہ ہوا۔ خوبصورت موسم۔ ہائی وے پر چلتے جاؤ۔ تھکاوٹ کا احساس نہ ہو۔ تینوں کو بہت لطف آیا۔

راستے میں کھانا کھایا۔ سہ پہر ہونے کو تھی جب یہ اپنے ہوٹل میں پہنچیں۔ کمرا چیک کیا۔ بہترین، صاف ستھرا، کافی سستا، اسٹاف بھی مستعد، تمیزدار۔ منیجر نے چابی دیتے ہوئے بتایا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اور بھی خوبصورت چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہیں۔ آپ لوگ وہاں کے Beaches پر ضرور جائیں۔ بہت لطف اندوز ہوں گی۔

اپنا سامان رکھنے کے بعد جب تینوں دس منٹ کے فاصلے پر ایک شہر میں پہنچیں تو زارا جیسے اس شہر کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔

لیونگ ویک اینڈ کی وجہ سے ساحل لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید کوئی مقامی میلہ لگا ہوا تھا۔ آرٹس کرافٹ کا' چھوٹے کھانوں کے اسٹال' میوزک۔ سب کچھ تھا۔ وہ تو گاڑی سے اترتے کے ساتھ ہی ہاتھ چھڑا کر پانی کی طرف لپکی۔

وہ دونوں سہیلیاں بھی ٹہلنے لگیں۔ لوگ بہت فرینڈلی تھے۔ ساحل کے پاس چھوٹی چھوٹی دکانیں۔ سیپیوں سے بنی چیزوں کی' گفٹ کی' کتابوں کی۔ چیزوں کی قیمت مناسب۔ وہاں جاکر تو سارہ بھی اپنے غم بھول گئی۔

"ماما۔ میں نے زندگی میں اتنا بھی نہیں enjoy کیا۔" واپس ہوٹل آکر بستر پر لیٹتے ہوئے زارا نے کہا۔

"اچھی بات ہے میری جان۔ اللہ کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔" سارہ نے خوش ہو کر کہا۔

اگلے دن انجم کو اپنے سیمینار کے لیے جانا تھا۔ ان دونوں کا کوئی موڈ نہ تھا لمبی ڈرائیو کا۔ طے یہ پایا کہ وہ بس سے چلی جائے اور یہ لوگ ایک دو روز اس ہوٹل میں قیام کرلیں پھر وہ واپس آکر ان کے ساتھ وقت گزار کر ان کو L.A لے جائے گی۔

☆☆☆

زندگی اس طرح کا ٹرن لے گی یہ سوچا بھی نہ تھا۔ یہ وہ دن جو اُن ماں بیٹی نے اس چھوٹے شہر میں گزارے تو بہت کچھ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہیں گھر بسانے، اسی شہر میں باقی زندگی گزارنے کا۔

کافی لوگوں سے بات چیت کی۔ سب نے بتایا کہ یہ شہر نو عمر بچوں کے لیے آئیڈیل ہے۔ اچھے اسکول' پارکس' سینما گھر' شاپنگ سینٹرز اور سب سے اچھی بات کہ ماحول بے حد نفیس' فرینڈلی۔ ہمارے یہاں کرائم نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ ہم ایک کمیونٹی میں فیملی کی طرح ہیں۔ ایک دوسرے سے جان پہچان ہے۔ بڑے شہروں میں تو آپ برابر کے ہمسایہ کے متعلق بھی نہیں جانتے۔ پھر بے ہنگم ٹریفک، کاروں کا دھواں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ وہ چالیس سال سے یہاں

ہیں۔ L.A سے ہی آئے تھے۔ اب سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔

سارہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ چھوٹا موٹا فیصلہ نہ تھا۔ پوری زندگی کا سوال تھا۔ یہاں وہ سب کچھ تھا جس کی اُسے اور زارا کو ضرورت تھی۔ بس یونیورسٹی نہ تھی۔ بڑا کالج نہ تھا۔ لیکن وہ تو بہت دور کی بات تھی۔ انجم کے واپس آتے کے بعد اسی ٹاپک پر بات چلی۔ اُس کو بھی یہ بات بہت پسند آئی۔

''لیکن میں یہاں کیا کروں گی؟'' سارہ نے کہا۔

''وہاں کیا کررہی ہو؟''

''فی الحال تو کچھ نہیں۔''

''مجھے امید ہے کہ تم دونوں انشاء اللہ یہاں آنے سے خوش رہو گی۔'' انجم نے سیریس ہو کر کہا۔

☆☆☆

وہ تینوں ساحل کے پاس آ گئیں۔ وہیں ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر کے اندر چلی گئیں۔ نام لکھا تھا۔ ڈیبی سولوون۔ خوبصورت شکل کی نوجوان خاتون تھی۔ انجم نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ''میری دوست اور بچی کبھی اکیلی نہیں رہیں۔ وہ بھی کسی اجنبی شہر میں......''

''میں آپ کو ایک بڑی اچھی رائے دیتی ہوں۔ یہاں پر ''بیڈ اینڈ بریک فاسٹ'' گھر مل رہے ہیں۔ جہاں آپ کا مختصر قیام ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت ہے ''Paying guests'' کی۔ چونکہ یہ تفریحی شہر ہے۔ لوگ کبھی کبھی زیادہ لمبا قیام کرکے بعد میں اپنا گھر خریدتے ہیں۔ اس صورت میں مالک مکان اپنے گھر کا ایک پورشن کرایہ پر دے دیتا ہے۔ لیکن فرنیچر سمیت' کھانے پینے کا انتظام بھی خود ہی کرتا ہے۔ صفائی' کپڑوں کی دھلائی سب کچھ۔ اس صورت میں کرایہ ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن کرایہ دار کو بہت سہولت ہو جاتی ہے۔'' وہ بتاتے بتاتے رکی۔ ان تینوں کی طرف دیکھا جو ہمہ تن گوش تھیں۔ ''آج کل اس کا کافی رواج ہو گیا ہے۔''

''مجھے تو یہ آئیڈیا بہت بھایا ہے۔ اگر تم دونوں یہاں شفٹ ہونا چاہو تو اسی طرح کی Arrangement کرلو۔ اچھا سا خوبصورت گھر لو اور اپنا چھوٹا موٹا سامان اٹھا کر یہیں آ جاؤ۔ کیوں کیا خیال ہے......؟'' انجم نے کہا۔

''ہوں، آئیڈیا تو اچھا ہے۔ سجا سجایا گھر، پکا پکایا کھانا، بجلی پانی کے بلوں سے آزادی۔'' سارہ جیسے اپنے آپ سے بات کررہی تھی۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میرا جی بھی اوب سا گیا ہے' L.A سے۔ چینج کرکے دیکھ لیتے ہیں۔''

زارا خوشی کے مارے چیخ اٹھی۔ ماں کو گلے لگا لیا۔

''مما، آئی لو یو......''

اسٹیٹ ایجنٹ ڈیبی نے بہت خوبصورت دو بیڈ روم کا پورشن ساحل سے تقریباً پانچ منٹ کے فاصلے پر دکھا دیا۔

مالک مکان مسٹر اینڈ مسز جان اینڈرسن تھے۔ پچپن، ساٹھ کے ہوں گے۔

مسز اینڈرسن گرے بالوں، گہری نیلی آنکھوں اور خوبصورت مسکراہٹ کے مالک۔ ہنستی ہوئی آنکھیں، خوش مزاج۔ جلد ہی فری ہونے والے۔ مسز اینڈرسن میری چشمہ لگائے، ذرا سوبر سو بری تھیں۔

ان تینوں کو بہت اچھے لوگ لگے یہ دونوں۔

گھر دکھایا۔ کچن صاف ستھرا۔ دونوں کمروں میں صاف ستھرے بیڈ۔ الماریاں۔ رائٹنگ ٹیبل اور لونگ روم میں ہلکا پھلکا فرنیچر۔

سارا کا دل تو جیسے خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ یہ پورشن اوپر تھا۔

نیچے چھوٹا سا باغ نظر آرہا تھا۔ خوبصورت پودے پھول سے آراستہ۔ فضا اجلی اجلی۔ موسم دلفریب۔ کرایہ مناسب لگا۔ اسی وقت بسم اللہ کہہ کر پیشگی دے دیا گیا۔

ڈیبی نے کنٹریکٹ سائن کروایا۔ ''دونوں میاں بیوی کی کمیونٹی میں اچھی شہرت ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ بس کبھی کبھی سیزن آنے پر یہ پورشن کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ ''ویسے سارہ، آپ کہاں جاب کرتی ہیں......؟''

''میں نے کبھی جاب نہیں کی۔ بزنس کا شوق تھا۔'' اس نے ذرا اداسی سے کہا۔

ڈیبی بہت فرینڈلی لڑکی تھی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا لیا کہ سارہ کو کتابوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ ''میرے پاس ایک کتابوں کی دکان بھی سیل کے لیے کل ہی آئی ہے۔ مالک واشنگٹن واپس جارہی ہے۔ لوکیشن نہایت عمدہ، ساحل پر، کافی شاپ کے پاس۔''

سارہ اور انجم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''یہ لیں جی۔ یہ بروشر ہے اس شاپ کی۔'' ''کورل ڈراپ بک شاپ۔'' ''بہت کیوٹ سی ہے۔ چھوٹی سی۔ نئی پرانی کتابیں۔ پیپر بیک، دس سینٹ سے لے کر 50 ڈالر کی

کتاب تک۔ اس کے علاوہ گریٹنگ کارڈز وغیرہ بھی رکھے ہیں۔'' بہت جوش سے ڈیبی نے دکان کی تصویر دکھائی۔

سارہ کا دل تو جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ شاید اس کے خوابوں کی تعبیر کا وقت آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

جس دن انجم واپس ہیوسٹن گئی سارہ اور زارا کی زندگی ایک نئے ڈھب پر چل پڑی۔ نیا گھر، خوبصورت کتابوں کی شاپ کے ساتھ۔ ''کورل ڈراپ'' کا نام بدل کر ''ZARAS'' رکھا گیا۔ اس تمام مرحلے میں مسٹر اینڈرسن نے بہت زیادہ مدد کی۔ دکان گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس کا سامان ٹھیک ہی تھا۔ ابھی اس میں اور بھی بہت کچھ رکھا جا سکتا تھا۔

مسز اینڈرسن نے دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پہلی شام کھانے میں روسٹ چکن، فرنچ فرائز، بریڈ، سلاد وغیرہ تیار تھے۔ گرما گرم سوپ پہلے پیا گیا۔ ان کا اپنا پورشن نیچے تھا۔ ویسے اندر سے بھی راستہ جاتا تھا لیکن باہر ہونے سے بہت فائدہ تھا۔

''تم لوگوں کے پاس چوائس ہے۔ کچھ خود ہی پکانے کو جی چاہے تو کچن استعمال کرلو۔ ورنہ دونوں وقت نیچے کھانے کے لیے آ جاؤ۔'' میری اینڈرسن نے مسکرا کر کہا۔ انہیں بھی دونوں بہت پسند آ گئیں۔

زارا تو خوشی خوشی نیچے اوپر گھوم رہی تھی۔ مسٹر اینڈرسن دیکھ کر مسکراتے رہے۔

جس دن ''زاراز بک شاپ'' کا افتتاح تھا، سارہ اور زارا بے حد مصروف تھیں۔

ابھی دروازے کھولے نہیں تھے کہ مسٹر اینڈرسن بے حد خوبصورت لمبا پودا لے کر آ گئے۔

پودے کو کونے میں رکھا گیا تو کونا سج گیا۔

ساتھ میں ایک درجن ڈونٹس doughnuts انہوں نے زارا کو دے دیے۔

''لو بھئی لٹل ڈول، enjoy کرو، اپنی دکان۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اس کے گال پر ہلکا سا بوسہ دے دیا۔

سارہ کو بہت اچھا لگا۔ یہ اجنبی شخص اس کے ساتھ اس قدر شفقت سے پیش آئے گا وہ سوچ بھی نہ سکی تھی۔

دکان کے باہر بہت سے مختلف رنگوں کے غبارے لہرا رہے تھے۔

''گرینڈ اوپننگ'' لوگ ویسے ہی اندر چلے آئے۔ کچھ دیکھنے کے لیے۔ کچھ خریدنے کے لیے۔ تمام دن اتنی مصروفیات میں گزرا کہ پل بھر بھی بیٹھنے کا موقع نہ ملا۔ لوگ بہت خوش اخلاق اور ملنسار لگ رہے تھے۔

ان دونوں سے کافی گپ شپ کرتے رہے۔ تھوڑی بہت سیل بھی ہو گئی۔

شام تک بے حد تھکاوٹ ہو گئی۔ جی چاہتا تھا اب ٹانگیں پسار کر آنکھیں بند کرکے زبردست سی چائے یا کافی پی جائے۔ اسی وقت مسٹر اینڈرسن چلے آئے۔ ''کیوں بھئی، کیسا رہا پہلا دن......؟''

''بہت اچھا، مسٹر اینڈرسن''۔ سارہ نے خوشی سے کہا۔

''بھئی، تم مجھے جان کہہ سکتی ہو۔ یہ مسٹر اینڈرسن تو مجھے بہت بوڑھا بوڑھا بنا کر رکھ دے گا۔'' ایک زوردار قہقہہ انہوں نے لگایا۔

''او کے جان، تھینکس۔'' سارہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''گھر جانے کے لیے تیار ہو؟'' میری نے گرما گرم سوپ تیار کر رکھا ہے اور ہاں فریش چاکلیٹ کیک بھی۔ بھئی زبردست کک ہے میری بیوی بھی۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

وہ دونوں دکان لاک کرکے جان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

''شکر ہے مجھے ڈرائیو نہیں کرنا پڑی۔ تھکاوٹ کافی ہو گئی ہے آج۔ تھینکس جان، بہت بہت شکریہ۔'' بہت سچے دل سے سارہ نے کہا۔

''کوئی بات نہیں بچے، یہ میری خوشی ہے''۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

زارا کا اسکول میں داخلہ ہوا تو پہلے دن ہی ایک بچی اس کی دوست بن گئی۔ جولی لارسن۔ اس کا باپ ایک امیر آدمی تھا۔ وہ بہت پیاری سی تھی۔ ڈیل ڈول میں عمر سے بڑی لگتی تھی۔

جولی عام طور پر تو باقی بچوں کی طرح اپنی اسکول بس میں آتی جاتی تھی لیکن کبھی کبھی زارا سے ملنے اپنی مام کے ساتھ بک شاپ پر بھی آ جاتی۔

سارہ کو اس کی ماں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تقریباً اس کی ہم عمر۔ جیکی کسی فرم میں کام کرتی تھی۔ اچھی فرینڈلی سی تھی۔ امتحان نزدیک آرہے تھے۔ موسم بھی بدل رہا تھا۔ اور سرِ شام ہی اندھیرا ہو جاتا تھا۔

کبھی کبھی دونوں بچیاں زارا کے گھر پر بیٹھ کر مطالعہ کرتیں اور کبھی وہ اسکول سے سیدھی جولی کے گھر چل جاتی جہاں سے واپس لانے کے لیے سارہ کو تھوڑی دقت ہوتی۔

''میں لیتا آؤں گا زارا کو۔'' مسٹر اینڈرسن اُس کی پریشانی بھانپ گئے تھے۔''میں وہیں پام اسٹریٹ جارہا ہوں۔بس زارا کو بتا دینا کہ میں صرف ہارن دوں گا۔مجھے انتظار نہ کرائے۔'' انہوں نے کہا۔

سارہ نے سکھ کا سانس لیا۔دراصل جولی کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اور سارہ دکان چھوڑ کر جا نہیں سکتی تھی۔اب ایسا کئی مرتبہ ہوا۔

جان اینڈرسن زارا کا بہت خیال رکھتے۔بس وہ چاہتے تھے کہ سارہ دکان پر پریشان نہ ہو۔

ایک دن وہ شام میں تھکی ہاری آئی تو زارا کے چہرے پر کچھ پُراسراری مسکراہٹ تھی۔

''میرے پاس ایک سرپرائز ہے' مما۔'' اس نے کہا۔

''کیسا سرپرائز بھئی......؟''

''یہ دیکھیں۔'' زارا نے بستر کے پاس قالین پر ایک چھوٹے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہے یہ؟''

''میرا اپنا بلی کا بچہ۔'' زارا نے جوش میں آکر اس ڈھیر کو ہٹایا تو بے حد خوبصورت، براؤن سفید روئی کے گالے کی طرح بلی کا بچہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

سارہ حیران رہ گئی۔

''کہاں سے لیا''؟ اُس نے ہولے سے بچے کو چھُوا۔بالکل ریشم کے گولے کی طرح۔بلیاں اس کو بھی بہت پسند تھیں۔

''مجھے مسز اینڈرسن نے دیا ہے۔ان کے کسی دوست کی بلی نے تین بچے دیئے تھے۔وہ انہوں نے بانٹ دیئے۔لیکن یہ سب سے کیوٹ مجھے مل گیا......'' خوشی خوشی بولی'' اوہ ماں، میں کس قدر خوش ہوں۔میرا اپنا pet ہے۔میں اسے sam کہوں گی۔اچھا نام ہے نا؟''

وہ اس قدر خوش تھی کہ سارہ کا دل جان کے لیے تشکر سے بھر گیا۔

''کیوں بھئی کیسا لگا سام تمہیں؟'' رات کھانے پر وہ سارہ سے پوچھ رہے تھے۔

''بہت خوبصورت! آپ کو پتا ہے کہ یہ زارا کا خواب تھا کہ اس کا اپنا کوئی پالتو جانور ہو۔بہت بہت شکریہ جان۔''

''بھئی، مجھے اس نے کافی مرتبہ بتایا تھا۔اس لیے میں نے اپنے دوست سے ایک ماہ قبل ہی مانگ لیا تھا۔اصلی نسل کا ہے یہ بچہ۔وہ تو شاید بیچنا چاہتا تھا۔''

''بس اب اس کا خیال رکھنا ہے۔اسے ٹرین کرنا ہے اور اندر گندگی بالکل نہیں پھیلانے دینا۔'' سارہ نے بہت سختی سے میری کے سامنے زارا سے کہا۔ان کو اپنا گھر صاف ستھرا رکھنے کا خبط تھا۔

☆☆☆

سارہ کی دکان چل پڑی تھی۔کئی مرتبہ تھوڑی دیر اور بیٹھنا پڑ جاتا۔اس صورت میں زارا گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی اس کا خیال رکھتے تھے۔لیکن زارا اب بڑی ہورہی تھی۔اس کے جسم میں ہونے والی تبدیلیاں کافی نمایاں تھیں۔

اب وہ ماں سے دکان پر فون کرکے کہہ دیتی کہ وہ بور ہورہی ہے۔پڑھائی ختم کرلی ہے۔سام بھی سو رہا ہے۔اب میں آپ کو مِس کررہی ہوں۔

''بیٹے آپ دکان پر کسی طرح آجائیں تو ہم کھانا آج باہر کھالیں۔'' سارہ نے کہا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔میں مسٹر اینڈرسن سے پوچھتی ہوں۔اگر وہ مجھے ڈراپ کردیں۔'' بڑے جوش میں اس نے کہا۔

یہ پہلی مرتبہ اس نے کہا تھا جان مان گئے۔زیادہ فاصلہ بھی تو نہ تھا۔

''بھئی زارا نے خواہش کی ہے تو میں کیسے رد کرسکتا ہوں۔'' انہوں نے ٹیلی فون پر سارہ سے کہا۔

زارا دکان پر پہنچ کر بہت خوش ہوئی۔اس کے بعد کئی مرتبہ انہوں نے خود ہی آفر کی کہ وہ اُدھر جارہے ہیں۔ڈراپ کردیں گے۔

کچھ دنوں سے سارہ نوٹ کررہی تھی کہ زارا خاموش خاموش سی رہنے لگی ہے۔مسز اینڈرسن سے بھی زیادہ ہنسی مذاق نہیں کررہی۔اکھڑی اکھڑی رہنے لگی ہے۔

سارہ نے پوچھا تو کوئی جواب نہ دیا۔بلکہ ایک مرتبہ اس نے جان کے ساتھ آنے کا ذکر کیا تو فوراً بولی۔

''نہیں ماما، میں ٹھیک ہوں۔میں فون کرکے کیب بلا لیتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں ذرا سختی تھی۔وہ حیران رہ گئی۔

جولی جب بھی ان کے گھر آتی تو کافی دیر بیٹھتی۔وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔خوبصورت آنکھیں۔گولڈن لمبے بال۔دراز قد اور متناسب جسم۔زارا کے مقابلے میں کافی بڑی بڑی۔حالانکہ عمریں دونوں کی تقریباً ایک جیسی تھیں۔

جان اینڈرسن ان دونوں بچیوں کا بہت خیال رکھتے۔کئی بار اوپر جاکر کچھ کھانے پینے کا پوچھتے۔کبھی آئس کریم تو کبھی پاپ کارن۔چپس۔کوک۔

''پلیز آپ تکلف نہ کریں۔'' زارا ذرا بے زاری سے کہتی۔کیوں کہ وہ اکثر دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آجاتے۔جب کہ دونوں بچیاں بستر پر ٹانگیں پسار کر گپ شپ مار رہی ہوتیں اور تھوڑا گھبرا جاتیں۔

کئی مرتبہ زارا کا جی چاہا۔ماں سے بات کرے۔لیکن تھوڑا گھبراتی تھی کہ وہ اُسے ڈانٹیں گی۔جان بہت اچھے انسان تھے۔اس کے دادا کے برابر، بس وہ فرینڈلی تھے اور تو کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

سارہ نے دکان پر ایک سیلز گرل رکھ لی تھی۔جو دکان خود ہی بند کردیتی تھی۔اس سے بہت سہارا مل گیا۔سارہ نے نوٹ کیا تھا کہ میری ذرا خاموش خاموش سی رہنے لگی ہیں۔کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھارہی تھیں۔بلکہ کئی مرتبہ خلا میں گھور رہی ہوتیں۔

کچھ دنوں سے ان کے اپنے پورشن میں بھی کچھ عجیب سے واقعات ہونے لگے۔ایک شام وہ سنک کے پاس پڑے ہوئے گلاس میں نلکے سے پانی بھرنے لگیں تو گلاس چٹاخ کی آواز سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔حالانکہ بظاہر بالکل ٹھیک تھا۔

ایک رات نیند نہیں آرہی تھی۔کچن میں آئیں کہ اپنے لیے چائے بنالیں۔لائٹ آن نہیں کی۔

دیکھا کہ ایک پیالی ان کی طرف جیسے خود بخود ہی چلی آرہی ہے۔

گھبراہٹ میں ان کی چیخ نکل گئی۔چائے کا ارادہ ترک کردیا۔جلدی سے جاکر بستر میں گھس گئیں۔دروازہ اندر سے لاک کردیا۔

جان اینڈرسن کچھ کام کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے اسی اسکول میں درخواست دے دی جہاں زارا اور جولی پڑھتی تھیں۔وہ وہاں کسٹوڈین کی نوکری پر لگ گئے۔بچوں کے آنے جانے کا خیال رکھنا۔ان کو حفاظت سے ماں باپ کے حوالے کرنا۔وغیرہ۔

یونیفارم میں جب وہ پہلی مرتبہ سارہ کے سامنے آئے تو اُسے بہت اچھے لگے۔

''اس عمر میں بھی وہ اپنے آپ کو معروف رکھنا چاہتے ہیں۔اچھی بات ہے۔'' اس نے میری سے کہا۔

''ہاں! اچھی بات ہے۔'' انہوں نے جیسے طنزاً کہا۔''ویسے میں اس ملازمت کے حق میں نہیں تھی۔''

''ارے وہ کیوں؟ وہ تو بچوں پر جان دیتے ہیں۔آپ نے دیکھا، زارا اور جولی کو بالکل اپنی بچیوں کی طرح سے سمجھتے ہیں۔'' سارہ نے جوش سے کہا۔

''ہاں۔'' میری نے جیسے بات بدلنے کی کوشش کی۔لہجے میں بشاشت کا فقدان تھا۔

☆☆☆

زارا اور جولی کی کلاس پکنک پر جارہی تھی۔بچیاں بے حد خوش تھیں۔جان اینڈرسن بچوں کے ساتھ بس میں باقی دو ٹیچروں کے ہمراہ جارہے تھے۔بس کو صبح سات بجے اسکول سے نکلنا تھا۔

شام پانچ بجے واپسی تھی۔پوری بس بھر کر جارہی تھی۔

صبح صبح اتنے سارے بچے اور والدین جوش وخروش سے باتیں کرتے ہوئے۔بہت اچھا لگ رہا تھا۔ایک ہنگامہ سا تھا۔بچوں کی گنتی۔ان کا سامان۔ان کو بٹھانے کا انتظام۔سب جان اینڈرسن کا کام تھا۔

زارا اور جولی نے ہم رنگ سویٹر پہن رکھے تھے۔سروں پر اونی ٹوپیاں۔بہت پیاری لگ رہی تھیں دونوں۔سہیلیاں بھی ساتھ ساتھ تھیں دونوں کی۔

سارہ وہیں کھڑی جیکی اور اس کے شوہر لارسن سے باتیں کررہی تھی۔

''دونوں کی دوستی بے مثال بن گئی ہے۔'' سارہ نے جیکی سے کہا۔

''آپ صحیح کہتی ہیں۔جولی بھی زارا کو بہت پسند کرتی ہے۔دونوں کی طبیعتوں میں ہم آہنگی ہے، ٹھہراؤ ہے۔ہم دونوں زارا کو بہت پسند کرتے ہیں۔آپ نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے'' مسٹر لارسن نے کہا۔

''تھینک یو۔'' وہ خوش ہوکر بولی۔

پورے سات بجے بس اسکول کے گیٹ سے نکلی تو تمام لوگ گھروں کو جانے کے لیے تیار ہوگئے۔سارہ گھر

آئی۔ابھی دن چڑھا بھی نہ تھا۔وہ اپنے کمرے میں گئی اور بستر میں گھس گئی۔دس بجے تک سوتی رہی۔

☆☆☆

جلدی جلدی نہا دھو کر دکان پر پہنچی۔اس کی ہیلپر لنڈا کے پاس چابی تھی۔وہ دکان کھول چکی تھی اور اب ایک طرف کرسی پر بیٹھی تازہ اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔گاہک کوئی بھی نہ آیا تھا۔

تازہ کافی بنی ہوئی تھی۔سارہ نے بھی لے لی اور زارا وغیرہ کا سوچنے لگی۔

کتنا لطف آرہا ہوگا بچیوں کو۔شکر ہے کہ زارا اپنی زندگی میں پھر واپس آگئی ہے ورنہ رضا کے جانے کے بعد تو وہ جیسے بالکل بجھ سی گئی تھی۔

ڈھائی بجے ہوں گے۔تین چار گاہک دکان کے اندر موجود تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

لنڈا نے اٹھایا۔پھر اُسے اشارہ کیا۔

"میرے لیے؟" اس نے گاہک کو ایکسکیوز کہہ کر فون اٹھالیا۔

"مسز حسن؟" کوئی مردانہ آواز تھی۔

"جی بول رہی ہوں۔" آواز پہچانی ہوئی نہ تھی۔

"میں کریسنٹ جونز ہائی اسکول سے جارج بات کررہا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔" سارہ نے ذرا فکر سے پوچھا۔

"آپ کی بیٹی زارا حسن ہمارے اسکول میں پڑھتی ہے اور آج اپنی کلاس کے ساتھ فیلڈ ٹرپ پر گئی ہوئی تھی۔"

"جی جی...... زارا میری بیٹی ہی ہے۔کیا ہوا اُسے؟وہ ٹھیک تو ہے نا؟" اب وہ بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔

"مسز حسن، وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے کلاس فیلوز میں سے ایک بچی کے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا ہے۔اس لیے وہ لوگ جلدی لوٹ رہے ہیں۔آپ بھی چار بجے تک اسکول آجائیں گے زارا کو لینے۔"

"کون بچی......؟کیا ہوا۔وہ ٹھیک تو ہے نا؟" بے حد پریشانی سے وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔گاہک بھی متوجہ ہوگئے۔

"میڈیم!آئی ایم سوری، ہم ابھی نام نہیں بتا سکتے۔نہ ہی تفصیلات۔بس آپ اسکول چار بجے تک آجایئے۔"

سارہ پریشان ہوگئی۔یہ اچھی بات تھی کہ زارا ٹھیک تھی لیکن تمام بچے ہی اہم تھے اپنے ماں باپ کے لیے۔"اللہ کرے جو بھی ہو، ٹھیک ٹھاک ہو۔" اس نے دل سے دعا کی۔

اسکول کے پارکنگ لاٹ پہنچنے پر ایسا لگا جیسے تمام شہر کی گاڑیاں پارک ہوں۔بہت سے لوگ اتر کر تیز تیز جارہے تھے۔

اندر ہال میں بھی ماں باپ جمع تھے۔پریشان۔کچھ کو وہ پہچان سکتی تھی۔باقی اجنبی تھے۔اس نے مسٹر اینڈ مسز لارنس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ نظر نہ آئے۔

پرنسپل صاحب بھی آچکے تھے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!پلیز آپ لوگ بیٹھ جایئے اور ذرا خاموشی سے میری بات سن لیجیے۔"

لوگ خاموش ہوگئے۔

"جیسے کہ آپ کو اب تک پتا چل گیا ہوگا کہ فیلڈ ٹرپ پر جانے والے بچوں میں سے ایک بچی کو حادثہ پیش آیا ہے۔"

"کون ہے وہ بچی؟" کوئی دس لوگوں نے پوچھا۔

"ہم اس کے والدین کو ٹریک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان سے رابطہ ہونے کے بعد ہی ہم نام کا اعلان کریں گے۔"

"کیا بچی زندہ ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں۔بدقسمتی سے وہ مرچکی ہے۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔

"بچی حادثہ کا شکار ہوکر مرچکی ہے۔پتا نہیں کون تھی وہ بدنصیب؟" سارہ کا دل جیسے اتھل پتھل ہورہا تھا۔

اب سب لوگ اونچی اونچی آواز میں معاملے پر ڈسکس کررہے تھے۔پریشان تھے۔بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔لیکن پرنسپل صاحب اندر جاچکے تھے۔

"بس آگئی۔" کسی نے بلند آواز میں کہا تو جیسے ہال میں بھونچال سا آگیا۔سب لوگ باہر کی طرف بھاگے۔دروازہ کھلا۔بچے نکلنے شروع ہوئے۔مرجھائے ہوئے۔ستے ہوئے چہرے سے پاگلوں کی طرح سارہ نے زارا کو تلاش کیا۔

شکر ہے کہ وہ زندہ تھی لیکن......اس کی حالت جیسے مُردوں سے بدتر تھی۔

"زارا، میری جان۔کیا ہوا۔کون بچی تھی وہ جسے حادثہ پیش آیا؟" زارا کو اپنے آپ سے لپٹائے وہ پاگلوں کی طرح پوچھ رہی تھی۔

"میری دوست، مام!میری بیسٹ دوست جولی مر گئی۔"

زارا کی آواز اتنی مدھم تھی کہ سارہ کو سننے میں دقت ہورہی تھی۔

"کیا......؟" اس کی جیسے چیخ نکل گئی۔

"کیسے زارا، کیسے ہوا یہ سب کچھ؟" وہ اُسے بری طرح ہلا رہی تھی۔

اب اور لوگ بھی اپنے اپنے بچوں کو لے کر اندر ہال میں جارہے تھے۔

دو لیڈی ٹیچروں کے پیچھے پیچھے جان اینڈرسن تھے۔ان کا بہت برا حشر تھا۔چہرے پر اسکریچ تھے۔چہرہ ستا ہوا۔سر جھکا ہوا۔

یہ قدرتی بات تھی کہ وہ ان بچوں کا خیال رکھنے کے لیے ہمراہ گئے تھے اور اب یہ حادثہ۔پتا نہیں کہ ان پر کتنا الزام آئے گا۔

سارہ آگے بڑھ کر ان سے پوچھنا چاہتی تھی لیکن کافی لوگ اسے دھکیل کر اندر لے گئے۔

ٹی وی رپورٹر۔اخبار کے نمائندے۔پورا اسٹاف۔پرنسپل صاحب۔اب تو ہال میں واقعی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔

وہ زارا کو لے کر ایک طرف بیٹھ گئی۔زارا اس سے بری طرح چپکی ہوئی۔کانپ رہی تھی۔بالکل چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی۔

پرنسپل صاحب نے سب کو خاموش ہونے کے لیے کہا۔

"ہم انتہائی افسوس کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ آج فیلڈ ٹرپ پر جانے والے بچوں میں سے ایک بچی وہیں پہاڑوں پر حادثے کا شکار ہوگئی۔

"جولی لارنس۔مسٹر اینڈ مسز جیف لارنس کی بیٹی۔مجھے افسوس ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔" انہوں نے سر جھکا کر بہت تاسف سے کہا۔

"مسٹر جان اینڈرسن بچوں کی حفاظت کے لیے گئے تھے، ان کو بلائیں۔" ایک صاحب نے بہت غصے سے کہا۔

سارہ نے دیکھا۔جان اینڈرسن مرے مرے قدموں سے ڈائس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ان کے چہرے پریشان تھے۔اجڑے ہوئے بال اور حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کافی پریشان ہیں۔

> طوسی اور کاشانی کے عہد میں اسلامی دنیا میں مستند علما کا ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا۔ان میں سے بہترین ابوالعباس ابن بنا المراکشی تھا۔جس نے ساتویں صدی ہجری میں ریاضی کی تمام شاخوں پر تقریباً ستر کتابیں تحریر کیں جن میں سب سے زیادہ مشہور "تلخیص عمل الحساب" تھی۔جو اس مضمون پر مسلمانوں کی بہترین کتاب شمار کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ مغرب میں ابن حمزہ المغربی نے بھی دسویں صدی ہجری میں ترکی زبان میں "تحفتہ الاعتقاد" نامی کتاب فلسفہ اعداد پر تحریر کی۔اس نے اکثر یتی عددی سلسلے سے لوگارتھم تک پہنچنے کے لیے ٹھوس بنیاد تیار کی۔ان کے ہمعصر ایران میں ملا باقر یزدی تھے۔
>
> اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

"بتایئے کیا ہوا تھا۔آپ تو وہیں تھے نا......؟" ایک رپورٹر نے پوچھا۔

"یہ شاید ایک بجے کا واقعہ ہے۔سب بچے پکنک اسپاٹ پر اتر کر پھیل گئے۔بال، ریکٹ جو جو بھی لائے تھے اس سے کھیلنے لگے۔کھانا سب نے کھا لیا تھا۔" وہ رکے۔اوپر دیکھا۔لوگ دم سادھے سن رہے تھے۔"جولی پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔یوں تو اور بچے بھی تھے۔لیکن......اُسے ایک خرگوش بھاگتا دکھائی دیا۔وہ اس کی طرف بھاگی۔میں نے دیکھا کہ وہاں راستے میں خاردار جھاڑیاں بھی ہیں لیکن میں نے پروانہ کی اور اسے زور زور سے آوازیں دیتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔چونکہ خرگوش دوسری طرف سے ڈھلان میں اتر کر غائب ہوچکا تھا۔وہ اس کو نیچے جاتا دیکھ رہی تھی۔میں نے بہت آوازیں دیں لیکن وہ تو جیسے اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں تھی۔اچانک اس کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ نیچے کھائی میں گرتی چلی گئی۔" جان اینڈرسن نے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا "جب میں نے نیچے جھانکا......تو وہ......وہ جاچکی تھی، بہت دور۔"

"جھوٹ کہہ رہے ہیں۔" زارا نے بڑبڑا کر کہا۔

"شش!" سارہ نے گھبرا کر کہا۔

دفورِ جذبات سے جان کا جسم کانپ رہا تھا۔ دو لوگوں نے ان کو سہارا دے کر اتارا۔ انہیں جان پر بہت ترس بھی آ رہا تھا کہ ان کی سپردگی میں ایک نوعمر بچی مر گئی۔ یہ بات قانونی مقدمہ کی حد تک جا سکتی تھی۔ پولیس کیس بھی بن سکتا تھا۔ بے چارے جان اینڈرسن۔

سارہ کو بھی جولی کی ناگہانی موت کا بے حد صدمہ تھا۔ اس سے زیادہ اُسے زارا کی فکر ہو رہی تھی جس کو قدرت نے سال کے اندر دو بڑے غم دے دیے۔ پہلے باپ کا غم اور اب اپنی سب سے اچھی، پیاری دوست جولی کا غم جسے قبول کرنے میں شاید بہت عرصہ لگ جائے۔

☆☆☆

جب وہ زارا کو اپنی گاڑی کی طرف لا رہی تھی تو مسلسل جولی کے ماں باپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ پتا چلا کہ ماں اسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ باپ اس کے پاس ہے۔

انہیں دوپہر دو بجے ہی فون کے ذریعے اطلاع دے دی گئی تھی۔ ہمدردی، ترس اور افسوس سے سارہ کا دل بھر گیا۔ اکلوتی اولاد، نوعمر، خوبصورت، ذہین جولی، ماں باپ کو کبھی نہ بھولنے والا غم دے کر جا چکی تھی۔

زارا کے جسم میں جیسے جان نہ رہی تھی۔ وہ بہت مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر کار کی طرف آ رہی تھی۔

''میں بہت تھک گئی ہوں مام اور نیند بھی بہت آ رہی ہے۔'' وہ تقریباً غنودگی میں کہہ رہی تھی۔

سارہ کو اپنی گاڑی ڈھونڈنے میں تھوڑا سا وقت لگا۔ کیونکہ اب جیسے سارے شہر کی گاڑیاں اس پارکنگ لاٹ میں آ چکی تھیں۔

زارا کو بمشکل سیٹ پر بٹھا کر سیٹ بیلٹ لگائی اور گاڑی اسٹارٹ کی تو وہاں سے نکلتے نکلتے وہ سو چکی تھی۔

گھر پہنچی۔ پھر ڈرائیو وے میں گاڑی پارک کی تو میری باہر ہی آ گئیں۔ ان کا چہرہ کسی مردہ کی طرح زرد تھا۔

''زارا کو نکالنے میں میری ذرا مدد کریں میری۔ وہ سو گئی ہے۔'' بہت آہستگی سے اس نے کہا۔

دونوں نے مل کر بچی کو نکالا اور تقریباً گود میں اٹھائے ہوئے اوپر لے گئیں۔

سارہ نے جلدی سے بیڈ کور اٹھایا اور اُسے لٹا دیا۔ وہ جیسے بے ہوش تھی۔ جوتے بھی بعد میں سارہ نے اتارے۔ اسے احتیاط سے کمبل اوڑھا کر وہ دروازہ بند کر کے نیچے آئی۔ میری نے اس کے لیے گرم کافی کا کپ تیار رکھا تھا۔

''آپ کو پتا چلا، آج کیا ہو گیا......؟'' سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔

انہوں نے اشارہ سے ہاں کہا۔ ''میں نے ٹی۔ وی پر دیکھا ہے۔'' ہلکی آواز میں وہ بولیں۔

''آپ کو پتا ہے کہ جو بچی مری ہے وہ کون سی تھی......؟''

''نہیں، یہ پتا چلا ہے کہ ایک بچی پہاڑی سے گر کر ختم ہو گئی۔''

''وہ بچی جولی لارسن تھی۔ وہی جولی جو میری زارا کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ یاد ہے وہ یہاں آیا کرتی تھی؟'' سارہ نے بتایا۔

''وہ جولی......'' میری کی آواز میں حیرت کے ساتھ دکھ تھا۔ ''اوہ...... بڑی پیاری بچی تھی وہ...... تو وہ مر گئی......؟'' انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

''ہاں......وہ مر گئی۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ زارا کا کیا حشر ہے۔ پہلے بے چاری کا باپ اور اب یہ دوست جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔'' سارہ کی آنکھوں میں دکھ سے آنسو آ گئے۔

''ان بچوں کی نگہداشت تو جان کے سپرد تھی۔'' میری نے جیسے بڑبڑا کر کہا۔

''ہاں...... وہاں اسکول میں تقریباً سب لوگ ہی ان سے بے شمار سوال پوچھ رہے تھے۔''

''انہوں نے کیا کہا؟'' میری کی آواز مدھم تھی۔

''انہوں نے بتایا کہ وہ کسی خرگوش کے پیچھے بھاگی تھی۔ انہوں نے بچانے کی بہت کوشش کی مگر جولی کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اُسے بچا نہ سکے۔''

''اوہ۔'' میری نے ایسے کہا جیسے جان میں جان آ گئی ہو۔ ''تو وہ بے قصور ہیں۔'' انہوں نے بڑبڑا کر کہا۔

''ہاں، ہاں۔ وہ بے قصور ہیں میری۔ ان کا تو اپنا بھی صدمے سے برا حال تھا۔'' بہت ہمدردی سے سارہ نے میری کا ہاتھ تھام کر دبا دیا۔ وہ ریلیکس ہو گئیں۔

☆☆☆

وہ رات سارہ کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھی۔

جب میری کو گڈ نائٹ کہہ کر وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو زارا بڑبڑا رہی تھی۔

''پلیز...... چھوڑ دیں...... میری دوست کو چھوڑ دیں......''

سارہ نے ذرا غور سے سنا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ کس کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ سارہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ اُسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ گہری نیند میں تھی۔

اس کے بعد بھی تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ ایسی ہی بات دہراتی رہی۔ ''اس کو ہرٹ نہ کریں...... ورنہ میں ٹیچر کو بتا دوں گی......''

یہ آخری بات زارا نے کی اور جیسے بے ہوش ہو گئی۔ سارہ کی تو جان ہی نکل گئی۔ ماتھا چیک کیا تو وہ بخار سے پھنک رہی تھی۔

''یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ کیا بول رہی ہے؟ کیا دیکھا ہے اس نے جو اب نیند کی حالت میں بھی اُسے تنگ کر رہا ہے۔

وقت دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ڈاکٹر سے ابھی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ خود ہی باتھ روم سے تولیا گیلا کر کے ماتھے پر رکھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ غنودگی اور نقاہت سے بچی کا برا حشر تھا۔

''زارا...... کیا ہو گیا میری جان؟'' اس نے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''مام، میں تھک گئی ہوں۔ مجھے سونے دیں، پلیز۔'' وہ بہت ہی نقاہت سے بول رہی تھی۔

''بخار بہت تیز ہے۔ میں آپ کو کچھ کھانے کے لیے لا کر دیتی ہوں۔ بعد میں دوا دوں گی۔'' وہ اٹھنے لگی۔

یکایک زارا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

''مام، آپ کہیں نہ جائیے۔ پلیز، مجھے اکیلا نہ چھوڑنا۔''

اور پھر وہ گہری نیند میں چلی گئی۔ ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اتنا گرم جیسے آگ نکل رہی ہو۔

سات بجے ڈاکٹر ہرش سے بات کی۔ انہوں نے فوراً اسے لانے کے لیے کہا۔

بہت مشکلوں سے اُسے اٹھایا۔ کپڑے تو رات سے تبدیل ہی نہ کیے تھے۔ مشکلوں سے جوتا پہنایا اور خاموشی سے نیچے آ گئی۔ میری اور جان کا بیڈ روم بند تھا۔ وہ ہولے سے مین دروازہ کھول کر آئی۔ باہر سے لاک کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ زارا کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا کہ آرام کر لے۔

ڈاکٹر ہرش بچوں کے ڈاکٹر تھے۔ کلینک زیادہ دور نہ تھا۔ حالانکہ نو سے پہلے نہ کھولتے تھے لیکن اب ایمرجنسی کی وجہ سے وہ بھی جلدی آ رہے تھے۔ تمام راستہ اس کا ذہن زارا کی بڑبڑاہٹ میں الجھا ہوا تھا۔ وہ کس سے درخواست کر رہی تھی کہ اس کی دوست کو چھوڑ دیں، بعد میں یہ بھی کہا کہ وہ ٹیچر کو بتا دے گی۔ تو کیا اس حادثے کے پیچھے کوئی راز تھا۔ زارا نے کچھ دیکھا تھا جو اس کے تحت الشعور میں اُسے تنگ کر رہا تھا؟''

''یا اللہ! میں کیا کروں۔ کس سے بات کروں؟'' اس نے بہت دکھ اور فکر سے سوچا۔ جب وہ کلینک پہنچی تو ڈاکٹر ہرش اپنی نرس کے ہمراہ خود ہی آ گئے۔

''کیا ہو گیا، ہماری پیاری دوست زارا کو......؟'' انہوں نے بہت پیار سے اُسے وہیں بیڈ پر لٹاتے ہوئے کہا۔

''میں بہت بیمار ہوں ڈاکٹر۔'' زارا نے نقاہت سے کہا۔

''ٹھیک ہے، اب آپ اپنے ڈاکٹر کے پاس آ گئی ہیں۔ اب ہم اس بیماری کو یوں چٹکیوں میں ختم کر دیں گے۔'' انہوں نے مزاحیہ انداز میں چٹکی بجا کر کہا اور تھرما میٹر احتیاط سے اس کے منہ کے بجائے بغل میں لگایا کیونکہ اس کو غنودگی ابھی بھی بہت تھی۔

103 بخار۔ نرس سے فوراً بخار اتارنے والی دوائی کا انتظام کرنے کو کہا۔ پہلے اسے اچھا سا جوس پلایا پھر دوا دی اور آرام کرنے دیا۔ خود سارہ کو لے کر اپنے آفس میں آ گئے۔ کافی کا گرم کپ اس کے سامنے رکھا۔

''کیا ہوا ہے زارا کو؟'' وہ بے حد سنجیدگی سے سارہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

سارہ نے تمام واقعہ بتا دیا۔

''تو لارسن کی بیٹی جولی زارا کی دوست تھی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی، بیسٹ فرینڈ۔ ہم جب سے اس شہر میں آئے ہیں وہی اس کے ساتھ رہی۔ کئی مرتبہ وہ ہمارے گھر پر بھی آئی۔ بہت ذہین، بے حد پیاری اور سلجھی ہوئی بچی تھی۔'' سارہ نے بتایا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا ڈاکٹر کہ تقریباً پوری رات زارا کسی کو اپنی دوست کے قریب آنے سے منع کر رہی تھی۔'' اس نے کہا۔

''کوئی نام نہیں لیا؟'' انہوں نے غور سے تمام بات سننے کے بعد کہا۔

''جی نہیں۔ بس یہی کہ میری دوست کو ہرٹ نہ کریں۔''

''اس پکنک پر بچوں کا سربراہ کون تھا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''مسٹر جان اینڈرسن جو اتفاق سے ہمارے مالک مکان بھی ہیں۔ بے حد شریف، بچوں کو پیار کرنے والے۔'' سارہ نے بہت جوش سے کہا۔

''ہوں۔'' ڈاکٹر نے سوچ کر کہا۔

''ان کے کہنے کے مطابق تو جولی کسی خرگوش کے پیچھے بھاگی تھی اور گرگئی۔ ان کے چہرے پر خراشیں بھی تھیں کہ انہوں نے اُسے بچانے کی کوشش کی لیکن......؟'' سارہ ایک دم رکی۔

''لیکن کیا۔'' ڈاکٹر ہرش نے کہا۔

''مجھے یاد آیا۔ اسکول میں جب لوگ ان سے سوال پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا تو زارا نے جیسے بڑے غصے سے کہا تھا۔ یہ جھوٹے ہیں۔ میں نے اُسے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہونے کو کہا تھا۔ کیونکہ مجھے لگا زارا کو دوست کا صدمہ ہے جسے شاید قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں۔''

''یہ بات بہت سیریس ہے سارہ۔ ابھی تو میں زارا کو دوائی اور انجکشن دے رہا ہوں۔ اس کی کیفیت ذرا بہتر ہو تو دوبارہ لانا۔ میں اس سے کچھ سوال پوچھنا چاہوں گا۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولے۔

وہ زارا کو گھر لے کر آئی۔ مین دروازہ لاک نہ تھا۔ مسٹر اینڈرسن اندر کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ایک دم اچھل سے گئے۔

''تم دونوں کہاں گئے تھے۔ میرا مطلب اتنی صبح صبح......؟'' ان کے لہجے میں ایک عجیب خوف اور غصہ تھا۔

''وہ میں زارا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی۔'' اس نے زارا کی سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''لاؤ، میں مدد کردوں۔'' وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ جیسے زارا کو کسی نے بجلی کا شاک دے دیا ہو۔

''دور رہیں مجھ سے۔ میرے نزدیک نہ آئیں۔'' وہ جیسے چیخی۔

''کیا ہوگیا ہے زارا۔ جان آپ کو اتارنے میں مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' سارہ نے شرمندگی سے کہا۔

جان کا بھی جیسے رنگ بدل گیا۔ شرمندگی سے بولے۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ میں ہیلپ نہیں کروں گا۔ آپ اب بڑی ہوگئی ہو لٹل ڈول۔''

''مجھے لٹل ڈول مت کہیں۔'' زارا کے لہجے میں اس قدر نفرت تھی کہ سارہ حیرت زدہ رہ گئی۔ بڑی مشکلوں سے اسے اوپر لائی۔ بستر پر لٹایا۔

''دروازہ جلدی سے بند کریں مام۔''

''کیا بات ہے بیٹا، آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ آپ کو پتا بھی ہے آپ جان سے کتنی بدتمیزی سے بات کررہی تھیں۔'' سارہ نے ذرا سرزنش سے کہا۔ ''وہ اتنے اچھے ہیں۔ ہمیں اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ آپ کی مدد کرنا چاہتے تھے۔'' سارہ نے اس کے بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے اُسے سمجھایا۔

''وہ اچھے نہیں ہیں...... مام وہ اچھے نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتیں......'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔

☆☆☆

پوری رات زارا بڑبڑاتی رہی۔ وہ کسی کو اپنی دوست سے دور رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

سارہ کا دماغ ماؤف ہورہا تھا۔ وہ جان اور میری سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن زارا کا جان سے نفرت کا اظہار بہت سے سوالوں کو جنم دے رہا تھا۔

اب اُسے بھی خوف آنے لگا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی ضرور جو حادثے والے دن زارا نے دیکھی۔ یہ بہت سیریس بات تھی۔

کسی شخص پر الزام لگانا اور پھر اُسے ثابت نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ پھر بارہ سال کی بچی؟ کیا پتا سہیلی کی موت کے صدمے نے ذہن میں کیا کیا ڈال دیا تھا۔ وہ بے حد ڈسٹرب تھی۔

سارہ نے دکان جانا ختم کیا ہوا تھا۔ زارا کا بخار تو ٹوٹ گیا تھا لیکن نقاہت باقی تھی۔ ڈاکٹر ہرش نے اُسے دوبارہ دکھانے کو کہا تھا۔ اُس نے انہیں فون کیا۔

انہوں نے اُسی دن کی اپائنٹمنٹ دے دی۔ وہ شاور لینے چلی گئی۔ نہا لینے سے طبیعت ذرا بشاش ہوگئی۔ واپس آئی تو دیکھا زارا تھر تھر کانپ رہی ہے۔

''کیا ہوگیا......؟'' وہ گھبرا کر اس کی طرف آئی۔

''مام...... وہ میری بلی کو ماردیں گے۔ وہ میری سام کو ماردیں گے۔'' وہ پردے کی طرف اشارہ کرکے پاگلوں کی طرح کہہ رہی تھی۔

''کون؟'' سارہ نے دیکھا۔

''وہ کہہ رہے تھے کسی کو کچھ نہیں بتانا ورنہ...... اور پھر انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ تمہاری سام مر جائے گی۔ مام وہ میری سام کو گلا دبا کر ماردیں گے۔'' تھر تھر کانپتی زارا ماں کے گلے سے لگ گئی۔

☆☆☆

جب بات طب اسلامی کی چھڑے تو جو نام بے ساختگی سے ذہن میں بار بار آتا ہے وہ ''رئیس الاطباء'' بوعلی ابن سینا کا ہے۔ وہ بچپن میں بھی حیرت انگیز کمالات دکھاتے تھے۔ انہوں نے بہت کم عمری میں قرآن حفظ کرلیا' کئی فنون خود بخود دیکھ لیے۔ ایک بااصول اور متبحر عالم تھے۔ انہوں نے ایسی کتابیں تصنیف کیں جو اسلامی ممالک اور یورپ دونوں جگہ صدیوں تک طب کے بارے میں مستند حوالوں کا کام دیتی رہیں۔ ان کی کتاب ''القانون فی الطب'' طب کے نظریہ و عمل میں عدیم المثال اثر کی حامل رہی ہے۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور قرونِ وسطیٰ کے آخری دور تک وہ علمی تصانیف میں ممتاز ترین حیثیت کی مالک تھی۔ اس کی اساس عہد ابن سینا میں دست یاب اعلیٰ علوم پر رکھی گئی تھی اور خاص طور پر اس میں ابن سینا کے اپنے مشاہدات اور اکتشافات بھی شامل تھے جو اس نے امراض متعدیہ (مثلاً جن کا اطلاق تپ دق پر ہوتا ہے) گردن توڑ بخار (جس کا سب سے پہلے ذکر انہوں نے کیا) اور نفسیاتی عوارض کے مطالعے کے بعد مرتب کیے۔ طب کی بائبل ''القانون'' کا مصنف اور تھرمامیٹر کا موجد یورپ کا ایوی سینا ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا 980ء میں بخارا میں پیدا ہوا۔ 1037ء میں دردِ قولنج سے فوت ہوا۔

اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

ڈاکٹر ہرش کا آپریشن ڈے تھا۔ وہ صبح سات سے دس تک وہیں رہے تھے اور اب بالکل فارغ تھے۔

وہ سارہ کو اپنے کمرے میں لے آئے۔ دروازہ بند کرلیا۔ نرس سے سختی سے کہا کہ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

''اب بتاؤ کیا ہوا۔'' انہوں نے سارہ کی طرف پوری توجہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سارہ نے کہا وہ جان اینڈرسن سے بے حد نفرت کرنے لگی ہے۔ صبح اس نے کہا کہ وہ میری بلی کو ماردیں گے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ اپنے ذہن سے ایسا سوچ رہی ہے یا وہ واقعی کسی وقت ہمارے کمرے میں آئے اور اُسے دھمکا کر گئے۔

''بلی زارا کو کس نے دی تھی؟''

''جان نے۔ اور وہ اُسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ کسی بچے کو بھی جانور مارنے کی دھمکی دی جائے تو بے چارہ یوں بھی دہشت زدہ ہوجائے گا۔'' سارہ نے اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ہرش گہری سوچ میں چلے گئے۔ ''تم دونوں گھر جاؤ اور اس بات کا کسی سے بھی ذکر نہ کرنا۔ اپنے فون سے بھی نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس ایکسٹینشن ہے۔''

''اگر اینڈرسن مجرم ہے تو وہ زارا کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرے گا۔''

''میں یوں کرتا ہوں کہ کسی صورت تم دونوں کو 2-3 روز کے لیے کہیں اور ٹھہرانے کا انتظام کروں۔ میں سہ پہر اپنی نرس سے فون کرا کے کہوں گا کہ زارا کی ٹیسٹ رپورٹ بہت خراب آئی ہے۔ اس کو فوراً کلینک لائیں۔ تم اس عرصہ میں اس کے کچھ کپڑے اپنے کپڑوں کے ساتھ ملا کر بیگ میں ڈال لینا اور اس طرح نکلنا جیسے ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ تم سمجھ گئی نا؟'' ڈاکٹر ہرش نے کہا۔

مارے پریشانی کے سارہ کا برا حشر تھا۔

''گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کیس کی تہ تک پہنچنا اب ضروری ہوگیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی سب سے اہم کڑی زارا حسن ہے۔'' انہوں نے نرمی اور محبت سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا۔

''بہت بہت شکریہ ڈاکٹر۔'' سارہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

☆☆☆

تمام راستہ سوچوں میں گزر گیا۔

زارا مین دروازے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی میری نظر آگئیں۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے ذرا فکر سے پوچھا۔

''بس! کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ ڈاکٹر ہرش نے کافی ٹیسٹ کروائے ہیں رپورٹ آئے گی تو پتا چلے گا۔ اس کا بخار ہی نہیں اتر رہا۔'' سارہ نے کہا۔

''اللہ کرے ٹھیک ہوجائے۔ سنو، کھانا تیار ہے، دے دوں؟ میں نے زارا کے لیے چکن کا سوپ بھی بنایا ہے۔''

''بہت شکریہ۔ میں ذرا اس کو سیٹل کرکے آتی ہوں۔''

اس عرصہ میں جان دروازے سے نکلتے نظر آئے تو زارا کی آنکھوں میں خوف سا آ گیا۔ ماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''جلدی چلیں مام، مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔''

☆☆☆

نیچے آکر اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ جان اپنے کمرے میں تھے۔ میری باتیں کرتی رہیں۔

وہ اوپر اپنے کمرے میں گئی۔ زارا اور اپنا تھوڑا تھوڑا سامان بیگ میں ڈال لیا اور دھڑکتے دل سے فون کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے زارا کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

وہ بستر پر خاموش لیٹی تھی کہ فون بجا۔

''جی...... بول رہی ہوں...... کیا؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میری ڈاکٹر ہرش سے بات کروایئے۔'' وہ ذرا اونچا اونچا بول رہی تھی۔ اُسے احساس ہو چکا تھا کہ نیچے کا فون کسی نے خاموشی سے اٹھالیا ہے۔

ڈاکٹر ہرش نے حسب وعدہ بہت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بتایا کہ زارا کی بلڈ رپورٹ ٹھیک نہیں آئی۔ کچھ پیچیدگیاں ہیں۔ اُس کا گھر پر بیٹھ کر علاج نہیں ہو سکتا۔ مسز حسن کیا آپ اس کو لے کر فوراً میرے کلینک آسکتی ہیں؟''

''کیا ہو گیا ہے...... زارا کو ڈاکٹر...... میں آپ کو صبح تو اُسے دکھانے گئی تھی۔''

''اس وقت میرے پاس کچھ اہم ٹیسٹوں کی رپورٹ نہیں آئی تھی۔ آپ یہ سب باتیں میرے آفس میں بھی آ کر کر سکتی ہیں۔ اچھا گڈ بائے۔'' انہوں نے جیسے تنگ ہو کر کہا۔

''اچھا ہم آرہے ہیں۔''

''سنیں۔ اُس کے کچھ کپڑے ضرور لے آئیں۔ ہو سکتا ہے ایڈمٹ کرنا پڑے۔'' فون بند ہو گیا۔

اس نے جلدی جلدی زارا کو اٹھایا۔

''اب کیوں جانا ہے؟ وہ مجھے انجکشن دے دیں گے۔ مجھے پتا ہے۔'' اس نے بڑبڑا کر کہا۔

اُس کے سامنے جان بوجھ کر تھوڑے سے کپڑے، برش وغیرہ ٹھونسے۔ پرس پکڑا۔ نیچے آئی۔ میری اور جان وہیں کھڑے تھے۔

''کیا ہوا، کہاں جارہی ہیں؟'' میری نے پوچھا۔

''ڈاکٹر ہرش نے فون کر کے بلوایا ہے۔ کچھ رپورٹس کی بات کرنی ہے۔ بس اب دعا کرنا کہ زارا ٹھیک ہو جائے۔'' یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میری نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ جان نے بھی اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ کرے۔'' سارہ نے کہا اور زارا کا ہاتھ پکڑ کر وہ جلدی جلدی کار کی طرف لپکی۔ دروازہ کھول کر زارا کو ساتھ والی سیٹ میں بٹھا کر سیٹ بیلٹ باندھی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

☆☆☆

ڈاکٹر ہرش جیسے ان کا انتظار ہی کر رہے تھے۔

''بیگ نرس کو دے دو اور میرے ساتھ آ جاؤ۔''

اندر ان کا کوئی پرائیوٹ کمرا تھا۔ وہاں دو آدمی بیٹھے تھے۔

جب یہ دونوں اندر داخل ہوئیں تو وہ دونوں احتراماً کھڑے ہو گئے۔

''سارجنٹ شیفرز، ڈاکٹر سہگل یہ سارہ حسن ہیں۔ اور یہ ان کی بیٹی زارا حسن۔''

دونوں نے سارہ سے ہاتھ ملایا۔ زارا کو پیار سے اپنے پاس بلا لیا۔

''یہ سب کیا ہے ڈاکٹر؟'' سارہ نے حیرت سے پوچھا۔

ڈیسک پر چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔

کچھ نوٹ پیڈز تھے جو سارجنٹ شیفرز نے اپنی طرف کر لیے۔

''یہ دونوں میرے بڑے اچھے دوست ہیں زارا۔ ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جس دن آپ لوگ پکنک پر گئے تھے اس دن کیا ہوا تھا؟'' ڈاکٹر ہرش نے اُسے ایک بڑی کینڈی بار دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی، تو کیسی تھی پکنک، زارا حسن؟'' سارجنٹ نے بہت نرم! پیارے طریقے سے پوچھا۔

''بہت اچھی۔ ہم لوگ بہت enjoy کر رہے تھے۔ میں اور جولی ساتھ ساتھ تھے۔'' وہ رکی۔ جولی کا نام لیتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ ''آپ کو پتا ہے آفیسر۔ میری دوست جولی اسی پکنک میں مر گئی۔ میری سب سے اچھی دوست؟'' اس نے اچانک اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے اور سسکیوں سے رونے لگی۔

سب کے چہرے اتر گئے لیکن انہوں نے اُسے رونے دیا۔

کیتھولک آئے اور انہوں نے آدھے علاقے کو اپنے مذہب میں شامل کیا۔ باقی آدھے پر آرتھوڈکس کا قبضہ رہا۔ ان دونوں مذہب کو ٹھکرانے والا بوگول قبیلہ تھا جسے دونوں نشانہ بناتے تھے۔ 1390ء میں ترکوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو ان کے حسن سلوک کی وجہ سے بوگول قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ ہم انہی بوگول کی اولاد ہیں۔

''گویا نسلی طور پر تم لوگ یورپی ہو؟'' طارق بٹ نے سوال کیا۔

''جی ہاں! ہم پوری طرح یورپی ہیں مگر مسلمان ہیں ناں! اسی لیے یورپی ہمیں اپنا نہیں کہتے اور ہم مسلمان ہونے کی سزا صدیوں سے بھگت رہے ہیں۔ 1683ء میں عثمانی فوجیں پسپا ہوئیں تو مسلمانوں کو تبدیلیٔ مذہب پر مجبور کر دیا گیا اس دور میں مسلمانوں پر جو ظلم ہوئے اسے سن سکو گے؟ تو سنو...... کلیسا کا حکم تھا کہ ایک بھی مسلمان پورے علاقے میں نہ رہے۔ مسلمانوں کو گھروں سے کھینچ کھینچ کر نکالا جاتا اور انہیں گھر والوں کے سامنے ذبح کیا جاتا۔ گھر کی عورتوں کو یہ سب دیکھنے پر مجبور کیا جاتا۔ اسی دور میں ''کارلووک'' میں ایک ایسا کیمپ قائم کیا گیا تھا جس کی مثال شاید ہی کبھی ملے! اس کیمپ میں 500 سے زائد عورتوں کو رکھا گیا تھا۔ ان عورتوں کی پیشانی پر دہکتے لوہے سے صلیب بنا دی گئی تھی تاکہ یہاں سے فرار ہونے والی فوراً گرفتار ہو سکے۔ ان عورتوں کو تین دن میں ایک بار ابلے ہوئے چاول کھانے کو دیے جاتے وہ بھی اس طرح کہ ایک بڑے سے ٹب میں چاول انڈیل دیے جاتے پھر ان عورتوں کے ہاتھ پشت پر باندھ کر ٹب کی طرف ہانک دیا جاتا۔ بھوک سے بلبلاتی عورتیں جانوروں کی طرح منہ ڈال کر کھاتیں۔ سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ ان عورتوں کے جسم پر کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ توجیہہ یہ دی گئی تھی کہ وہ برہنہ ہونے کی وجہ سے فرار نہیں ہوں گی۔ اتنے ظلم و ستم کے بعد بھی وہ علاقہ مسلمانوں سے خالی نہ ہو سکا۔ بچ جانے والے مسلمانوں کی اولادیں پھلتی پھولتی رہیں۔ 19741 مربع میل کے بوسنیا ہرزی گووینا میں جہاں کی کل آبادی 439800 ہے مسلمان 44 فی صد ہیں جبکہ 31 فی صد سرب اور 17 فی صد کروٹ۔ الگ الگ دیکھا جائے تو مسلمان ہی اکثریت میں ہیں مگر عیسائیت کے حوالے سے سرب اور کروٹ ملے ہوئے ہیں تاکہ مسلمانوں کا صفایا بہ آسانی کر سکیں۔

اقتباس: دشت آلام میں بحوالہ سانحہ بوسنیا از محمد الیاس انصاری

''اوہ، بڑا افسوس ہوا زارا۔ مگر ہم نے سنا ہے کہ وہاں کوئی خرگوش آ گیا تھا اور وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی......'' سارجنٹ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی۔

''نہیں، نہیں آفیسر۔ وہاں کوئی خرگوش نہیں تھا۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''لیکن مسٹر جان اینڈرسن تو......؟''

''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہاں کوئی خرگوش نہیں تھا۔'' وہ رکی۔ شدتِ جذبات سے اس کا سانس پھول سا گیا۔

''لیکن ان کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے زارا۔'' سارجنٹ نے کہا۔

''اس لیے کہ وہ...... وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔''

اب سب دم سادھے اس کی بات سن رہے تھے۔

''ہم سب کھیل رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے اور جولی نے پہاڑی پر چڑھنے کا ارادہ کیا۔ وہ مجھ سے آگے تھی اور تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ میں واپس پلٹی کہ مس آڈ حر کو بتا دوں کہ ہم لوگ پہاڑ پر ٹریکنگ کرنے جا رہے ہیں۔ بغیر بتائے جاتی تو وہ ناراض ہو جاتیں کہ اکیلے کیوں گئی۔'' اب زارا جیسے سارا سین دیکھ رہی تھی۔ ''مجھے تھوڑا سا وقت لگ گیا۔ واپس اس جگہ آئی جہاں پہلے جولی کھڑی تھی۔ لیکن...... میں نے دیکھا کہ وہ اکیلی نہ تھی۔ جان اینڈرسن اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ ان کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔'' پلیز، میرے نزدیک نہ آئیں۔ مجھے تنگ نہ کریں۔''

''میں پاگلوں کی طرح یہ سب دیکھ رہی تھی۔ لیکن مسٹر اینڈرسن نہیں رکے۔ وہ اُسے جیسے دبوچنا چاہتے تھے۔ میں چیخی چھوڑ دیں۔ میری دوست کو چھوڑیں۔'' تقریباً چیختے ہوئے میں نے کہا۔

'' انہوں نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ میں کافی فاصلے

پر تھی وہ شاید اس سے پہلے ہی اُس پر جھپٹ چکے تھے۔ کیونکہ جولی نے اپنے لمبے ناخن ان کے گال میں گاڑ دیئے تھے۔ جولی کی چیخ سنی۔ مسز اینڈرسن اُسے دھکا دے چکے تھے۔ میری دوست...... میری دوست پہاڑ کی کھائی میں

گرتی رہی۔ گرتی رہی اور پھر آخر کار......" زارا اس سے زیادہ نہ بول سکی۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سب دم سادھے خاموش بیٹھے تھے کہ کلک کی آواز سنائی دی۔ سارجنٹ شیفرز ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آف کر رہے تھے۔

یہ سب کچھ ریکارڈ ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر ہرش نے بٹن دبا کر نرس کو بلایا اور خوشگوار لہجے میں کہا۔

"بھئی ہزارا کا برگر اور ملک شیک آگیا ہے؟"

"جی ڈاکٹر، ابھی ابھی دے کر گیا ہے۔"

"چلو جی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ گرما گرم برگر، فرنچ فرائز اور چاکلیٹ ملک شیک آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

زارا نے خوش ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

"شکریہ ڈاکٹر! آپ نے بہت مدد کی ہم دونوں کی۔"

"مسز حسن، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت آپ کی اس کم عمر بچی نے ہماری کتنی بڑی مدد کی ہے۔ مسٹر جان اینڈرسن کے چہرے پر اسکریچ کسی کانٹے دار جھاڑی سے نہیں لگے تھے۔ جولی لارسن کا پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے اور ڈاکٹر سہگل جو یہاں بیٹھے ہیں، انہوں نے اس میں بڑا حصہ لیا۔ اس بچی کے ناخنوں میں جان اینڈرسن کی جلد کا گوشت پھنسا ہوا تھا۔ زارا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ جولی نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ناخن استعمال کیے۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکے پھر بولے "ہمیں اس کیس کو سلجھانے میں مشکل آرہی تھی کہ اس کا چشم دید گواہ کوئی نہ تھا۔ پولیس جانتی ہے کہ ایسے ہوشیار، مکار مجرم سے کیسے نمٹا جائے۔ زارا سے گواہی لینے کے لیے یہ سارا ڈراما رچانا پڑا۔ ورنہ وہاں رہ کر آپ دونوں ماں بیٹی کو خطرہ ہو سکتا تھا۔"

"اب آپ دونوں کو کوئی خطرہ نہیں۔" سارجنٹ نے مسکرا کر سارہ سے کہا۔ "آپ کے یہاں پہنچنے کے بعد ہم نے پولیس وین بھیج کر اس کو تھانے بلا لیا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک بارہ تیرہ سال کی بچی نے ایسا ثبوت دے دیا ہے جس سے وہ جیل میں سڑے گا۔"

☆☆☆

صبح دس بجے وہ دونوں گھر پہنچیں۔

ذرا گھبراہٹ خوف سے۔ اس خیال سے کہ وہ اتنا عرصہ کسی قاتل کے ساتھ رہ رہی تھیں۔

دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

ہُو کا عالم تھا۔ جان اینڈرسن جو ہمیشہ بالکل سامنے والی آرام دہ چیئر پر بیٹھے رہتے تھے آج غائب تھے۔ میری البتہ کچن میں خاموش بیٹھی تھیں۔

دونوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے زارا؟" خاموش لہجے میں پوچھا۔

"اب میں بہتر ہوں مسز اینڈرسن۔" اس نے ذرا بشاشت سے کہا۔

"یہ جان نظر نہیں آرہے؟" سارہ نے ایکٹنگ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"وہ لے گئے ہیں اُسے۔" انتہائی نفرت سے میری نے کہا۔

"لے گئے ہیں؟ کون، کہاں؟" سارہ نے پوچھا۔

"پولیس والے آئے تھے وارنٹ گرفتاری لے کر جولی لارسن کے قتل کیس میں۔ کہتے تھے تفتیش کرنی ہے۔" لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ الزام ثابت ہونے کے بعد کسی معافی کا حقدار ہے......" میری نے بہت عجیب لہجے میں کہا۔

"جی......؟" سارہ بری طرح چونکی۔

"بہت ہو گیا ہے۔ ہاں بہت ہو چکا ہے۔ بس اور نہیں۔"

جانے میری کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔

سارہ نے زارا کو اشارہ کیا کہ اپنے کمرے میں جا کر ٹی وی لگا لے۔ یوں بھی اس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی۔

وہ اوپر جا کر بستر پر لیٹ گئی۔

"یہ پہلی واردات نہ تھی، جان ذہنی طور پر کج روی کا شکار ہے۔ یہ وبا پورے اسٹیٹس کو گھیر رہی ہے کہ معصوم بچیوں کو ڈرا دھمکا کر غلط راستوں پر ڈالا جا رہا ہے اور اس وبا کے شکار زیادہ عمر والے ہیں جو رشتوں کے تقدس کو پامال کر رہے ہیں۔ جان کو پوری سزا ملے یہ میری خواہش ہے۔ اس کے بغیر میں اکیلی ضرور ہو جاؤں گی مگر معاشرہ تو بچ جائے گا۔" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔